on Christmas Day
1938

بائبل کی کتابوں کا دیباچہ

اور

اُن کے مضامین

بائبل کا عام دیباچہ

بائبل الہام کا نتیجہ بھی ہے اور چشمہ بھی۔ زمانہ سلف کے لوگوں کے اقوال اور کلمات رُوح القدس کے اشارے یا ہدایت سے ویسے ہی از سر نو زندہ اور متحرک ہو جاتے ہیں اور اُسی رُوح کی برکت سے انسانوں کے دلوں اور زندگیوں میں وہ واقفیت بخشنے والے پستی کے گڑھے سے نکال کر بلند و بالا کرنے والے اور نجات بخش قوت دینے والے بن جاتے ہیں اس لئے ان کے متعلق ہر تفصیل دلچسپی رکھتی ہے ✦

۱۔ نام ۔ بائبل ایک کتاب نہیں بلکہ بہت کتابوں کا ایک مجموعہ ہے لفظ بائبل کی اصلی صورت اور معنی سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے ۔ یونانی میں لفظ ببلاس کے معنے کتاب ہیں ۔ کیونکہ ببلاس کھجور جیسے پیڑ کے درخت کے اندرونی چھلکے کا نام تھا جس پر قدیم تحریریں لکھی جاتی تھیں ۔ متی ۱: ۱ میں یہ لفظ ببلاس آیا ہے ۔ لیکن لوقا ۴: ۱۷ میں اس کا اسم تصغیر ببلی آن اسی معنی میں آیا ہے ۔ قدیم یونانی مسیحی اپنے نوشتوں کو تا ببلیا کہتے تھے ۔ یعنی اعلےٰ کتابیں ۔ صدیوں تک وہ اسی نام سے موسوم رہیں ۔ لیکن بعد ازاں ببلیا کی لاطینی صورت گو دراصل جمع تھی لیکن غلطی سے واحد مونث خیال کر لی گئی ۔ اس روز افزوں رائے کے ذریعہ بھی اس خیال کی تائید ہوئی کہ یہ نوشتے ایک مکمل کتاب ہے ۔ لاثانی کلام اللہ جہان کے لئے ۔ اس طریقہ سے یہ کلام بطور واحد کے بہت مروج ہو گیا ۔ ...

یہودی اور مسیحی مقدس کتابیں جو پہلے پہل خاص کردہ نوشتے (ہائے گرافائے) کہلاتے
تھے یورپ کی ساری زبانوں میں بائبل کے نام سے مشہور ہوئے ۔

لفظ "عہد نامہ" جس کی وجہ سے یہ دو محاورے "پرانا اور
نیا عہد نامہ" ہم میں مشہور ہوا غالباً یونانی لفظ ڈیاتھیکے (Diatheke)
کا ترجمہ ہے۔ لیکن اس میں کچھ غلط فہمی ہوئی۔ پرانے عہد نامہ کے یونانی
مترجموں نے عبرانی لفظ بریت (Berith) کا ترجمہ عہد کیا اور شروع شروع
میں اس لفظ کے بہت عام معنے تھے۔ اور اس سے فیصلجات اور مختلف قسم کی
فتووں اور اقرارناموں کی طرف اشارہ تھا۔ مگر چونکہ ان فیصلجات اور فتووں کے ساتھ دینی
رسم و رسوم ملحق تھیں اس لئے لفظ "عہد نامہ" کے ایک خاص دینی معنے ہو گئے اور
خدا کے فیصلجات اور اس کے اُن اقراروں یا عہد و پیمان کے لئے مستعمل ہونے لگا
جو وہ اپنی برگزیدہ اُمت یا اُن کے خاص نمائندگان سے کرتا تھا۔ مثلاً اُس کا
"عہد" نوح سے۔ ابرام سے وغیرہ اور نیا "عہد" جو اُس نے مسیح کے وسیلے
آدمیوں سے کیا۔ پہلے عہد کے ذریعہ اسرائیل کے بزرگوں اور ان کی اولاد پر
خدا کی اطاعت اور عبادت فرض ہو گئی اور اُس نے اپنی طرف سے اُن کو
برکت دینے اور شفقت کرنے کا وعدہ کیا۔ چونکہ بنی اسرائیل کاموں کے اس عہد کو پورا
کرنے میں قاصر رہے اس لئے فضل کے عہد کی ضرورت پڑی جس کے زیر تحت
مسیح پر ایمان لانے کے وسیلے معافی اور استبنائیت ہم کو ملتی ہے۔ اسی معنی میں
مقدس پولس نے یہ لفظ استعمال کیا (۲ کرنتھی ۳: ۶)۔ صرف ایک دفعہ (عبرانی
۹: ۱۶ و ۱۷) شاید اس کا اشارہ وصیت یا انتقال (Dispositionem)
کی طرف ہے۔ لیکن جب لاطینی لفظ (Testamentum) کے ذریعہ
اس کا ترجمہ کیا گیا اُس کے عام معنے یہی ہیں۔ یعنی وصیت یا جائداد کا انتقال کچھ

سعی کی گئی کہ لفظ ٹسٹامنٹم (Testamentum) کی جگہ ایک دوسرا
لفظ انسٹرومنٹم (Instrumentum) یعنی مستند تحریر استعمال
کیا جائے۔ لیکن پہلا لفظ قائم رہا اور یہ جملہ مروج ہو گیا "پرانا اور نیا عہد نامہ"
یعنی ایسے عہد یا اقرار نامے جو خدا نے اپنی اُمت سے یہودی اور مسیحی زمانوں
میں علیحدہ علیحدہ کئے تھے ۔

۲۔ زبان۔ جن لوگوں میں پہلے پہل بائبل کا رواج ہوا انہیں کی زبان
میں یہ لکھی گئی۔ عہد عتیق کی زبان عبرانی ہے ۔

عبرانی زبان داہنی طرف سے بائیں طرف کو لکھی جاتی تھی۔ زمانہ حال کی
عبرانی بائبل میں صفحے بھی داہنی طرف سے بائیں طرف کو جاتے ہیں حروف صحیح تو
مربع صورت کے ہیں۔ اور حروف علت کی جگہ چھوٹے چھوٹے اعراب کے
نشان دیئے گئے ہیں۔ شروع شروع میں عبرانی میں کوئی حروف علت نہ تھے
اور بندی کے لئے اس زبان کی تلاوت کیسی مشکل ہو گی مثلاً لفظ د۔ ب۔ ر
کو دابھار بھی پڑھ سکتے ہیں (بمعنی لفظ) یا دِبَر (بمعنی وہ بولا) یا دوبیر (بمعنی بولنے
والا) یا دوبھر (بمعنی چراگاہ) یا دِبھر (بمعنی مری)۔ لیکن جیسا پیچھے ذکر آئیگا۔ اعراب
کا رواج چھٹی صدی مسیحی میں ہوا تاکہ صحیح تلفظ کو قائم رکھ سکیں۔ عہد عتیق کے
ترجمے اور تشریح کرنے میں جو مشکلات پیش آئی ہیں اُن میں سے ایک یہ مشکل
تھی جس کا ذکر ہوا۔ بعض اوقات یہ شبہ رہتا ہے کہ آیا اصل متن کے حروف صحیح پر صحیح
اعراب لگائے گئے یا نہیں یا اُن کی جگہ کونسے اعراب لگانے چاہئے ۔

عبرانی میں آرامی زبان بھی داخل ہے۔ اس کا عبرانی سے قریب تعلق ہے
اور اس میں خاص خصوصیتیں بھی ہیں۔ عہد عتیق کے حصے مثلاً عزرا ۴: ۸ سے ۶: ۱۸
۷: ۱۲ سے ۲۶۔ یرمیاہ ۱۰: ۱۱۔ دانیال ۲: ۴ سے ۷: ۲۸۔ آرامی زبان

ہیں لکھے گئے تھے اور اس زبان کے بعض الفاظ اور جملے عہد عتیق کے کئی دوسرے مقامات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ یا تو اصل مصنّف کے خاص مقامی خواص کے سبب ہوا یا نقل کنندگان کی غفلت کے سبب۔ عام قیاس یہ ہے کہ ہمارے خداوند اور اُس کے شاگردوں کی عام بول چال آرامی زبان کی ہی کسی صورت میں ہوگی اور اس بولی کے زیادہ غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کے باعث ان کی تعلیم زیادہ روشن ہوگئی ہے۔ نئے عہد نامہ میں جو اشارے عبرانی کی طرف ہیں وہ خاص کر آرامی زبان کے ہیں۔ (یوحنا ۵: ۲ + ۱۹: ۱۳ و ۱۷ + اعمال ۲۱: ۴۰ + ۲۲-۲ وغیرہ) +

عہد عتیق کے آرامی حصوں کے لئے بعض اوقات لفظ خلدی آیا ہے۔ لیکن یہ غلطی ہے کیونکہ خلدیہ بابل کا نام ہے اور خلدی بابلی کتبوں کی زبان ہے +

دوسری صدی قبل از مسیح میں بمقام اسکندریہ عہد عتیق کا یونانی ترجمہ ہونے لگا۔ یہ ستر ونکا (septuaginta) ترجمہ کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ روایتًا یہ مان لیا گیا تھا کہ اس کے ترجمہ کرنے کے لئے ستر فقیہہ لگائے گئے تھے غالبًا مسیحی سن سے کچھ عرصہ پیشتر یہ ترجمہ ختم ہوگیا۔ اور عہد عتیق کے مطالعہ میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے (دیکھو فصل عہد عتیق اور جدید کے مابین عرصہ میں جو تصنیفات ہوئیں) +

نئے عہد نامہ کی زبان یونانی ہے۔ یونانی کی ایک خاص صورت جو ہیلنسٹک (Hellenistic) یونانی کے نام سے نامزد ہی۔ مگر زمانہ حال کی معلومات کے ذریعہ سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوگیا ہے کہ نئے عہد نامہ کے زمانہ میں جو یونانی زبان دُنیا بھر میں بولی جاتی تھی وہ یہی تھی۔ اس لئے ستروں کے ترجمے کے اور مقدس پولس کے خطوں کے اور اناجیل کے محاورات مسیحی دین یا اُس کے پیغام سے مخصوص نہیں

بلکہ اُس زمانہ کی طرز تحریر اور مروجہ زبان یہی تھی +

۴۔ حصے۔ اس بات کا تو ذکر ہو چکا ہے کہ بائبل کے دو حصے ہیں یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ۔ ہماری موجودہ بائبل میں عہد عتیق کی ۳۹ کتابیں ہیں۔ لیکن عبرانی بائبل میں ان کا شمار صرف ۲۴ ہے۔ سموئیل کی پہلی اور دوسری کتابیں۔ سلاطین کی پہلی اور دوسری کتابیں۔ دوسری تواریخ کی کتاب معہ عزرا اور نحمیاہ کے اور بارہ انبیائے صغیر ایک ایک کتاب گنی گئیں۔ عبرانی تقسیم وسیع طریقوں پر ہے۔ پہلی پانچ کتابیں توراہ (یا شریعت) کہلاتی ہیں۔ بعد ازاں بنی ایم (یعنی انبیا) پھر ان میں سے بعض ماقبل (چار کتابیں) اور مابعد (چار کتابیں) پر منقسم ہوئیں۔ اور تیسرا بڑا حصّہ کتوبیم (یعنی نوشتے۔ جو ستروں کے ترجمہ میں ہگیوگرافا کہلاتی ہیں) +

مفصلہ ذیل نقشے سے ظاہر ہو جائیگا کہ عبرانی بائبل میں مختلف کتابوں کو اس طرح تقسیم کیا ہے :-

۱۔ توراہ		پیدائش	Genesis
		خروج	Exodus
		احبار	Leviticus
		گنتی	Numbers
		استثنا	Deuteronomy
۲۔ بنی ایم	ماقبل	یشوع	Joshua
		قاضی	Judges
		سموئیل	1 & 2 Samuel
		سلاطین	1 & 2 Kings

مابعد

یسعیاہ
یرمیاہ
حزقیل
بارہ انبیائے صغیر

۳- کتوبیم

زبور
امثال
ایوب

پانچ مگلوتھ یا طومار کتابیں

غزل الغزلات
روت
نوحہ
واعظ
آستر

دانیال
عزراہ اور نحمیاہ
تواریخ

ہگیوگرافا کے معنی ہیں "مقدس کتابیں"۔ کتوبیم کی یہ تشریح ہے۔ ان کا نام پانچ مگلوتھ اس لئے رکھا گیا۔ کیونکہ یہ کتابیں علیحدہ علیحدہ پانچ طوماروں میں لکھی گئی تھیں وہ یہودی عیدوں کے وقت سال بہ سال پڑھی جاتی تھیں۔ غزل الغزلات عید فسح کے وقت۔ روت عید پنتی کوسٹ کے وقت۔ واعظ۔ عید خیام کے وقت۔ آستر عید پوریم کے وقت۔ نوحہ۔ یروشلم کی بربادی کی سالگرہ پر +

اس کے بعد یوسیفس نے ان کتابوں کا شمار بائیس بتایا تاکہ عبرانی کے بائیس حروف تہجی کے مطابق کرے۔ اس شمار کے لئے روت کو قاضیوں کی کتاب سے اور نوحہ کو یرمیاہ کی کتاب سے ملحق کیا +

۴- ترتیب۔ عبرانی بائبل کی جو تقسیم اوپر دی گئی اُس سے ظاہر ہے کہ وہ انگریزی یا اُردو بائبل کی کتابوں کی تقسیم اور ترتیب سے بہت متفرق ہے۔ انگریزی بائبل نے لاطینی ولگاٹ کی تقسیم و ترتیب کو اختیار کیا اور ولگاٹ نے ستروں کے ترجمہ کی۔ یہاں تقسیم مضمون کے مطابق ہے۔ شریعت (پانچ کتابیں) تاریخ (بارہ کتابیں) نظم (پانچ کتابیں) نبوت (سترہ کتابیں) لیکن تحقیق کرنے پر ظاہر ہو جائیگا کہ یہ ترتیب و تقسیم ناقص اور ادھوری ہے۔ اور جو تقسیم عبرانی بائبل میں دی گئی اُس سے بھی بہ کم تسلی بخش ہے۔ حال کے علماء نے کوشش کی کہ ان کتابوں کی کوئی تاریخی ترتیب ٹھیرائیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ طالب علم ہمعصر واقعات کی روشنی میں ان مختلف کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ مرحوم پروفیسر ڈیوڈسن صاحب (A. B. Davidson) نے صرف انبیا کی ترتیب تاریخی سلسلہ کے مطابق دی ہے۔ اُس خاکے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایسی ترتیب سے کیا فواید حاصل ہوتے اور کونسی مشکلات پیش آتی ہیں۔ (۱) آسوری زمانے کے انبیاء۔ عاموس۔ ہوسیع۔ یسعیاہ (۷۴۰ ق م سے ۷۰۰ ق م)۔ میکہ۔ ناحوم۔ صفنیاہ۔ (۲) بابلی زمانہ کے انبیا حبقوق۔ یرمیاہ (۶۲۶ سے ۵۸۰ ق م)۔ حزقیل (۵۹۳ سے ۵۷۰ ق م) (۳) جلاوطنی اور بحالی کے زمانہ کے انبیا۔ یسعیاہ ۴۰ سے ۶۶ تک (۵۵۰ ق م)۔ حجی اور زکریاہ (۵۲۰ ق م) ملاکی (۴۲۰ ق م) یوایل اور عبدیاہ کا زمانہ ٹھیک طور سے معلوم نہیں۔ اور یونہ کا زمانہ بہت مابعد ٹھیرایا۔ عہد عتیق کے باقی دو حصّوں کے بارہ میں اور بھی بڑی مشکلات ہیں (دیکھو فصل۔ قانون) +

برعکس اس کے نئے عہد نامہ کی ترتیب آسانی سے ہو سکتی ہے۔ یہ کتابیں جو شمار میں ۲۷ ہیں آسانی سے چھ حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں (۱) اناجیل (۲) رسولوں کے اعمال (۳) مقدس پولس کے خطوط (۴) عبرانیوں کی طرف کا خط (۵) خطوط عام

(۶) مکاشفہ کی کتاب۔ یہ ترتیب کم از کم اس وسیع تجویز کے مطابق ہے جس کے ذریعہ یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسیحی دین کا آغاز یسوع مسیح سے ہوا۔ اس کی ترقی رسولوں کے زمانہ میں ہوئی۔ قدیم مسیحی خطوں میں اس دین کے مسائل اور تصورات قلمبند ہوئے اور اس کا آخری کمال اُس منکشف رویت میں ہوا جو مکاشفہ کی کتاب میں مندرج ہے۔ لیکن یہ ترتیب تواریخی سلسلہ کے مطابق نہیں۔ مقدس مرقس کی انجیل غالباً اناجیل میں سب سے پہلے تحریر ہوئی۔ حالانکہ مقدس پولس کے بعض خط شاید اس سے بھی پہلے لکھے گئے۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ بابوں اور آیتوں کی تقسیم اصل کتاب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ یہ وسطی زمانوں کی اختراع ہے۔ آیات کے شمار کے ساتھ پہلے پہل ۱۵۶۰ء میں بائبل شائع ہوئی۔ حوالوں کے لئے تو یہ تقسیم مفید ہے۔ لیکن اس تقسیم سے کبھی کبھی معنی خبط ہو جاتے اور بیان میں بلاضرورت خلل پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ۱۸۸۵ء کے نظرثانی کرنے والوں نے بابوں اور آیتوں کا شمار حاشیہ میں دیا۔

۵۔ قانون۔ بائبل کے ہر دیباچہ میں یہ جملہ مستعمل ہوا ہے "عہد عتیق کا قانون" یا "عہد جدید کا قانون" یا "قانونی کتابیں" ان جملوں سے کیا مراد ہو گی؟ لفظ قانون یونانی ہے جس سے ماپنے کا گز یا فیتہ مراد تھا۔ بعد ازاں اسکے معنی ماپنے کا معیار ہوا۔ اور آخر کار اس کے یہ معنی ہوئے۔ وہ ساری جگہ جو ایسی پیمائش میں آ گئے۔ یہ لفظ قانون بائبل کی کتابوں کے متعلق مسیحی چوتھی صدی میں مستعمل ہوا جس سے یہ مراد تھی کہ یہ کتابیں ایمان کا معیار تھیں۔ یا یہ کہ یہ خاص جگہ رکھتی ہیں جہاں وہ ساری کتابوں سے علیحدہ کی گئی ہیں۔ عام طور پر قانون سے عہد عتیق اور عہد جدید کی اُن کتابوں کا مجموعہ مراد ہے جو اپوکرفا کی کتابوں سے الگ کی گئیں (دیکھو اپوکرفا)۔ اس مضمون کے متعلق دو سوال کئے جاتے ہیں۔ (۱) کیوں ایسا مجموعہ

کیا گیا؟ کن اصولوں کے مطابق یہ کتابیں منتخب ہوئیں؟

اگر ہم پہلے سوال کو عہد عتیق پر عاید کریں تو ہمیں پتہ لگے گا کہ اس مضمون پر کس قدر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ کم سے کم سموئیل کے دنوں میں "انبیا کے سکول" موجود تھے۔ جہاں نہ صرف دینی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی بلکہ علمی بھی۔ اِن سکولوں میں اسرائیل کی تاریخ کی پہلی تحریریں محفوظ رہیں۔ ان تحریروں کی تالیف اور ترتیب مابعد پشتوں کا کام تھا۔ اب ہم یقینی طور سے نہیں بتا سکتے کہ یہ کیسے ہوا۔ اگر ہم عہد عتیق کے بڑے بڑے حصوں کو لیں تو اُن سے ظاہر ہو گا کہ یہ قانون کیسے بن گیا۔ یہ عمل بتدریج ہوا۔ جب عزراہ نے توریت لوگوں کے سامنے پڑھی (نحمیاہ ۸ باب) اس وقت غالباً موسےٰ کی پانچ کتابیں ہی قانونی تسلیم کی گئی تھیں۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ سامری جو اس وقت کے قریب ایک علیحدہ جماعت بن گئے ان کے پاس صرف موسیٰ کی پانچ کتابیں ہی ہیں۔ جو پہلا سوال اوپر پوچھا گیا اُس کا جواب عزراہ کے کام سے ملتا ہے۔ عزراہ اور نحمیاہ تمدنی اور دینی مصلح تھے۔ ان لوگوں کی آرزو تھی کہ اُمت کی ہدایت کے لئے ایک صاف اور خاص ہدایت نامہ ہو اور اس لئے اُنہوں نے موسےٰ کی پانچ کتابوں کو ایمان اور اخلاق کے معیار کے لئے پیش کیا۔ اس عرصہ میں مختلف نبیوں کی تصنیفات بھی معہ تاریخوں کے حفاظت سے رکھی گئیں اور کچھ عرصہ بعد اُن کو بھی موسیٰ کی پانچ کتابوں پر ایزاد کیا۔ اس سے بھی بہت پیچھے۔ اور وہ بھی بہت بحث کے بعد تیسرا حصہ یعنی کتوبیم ایزاد کیا گیا۔ جب کوئی نبی زندہ نہ رہا جس کی آواز لوگ سُن سکتے۔ اُس زمانہ میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ نبیانہ کتابوں کا بھی حق ہے کہ وہ قانون میں داخل سمجھی جائیں کتوبیم

کے مقصد نے مزامیر کے لئے جگہ صاف کر دی جو دوسری ہیکل کی عبادت کے لئے ایسی ضروری تھے اور مگلوتھ یا پانچ طوماروں کے لئے بھی جو مختلف عیدوں کے موقعوں پر پڑھے جاتے تھے ؞

جن عام اصولوں کے مطابق یہ کتابیں قانون میں داخل ہونے کے لئے چُنی گئیں وہ تین تھے۔ (۱) یہ وہ کتابیں تھیں جو بہت پہلے سے موجود اور مشہور تھیں یا (۲) ایسی کتابیں تھیں جو کسی بڑے شخص کے نام سے منسوب تھیں۔ مثلاً موسےٰ کی کتابیں۔ داؤد کے مزامیر۔ سلیمان کے امثال۔ یا (۳) ایسی کتابیں تھیں جن کا بہت قریب تعلق قومی تاریخ یا قومی تیوہاروں سے تھا ؞

جو ساری کتابیں قانون میں شامل ہوئیں ان کی نسبت بیشک یہ ایمان تھا کہ اُن میں خدا کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسا کہ اُس نے عبرانی قوم کے آباؤں مقدسوں اور نبیوں سے کلام کیا تھا۔ یعنی جیسا اُس نے کسی زمانہ میں کسی اور ملک کے لوگوں سے کلام نہ کیا تھا۔ یا یہ کہ اُس کی قوت ویسے ہی محسوس کر سکتے تھے جیسی کہ نہ فقط افراد کے تجربوں میں آشکارا ہوئی تھی بلکہ قوم کی عام تاریخ میں بھی۔ چونکہ ان کتابوں میں خدا کی حضوری محسوس ہوتی تھی یا الہامی عنصر پایا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہم مانتے ہیں۔ اس لئے اُن کی نظروں میں یہ کتابیں لاثانی اور مقدس ٹھیریں ؞

عہد عتیق کے قانون مقرر ہونے کی ٹھیک تاریخ ہمیں تحقیق معلوم نہیں۔ اس کی تاریخ دوسری صدی قبل از مسیح کے آخر سے پہلے غالباً نہ ہوگی۔ حالانکہ دوسری صدی مسیحی میں یہودی ربّی بعض کتابوں کی دعاوی کی نسبت بحث کیا کرتے تھے۔ مثلاً واعظ اور غزل الغزلات کی نسبت کہ آیا انکو قانون میں جگہ ملنی چاہئے یا نہیں ؞

عہد جدید کے قانون کی تاریخ کسی قدر اس سے متفرق ہے۔ اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ عہد جدید کی ساری کتابیں جن کو ہم جانتے ہیں وہ پہلی صدی مسیحی کے آخر سے پیشتر یا عین اُس کے خاتمہ کے بعد موجود تھیں۔ لیکن کئی سالوں تک عہد جدید مکمل صورت میں تسلیم نہ کیا گیا۔ جب تک رسول زندہ رہے یسوع مسیح اور انجیل کے بارہ میں کسی تحریری بیان کی کوئی ظاہرا ضرورت نہ تھی۔ پہلے مسیحی یہ مانتے تھے کہ خدا کا رُوح ان پر نازل ہوا تاکہ اُن کو ساری سچائی کی راہ میں لے چلے۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ساری چیزوں کا آخر نزدیک تھا۔ اِن دو عقیدوں کی سند کے لئے کوئی تحریری معیار مقرر کرنا فضول تھا۔ دوسری صدی کے وسط میں بھی حالانکہ اب اتنی دیر گزر گئی تھی ایک مسیحی پیشوا پے پی آس نامی نے جو ہائراپولس (Hierapolis) کا بشپ تھا اپنی ایک تحریر میں ظاہر کیا کہ روحانی نعمتیں تحریری شہادت سے کہیں افضل تھیں۔ لیکن جب رسولی زمانہ کی سرگرمی کی پہلی چمک دمک ماند پڑنے لگی اور جب مسیحیت کو بت پرست فلسفہ کے ساتھ مقابلہ پیش آیا تو قدیم مسیحی تحریریں زیادہ بیش بہا ٹھیریں۔ جسٹن شہید نے ۱۵۰ء کے قریب یہ بتایا کہ کیسے "رسولوں کے تذکرات کی" (جن سے اناجیل مراد ہوگی) اور "عہد عتیق کے انبیا کے" کی خداوند کے دن تلاوت ہوا کرتی تھی۔ دوسری صدی کے آخر کے قریب عہد جدید کے سریانی ترجمہ میں وہ ساری کتابیں داخل تھیں جو ہمارے قانون میں پائی جاتی ہیں۔ سوائے یوحنا کے دوسرے اور تیسرے خط اور پطرس کے دوسرے خط۔ یہوداہ کے خط اور مکاشفہ کی کتاب کے۔ حالانکہ مغرب میں یہ سب کتابیں قانون میں شامل ہوگئیں سوائے عبرانیوں کی طرف کے خط۔ یعقوب کے خط اور پطرس کے دوسرے خط کے۔ یوسیبس نے ۳۲۵ء

کے قریب اپنی ایک تصنیف میں عہد جدید کی کتابوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔ اول تو وہ جن کو سبھوں نے مستند تسلیم کیا۔ دوم وہ جن کی سند پر کبھی کچھ شک پیدا ہوا۔ سوم وہ جو جعلی سمجھی گئیں۔ جن کتابوں کی نسبت کبھی شک کیا گیا یہ تھیں۔ یعقوب کا خط۔ یہوداہ کا خط۔ یوحنا کا دوسرا اور تیسرا خط۔ عبرانیوں کا خط۔ اور مکاشفہ کی کتاب۔ جعلی کتابیں یہ تھیں۔ پطرس کی انجیل پولس کے اعمال۔ اور چند دیگر اناجیل اور مکاشفہ کی کتابیں۔ ان میں سے اکثر اب کھو گئی ہیں۔ مشتبہ کتابوں کے بارہ میں یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ جو سوال زیر بحث تھا وہ یہ تھا کہ کلیسیا میں وہ معیار کے طور پر سند مانی جائیں اس کے متعلق رایوں میں بڑا اختلاف تھا۔ مشرق میں چوتھی صدی تک مکاشفہ کی کتاب کی مخالفت ہوتی رہی۔ حالانکہ مغرب میں جس کتاب کے مستند ہونے پر مدت تک شک رہا وہ عبرانیوں کی طرف کا خط تھا۔ کلیسیا کے بہت مجمعوں میں اس مضمون پر بحث ہوتی رہی۔ اور صرف تیسری صدی میں جا کر ۳۹۵ء میں کارتھیج کے مجمع میں عہد جدید کا قانون پورے طور سے موجودہ صورت میں قایم ہوا۔

۱۶۔ **بائبل کا نص**۔ اگر انگریزی نئے ترجمہ (Revised version) کا مقابلہ انگریزی پرانے ترجمے (authorized version) سے کیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ کس قدر تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بعض تبدیلیوں کی وجہ تو انگریزی زبان کی ترقی ہے۔ لیکن بہت ساری تبدیلیوں کی وجہ قرات کا اختلاف ہے۔ نص تو عہد عتیق کی اصل عبرانی ہے۔ اور عہد جدید کی اصل یونانی پہلے پہل تو یہ رائے بہت مشہور ہو گئی تھی کہ نص تبدیل نہیں ہو سکتی اور لاتبدیل ہے جو قدیم زمانوں سے معجزانہ طور پر من وعن محفوظ چلی آئی ہے۔ بیشک یہ ایک بڑا معجزہ

ہے کہ بائبل اس قدر عرصہ سے محفوظ رہی ہے۔ جب ہم خیال کرتے ہیں کہ یورپ میں فن چھاپہ کی ایجاد سے پیشتر ہزار سال سے بائبل موجود تھی اور بڑی محنت کے ساتھ ہاتھ سے اس کی نقلیں کی جاتی تھیں اور ہزاروں ناقل اس کام میں مصروف رہتے تھے اس لئے جائے تعجب یہ نہیں کہ نص میں بعض مختلف قراتیں پائی جاتی ہیں بلکہ تعجب یہ ہے کہ یہ قراتیں ایسی تھوڑی اور خفیف سی ہیں۔ بائبل کی نص انسانی ہاتھوں کے ذریعہ محفوظ رہی جو انسانی قیود کے اندر کام کرتے رہے۔ لیکن اس میں خدا کا ہاتھ بھی ہے۔

۱۷۔ **عہد جدید کا نص**۔ عہد عتیق کی سند کے خلاف ایک پرانی دلیل یہ تھی کہ ایسے قدیم زمانہ میں فن تحریر کا رواج نہ ہوا تھا۔ لیکن اب یہ اعتراض بالکل اڑ گیا ہے۔ ہمارے پاس ایسی تختیاں موجود ہیں جو پندرہ سو برس قبل از مسیح تحریر ہوئی تھیں جو فلسطین کے جنوبی شہروں کے گورنروں نے اپنے حکام یعنی مصری بادشاہوں کی طرف لکھی تھیں اور جو کتبے مصر ہی سے ملے ہیں اُن کی تاریخ پانچ ہزار سال قبل از مسیح ہے۔

علما کا اب اس امر پر اتفاق ہے کہ عہد عتیق کے بعض حصے مسیح سے ایک ہزار سال پہلے تحریر میں موجود تھے۔ پہلے پہل غالباً یہ طومار (رنگلوتھ) کی صورت میں چمڑے پر لکھے گئے۔ قدیم عبرانی (جیسا کہ موآبی پتھر سے ظاہر ہے جو ۸۵۰ ق م کا ہے) حال کی عبرانی سے بہت متفرق تھی۔ کیونکہ حال کی عبرانی کے حروف مربع صورت کے ہیں۔ قدیم زمانوں سے لیکر چھاپہ کے زمانہ تک صدہا سال تک ان کی نقلیں ہی ہوتی رہیں اور اس لئے کئی غلطیاں سہواً ہو گئی ہونگی۔ بہت صدیوں تک اعراب بالکل استعمال نہیں ہوئے اور حروف صحیح بھی ایسے طور سے لکھے جاتے تھے کہ ان کے مابین فاصلہ نہ ہوتا تھا۔ جو نقیہ نقل کیا کرتے تھے وہ بڑی خبرداری سے کام لیتے تھے۔ لیکن بعض اوقات ایک ہی صحیح حرف دو دفعہ لکھا گیا۔ بعض اوقات جہاں دو حروف صحیح ایک ہی صورت کے تھے اُن میں سے ایک چھوٹ گیا۔ کبھی شاید ایک ہی آیت میں ایک لفظ دو دفعہ آگیا اور

جب کاتب نے پہلا لفظ لکھکر دوسرا لکھنا شروع کیا تو درمیانی الفاظ چھوٹ گئے تیسری صدی مسیحی میں چند حروف صحیح بعض لمبے حروف علت کے لئے استعمال ہونے لگے۔ اِسے پوری تحریر (scriptio continua) کہتے تھے چھٹی صدی کے وسط میں جب یہودی بہت پراگندہ ہو گئے تھے۔ تب یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں عبرانی صحیح تلفظ گم نہ ہو جائے۔ ایک خاص قسم کے فقیہوں نے جنہیں مسورتیز (massoretes) یا محدث کہتے تھے۔ اعراب کا ایک کامل سلسلہ نکالا تاکہ وہی تلفظ حاصل ہو جو قدیم زمانوں سے مروّج چلا آیا تھا۔ اس سے بہت عرصہ پہلے یہ نص جو حروف صحیح میں لکھی گئی تھی۔ یہودیوں کے نزدیک شوشہ شوشہ اور نقطہ نقطہ میں مطلقاً مقدس مانی گئی تھی۔ مسورتیز نے نہایت احتیاط کی کہ اس نص میں سرمو فرق نہ آئے۔ اور جہاں تبدیلی کی ضرورت آشکارا تھی وہاں اُنہوں نے حاشیہ میں ان کا نوٹ دیدیا۔ یہ نص ایسی مقدس تھی کہ ذرا ذرا کی بھی نقل کی جاتی یا جسے کہتے ہیں کہ مکھی پر مکھی ماری جاتی تھی۔ جو حروف بڑے تھے وہ بڑے لکھے جاتے اور جو چھوٹے تھے وہ چھوٹے ہی لکھے جاتے۔ بعض نشانات جو غیر معلوم تھے (بعض شاید حوادثات کے صدمہ سے) وہ بھی من وعن ویسے ہی نقل کئے جاتے۔ اسی طرح سے عبرانی نوشتوں کی ہزارہا نقلیں پہلے پہل چمڑے پر لکھی گئیں اور بعد ازاں بھوج پتر پر۔ لیکن ان میں سے ہزاروں پہلی صدیوں میں تلف ہو گئیں۔ خود یہودیوں نے از حد تعظیم کی وجہ سے بہت نقلیں چھپا دیں۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گئیں۔ پھر جو جلدیں کچھ شکستہ اور خستہ ہو گئیں وہ بھی تلف کر دی گئیں تاکہ مقدس نص کو نقصان نہ پہنچے۔ رومی قیصروں کے ایام میں جب مسیحیوں کی ایذا رسانیاں وقوع میں آئیں تو یہ سخت کوشش کی گئی کہ مسیحیوں کی مقدس کتابیں یعنی عہد عتیق اور عہد جدید کے تلف کرنے کے ذریعہ مسیحی دین کو نیست کر ڈالیں اس کام میں محمد کے پیروؤں نے اور بھی سرگرمی دکھائی۔ اپنی فتوحات کے زمانہ میں

وہ ایسے جوش میں مبتلا تھے کہ قرآن کے سوا ساری کتابوں کو تلف کر دینا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبرانی بائبل کا سب سے پرانا حصہ جو اب موجود ہے وہ ان نبیانہ کتابوں کا حصہ ہے جو ۹۱۶ء میں جمع ہوا۔ حالانکہ کل بائبل کا سب سے پرانا کامل نسخہ گیارھویں صدی مسیحی کا ہے۔ اور ہمارے پاس بہت تھوڑے نسخے ہیں جن سے مختلف قراءتوں کے بارہ میں مدد مل سکے۔ البتہ قدیم ترجموں سے ہم کو بہت مدد مل سکتی ہے +

(ا) **اکوئلا کا یونانی ترجمہ ہے۔** اکوئلا ایک عالم یہودی مرید تھا جس نے دوسری صدی مسیحی میں عبرانی کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا +

(ب) سماخوس۔ ایک ابیونی شخص تھا اُس نے بھی اسی صدی میں یونانی میں ترجمہ کیا +

(ج) تھیوڈوشن نے اُسی وقت کے قریب سترون کے ترجمہ کی ترمیم کی +

(د) غالباً دوسری صدی ہی میں عبرانی سے اور ستروں کے ترجمہ سے سریانی زبان میں مقدس کتابوں کا ترجمہ کیا گیا جسے پیشیتو (Peshitta) یا سلیس ترجمہ کہتے ہیں۔ مقابلہ کرنے کے لئے یہ ترجمہ بہت ہی مفید ہے +

(ہ) ایک پرانے لاطینی ترجمہ کا ایک حصہ بھی ہمارے پاس ہے۔ یہ بھی زیادہ تر ستروں کے ترجمہ پر مبنی ہے +

(و) اس پرانے لاطینی ترجمہ سے بھی زیادہ ضروری ترجمہ وہ ہے جو مقدس جیروم نے عہد عتیق کا کیا۔ چوتھی صدی کے آخر کے قریب یہ عموماً عبرانی سے لاطینی میں کیا گیا۔ اور یہ عام طور پر ولگاٹ کے نام سے مشہور ہے +

مگر یہ بھی یاد رہے کہ اگرچہ بہت ساری مختلف قراءتیں موجود ہیں ان میں سے اکثر بہت خفیف ہیں اور اس امر پر شاہد ہیں کہ یہودی فقیہوں نے کیسی عجیب

صحت کے ساتھ اُن کی نقل کی اور اس امر کی کہ زمانوں کے بہت انقلابات و تغیرات میں سے یہ مقدس نوشتے کیسے عجیب طور پر محفوظ رہے ہیں۔ حال ہی میں چند سالوں سے عہدِ عتیق کے مطالعہ کی طرف بہت صبر و محنت سے توجہ مبذول ہو رہی ہے تاکہ نص کو از سرِ نو ترمیم کرے۔ اس کوشش میں علماء نے یہودی تارگموں سے (یعنی حاشیہ کی وہ تشریحیں جو قدیم یہودی ربّیوں نے آرامی زبان میں لکھی تھیں) اور ترجموں سے بہت کام لیا اور اِن سے آگے بڑھکر یہ بھی کوشش کی کہ عہدِ عتیق کی مختلف کتابوں کی زیادہ صحت سے ترمیم کی جائے ٭

۸۔ عہدِ جدید کا نص ۔عہدِ جدید کے نص کی کہانی زیادہ مختصر طور سے بیان ہو سکتی ہے۔ گو یہ مضمون زیادہ پیچیدہ ہے۔ عہدِ جدید یونانی میں لکھا گیا تھا۔ اور جب ہم کسی نص کے اصلی الفاظ دریافت کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس تین طرح کے وسائل ہیں:-

(۱) یونانی کے قدیم نسخے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور مفصلہ ذیل ہیں:-

(ا) کوہِ سینا کا نسخہ (جو الف N) کے نام سے مشہور ہے جو تشنڈراف صاحب کو ۱۸۵۹ء میں کوہِ سینا پر مقدس کیتھرائن کے راہب خانہ میں ملا۔ یہ غالباً ۳۵۰ء کے بعد نہیں لکھا گیا ہوگا۔ اس میں عہدِ عتیق (ستروں کا ترجمہ) اور کل عہدِ جدید ہے اب یہ بمقام سینٹ پیٹرزبرگ شاہی عجائب گھر میں دھرا ہے ٭

(ج) اسکندری نص جو A کے نام سے مشہور ہے۔ اسے ۱۶۲۷ء میں قسطنطنیہ کے بطریق نے شاہ چارلس اول کی نذر کیا۔ یہ پانچویں صدی سے متعلق ہے۔ اور اس میں سارا عہدِ عتیق (ستروں کا ترجمہ) اور تقریباً سارا عہدِ جدید شامل ہے۔ اب یہ انگریزی عجائب گھر میں دھرا ہے ٭

(ج) ویٹی کن (جو B کے نام سے مشہور ہے) اس میں عہدِ عتیق (ستروں کا ترجمہ) لیکن مکمل نہیں۔ اور عہدِ جدید عبرانی ۹: ۱۴ تک پایا جاتا ہے۔ اب یہ بمقام روم ویٹیکن محل میں ہے اور اس میں خطوطِ عام داخل ہیں۔ لیکن چوپانی خطوط فلیمون کا خط۔ اور مکاشفہ کی کتاب اس میں نہیں۔ یہ تین خاص بڑے نسخے ہیں۔ البتہ تقریباً انکے برابر ہی وہ نسخے بھی ضروری ہیں جو C و D اور P کہلاتے ہیں ٭

(۲) قدیم بزرگوں سے اقتباسات ۔ان میں کلمینٹ رومی۔ ٹماشیان جسٹن شہید۔ آئرینیوس اور اوریگین یونانی مصنف اور ترتلیان کپریان۔ امروز اور آگستین لاطینی مصنف داخل ہیں۔ ان اقتباسات کے متعلق یہ دقت ہے کہ مصنف اکثر اپنی یادداشت سے اقتباس کرتے ہیں اور لفظ بلفظ اقتباس نہیں کرتے بلکہ معنی کو پیش کرتے ہیں جیسے خود نئے عہد نامہ کے بارہ میں ذکر ہوا ویسے اُن کی نقل کرنے میں بھی سہو کاتب ہوئے ہیں ٭

(۳) عہدِ جدید کے ترجمے ۔ان میں سب سے زیادہ ضروری ٹماشیان کی ڈایاٹسے رن (Dialessaron) یعنی چاروں اناجیل کی تطبیق ہے جس میں جا بجا آیات مندرج ہیں۔ (لفظ ڈایاٹسی رن کے معنے ہیں چاروں کے مطابق) یہ کتاب ۱۷۰ء کے قریب لکھی گئی۔ ٹماشیان جسٹن شہید کا شاگرد تھا۔ یہ تصنیف عربی ترجمہ میں بھی موجود ہے اور اس تفسیر میں بھی جو افرائیم سُریانی نے اس تطبیق پر لکھی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس پشتی تو ترجمہ ہے اور پرانا لاطینی ترجمہ اور ولگات جن کا ذکر عہدِ عتیق کے ساتھ ہو چکا ہے۔ جیسے عہدِ عتیق کے متعلق ویسے عہدِ جدید کے متعلق بھی۔ بعض ایسے ترجمے ہیں جو ان سے کم ضروری ہیں۔ مثلاً آرمنی۔ مصری اور گاتھک ٭

عبرانی نوشتے ۱۴۸۸ء میں چھپ گئے۔ لیکن یونانی عہدِ جدید ۱۵۱۴ء تک طبع نہیں ہوا۔ یہ اُن چھاپنے والوں کا کام تھا جو کارڈینل ذیمی نس cardenalximena

کی زیرِ ہدایت عمل کر رہے تھے۔ اور ۱۵۱۶ء میں ایراسمس نے ایک مختلف ترجمہ شائع کیا۔ اور وہ ترجمہ جو مسلمہ نص (Received Text) کے نام سے مشہور ہے۔ جسے آر ستفنس (R. Stephnes) نے تیار کیا اور ۱۶۲۴ء میں بمقام لی ڈن (Leyden) الزویرس (Elzevirs) نے طبع کرایا۔ اس وقت سے نسخوں کے مقابلہ کرنے میں بڑی ترقی ہوئی اور کئی ایک مشہور اڈیشن طبع ہوئے۔ جن میں یہ اڈیشن شامل ہیں۔ تشندراف کا اڈیشن (۱۸۶۹ء میں) ویسکاٹ اور ہارٹ کا (۱۸۸۱ء میں) اور نسلے (Nestle) کا ۱۹۰۱ء میں ✦

جو عالم عہد جدید کے مصنفوں کے خیال کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا کام عہد عتیق کے مصنفوں کے خیال دریافت کرنے کی نسبت زیادہ مشکل ہے مثلاً اناجیل کے مصنف یونانی میں تحریر کرتے ہیں (حالانکہ ان کے پاس کچھ آرامی وسائل ان کی تصنیف کے لئے ہونگے مثلاً یشوع مسیح کے اقوال۔ یہ غالباً آرامی زبان میں ہونگے۔ کیونکہ یسوع مسیح آرامی زبان میں ہی کلام کرتے ہونگے۔ اور یہ اغلب نہیں کہ ان مصنفوں کو یا ان کے ناقلوں کو یہ خیال ہی ہو کہ ان کی تحریرات ابتدائی کلیسیاؤں کے (جن سے وہ واقف تھے) مابعد زمانوں میں بھی کام آئیگی ✦

یہی مقدس پولس پر صادق آتا ہے۔ اُس کے خطوں کی جو آجکل ایسی قدر کیجاتی ہے وہ ایسے پیغام تھے جو صرف انہیں کلیسیاؤں کے لئے تھے جن کی طرف وہ بھیجے گئے۔ جنہوں نے اُنہیں پہلے نقل کیا انہوں نے اُنہیں اُسی معنی میں مقدس نہ سمجھا ہوگا جس معنی میں ہم اُن کو سمجھتے ہیں ✦

مابعد صدیوں میں بھی اُن کی نقل کرتے ہیں اُس قسم کا تعظیمانہ خیال پایا نہیں جاتا جو عہد عتیق کے نقل کرنے میں ہم نے معلوم کیا۔ بعض اوقات ناقل نے ایسی بات درج کر دی جو اصل میں نہ تھی۔ بلکہ جس کی نسبت اُس نے خیال کیا کہ ہونی چاہئے۔

کبھی کبھی اُس نے اپنے کمزور حافظہ کے مطابق کچھ درج کیا یا جس فریق سے اُس کا علاقہ تھا اُس فریق کی تعلیم کے ساتھ مطابق کرنے کے لئے متن کو بدلا۔ اس کے علاوہ بے شمار نقلیں اب تک محفوظ ہیں۔ ان ترجموں اور قدیم مسیحی بزرگوں کے اقتباسات کے علاوہ عہد جدید کے تقریباً چار ہزار یونانی نسخے موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قراتوں کا اختلاف بہت ہے ✦

لیکن گو ہم یہ یاد رکھتے ہیں کہ عہد جدید کے عالموں کے آگے جو کام ہے وہ کیسا پیچیدہ اور مشکل ہے۔ تو بھی ہم ایک طرف تو یہ یاد رکھیں کہ جو فرق پائے جاتے ہیں وہ کیسے خفیف ہیں اور دوسری طرف یہ یاد رکھیں کہ جہاں کہیں وہ فرق اہم بھی ہیں وہاں خدا کی قدرت کاملہ نے صداقت کے دریافت کرنے کے لئے ایسا سامان ہمیں بہم پہنچایا ہے جو پہلے زمانوں میں حاصل نہ تھا ہم اب بھی کامل بھروسہ کے ساتھ مقدس نوشتوں کی تلاش کر سکتے ہیں کہ وہ مسیح کی شہادت دینگے۔ اور کہ اُنکی شہادت راست ہے ✦

(۹) انگریزی میں مقدس نوشتوں کے جو ترجمے پہلے پہل کئے گئے وہ اب تک موجود ہیں۔ مزامیر کا بالتفصیل ترجمہ موجود ہے۔ اور بعض دیگر کتابوں کے قدیم انگریزی ترجمے پائے جاتے ہیں۔ چوتھی صدی کے آخر کے قریب (۱۳۸۲ء) لاطینی ولگاٹ سے وکلف صاحب نے ایک مکمل ترجمہ کیا۔ اناجیل کا تو اُس نے خود ترجمہ کیا تھا لیکن بائبل کے باقی حصہ کا (معہ اپوکرفا کے) اُس کے بعض پیرووں نے کیا۔ اصلاح اور فن چھاپہ کے ایجاد نے ترجموں کے پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔ اور مفصلہ ذیل ترجمے سولہویں صدی میں شائع ہوئے۔ ٹنڈل صاحب نے عہد جدید۔ توریت اور بائبل کی دوسری کتابوں کا ترجمہ کیا (۱۵۲۵ سے ۱۵۳۵) مائلز کورڈیل صاحب نے (Miles Coverdale) انگریزی میں ساری بائبل کا ترجمہ کیا (۱۵۳۵ء) میتھیوز بائبل (Mathews Bible) ۱۵۳۷ء میں پہلے ترجموں سے

تیار ہوئی۔ اور شاہی لائسنس کے ذریعہ مستند ترجمہ (authorised version)
کے نام سے شائع ہوا۔ بائبل اعظم (The Great Bible) ۱۵۳۹ء میں
میتھوز بائبل کی نظر ثانی تھی۔ جنیوا بائبل (۱۵۶۰) اُن جلاوطن مسیحیوں نے ملکہ میری
کے عہدِ سلطنت میں جو جنیوا میں تھے شائع کی۔ اور عوام الناس مدت تک اس کو پسند
کرتے رہے اور پیدائش ۳: ۷ کے ترجمہ کی وجہ سے یہ برچیز (Breeches)
بائبل کے نام سے مشہور رہی۔ اور بشپ بائبل (Bishop's Bible) ۱۵۶۸ء
میں جسے اسقفی علماء نے تیار کیا۔ ان علماؤں میں اکثر اسقف صاحبان تھے۔ اور عام طور پر
یرمیاہ ۸: ۲۲ کے ترجمہ کی وجہ سے یہ ٹریکل (Treacle) بائبل کے نام سے مشہور
رہی۔ ۱۶۰۴ء میں شاہ جیمس اول نے بمقام ہیمپٹن کورٹ ایک کانفرنس جمع کی کہ کلیسیا میں
جو بے انتظامیاں گھس آئی تھیں اُن کو دور کرے۔ اس کانفرنس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ
علماؤں کی چھ کمیٹیوں نے بائبل کا ایک نیا ترجمہ کیا۔ ان میں سے دو کمیٹیاں تو وسٹ
منسٹر میں۔ دو کیمبرج میں اور دو آکسفورڈ میں منعقد ہوئیں۔ اور اس سارے ترجمہ کی
آخرکار جنرل کمیٹی نے نظر ثانی کی۔ یہ ترجمہ ۱۶۱۱ء میں شائع ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے
سارے پہلے ترجموں کو ماند کر دیا۔ اور خواندہ اور ناخواندہ دونوں قسم کے لوگوں نے
اس کو پسند کیا کیونکہ اصلی زبانوں کا اس نے بہت صحت سے ترجمہ کیا اور اس کی
انگریزی بھی آسان اور سلیس تھی یہ وہی ترجمہ ہے جو اب تک عموماً مستند (authorised version)
ترجمہ کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ آخری
صدی کے پچھلے نصف میں عام طور پر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ بائبل کے بارہ میں جو نیا
مصالح مل گیا ہے مثلاً قدیم نسخے۔ ترجمے اور قدیم مصنفوں سے اقتباسات اس لئے
ایک نئے ترجمہ کی ضرورت ہے اور کنٹربری کی کانووکیشن (Convocation
of Canterbury) کی ہدایت سے مترجموں کے دو گروہوں نے نیا ترجمہ شروع

کیا۔ ایک گروہ نے عہدِ عتیق کو لے لیا اور دوسرے گروہ نے عہدِ جدید کو۔ ان کے
ساتھ دو امریکن علما کے گروہ بھی شامل ہو گئے اور ان مجموعی محنتوں کا یہ نیا ترجمہ
(Revised Version) ہے۔ اس میں سے نیا عہد نامہ ۱۸۸۱ء میں
شائع ہوا اور پرانا عہد نامہ ۱۸۸۵ء میں۔ اس نئے ترجمے نے حتی الامکان مستند ترجمہ
کی صورت اور طرز عبارت کو قائم رکھا لیکن جو اس میں ترجمہ کی غلطیاں تھیں اُن کی
تصحیح کی پرانے متروک انگریزی الفاظ کی جگہ زمانہ حال کے مستعمل الفاظ ڈالے گئے
اور نئی معلومات کے مطابق جو تبدیلیاں درکار تھیں وہ عمل میں آئیں۔ اس لئے یہ
ترجمہ نہ صرف علماء کے لئے بلکہ اُن سب کے لئے نہایت قیمتی ہے جو نوشتوں کی
اصل زبان کے مطلب کو زیادہ گہرے طور سے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ بہ نسبت ان
معدودے چند نسخوں کے جو ما قبل ترجموں کے وقت موجود تھے۔

عبرانی تاریخ جلاوطنی تک

۱۔ عبرانی تاریخ کی لاثانی قدر۔ انسانی تاریخ کے ہر بیان میں عبرانی لوگوں کی تاریخ نہایت مقدم ہے۔ اگرچہ دوسری قومیں عبرانیوں کی نسبت زیادہ وسیع ملکوں پر حکمران رہ چکی ہیں۔ اور علوم وفنون میں زیادہ بڑی بڑی یادگاریں پیچھے چھوڑ گئی ہیں لیکن مسیحی دین عبرانی نسل ہی سے شروع ہوا۔ اگر یہ کہنا بجا ہو کہ دنیاوی طور پر ہماری عقلی زندگی یونان اور روم کی ممنون احسان ہے تو یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہماری دینی زندگی قوم اسرائیل کی ممنون احسان ہے۔ جب تک لوگ اس امر کے قائل ہیں کہ دین ہمارے گہرے سے گہرے تقاضا کو پورا کرتا ہے اور اس لئے دین کی دائمی قدر کرتے ہیں تب تک وہ اُس قوم کے آغاز اور بتدریج نشوونما کی تاریخ میں برابر دلچسپی لیتے رہینگے جس کے عقیدہ نے مہذب دنیا کو فتح کر لیا +

۲۔ ایک خاص بیان کی ضرورت۔ خاص وجوہات کے باعث عبرانیوں کی تاریخ کا الگ خاکا دینا مناسب ہے۔ بائبل کے بیانات دنیاوی تاریخ سے اس امر میں متفرق ہیں کہ ان میں سارے بیان دینی غرض سے دیئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے نہایت اہم بڑے بڑے ملکی واقعات کو سرسری سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ روحانی تجربہ بیان کرنے کے لئے بابوں کے باب مخصوص کئے گئے۔ علاوہ ازیں جیسی کہ اس جلد میں تشریح ہوئی مختلف زمانوں کی تصنیفات کو بلا تاریخی پتا دیئے ایک دوسرے کے پاس جگہ دی ہے۔ اور زمانہ حال میں جو کھنڈرات اور کتبات وغیرہ ملے ہیں اُن سے بخوبی روشن ہوگیا ہے (جیسا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا) کہ قرب وجوار کی قوموں میں اسرائیل کو کیا جگہ حاصل تھی۔ اس مختصر خاکا میں ذہن انقصد

مدنظر ہے (۱) عبرانیوں کی تاریخ کا اظہار کہ اس کا تعلق دوسری قوموں کی بڑی بڑی عالمگیر تحریکوں کے ساتھ کیا تھا۔ (۲) ان بڑے خیالات اور ان کے نشوونما کا اظہار جن کی اعلےٰ تکمیل یسوع مسیح میں ہوئی +

۳۔ عبرانیوں کا آغاز۔ عبرانی قوم نوع انسان کی اُس شاخ سے تعلق رکھتی ہے جو سِیم کی نسل کہلاتی ہے۔ اس شاخ کا اصل وطن غالباً عرب تھا۔ یہ لوگ شمال ومغرب کی طرف آگے بڑھتے بڑھتے مغربی ایشیا اور زیادہ تر مسوپتامیہ میں آباد ہوگئے جو دریائے دجلہ اور فرات کے مابین واقع تھا تین یا چار ہزار برس قبل از مسیح جیسا کہ قدیم تحریروں سے ظاہر ہے۔ یہ قومیں وہاں مستقل طور سے آباد۔ اور تہذیب ومذہب ورسوم میں اعلےٰ ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ دو ہزار چار سو برس قبل از مسیح۔ بابل کے قدیم شہر کے بادشاہ اس ملک کے بڑے حصہ پر غالب آئے اور اُس خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں سے مشہور حموربائے نکلا (دیکھو فصل ”حموربائے کے قوانین“) اب عموماً یہ مانا جاتا ہے کہ یہ حموربائے۔ امرافل تھا (پیدائش ۱۴-۱)۔ اس لئے ابراہیم کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں (سنہ ۲۲۵۰ ق م) بعض علما حموربائے کی تاریخ سنہ ۱۹۰۰ ق م بتاتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پتری آرکوں کا زمانہ دو ہزار برس قبل از مسیح تک پہنچتا ہے +

ابراہیم کے متعلق عام طور پر بائیبل کے بیانات کی تاریخ کے بارہ میں پیدائش ۱۲ سے ۲۵ تک کا دیباچہ دیکھو۔ وہاں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ہمارا یہ حق ہے کہ ہم ابراہیم کو اسرائیل کے خاص دین کا بانی سمجھیں۔ اس لئے ان باتوں کو جاننا کہ اس نے کیسی دینی تاثیروں کے زیر تحت پرورش پائی اور بھی دلچسپ ہوگا۔ کیا اُس کے زمانہ سے پیشتر خالص عقیدہ کی طرف کچھ میلان موجود تھے؟

ہم کو معلوم ہوگیا ہے کہ اس زمانے کی ساری تحریریں دین سے مملو تھیں۔

مذہب سارے معقول کاروبار کا پشت تھا۔ اور کاہن ہر صیغہ میں پیشوا تھے۔ بادی النظر میں یہ دین از حد کھلبلی کی ایک تصویر نظر آتا ہے۔ آسمان کے دیوتا۔ زمین کے دیوتا۔ سمندر کے دیوتا۔ دیوتاؤں کے خاندان۔ باپ۔ ماں۔ بیٹے۔ بیٹیاں شہروں اور پہاڑوں کے مقامی دیوتا۔ سارے قوائے فطرت کے رہنما اور ان میں مبتلا ہم کو حیران اور ششدر کر دیتے ہیں۔ اس کا سارا نتیجہ ایک سخت مشرکانہ تعلیم ہے جس میں ہر طرح کا پست کنندہ وسواس اور وہم پایا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم زیادہ گہری نظر سے دیکھیں تو کچھ اعلےٰ خیالات بھی اپنی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ جب آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے۔ جس سے اہل مشرق اس درجہ تک واقف تھے کہ ہم کو بالکل معلوم نہیں۔ بابل کے اہل نکر لوگ اجرام فلکی کی گردشوں کو تاکتے رہتے اور ان میں بڑے دیوتاؤں کی جگہوں کو دیکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک کل عالم تین طبقوں پر منقسم تھا۔ اوّل شمالی افلاک۔ جن میں قطب ستارہ برابر اپنی چمک دمک دکھاتا تھا۔ پھر منطقۃ البروج جس کے اندر سورج۔ چاند اور سیارگان کی حرکات محدود تھیں۔ سوم جنوبی گہرائو۔ ان تین طبقوں پر تین بڑے دیوتا۔ انو۔ بیل۔ آئی حکمران تھے۔ اسی کے مطابق خود منطقۃ البروج کے تین حصے تھے۔ جن پر چاند۔ سورج زہرہ یعنی شام کا ستارہ حکمران تھے۔ بار بار یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ واحد خدا تعالیٰ کا تصور جس کے باقی سب ظہور تھے۔ اب طلوع ہوا اب طلوع ہوا۔ اس لئے سِن یعنی چاند دیوتا کی تعریف ان اعلےٰ الفاظ میں ہوئی:۔

"خداوند۔ آسمان اور زمین کے قوانین کا مقرر کرنے والا جس کے احکام توڑے نہ جائیں۔ آسمان میں کون اعلےٰ ہے؟ اکیلا تو ہی۔ تو ہی اعلےٰ ہے۔ زمین پر کون اعلےٰ ہے؟ اکیلا تو ہی۔ تو ہی اعلےٰ ہے"

اسی طرح جب مقامی دیوتا زیادہ زیادہ بابل کے مردک کے فتح کرنے میں مصروف ہوئے یا جیسا توبہ کے مزامیر میں پایا جاتا ہے۔ عابد اپنے عقیدہ کی چاردیواری سے گویا بہت باہر نکل آتا ہے۔ ہم نئے مکاشفہ کے عین کنارہ تک پھر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اس کنارہ سے آگے کبھی قدم نہیں رکھا۔ اہل بابل کے مذہب میں جو اعلےٰ سے اعلےٰ خیالات پائے جاتے ہیں ان میں دیوتا زندہ اشخاص معہ اپنے خاص خط و خال کے نظر نہیں آتے بلکہ دھندلے سے تصورات معلوم پڑتے ہیں۔ ابراہیم کا جو بیان بائبل میں قلمبند ہوا اُس کی جگہ یہاں ہے۔ اس قسم کے مذہبی خیالات کے درمیان وہ زندہ تھا۔ اس حالت میں اُس کے اپنے ہی کانشنس اور دل میں ایک گہری آواز اُسے یہ کہتی سنائی دی کہ وہ خدا کے ساتھ جو فی الحقیقت مشخص خدا ہے حقیقی قربت و شراکت رکھ سکتا ہے۔ اور اس قربت کی خاطر اُس نے اپنا وطن چھوڑا اور کنعان میں بھٹکتا پھرا ملک صدق جیسے عجیب شخص کے ذکر سے پتہ لگتا ہے کہ بعض دوسرے شخصوں کو بھی کسی قدر یہ صداقت حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن ابراہیم ہی ایک ایسا شخص نکلا جس کا ایمان مابعد لوگوں تک پہنچا۔ اگر ایسا ہو تو یہ پہلا شخص ہوگا جس نے یہ سمجھا کہ دین سے مراد خدا کے ساتھ شخصی شراکت ہے۔ ہمارے پاس ایسے وسایل موجود نہیں جن کے ذریعہ ہم دریافت کر سکیں کہ کہاں تک اُس نے عقلی طور سے اُس توحید کو سمجھا۔ یا کہ اخلاق کے بارہ میں اس کے تصورات کیسے اعلےٰ تھے۔ لیکن جیسا بیان ہوا ہے اگر اس نے وہ بڑا قدم اٹھایا تب وہ فی الحقیقت "ایمانداروں کا باپ تھا" اور پھر ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں مابعد مکاشفہ اُس کی اولاد کو ملا نہ کسی دیگر نسل کو۔

باپ کو جو ہمیشہ ایسے پرستاروں کی تلاش کرتا ہے جو روح اور راستی سے اس کی پرستش کرینگے۔ آخر کار ایک ایسا شخص مل گیا جو اُس کے پیغام کو سمجھ سکتا تھا۔

۴۔ اسرائیل اور مصر۔ جس عرصہ میں عبرانی قوم خانہ بدوش لوگوں کی طرح جبروں اور بیر شبع کے مابین جو پیچھے نگب یا جنوبی یہوداہ کے نام سے مشہور ہوا۔ (پیدائش ۲۲-۱۹+۲۸:۱۰) چراگاہوں میں زندگی بسر کرتی تھی۔ اس زمانہ کے بعد یہ لوگ جشن کی سرزمین کو چلے گئے جو مصر کی سرحد پر زرخیز زمین تھی۔ اس وقت مصر ہکساس (Hyksos) یا چوپانی بادشاہوں کے ماتحت تھا۔ شاید یہ بادشاہ بھی سیم کی نسل سے ہوں جنہوں نے اپنا خاندان وہاں قایم کیا اور سولہویں صدی قبل از مسیح تک یہ خاندان وہاں رہا۔ چونکہ ان بادشاہوں نے عبرانیوں سے ایسی مہربانی کا سلوک کیا۔ تو اس کی شاید یہی وجہ ہوگی کہ اُن کا یہ رشتہ حکمران خاندان سے تھا۔ جب ہکساس نکالے گئے (غالباً ۱۵۳۰ ق م کے بعد نہیں) تو ایک نیا بادشاہ اٹھا جو یوسف کو نہ جانتا تھا (خروج ۱: ۸) اور اُن پر ظلم شروع ہوا۔ اب یہ تقریباً یقینی طور سے ثابت ہو چکا ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل پر ظلم کیا وہ رعمسیس دوم تھا جس کی نسبت یہ دریافت ہوا کہ یہ وہی شخص تھا جس نے خزانہ کا شہر پتوم تعمیر کیا۔ (خروج ۱: ۱۱)

۵۔ خروج۔ شہادت کے مختلف سلسلوں سے یہ ظن غالب ہے کہ خروج کا زمانہ ۱۱۸۰ ق م کے بعد نہ تھا۔ شاید ۱۲۵۰ ق م ہو۔ جیسا کہ تل العمرنا تختیوں سے ظاہر ہے اس وقت سے پیشتر فلسطین مصر کا صوبہ تھا۔ اور مصر کی حکومت ایسی زبردست تھی کہ عبرانی فتوحات کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس کے بعد شاہی کمزوری اور عام ابتری کا زمانہ آیا۔ اس وقت سلطنت کے دور دور کے علاقوں پر حکومت کمزور ہو گئی۔ رعمسیس سوم (۱۱۸۰ ق م سے ۱۱۴۸ ق م تک) کا عہد سلطنت غالباً وہ زمانہ تھا جب بنی اسرائیل بیابان میں آوارہ پھرتے رہے۔ مرن پتاہ (Merenptah) رعمسیس دوم کا بیٹا غالباً خروج کے زمانہ کا فرعون تھا۔

اس بحث کے لئے کہ کیا آفتیں آئیں۔ اور جشن سے کس راہ سے وہ نکل کر گئے۔ تفسیر کو دیکھو۔ دریائے قلزم میں سے گزرنے کی خواہ کیسی تشریح کیوں نہ کی جائے لیکن قوم کی یادداشت میں اُس کا دایمی اثر رہا۔ چنانچہ کارنل صاحب (Cornill) فرماتے ہیں کہ "اس حیرت انگیز واقعہ نے قوم اسرائیل کو خلق کیا انہوں نے اسے کبھی فراموش نہیں کیا۔ یہاں انہوں نے اپنے آباو اجداد کے خدا کو تسلیم کیا جس نے زبردست ہاتھ اور بڑھائے ہوئے بازو کے ساتھ اپنی امت کو بچایا اور مصر میں سے غلامی کے گھر سے باہر نکالا"۔

۶۔ موسےٰ کی دینی تعلیم۔ اسرائیل کی اس مخلصی کے بعد کچھ عرصہ تک اسرائیل کوہ سینا کے قرب وجوار میں رہے۔ یہاں موسےٰ نے وہ بڑا کام کیا جس سے اس قوم کے مذہب کو ایک نیا نظم ونسق حاصل ہوا۔ توریت کے مختلف چشموں کی نسبت بحث کے بعد یہ بکثرت روشن ہو گیا کہ موسےٰ کی زیر ہدایت **یاہوواہ** اور قوم اسرائیل کے درمیان بمقام سینا ایک عہد باندھا گیا۔ (خروج ۲۴: ۳-۱۰ وغیرہ) یہ عہد محض قومی معاہدہ نہ تھا۔ ان کے باپ دادوں کے جس خدا نے محض ترس سے ان لوگوں کو مصر سے مخلصی دی تھی اور آیندہ کو بھی اُنہیں بچانے کو تیار تھا اُس نے بالرضا یہ عہد اُن سے باندھا تھا۔ جیسا کہ تفسیر میں بیان ہوا ہے اس انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ دس احکام اپنی ابتدائی صورت میں موسیٰ کو عطا ہوئے تھے۔ اس لئے مفصلہ ذیل طریقہ سے موسےٰ کے عقیدہ کا خلاصہ بیان کرنا ممکن ہے۔

(۱) وہ مشخص خدا پر ایمان رکھتا تھا جس نے قدیم زمانہ میں اپنے تئیں اُنکے آباواجداد پر منکشف کیا تھا۔ اور اب وہ پھر اپنے تئیں اپنی امت پر ظاہر کر رہا تھا۔ یہ خدا جس کا مقدس نام یاہوواہ تھا اس قوم سے کوئی خونی رشتہ نہ رکھتا تھا اور نہ کسی بیرونی ضرورت کی وجہ سے اُن سے وابستہ تھا بلکہ اُس کے

اور ان کے درمیان رشتہ اُس کے اپنے ہی آزاد ارادہ سے تھا۔ اس لئے اسرائیل یا یہوواہ کی امت تھی کیونکہ اُس نے اُن کو چنا تھا۔ کسی اور قوم کا اپنے معبود کی نسبت یہ خیال نہ تھا۔

(ب) وہ ایسے خدا پر ایمان رکھتا تھا جس کی عینی صفات صداقت اور رحمت تھیں۔ اس خدا کی قوت مصر کی زبردست قوت سے بڑی تھی۔ لیکن یہ جیوانی طاقت نہ تھی۔ یہ ہمیشہ اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال ہوتی تھی۔

(ج) اُس نے یہ تعلیم دی کہ یہ خدا جس نے اس امت کے ساتھ اپنا عہد باندھا۔ ان سے صادق چلن۔ انصاف اور انسانوں کے درمیان باہمی برادرانہ اُلفت کا متقاضی تھا۔ اس لئے اُس نے اس امر پہ زور دیا کہ دین اور اخلاق کے درمیان لازوال رشتہ ہے۔ گو موسیٰ کے زمانہ میں اور اُس کے بعد مدت تک اسرائیل کا مذہب قومی مذہب رہا۔ اس کی تعلیم میں عالمگیر مذہب کے بیج چھپے تھے۔ اُس کے بڑے بڑے اصولی تصورات اکثر فراموش کئے جاتے تھے اور بعض اوقات بت پرستی کی آلودگیوں کے نیچے دفن بھی ہو جاتے تھے تو بھی انہیں صداقتوں کے ذریعہ اسرائیل کا دین کنعان کی تاثیروں کا مقابلہ کر سکا اور خود اس قوم سے بھی زیادہ عرصہ تک زندہ رہا۔ اس کی تعلیم کی عقلمندی اس کے دعوے کی صداقت کا کافی ثبوت ہے کہ وہ خدا کا خاص چنا ہوا ایلچی تھا۔

۷۔ کنعان کا مفتوح ہونا۔ بیابانی آوارگی کے زمانہ کا بڑا حصہ قادیش برنیع میں صرف ہوا۔ یہ مقام کنعان کے جنوب کی طرف بیابان میں واقع تھا اور مصریوں کی رسائی سے پرے تھا (گنتی ۱۳-۲۶ + استثنا ۱-۴۶) لیکن اس اثنا میں ایسے واقعات وقوع میں آ رہے تھے جن کی وجہ سے کنعان پر حملہ کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ بہت اجنبی قبائل۔ جن میں مغرب کے دریائی لٹیرے بھی

شامل تھے جو فلستیوں کے نام سے مشہور ہیں اور فلسطین پر یورش کر رہے تھے۔ رعمسیس سوم نے ایک بڑی مہم بھیج کر مصری طاقت کو وہاں پھر قایم کرنا چاہا۔ لیکن مصر کی طرف سے یہ آخری مداخلت تھی اور صدیوں تک وہ اِدھر رُخ نہ کر سکا۔ مصر کے پنجہ سے سوریا آزاد ہو گیا۔ جہاں چند خود مختار شہری ریاستیں قایم ہو گئیں اور ملک موعود پر حملہ کرنے کا راہ کھُل گیا۔ پہلی لڑائیاں یردن کے مشرق کی طرف ہوئیں۔ جہاں اموریوں کی سلطنت تھی جس کا دار الخلافہ حسبون تھا۔ اس کا بادشاہ سیحون شکست کھا کر مقتول ہوا اور اُس کا ملک بنی اسرائیل کے قبضہ میں آ گیا (گنتی ۲۱:۲۱ سے ۲۵)۔ جب موسیٰ کا انتقال ہوا تو یشوع اُس کا جانشین ہوا۔ یریحو کے بالمقابل یردن کو عبور کر کے حملہ شروع ہوا (یشوع ۱ سے ۱۲ تک)۔ جو بیان یشوع کی کتاب اور قاضیوں کی کتاب کے پہلے باب میں آیا ہے اُن کو ملا کر (دیکھو نقشہ ۲) یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یشوع کے ماتحت متفقہ فتوحات کے ذریعہ موعود زمین میں ان کا پیر جم گیا۔ اس کی وفات کے بعد (کیونکہ اب تک بہت حصہ ملک کا تسخیر ہونے سے رہ گیا تھا) مختلف فرقوں۔ یہوداہ۔ شمعون۔ یوسف۔ زبولون۔ آشر۔ نفتالی اور دان نے علیحدہ علیحدہ چڑھائیاں کیں (قاضی ۱ باب)۔ آخر کار فنیکیہ اور فلسطیہ کے ساحل سمندر کے شہر خود مختار رہے اور مضبوط حصین شہروں مثلاً تعنک۔ مجدو۔ بیت شان (۱:۲۷) کے ذریعہ وہاں کے باشندوں کو نہایت زرخیز میدان اور اور قیشون کی وادی پر قبضہ رہا۔ اور عجلون (۱:۳۵)۔ یابیس (۱:۲۱) اور جزر (۱:۲۹) کے حصین شہروں کے ذریعہ یہوداہ اور شمعون باقی اسرائیل سے تقریباً بالکل جدا ہو گئے۔ حال میں فلسطین میں جو پرانی جگہیں کھودی گئی ہیں اُن سے قطعی طور پر اس بیان کی صداقت ظاہر ہو گئی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعہ یہ صاف روشن ہو گیا کہ ان کنعانی شہروں کی نشو و نما اس حملہ کے بعد تقریباً دو سو برس

تک بلا روک ٹوک ہوتی چلی گئی۔ اگر اس بیان کا ثبوت ڈھونڈنا چاہو تو فلسطین
ایکس پلوریشن فنڈ (Palestine Exploration Fund)
کی بعض اشاعتوں کو دیکھو +

۸۔ قاضیوں کا زمانہ۔ جو تاریخ خروج کی بتائی جاتی ہے اس کے
ذریعہ اس زمانہ میں دو سو برس کی کمی ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ زمانہ ۱۰۵۰ ق م پر
ختم ہو جاتا ہے (دیکھو قاضیوں کی کتاب کا دیباچہ)۔ جو فتحیابیاں دبورہ اور برق
کے ذریعہ (قاضیوں ۴ و ۵) اور جدعون کے ذریعہ (قاضیوں ۶ سے ۸) حاصل
ہوئیں اُن سے ظاہر ہے کہ ابتک لوگ یاہواہ کے نام پر جمع ہوا کرتے تھے۔ تو
بھی مفتوح ملک کے مذہب نے ان فاتحوں پر زبردست اثر کیا۔ بہت مذبحے
جو اونچے مکانوں پر نصب تھے اور جو پہلے مقامی دیوتاؤں سے مخصوص تھے
اب وہ یہوواہ کی عبادت کے لئے مخصوص ہوئے۔ اس کی وجہ سے مابعد
زمانہ میں بیشمار بدیاں پیدا ہوئیں جیسا کہ نبیوں کی کتابوں سے بخوبی ظاہر ہے
تو بھی بحیثیت مجموعی ایوالڈ (Ewald) صاحب کا بیان۔ راست رہتا ہے
ان لوگوں نے ہمیشہ کے جنگ و جدل کے ذریعہ دلیری سے اپنے نئے وطن کی
حمایت کرنا اور اپنے مذہب پر آزادانہ عمل کرنا سیکھ لیا۔ یوں آئندہ پشتوں کے
لئے وہ ایک مقدس جگہ تیار کر رہے تھے۔ جہاں وہ مذہب اور قومی تہذیب اپنے
نسلیں آزادانہ اور پورے طور سے ظاہر کر سکے۔ دبورہ کا گیت (قاضی ۵ باب)
جسے عموماً علما نے مانا ہے کہ وہ اس زمانہ کی تالیف ہے (دیکھو تفسیر) ان دو باتوں
کا عجب ثبوت ہے کہ ان لوگوں میں قومی اتحاد کا کیسا ادراک تھا اور کیسی سرگرمی
سے یاہواہ پر حقیقی ایمان رکھتے تھے۔ فلسطیوں کے ظلم پر یہ زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔
یہ بہادر اور جنگی قوم جو انگلستان کی قدیم تاریخ میں اہل ڈنمارک سے بہت مشابہ

تھی فن جنگ میں عبرانیوں سے کہیں اعلےٰ تھی۔ اُن کو شاید یہ خیال ہو گیا تھا کہ
ہم اسرائیل کو بالکل اپنے ماتحت کر لیں۔ شمجر (۳: ۳۱) اور سمسون (۱۲) مشہور بہادر
گزرے ہیں۔ جنہوں نے تن تنہا بہت بہادری کے کام کئے اور بہت لٹیرے
گروہوں کو تباہ کیا۔ لیکن عبرانی قوم ایسے باقاعدہ حملے کی ہرگز تاب نہ لا سکتی تھی
مصفاہ کے نزدیک بمقام افیق ان کا مقدس عہد کا صندوق لٹ گیا (اسموئیل ۴)
اور یہ ان کی قوم کی بربادی کا نشان سمجھا گیا۔ فلسطیوں کی حکومت اسرائیل کے سارے
وسطی اور جنوبی علاقوں پر رہی۔ اور جبعہ واقع بنیامین میں اُن کا صدر مقام تھا
اور اُنہوں نے عبرانیوں کو لڑائی کے اوزار استعمال کرنے سے بھی منع کیا تھا (اسموئیل
۱۳: ۳ و ۱۹ سے ۲۸) +

۹۔ سموئیل اور سلطنت کی بنیاد۔ اس نازک وقت میں ایک ایسا
شخص پیدا ہوا جو دوہری عزت کا مستحق تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ سلسلہ انبیا کا پہلا تھا۔ دوم اس لئے
کہ وہ شخصی حکومت (monarchy) کا بانی تھا۔ سموئیل کے بارہ میں
جو بیانات بائبل میں قلمبند ہوئے (جیسا کہ تفسیر سے ظاہر ہے)، وہ مختلف چشموں
سے لئے گئے ہیں جن کی وقعت بھی مساوی نہیں۔ اُس کی فتوحات (اسموئیل ۷: ۱۴)
ایسی مکمل نہ ہو نگی جیسا کہ ایک بیان یا چشمہ سے ظاہر ہے۔ ایک بڑی قومی پستی کے
وقت اُس نے یہ محسوس کیا کہ ان منتشر فرقوں کا ایک جتھا بنانے کے لئے ایک
بادشاہ درکار تھا تاکہ وہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں۔ حب القومی کے ان
دلولوں میں خانہ بدوش انبیا کے گروہوں سے اس کو مدد ملی جو یاہواہ کے
سرگرم پرستار تھے۔ شخصی حکومت کا قایم کرنا گو اعلےٰ تصور کے مطابق نہ تھا
(اسموئیل ۸)، لیکن موقعہ کے لحاظ سے یہ عقلمندی کا انتخاب تھا۔ ساؤل بنیامینی
فرقہ کا ایک بڑا بہادر شخص بادشاہ ہونے کے لئے چنا گیا۔ ایک بڑی مشہور لڑائی کے

بعد جس کے ذریعہ یابیش جلعاد کو اموینوں سے رہائی ملی (۱ سموئیل ۱۱ باب)۔ ساؤل کے پاس سارے فرقے جمع ہو گئے (۱ سموئیل ۱۱: ۱۴ و ۱۵)۔ ساؤل کی سلطنت کے سارے عرصہ میں فلسطیوں کے ساتھ جنگ و جدل جاری رہا۔ مشرق سے شروع کر کے اُس نے بتدریج یہوداہ کے پہاڑی علاقوں اور فلسطین کے وسطی علاقہ کو فتح کر لیا (۱ سموئیل ۱۴ و ۱۷ وغیرہ)۔ اس کی سلطنت کے آخر میں داؤد کے ساتھ جھگڑا کرنے کے ذریعہ وہ کمزور ہو گیا اور اُس کی دیوانگی نے بار بار جوش مار کر اس کی عقل کو تاریک کر دیا اور یزرعیل کے میدان میں کوہ جلبوعہ کی لڑائی میں وہ مر گیا۔ اس امر سے یہ ظاہر ہے کہ فلسطینی لوگ پھر اسرائیل کے وسطی علاقہ میں گھس آئے تھے (۱ سموئیل ۳۱)۔ اس لڑائی کی تاریخ ۱۰۱۰ ق م کے قریب ہے ✦

۱۰۔ داؤد کی سلطنت۔ سات سال کے وقفہ کے بعد جس عرصہ میں داؤد بمقام حبرون یہوداہ پر بادشاہت کرتا رہا اور ساؤل کے مددگاروں نے مناہیم کو یردن کے پار اپنا صدر مقام بنایا (۲ سموئیل ۲: ۸ و ۹ و ۱۱)۔ اِشبوشت کے قتل نے ساری اسرائیل پر حکومت کی راہ داؤد کے لئے کھول دی (۲ سموئیل ۵: ۱ سے ۳)۔ اس کے بعد عہد سلطنت میں یہ مشہور واقعات گزرے فلسطی بالکل مغلوب ہو گئے۔ اور تاریخ میں آگے ان کا بہت کم ذکر آتا ہے۔ (۲ سموئیل ۵: ۱۷ سے ۲۵ + ۸: ۱)۔ قرب و جوار کی قوموں پر فتوحات حاصل ہوئیں۔ جسے اسرائیل کی سلطنت کی حقیقی بنیاد سمجھنا چاہئے (۸: ۲ سے ۱۴ + ۱۰ باب)۔ اور یروشلم تسخیر ہوا۔ اور عہد کے صندوق کو وہاں پہنچا دیا (۲ سموئیل ۵: ۶ سے ۱۰ + ۶: ۱۲ سے ۱۹)۔ اس وقت آسور کمزور تھا اور حِتّیوں کی شمالی سلطنت معدوم ہو چکی تھی۔ مصر کی سلطنت بانٹی جانے سے کمزور رہ گئی تھی۔ اسی وجہ سے داؤد اور سلیمان کے عہد سلطنت میں اس قدر جلد ترقی ہو گئی ✦

۱۱۔ سلیمان۔ سلیمان کی سلطنت کا مشہور واقعہ ہیکل کی تعمیر اور تجارتی اعلیٰ ترقی تھی۔ لیکن جب اُس نے یہ کوشش کی کہ اسرائیل کی آزاد قوم کو ایک مشرقی بادشاہ کی رعیت کی حیثیت میں بدل ڈالے تو سخت بے چینی پیدا ہو گئی اور کسی خاص وجہ سے اس کے مرنے کے فوراً بعد جب یہ مضبوط ہاتھ جاتا رہا تو سلطنت دو حصوں پر منقسم ہو گئی (۱ سلاطین ۴: ۲۱ سے ۲۸ + ۵: ۱۳ + ۱۱: ۲۶ وغیرہ) ✦

۱۲۔ ابتدائی شخصی بادشاہت میں مذہب۔ اس زمانہ کے مذہبی حالات مختلف مقامات سے دریافت ہو سکتے ہیں۔ یہ تاکیدی قانون اب تک نامعلوم تھا کہ ایک ہی مرکزی مقدس ہو جس کی وجہ سے پیچھے یہ دستور العمل ہو گیا کہ ساری قربانیاں یروشلم ہی میں چڑھائی جائیں۔ سموئیل مصفاہ میں قربانی چڑھایا کرتا تھا (۱ سموئیل ۷: ۹)۔ اُس نے رامہ میں ایک مذبح بنایا (۷: ۱۷)۔ وہاں اونچے مکانوں پر قربانی چڑھاتا رہا (۹: ۱۲)۔ اور جلجال میں (۱۱: ۱۵) اور بیت لحم میں بھی اُس نے قربانیاں چڑھائیں (۱۶: ۵)۔ ۱۴: ۳۵ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس نے اپنی نمک حلالی کے ثبوت میں یہواہ کے لئے ایک سے زیادہ مذبحے بنائے ایسا ہی ۲۰: ۶ میں یہ اشارہ ہے کہ یسّی خاندان کے لئے بیت لحم میں سالانہ قربانی چڑھائی جاتی تھی۔ جس اتفاقی اور سرسری طریقے سے یہ اشارے آتے ہیں اُن سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں مستثنیات کا ذکر نہیں بلکہ معمولی دستور کا ذکر ہے۔ دیکھو خروج ۲۰: ۲۴ کی شرح۔ ساتھ ہی ناتن جیسے نبیوں نے یہواہ کے دعاوی کی اخلاقی سیرت کو قایم رکھا۔ اور اُن کی نہایت عزت کی (۲ سموئیل ۱۲: ۱ سے ۱۵)۔ داؤد کی سلطنت کی بنیاد پڑنے کے ساتھ ہی یہواہ کی دائمی سلطنت کی امید برپا ہو گئی جس کا ذکر مابعد انبیا کی تصنیفات میں اکثر آتا ہے۔ (۲ سموئیل ۷: ۱ سے ۱۷) ✦

۱۳۔ سلطنت کا منقسم ہونا۔ ۹۳۷ ق م (جب سلیمان کی وفات کے بعد سلطنت تقسیم ہوگئی تو یہوداہ کی سلطنت نسبتاً بہت چھوٹی اور خفیف سی رہ گئی اور مصر کے شاہ شیشک کے حملے نے اسے اور بھی کمزور کر دیا (۱ سلاطین ۱۴: ۲۵ تا ۲۶)۔ بمقام کرنک آمون کے مندر میں جو مصری فہرستیں ملی ہیں اُن میں اس حملہ کا ذکر ہے۔ چونکہ اس میں لکھا ہے کہ افرائیمی شہروں سے بھی خراج ادا کیا۔ اس لئے یہ خیال کیا گیا کہ کچھ عرصہ تک اسرائیل اور یہوداہ دونو مصر کے باجگذار رہے۔ لیکن شمالی اسرائیل کے خلاف کسی جنگی کارروائی کا حال مندرج نہیں۔ کچھ عرصہ تک یہ دونو سلطنتیں باہم جنگ کرتی رہیں۔ البتہ اسرائیل زیادہ زورکو تھا۔ لیکن جب آسا شاہ یہوداہ نے بن ہدد شاہ آرام کی مدد بعشہ کے خلاف طلب کی تو خطرناک غلطی کی (۱ سلاطین ۱۵: ۱۸ سے ۲۱ + ۸۸۰ ق م)۔ ایسے فعل پر ملامت کرنا (۲ تواریخ ۱۶: ۷ سے ۹)۔ بالکل راست تھا کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرامی فوجوں نے پہلے اسرائیل کے ملکوں پر حملہ کیا۔ بار بار انقلابات کے بعد عمری کے طاقتور گھرانے میں حکومت منتقل ہوئی ۸۸۵ ق م (۱ سلاطین ۱۶: ۲۳ سے ۲۸) عمری نے سامریہ کو تعمیر کر کے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کے زمانہ میں اسرائیل اور یہوداہ کے درمیان صلح ہوگئی اور نکاح کے رشتہ کے ذریعہ دونوں شاہی خاندانوں میں اتحاد ہوگیا۔ موآبی پتھر سے جس پر میشع کا کتبہ کندہ ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے موآب کو مغلوب کیا۔ اسوری یادگاروں میں جو اس کی طرف اشارے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اسرائیل کی سلطنت کا بانی سمجھا گیا تھا۔ اس کے زمانہ میں جو مشہور حملے واقع ہوئے ہیں اُن کی نسبت بائبل کی خاموشی اس امر کا ثبوت ہے کہ عبرانی مصنف ایسے واقعات کی چنداں پروا نہ کرتے تھے جو محض دنیوی تھے ۔

۱۴۔ یاہواہ یا بعل۔ عمری کے بیٹے اخی اب کے عہد سلطنت میں ایلیاہ اور بعل کے کاہنوں کے درمیان بڑا جھگڑا ہوا۔ یربعام نے شاہی حکمت عملی کے طور پر بیت ایل اور دان میں یاہواہ کے بچھڑے کی صورت کے سنہری بُت نصب کرائے تھے۔ اس لئے شمالی سلطنت کا سرکاری منظور شدہ دین یاہواہ کی عبادت کی ایک بگڑی ہوئی صورت تھی۔ ایسی دلیل لانا۔ جو بعض لوگ پیش بھی کرتے ہیں۔ بے ثبات ہے کہ جہاں تک بائبل سے معلوم ہو سکتا ہے ایلیاہ نے بچھڑوں کی عبادت کی نسبت خاموشی اختیار کی۔ اس لئے ایسی عبادت میں کچھ نقص نہ ہوگا۔ اسرائیل کا اعلےٰ کانشنس ہمیشہ ہر طرح کی بت پرستی کے خلاف تھا۔ شمالی اسرائیل میں بھی غالباً ایسے مذبحے تھے جہاں یاہواہ کی خالص عبادت ہوا کرتی تھی (مقابلہ کرو ایلیاہ کی شکایت ۱ سلاطین ۹: ۱۰ اور اُس کا فعل ۱ سلاطین ۱۸: ۳۰)۔ لیکن جب اخی اب کی فینیکی بیوی ایزبل صیدانیوں کی شاہزادی نے صوری بعل کی پرستش کو قایم کرنا چاہا اور یاہواہ کے پرستاروں کو ستایا (۱ سلاطین ۱۶: ۳۱ سے ۳۳ + ۱۸: ۴)۔ تو ایلیاہ یاہواہ کی حمایت کو اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب سوال یہ نہ تھا کہ یاہواہ کی خالص یا بگڑی عبادت کونسی تھی۔ بلکہ یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یاہواہ یا بعل کا سوال تھا۔ اسی وجہ سے۔ ایلیاہ نے اپنی فتح کے وقت ایسی سختی سے کام لیا (۱ سلاطین ۱۸: ۴۰)۔ اور الیشع نے انقلاب کی تحریک دی جس کی وجہ سے عمری کا خاندان برباد ہوا اور یاہو تخت کا مالک ہو گیا (۲ سلاطین ۹ باب) ۔

۱۵۔ آرامی لڑائیاں۔ جب یہ دینی جھگڑا برپا ہوا اُس وقت آرام کے ساتھ دیر تک جنگ ہوتی رہی۔ جس حملہ کا ذکر بعشہ کے زمانہ میں ہوا۔ اس وقت سے لیکر اب تک وہ جنگ جاری تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل کے

بادشاہ باجگذار بن گئے تھے (۱ سلاطین ۲۰: ۳۴) اور ۸۵۴ء ق م۔ آرام کے بن ہدد نے معہ اخیاب کے جس نے یادگاروں کے کتبوں کے مطابق دو ہزار رتھیں اور دس ہزار آدمی بہم پہنچائے تھے حمات کے نزدیک بمقام قرقر آسور کے بادشاہ شلمنسر دوم سے شکست پائی۔ بعد ازاں اخیاب نے آرام کے جوئے کو اُتار پھینکا۔ اور خود مختار ہوگیا اور کئی فتوحات حاصل کیں (۱ سلاطین ۲۰ باب)۔ اس وقت دمشق کے خلاف آسوری مہموں کے ذریعہ آرام کمزور ہوگیا تھا۔ ۸۵۰ء ق م و ۸۴۹ء ق م۔ و ۸۴۶ء ق م و ۸۴۲ء ق م میں شلمنسر دوم نے یاہو سے خراج حاصل کیا۔ (دیکھو لندن کے عجائب گھر میں شلمنسر دوم کی سیاہ لاٹھ) اور پھر ۸۳۹ء ق م میں دمشق کے حزائیل کو شکست دی۔ اس موقعہ پر شلمنسر دوم کے بیٹے کی سرکردگی میں آسور میں بغاوت ہوگئی۔ اس شخص نے اُس بادشاہ کو بھگا کر شمالی بابل میں پناہ گزین کرا دیا۔ اس سے آرام کو مہلت مل گئی۔ اور وہ سلطنت اپنی طاقت پھر بحال کرنے کے قابل ہوگئی۔ اسرائیل پر برابر حملے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بہت ہی تنگ آ گئے (۲ سلاطین ۱۰: ۳۲ + ۱۳: ۳ سے ۷ + ۱۴-۲۶)۔ دمشق پھر مغلوب ہوا اور یوآس اور یربعام دوم کے ذریعہ اسرائیل کو دوبارہ شہرت حاصل ہوئی اور جو ملک چھن گئے تھے وہ انہوں نے واپس لے لئے (۲ سلاطین ۱۳: ۲۵ + ۱۴: ۲۵ سے ۲۸)۔ ان فتوحات میں الیشع بڑا دور اندیش اور نڈر محب القوم نظر آتا ہے۔ (۲ سلاطین ۱۳: ۱۴ سے ۲۰) یوں یربعام دوم کے عہد سلطنت میں (۷۸۲ء سے ۷۴۱ ق م) اسرائیل کو ایسی فارغ البالی اور مرفہ حالی نصیب ہوئی جو سلیمان کے دنوں سے لیکر اب تک حاصل نہ ہوئی تھی۔ جنوبی سلطنت کو جو آرام اور موآب کے خلاف اسرائیل کی رفیق رہی تھی (۱ سلاطین ۲۲ + ۲ سلاطین ۳) عتلیاہ نے غصب کر لیا (۲ سلاطین ۱۱ باب) یہویدع کے وسیلے وہ اُس کے حقدار کو حاصل ہوگئی (۱۱: ۴) + امصیاہ نے

اسرائیل سے اتحاد چھوڑ کر یوآش سے سخت شکست پائی (۱۴: ۸ سے ۱۴)۔ لیکن عزیاہ کے دنوں میں (۷۹۰ سے ۷۳۹ء ق م) یہوداہ کو اُس کا پہلا رتبہ مل گیا اور فلسطیوں کو شکست دی (۲ تواریخ ۲۶: ۶)۔ فوج کا نئے سرے سے انتظام کیا (۲۶: ۱۳ و ۱۴)۔ اور سرحدی برج تعمیر کئے گئے تاکہ بیابان کے خانہ بدوش لوگوں کے حملوں کو روک سکیں (۲۶: ۱۰) +

۱۶۔ اسرائیل کا زوال۔ یربعام کی وفات کے ساتھ اسرائیل کے عروج کا زمانہ ختم ہوگیا۔ بار بار کے انقلابات کے باعث اسرائیل کی طاقت بہت گھٹ گئی۔ (۲ سلاطین ۱۵: ۱۰ سے ۱۴) اس اثنا میں تگلت پلاسر سوم کے عہد سلطنت میں (جو ۲ سلاطین ۱۵: ۱۹ میں پُول کہلاتا ہے) آسور نے پھر چڑھائیاں شروع کیں۔ اور اسرائیل کا بادشاہ منایہیم اُس کا خراج گزار ہوگیا (۷۳۸ء سے ۷۳۳ء تک)۔ اسرائیل کے بادشاہ فقح نے اپنے رفیق آرام کے شاہ رضین کے ساتھ مل کر یہوداہ پر حملہ کیا تاکہ شاید اُس کو مجبور کرے کہ وہ آسور کے خلاف اُن کی مدد کرے (۲ سلاطین ۱۵: ۳۷ + ۱۶: ۵ + یسعیاہ ۵-۷)۔ آسور کی مداخلت کے باعث یہوداہ بچ گیا اور شمالی اسرائیل برباد ہوگیا (۲ سلاطین ۱۵: ۲۹)۔ فقح کے قاتل ہوسیع کو تگلت پلاسر نے (یادگاروں کے بموجب) اپنا ماتحت بادشاہ تسلیم کر لیا لیکن ہوسیع نے مصر کے بادشاہ سو سے سازش کی جس کی سزا اُس کو فوراً مل گئی۔ شلمنسر چہارم نے اسرائیل پر چڑھائی کی لیکن سامریہ کے محاصرہ کے اثنا میں وہ مر گیا۔ اس کے کام کو اس کے بیٹے سارگون نے تکمیل دی اور ۷۲۲ء ق م میں سامریہ تسخیر ہوا اور شمالی سلطنت بالکل برباد ہو گئی +

۱۷۔ انبیا کی تعلیم۔ عاموس اور ہوسیع کی نبوتوں کے ذریعہ اس زمانہ پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ عاموس یربعام کے عہد سلطنت میں برپا ہوا اور اس نے

بڑے زور سے یہ پیش کیا کہ یاہواہ کے اخلاقی دعاوے نہ صرف اسرائیل پر تھے
بلکہ قرب وجوار کی قوموں پر بھی۔ بیت ایل کی رسمی عبادت پر سخت ملامت کی اور
اُس قوم کی جلد بربادی کی خبر دی۔ زمانہ آئندہ میں صرف ایک امید پیش کی کہ سخت
سزا کے بعد داؤد کے خاندان کے ماتحت یہ سلطنت بحال ہوگی (۹: ۱۱+ دیکھو تفسیر)

ہوسیع۔ یربعام کی وفات کے بعد غم والم کے دنوں میں خدمت کی اور
اُس کی افسوسناک شخصی تاریخ اُس کے پیغام کی کلید ہے (دیکھو تفسیر) اُس نے ایک
اور رنگ بھی اڑایا لیکن بہت کچھ عاموس کی نبوت کو جو بربادی کے متعلق تھی دُہرایا۔
اُس نے بچھڑوں کی پرستش کو عین بت پرستی کہا "انہوں نے اپنے روپے اور اپنے
سونے کے معبود بنائے ہیں" (۸: ۴) چونکہ ہوسیع نے خدا کی راستبازی پر اتنا
زور نہیں دیا جس قدر کہ اُس کی محبت پر زور دیا اس لئے اُس کی دھمکیاں زیادہ
خوفناک ہیں۔ تو بھی اس طوفان کے پرے وہ خدا کی دائمی سلطنت کو دیکھ رہا
ہے۔ اور اُس کی مداومت کا اُسے یقین ہے۔ (۳: ۵ وغیرہ) +

ان دو نبیوں کی اہم شہادت اعلےٰ درجہ کی ہے۔ یہ نئی باتوں کے اختراع کرنے
والے نہیں بلکہ قدیم ایمان کے بحال کرنے والے تھے۔ ان کی تعلیم کی غایت وہی ہے جو
موسیٰ کی تعلیم کی تھی۔ لیکن جس جرأت کے ساتھ انہوں نے یاہواہ کو جہان کا خدا
پیش کیا اور جس اٹل یقین کے ساتھ انہوں نے بیان کیا کہ گزشتہ حقوق اسرائیل کو
راستبازی کی شریعت کی حدود بیوں کے نتائج سے بچا نہیں سکتے اُس سے حقیقی
مذہب کی بنیاد زیادہ وسیع اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا ضرور ہے کہ یہ نہایت
مشکل ہے (جیسا کہ کسی نے کہا) کہ ہوسیع پہلا شخص تھا جس نے یاہواہ کی مورتوں کی
پرستش پر ایسی ملامت کی۔ کم سے کم اُسے ذرا بھی اس امر کا ادراک نہیں کہ اُس نے
کوئی نئی بات کہی۔ مثلاً جب سامریہ کے بچھڑے کی نسبت اُس نے یہ کہا "وہ کاریگر

نے اُسے بنایا ہے۔ اس لئے وہ خدا نہیں (۸: ۶) +

۱۸۔ آسوری زمانہ میں یہوداہ۔ شمالی اسرائیل کے برباد ہونے پر
یہوداہ کا انحصار زندگی آسور پر ہی رہ گیا۔ یسعیاہ کے اعتراضات کے باوجود
آخز نے کھلم کھلا اپنے فاتحوں کے دستوروں اور مذہب کی پیروی کی (۲ سلاطین
۱۶: ۱۰ سے ۱۸) اُس کا بیٹا حزقیاہ (۷۲۰ سے ۶۹۲ ق م) ایک فسادی سلطنت کا
وارث ہوا۔ جنوب میں مصر کے کوشی بادشاہ روز بروز زور پکڑتے جاتے تھے۔ اور
اُس کے ساتھ اتحاد کے خواہاں تھے۔ یسعیاہ نے اس تجویز پر سخت ملامت
کی (۳۰: ۱ سے ۷، ۳۱: ۱ سے ۴) اس نے یہ صلاح دی کہ دنیا کے مدبروں سے
بالکل کنارہ کرو اور صرف یاہواہ پر سادہ ایمان رکھو۔ مگر حزقیاہ نے اتحادوں کی
حکمت عملی کو پسند کیا۔ اُس نے مرودک بلدان سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری
رکھا (۲ سلاطین ۲۰: ۱۲ سے ۱۹) جو ۷۲۱ سے ۷۰۹ ق م بابل میں ایک سلطنت
قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور صور، صیدا، عسقلون اور عقرون کے ساتھ
آسور کے خلاف سازش کی اور مصر سے بھی کمک کا متوقع رہا۔ سارگون کے
جانشین سنحیرب کی مظفرانہ یورش کے سامنے یہ سازش پاش پاش ہوگئی مصر کو
عقرون کے نزدیک التکیہ پر شکست ہوئی اور حزقیاہ ۴۶ شہر اور رعیت
کھو بیٹھا۔ اور ایک رقم کثیر دیکر اُس نے یروشلیم کو غارت ہونے سے
بچایا (۲ سلاطین ۱۸: ۱۳ سے ۱۶)۔ اس کے بعد بائبل میں جو بیانات آتے ہیں
وہ کچھ خلط ملط ہیں۔ یادگاروں میں سنحیرب کی فوج کی کسی مصیبت کا ذکر
نہیں ہوا اور بعضوں کا گمان ہے کہ یہ کسی مابعد مہم کے وقت نازل ہوئی جس کا
ذکر قلمبند نہیں ہوا۔ تو بھی اس امر کی کچھ تشریح درکار ہے کہ یروشلیم تسخیر نہ ہوا
اس کی اغلب تشریح یہی ہے کہ حزقیاہ سے ایک رقم کثیر لیکر سنحیرب کی فوج

کا ایک حصہ واپس آیا اور فریب سے یہ طلب کیا کہ یروشلم ان کے حوالے کر دیا جائے۔ تب اُس فوج کے بڑے حصہ پر جو مصر کی سرحدوں پر پڑی تھی وبا نازل ہوئی اور سنحریب اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ یسعیاہ نے اس مخلصی (۷۰۱ ق م) کی پیشین گوئی کی تھی (۳۱: ۵ + ۳۷: ۳۳ سے ۳۵)۔ جس کا خیال یہ تھا کہ یروشلم خدا کا اپنا شہر مسخر نہیں ہو سکتا +

۱۹- میکہ اور یسعیاہ کی دینی تعلیم۔ اس زمانہ پر دو نبی روشنی کی شعاع ڈالتے ہیں۔ میکہ دہقان نے بڑی تندی سے دہقانوں کی تمدنی خرابیوں پر ملامت کی اور یروشلم کی بربادی کی خبر دی (۳: ۱۲)۔ تو بھی وہ الٰہی حکومت کی مداومت پر ایمان رکھتا تھا اور اُسے امید تھی کہ ایک اور بادشاہ داؤد کی طرح اُس اُمت میں ہی سے نکلے گا اور تباہ ملک کو بحال کریگا (۵: ۲ وغیرہ) +

یسعیاہ بار بار سزا کا متوقع تھا جن کے ذریعہ صرف ایک بقیہ بچ رہیگا (۶: ۱۱ سے ۱۳ وغیرہ)۔ اُس کے بیٹے شیریاشوب نام کے یہ معنی ہیں "بقیہ پھر آئیگا" (۷: ۳)۔ لیکن عمانوایل کے بارہ میں جو اُس نے پیشین گوئی کی (۷: ۱۲ سے ۱۶) اس میں ایک بہتر سلطنت کی امید بھی پائی جاتی ہے۔ اور اُس شاہزادے کے بارہ میں عالیشان وعدہ کیا گیا جس کے چار نام دیئے گئے (۹: ۶، ۷) جو ہزار سالہ امن و چین اور برکت کے وقت حکومت کریگا جو "یسی کے تنہ سے کونپل" کہلاتا ہے (۱۱: ۱ سے ۱۰) +

حزقیاہ کے عہد سلطنت میں اونچے مکانوں کے گرانے اور یروشلم میں عبادت محدود کرنے کے لئے قدرے کوششیں کی گئیں۔ لیکن یہ کام بہت ہی غیر مکمل رہا (۲ سلاطین ۱۸: ۴ سے ۲۲ وغیرہ) +

۲۰- منسی کے زمانہ میں برگشتگی۔ منسی کی دراز سلطنت (۶۹۲ سے ۶۴۱ ق م)

گو ظاہرا طور پر باعروج معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بُت پرستی کی طرف عود کرنے کے لئے مشہور ہے جس میں یسعیاہ کا بہت کام برباد ہو گیا (۲ سلاطین ۲۱: ۱ سے ۱۷) اس کی سلطنت کے آخر کے قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے آسوری وایسرائے کی بغاوت میں وہ شریک ہوا اور اسیر ہو کر وہ بابل کو گیا تاکہ آسوری بادشاہ آسر نبی پال کے سامنے اپنے جُرم کی سزا اُٹھائے (۲ تواریخ ۳۳: ۱۱ سے ۱۳) +

استثنا کی کتاب کے ذریعہ حقیقی ایمان پھر سرسبز ہوا۔ شاید یہ کتاب اسی زمانہ میں تالیف ہوئی اور شاید میکہ کے آخری دو بابوں کے ذریعہ (دیکھو تفسیر)

۲۱- یوسیاہ کی سلطنت۔ یوسیاہ (۶۳۹ سے ۶۰۸) اپنے مقتول باپ آمون کا جانشین ہوا اور طرح طرح کی مخالفتوں کے درمیان سلطنت شروع کی۔ سکوتیوں کے لشکر نے مغربی ایشیا پر حملے کئے۔ جس سے صفنیاہ کی افسوسناک پیشین گوئیاں پوری ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُس نے یہ خبر دی تھی کہ عالمگیر عدالت کا دن آ رہا ہے۔ لیکن ان حملوں نے آسور کی طاقت کو ایسا جھنجوڑ ڈالا کہ یہوداہ کو موقعہ ملا کہ اپنا کام آزادی سے کرے۔ یرمیاہ کی پہلی نبوتیں بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ (دیکھو تفسیر) ۶۲۱ ق م میں شریعت کی کتاب کے اتفاقی مل جانے سے دینی اصلاح کے کام میں بڑی مدد ملی۔ یہ کتاب غالباً استثنا کی کتاب تھی (۲ سلاطین ۲۲: ۸ وغیرہ) +

اس کتاب کی بنا پر سارے اونچے مکان جہاں یہوواہ کی پرستش نیم بت پرستوں کے طور پر ہوتی تھی گرا دیئے گئے اور یروشلم کی ہیکل عبادت کا اکیلا مرکز بن گئی (۲ سلاطین ۲۳: ۴ سے ۱۵) +

اس اثنا میں آسور تنزل ہو کر گرنے پر تھا اور نینوہ کا محاصرہ اہل بابل اور میدیوں

نے کر رکھا تھا اور مصر کے فرعون نکو نے شمال کی طرف سے اس ارادہ سے چڑھائی کی تھی کہ عالمگیر سلطنت قایم کرے۔ اس کی ترقی کو روکنے کے لئے یوسیاہ شکست کھا کر بمقام مجدو ۶۰۸ ق م میں مارا گیا (۲ سلاطین ۲۳: ۲۹، ۳۰)۔ اگلے سال نینوہ تسخیر ہوا۔ اور جب مصریوں نے بمقام کرکمیش جو دریائے فرات پر واقع تھا شکست کھائی۔ تو بابل کا نبوکدنضر ساری دنیا کا مالک ہوگیا۔ ۶۰۵ ق م۔ جس تھوڑے سے عرصہ میں مصریوں کو فلسطین میں عروج حاصل تھا اُس وقت یہویاخز معزول ہوا اور یہویقیم بادشاہ ہوگیا (۲ سلاطین ۲۳: ۳۱ سے ۳۴)۔ چونکہ اس سے تین سال بعد یہویقیم نے بابل سے بغاوت کی اس لئے وہ تخت سے اتارا گیا اور بابل میں اسیر ہو کر گیا (۲ سلاطین ۲۴: ۱، ۲ تواریخ ۳۶: ۶)۔ تین مہینے بعد اُس کا جانشین یہویکین بھی معہ اپنی قوم کے جوانوں کے ساتھ اسیر ہوگیا۔ ان اسیروں میں حزقیل بھی شامل تھا (۵۹۷ ق م۔ ۲ سلاطین ۲۴: ۸ سے ۱۶)۔ اس عرصہ کی نبیانہ تعلیم ناحوم کی کتاب میں پائی جاتی ہے اور نینوہ کی بربادی پہ خوشی کی شدت کا اظہار ہوا ہے اور حبقوق نے تباہ شدہ جہان پہ نظر ڈال کر معلوم کیا کہ ہر فاتح شخص یکے بعد دیگرے مجرم تھا لیکن اس آمیزش یقین کے ساتھ یہ بیان کیا کہ ”صادق اپنے ایمان سے جئے گا“ (۲: ۴)۔ یرمیاہ کی بہادرانہ خدمت کا وسطی حصہ بھی اسی عرصہ سے متعلق ہے ٭

۲۲۔ یروشلم کی تسخیر۔ یرمیاہ اور صفنیاہ کی نبوتوں کو رد کر کے یہوداہ کا آخری بادشاہ صدقیاہ بابل کے خلاف کئی سازشوں میں مبتلا ہوا (یرمیاہ ۲۷: ۱ سے ۱۱۔ حزقیل ۱۷: ۱۵)۔ اس کا اٹل نتیجہ وقوع میں آیا۔ یرمیاہ نے مدت سے یروشلیم کی بربادی کی خبر دی تھی اور ایسی جرأت کرنے سے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی (یرمیاہ ۳۸)۔ اب اُنیس مہینوں کے محاصرہ کے بعد جنوری ۵۸۸ ق م سے جولائی ۵۸۶ ق م تک نبوکدنضر نے شہر کو مسخر اور برباد کیا اور ہیکل کو جلا دیا (۲ سلاطین ۲۵) ٭

یرمیاہ کی شریف شخصیت ان آخری دنوں کا خاص جلال اور فخر تھا۔ یروشلم کی بربادی کی بار بار خبر دینے کے باوجود اس کی نظر اُس زمانہ کی طرف لگی ہوئی تھی جبکہ ایک دفعہ پھر وہ شہر ”یہوواہ کا تخت“ ہوگا (۳: ۱۷)۔ یا یہویقیم کی نسبت باوجود اُس کے یہ کہنے کے کوئی اس کی اولاد میں سے بھی اقبالمند نہ ہوگا کہ کبھی داؤد کے تخت پر بیٹھے اور یہوداہ پر سلطنت کرے“ (۲۲: ۳۰) اُسے یہ امید تھی کہ یہوواہ داؤد کے لئے ایک راستباز شاخ برپا کریگا“ (۲۳: ۵)۔ خدا کی سلطنت کی نسبت اسکی امید کی ناامیدی سے زیادہ پختہ تھی۔ لیکن اُس کا سب سے اعلےٰ کلام اُس کے عہد خاص میں سے صادر ہوا۔ جس وقت یروشلم کو بابل کی فوجیں گھیرے تھیں اُسے الہام تھا کہ نئے عہد کا ذکر کرے جبکہ خدا خود امت کے دلوں پر لکھیگا۔ اُس وقت چھوٹے سے بڑے تک سارے اُسے جانیں گے اور وہ معاف کئے جائینگے اور بحال ہونگے اور اُس کی مہربانی کا لطف اُٹھائینگے (۳۱: ۳۱ سے ۳۴) ٭

یوں یہ بڑی تاریخ امید پر ختم ہوتی ہے اور دین کا ایسا تصور پیش کیا جس کا دار ومدار فرداً فرداً روح اور اُسکے خدا کے درمیان شخصی اور قریبی رشتہ پر ہے۔ گو نبیوں کی وہ امیدیں کبھی پوری نہ ہوئیں کہ یروشلم میں ایک راستباز بادشاہ کے ماتحت ایک عالیشان سلطنت ہوگی لیکن وہ ایسے گہرے معنی میں پوری ہوئیں جس کا ان خبر دینے والوں کو شان و گمان بھی نہ تھا یعنی ایسے بادشاہ کے ذریعہ جس کی سلطنت ”اس دنیا کی نہیں“ جس نے اس نئے عہد پر اپنے ہی خون سے مہر لگائی۔ اس لئے ہمارا یہ دعوے ہے کہ انبیا کا عقیدہ ایسے استعارات اور تشبیہات میں ہم تک پہنچ گیا ہے کہ وہ لوگ تو گزر گئے لیکن اُن کا یہ عقیدہ آج تک دنیا میں ظفریاب ہے۔ جو عقیدہ اُن کے انبیا کا تھا اُسے یسوع نے لیا اور اپنی زندگی اور موت کے وسیلے ایسی سلطنت قایم کی جو کبھی جاتی نہ رہیگی۔ پیچھے کی طرف نظر مار کر ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ

ساری تاریخ ایک ہی ہے جسے خدا کی حکمران اور الہام بخشنے والی اور ہدایت کرنے والی روح نے ایسا وابستہ اور پیوستہ بنا دیا۔ آگے کی طرف نظر مار کے ہمیں یہ یقین ہے اور آگے سے زیادہ یقینی ایمان ہے کہ جس سلطنت کی اس قدر عرصہ سے آرزو چلی آئی اور انتظاری ہوتی رہی وہ کامل طور سے قایم ہوگی۔ عالم ارواح کے دروازے اُس پر کبھی غالب نہ آئینگے ✦

پنٹاٹیوک (توریت) کا دیباچہ

۱۔ **تقسیم اور مضامین۔** پنٹاٹیوک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "پانچ ہری جلد" اور آوریجن (تیسری صدی مسیحی) کے دنوں سے یہ نام مستعمل ہوتا چلا آیا۔ اور عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابوں کا یہ مناسب نام ہے۔ اس امر کے یاد دلانے میں اس سے مدد ملتی ہے کہ ایک جلد کے یہ پانچ حصے ہیں۔ خود عہد عتیق میں اس کا نام "شریعت" یا "شریعت کی کتاب" یا کبھی "خدا کی شریعت کی کتاب" یا "موسیٰ کی شریعت" آیا ہے۔ مثلاً دیکھو نحمیاہ ۸: ۱ و ۲ وغیرہ ۹۔ ۳، ۱۳+۳: ۱+۱ ما بعد یہودی مصنف اسے "شریعت کی کتاب" یا "شریعت کا پانچ پانچواں" کہتے تھے۔ عبرانی نسخوں میں پانچ کتابوں میں اس کی تقسیم ایسی آشکارا نہیں جیسی کہ انگریزی بائبل میں ہے۔ پنٹاٹیوک ایک کتاب سمجھی گئی اور اس کو کئی بڑی اور چھوٹی فصلوں میں تقسیم کیا جن کا شمار سلسلہ وار پیدایش کی کتاب سے استثنا کی کتاب تک دیا گیا ہے۔ ان پانچ بڑی فصلوں کا نام عموماً اُس کتاب کے پہلے لفظ سے لیا گیا یا اُس فصل کے کسی مشہور لفظ سے یوں پیدایش کی کتاب کا نام برَیشیت (B'reshith .) ہے یعنی "ابتدا میں"۔ خروج کا نام شموتھ (Shemoth یعنی "نام" یوں"۔ احبار کا نام ویقرا (Vayyithra) یعنی "اور ..... بلایا"۔ گنتی کا نام وَیدبر- (Nay'dabber) یعنی اور "وہ بولا" یا بمدبر یعنی بیابان میں۔ اور استثنا کا نام دباریم یعنی "باتیں"۔ کبھی کبھی کتابوں کے مضامین کے مطابق اُن کو نام دیئے گئے۔ مثلاً احبار کی کتاب "کاہنوں کی شریعت" یا گنتی کی کتاب "گنتیوں کا پانچواں حصہ" اور استثنا کی کتاب "شریعت ثانی" کہلائی۔ انگریزی بائبل میں

جو نام ان کتابوں کے مذکور ہیں وہ ولگاٹ لاطینی ترجمے سے لئے گئے۔ اور اُس ترجمہ میں ستروں کے ترجمہ سے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پنٹاٹیوک کا پانچ حصوں میں تقسیم ہونا ستروں کے ترجمہ سے پیشتر کا ہے اور شاید نحمیاہ کے زمانہ کا مزامیر کی تقسیم سے بھی یہ تقسیم پیشتر تھی کیونکہ مزامیر پنٹاٹیوک کے نمونے پر پانچ حصوں میں منقسم ہوئے ۔

چونکہ سیرت اور طرز میں یشوع کی کتاب بہت کچھ پنٹاٹیوک سے مشابہ ہے اور اُسی کا تواتر اور اُس کا تتمہ ہے اس لئے بعض حال کے علماء نے ان چھ کتابوں کو ہکساٹیوک (دیباچہ گنتی جلد) سے موسوم کیا۔ اور پیدایش کی کتاب سے یشوع کی کتاب تک کو کل کتاب کے چھ حصے قرار دیا ۔

پنٹاٹیوک کے مضامین کی تفصیل کے لئے اُن خاص دیباچوں کو دیکھو جو ہر کتاب کے شروع میں دیئے گئے ہیں۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ وہ دو عناصر سے مرکب ہیں یعنی تاریخ اور شریعت سے۔ ان کا مضمون یہ ہے۔ خدا کی سلطنت اس زمین پر۔ اور اس کا بتدریج مکاشفہ اور اظہار اسرائیل میں جو چیدہ امت تھی اپنی بیرونی (تاریخی) اور اندرونی (شرعی) صورتوں میں۔ موسیٰ کا گیت (استثنا ۳۲ باب) اور ایسے مزامیر جیسے ۱۰۵، ۱۰۶، ۷۸ (اس تاریخ کا خلاصہ بیان کرتے ہیں) جس طریقے سے پنٹاٹیوک شروع ہوتا ہے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس کا مقصد کل نوع انسان کی تاریخ بتانا ہے لیکن جلد ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا کی پیدایش کا بیان۔ گناہ کا داخل ہونا اور قوموں کا برپا ہونا اور پھیلنا اس کے خاص مقصد کی گویا تمہید ہیں۔ بتدریج تاریخ کا دایرہ تنگ ہوتا گیا جب تک کہ ہم پیدایش ۱۲ باب میں ابرہام تک پہنچ جاتے ہیں جو اُس امت کا جد امجد چنا گیا جس امت پر خدا خاص طور سے اپنے تئیں منکشف کریگا۔ اس نقطہ خیال سے پنٹاٹیوک بلکہ کل عہد عتیق عبرانی قوم کی تاریخ ہو جاتی ہے۔ ابراہیم سے تیسری پشت میں

اس کی اولاد جن کا شمار ستر تھا مع اپنے گھرانوں کے کنعان سے مصر کو چلی گئی۔ باوجود رکاوٹوں کے وہاں انکا شمار بہت بڑھ گیا اور وہ ایک بڑی قوم بن گئے۔ خروج کی کتاب میں بیان ہوا کہ انہوں نے موسیٰ کے ذریعہ مصر سے رہائی پائی۔ موعودہ زمین کی طرف سفر کرتے ہوئے وہ جزیرہ نما سینا میں پہنچے۔ وہاں انہوں نے یہواہ کے ساتھ ایک سنجیدہ عہد کیا جس کا انحصار اُس شریعت پر تھا جو وہ سینا پر دی گئی عملی طور پر ساری احبار کی کتاب میں شریعت ہی کا بیان ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اس قوم کو باقی ساری قوموں سے علیحدہ کر کے ایک خاص امت (یا یہواہ کی۔ اور کا انہوں کی سلطنت اور ایک مقدس قوم بنائے۔ گنتی کی کتاب میں ان کے بیابان میں سفر کرنے کی تاریخ مندرج ہے۔ حتی کہ وہ کنعان کی سرحدوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اس عرصہ میں کئی ایک شریعتیں دی گئیں۔ استثنا کی کتاب میں موسیٰ کی اُن تقریروں کا ذکر ہے جو اُس نے اپنی وفات سے پہلے امت کے سامنے کیں۔ اس میں بہت کچھ وہ شریعتیں بھی قلمبند ہیں اور آخر میں اُس بڑے پیشوا اور شارع کی تن تنہا فوت کا ذکر ہے۔ یشوع کی کتاب میں اسرائیل کے کنعان میں داخل ہونے کا موسیٰ کے جانشین یشوع کے ماتحت اسرائیلیوں کی فتوحات کا حال قلمبند ہوا ۔

۲ موسیٰ مصنف۔ حال کے زمانوں میں اس کی نسبت بہت بحث ہوتی رہی کہ پنٹاٹیوک یا ہکساٹیوک کا مصنف کون تھا۔ اور علما آج تک اس مضمون کی چھان بین میں مصروف ہیں۔ یہ قدیم روایت ہے کہ جن پانچ کتابوں پر موسیٰ کا نام ہے اُن کا مصنف موسیٰ ہی تھا اور تقریباً حال ہی کے زمانہ تک یہ رائے مسلم رہی اور اس پر نہ کسی نے شک کیا اور نہ اس کی تحقیقات کی۔ البتہ ان کتابوں کے بارے میں زیادہ وسیع تحقیقات کے ذریعہ بہت علماء نے یہ نتیجہ نکالا کہ مصنف کے بارہ میں ان کا عقیدہ امر واقعی سے لگاؤ نہیں کھاتا۔ اس لئے جو شہادت ان کتابوں کے بارہ میں حاصل

ہوئی اُس کے زور پر ایک دوسری رائے کی ضرورت ہے ۔

جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ ان کتابوں کا مصنف موسےٰ تھا وہ دو دلائل پیش کرتے ہیں جو غور طلب ہیں۔ (۱) ایک تو یہ امر ہے کہ ہمارے خداوند نے پنٹاٹیوک سے اقتباس کرتے وقت ان کتابوں کو موسےٰ ہی سے منسوب کیا (دیکھو متی ۱۹: ۸ ۔ مرقس ۷: ۱۰ + ۱۲: ۲۶ + لوقا ۲۴: ۴۴ + یوحنا ۵: ۴۵ سے ۴۷ + ۷: ۱۹) اس کی نسبت کبھی یہ کہا گیا کہ ہمارے خداوند نے جو یہ حوالے دیئے اُن سے ہم یہ ماننے پر مجبور نہیں کہ کل پنٹاٹیوک موسےٰ نے لکھا صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بعض حصے اس نے لکھے ۔ اور بعض بڑے بڑے علما اتنا تو مان لیتے ہیں۔ لیکن اور جواب بھی دے سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہمارا خداوند اس لئے نہ آیا تھا کہ کتابوں کے مصنفوں کی نسبت حکم لگائے بلکہ نجات لوگوں کو پہنچائے ۔ کہ اُس نے پنٹاٹیوک کا حوالہ صرف عملی مقاصد کے لئے دیا تاکہ آدمیوں کی تمیزوں کو جگائے اور ان کے گناہوں پر ملامت کرے اور اس نے اُسے موسےٰ کی شریعت اس لئے کہا کیونکہ وہ اسی نام سے عموماً مشہور تھیں۔ مقدس نوشتوں کے مطالعہ میں رہنمائی کا یہ اصول تسلیم کر دیا گیا ہے کہ الٰہی مکاشفہ کے مضامین ایسی باتیں ہیں جیسا کہ یہ سوال کہ بائبل کی کتابوں کے مصنف کون تھے ۔ یا طبعیات کا عمل کیسے ہوتا ہے کیونکہ یہ باتیں تو انسان اپنے قوائے فطری کے ذریعہ دریافت کر سکتے ہیں بلکہ ان کا مضمون ایسی صداقتیں ہیں مثلاً خدا کی محبت اور نجات کی نسبت اُس کے مقاصد" فرشتے بھی ان باتوں پر غور سے نظر کرنے کے مشتاق ہیں" اس کے کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہمارے خداوند کی تعلیم کا زور اس سے گھٹ بڑھ نہیں سکتا کہ پنٹاٹیوک کے مصنف کے بارہ میں کوئی رائے رکھیں۔ (۲) اس روایتی رائے کی تائید میں دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہودی روایت برابر ان کتابوں کو موسےٰ سے منسوب کرتی چلی آئی ہے اس امر کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قدیم زمانہ میں اس روایت کی موجودگی کا کوئی

سراغ نہیں ملتا۔ یہ روایت بہت پیچھے برپا ہوئی اور کسی پختہ شہادت سے اس کی تائید نہیں ہوئی۔ یہ بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ بحیثیت مجموعی ان پانچ کتابوں کے مصنفوں کے نام معلوم نہیں ہوئے اور عہد عتیق میں ایک بھی ایسا مقام نہیں ملتا جس کی نسبت یہ دعوےٰ ہو کہ وہ موسےٰ کی قلم سے نکلا۔ البتہ یہ جملہ تو اکثر آتا ہے "موسےٰ کی شریعت" اور اس میں کلام نہیں کہ اس اسرائیلی شریعت کا آغاز موسےٰ ہی سے ہوا لیکن یہ بیان اس امر کی شہادت نہیں کہ جس حالت میں پنٹاٹیوک ہم تک پہنچا اُس کا مصنف موسےٰ تھا یا جو قوانین اس میں مندرج ہیں وہ سب کے سب بلا تبدیلی اُسی کی طرف سے تھے ۔ برعکس اس کے ان کتابوں کے بعض حصے ایسے ہیں جو خاصکر اس سے منسوب ہیں مثلاً (۱) عمالیق کی شکست کا حال (خروج ۱۷: ۱۴) (۲) عہد کی کتاب خروج ۲۰ سے ۲۳ تک (خروج ۲۴: ۴ و ۷)۔ (۳) عہد کا بحال ہونا خروج ۳۴: ۱۰ سے ۲۶ (مقابلہ خروج ۳۴: ۲۷) (۴) کوچ کے مقامات کی فہرست گنتی ۳۳ باب میں (۳۳: ۲)۔ (۵) جس شریعت کا ذکر استثنا ۳۱: ۹ و ۲۴ سے ۲۶ میں آیا ہے۔ (۶) موسےٰ کا گیت استثنا ۳۲۔ نیز مقابلہ کرو یشوع ۱: ۷ و ۸ + ۸: ۳۱ و ۳۵ + ۲۳: ۶ + ۲۴: ۲۶ + ان مقامات سے پتہ لگتا ہے کہ موسےٰ نے خاص ضروری واقعات اور شریعتوں کو لکھا اور محفوظ رکھا ۔

یہ بھی مد نظر رہے کہ توریت میں بہت ایسے قوانین مندرج ہیں جن کا تعلق خیموں میں خانہ بدوش زندگی کے ساتھ ہے اور ایسے زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جب میں خود موسےٰ زندہ تھا مثلاً مقابلہ کرو احبار ۱۴: ۳ کا ۱۴: ۳۴ سے اور ۱۶: ۲۰ سے ۲۲ گنتی ۱۰: ۱ سے ۷ ۔

اس امر کے سمجھنے میں کچھ مشکل نہیں کہ موسےٰ کے مصنف ہونے یا ایسی رائے کے ساتھ ہمدردی کرنے کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ موسےٰ سے قطع نظر کر کے عہد عتیق

کے مذہب کی وجہ بتانا ناممکن ہوگا۔ یاہواہ کی ذات اور اسرائیل کے ساتھ اس کے
رشتہ کا جو خاص مکاشفہ علاوہ موسٰی ہی کو ملا تھا موسٰے ہی نے اُن خیالات و قوانین
اور ضابطوں کی بنیاد ڈالی جن کے ذریعہ اسرائیل ایسی قوم بن گئی جس سے زمین
کے سارے گھرانوں کو برکت حاصل ہوئی۔ عقیدہ، دستور اور رسوم کی
مابعد نشو و نما کے لئے شروع میں اُسی کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ اور اگر وہ
خدا کی زیر ہدایت ایسے عقیدوں اور رسموں کا بانی تھا جو عہد عتیق کے مذہب
کی تہ میں پائے جاتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُس نے بعض
شریعتوں اور بڑے بڑے واقعات کے بعض بیان خود قلمبند کئے تاکہ ان
لوگوں کے چلن میں رہنما ہوں۔ اور حب القومی اُن میں پھونک دی جس کو اُس نے
ایک قوم بنا دیا۔

مگر زیادہ گہری تحقیقات پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ توریت میں بعض ایسے امور
ملتے ہیں۔ جن کو ہم اس روایتی یقین کے مطابق نہیں پاتے کہ موجودہ صورت
میں یہ کتاب موسٰی کی تصنیف ہے۔ مثلاً ہم یہ بلا غلطی کے کہہ سکتے ہیں کہ موسٰے
کی موت کا جو بیان استثناء ۳۴ میں پایا جاتا ہے اُسے موسٰے نے قلمبند نہ
کیا ہوگا۔ استثناء ۱ کا بیان کہ موسٰی نے یہ باتیں "یردن کے پار بیابان میں
. . . . کہیں" (نیا ترجمہ) (دیکھو اُس مقام کی شرح) کیونکہ یہ ایسے شخص کا
بیان ہے جو کنعان میں رہتا ہوگا جہاں موسٰی کبھی نہیں رہا۔ اور جب ہم یہ
پڑھتے ہیں "اس وقت ملک میں کنعانی تھے" (پیدائش ۱۲: ۶ + ۱۳: ۷)
اور یہ کہ "وہ بادشاہ جو ملک ادوم پر مسلط ہوئے پیشتر اس سے کہ اسرائیل کا کوئی بادشاہ ہو
یہی ہیں" (پیدائش ۳۶: ۳۱) تو یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلی صورت میں مُتکلم کنعان کی
فتح کے بعد زندہ تھا۔ اور دوسری صورت میں اسرائیل میں بادشاہت قائم ہونے کے بعد پیدا ہوا

۱۴: ۱۴) اور استثناء ۳۴ میں دان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اُس علاقہ کا یہ نام اُس وقت
تک نہ ہوا جب تک کہ دانیوں نے موسٰے کی وفات سے بہت دیر بعد اُس
علاقہ کو فتح نہ کر لیا (یشوع ۱۹: ۴۷ + قاضی ۱۸: ۲۹) + پھر گنتی ۲۱: ۱۴ و ۱۵۔
میں ایک قدیم کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے "خداوند کا جنگنامہ"۔ یہ تو ظاہر ہے
کہ ایسی کتاب موسٰے کے زمانہ سے پیشتر کی نہ ہوگی۔ دیگر مقامات جن کو مشکل
کے ساتھ اُس سے منسوب کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔ خروج ۶: ۲۶ و ۲۷ + ۱۱: ۳
۱۶: ۳۵ و ۳۶ + احبار ۱۸: ۲۴ سے ۲۸ + گنتی ۱۲: ۳ + استثناء ۲: ۱۲ +

البتہ یہ ساری باتیں بذات خود تو یہ ثابت نہیں کرتیں کہ موسٰے مصنف نہ تھا
لیکن قدرتاً اس سوال کی طرف لے جاتی ہیں کہ کونسی سند پر اس عقیدہ کا انحصار
ہے کہ جو توریت کی موجودہ صورت ہے اُس کا مصنف موسٰے تھا۔ اور
معلوم ہوتا ہے کہ یہودی کلیسیا کی مابعد روایتی رائے کے سوا اور کوئی سند پیش نہیں
کر سکتے۔ اس لئے لوگوں نے سمجھا کہ ہم اس امر کی مزید تحقیقات کے مجاز ہیں اور
احتیاط کے ساتھ تحقیقات کرنے پر بعض علما کو یہ یقین ہو گیا کہ موسٰی کی تصنیفات
اس توریت کا بے ڈھنگا سا مصالحہ یا اُس مصالحہ کا جز تھیں اور کہ موجودہ
صورت میں یہ ایک آدمی کا کام نہ تھا بلکہ پہلے سے موجودہ تحریرات سے تالیف
ہوئی ہیں۔ اس تعلق میں یہ یاد رکھیں کہ عہد عتیق کی تاریخ میں ترتیب اور تالیف
کرنا تصنیف کا ایک مسلمہ طریقہ تھا۔ ٹھیک جیسے مقدس لوقا نے بیان کیا۔
(لوقا ۱: ۱) کہ پیشتر اس سے کہ چاروں اناجیل قلمبند ہوئیں۔ ہمارے خداوند کی
زندگی کے کئی ایک بیان پہلے سے موجود تھے۔ ویسے ہی عہد عتیق کے مصنف
ہمیں بتاتے ہیں کہ جن واقعات کو انہوں نے قلمبند کیا۔ وہ پہلے تحریریں آ چکے
تھے۔ نہ صرف اتنا ہی بلکہ وہ یہ بھی صاف طور سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی

کتابوں کے تالیف کرنے میں پہلی تحریرات کو استعمال کیا۔ موجودہ کتابوں کی سطح میں اسرائیل کے قدیم لٹریچر کے اجزا کا ملنا نہایت دلچسپ ہے۔ جیسے علم ارض کے جاننے والوں کو اس وقت خوشی ہوتی ہے۔ جب قدیم زمانہ کے معدوم حیوانات کے اجزا چٹانوں میں ان کو ملتے ہیں۔ مثلاً دیکھو "خداوند کا جنگ نامہ" (گنتی ۲۱:۱۴) "کتاب الیاشر" (۲-سموئیل ۱:۱۸)۔ جاد اور ناتھن کی تواریخیں (۱-تواریخ ۲۹:۲۹) شمعیاہ اور عیدو کی کتابیں (۲-تواریخ ۱۲:۱۵) ان مقامات سے شہادت ملتی ہے کہ مابعد زمانہ کے مترتبوں اور مولفوں کے پاس معلومات کے کونسے چشمے موجود تھے۔ مقدس نص میں بعض قدیم نظمیں بھی داخل کی گئیں۔ مثلاً پیدائش ۴:۲۳ وغیرہ۔ خروج ۱۵+۱۷:۱۶+ گنتی ۲۱:۱۷، ۱۸ اور ۲۷ وغیرہ + قاضی ۵ وغیرہ + یہ بھی قرین قیاس ہے کہ جن مذکورہ بالا چشموں کا پتہ لگا ہے ان کے سوا اور قدیم تحریریں بھی موجود ہونگی۔ اس لئے اس قیاس میں کوئی انوکھی بات نہ ہوگی کہ توریت کی کتابیں پہلے سے موجود مصالحے پر مبنی ہیں +

۳۔ **تصنیف**۔ اس یقین کی مفصلہ ذیل وجوہات ہیں۔ کہ توریت ایک شخص کی اصلی تصنیف نہیں بلکہ پہلے سے موجودہ تحریرات سے تالیف ہوئی +

(۱) تاریخی حصوں میں کبھی ایک ہی واقعہ کے دو بیانات ملتے ہیں جو تفصیل میں کبھی متفق بھی نہیں ہوتے اور کبھی دو بیانات ساتھ ساتھ ہی پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہوگئے ہیں اور بہت دفعہ ان کے فرق کو دور کرنے یا مطابق کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ مثلاً پیدائش کے دو الگ الگ بیان آتے ہیں ایک تو پیدائش ۱ سے ۲:۴ تک میں ہے۔ اور دوسرا ۲:۴ سے ۲۵ تک میں۔ پیدائش ۶ سے ۹ تک بغور پڑھنے سے طوفانوں کے دو بیانوں کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اسی طرح خروج

۱۲ باب میں عید فسح کے ماننے کے متعلق دو قسم کی ہدایتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک تو ۱ سے ۱۳ تک میں ہے اور دوسرا ۲۱ سے ۲۷ تک ہیں۔ ایسے مقامات کا بھی مقابلہ کرسکتے ہیں جیسے پیدائش ۲۷:۱ سے ۴۵۔ اور ۲۷:۴۶ سے ۲۸:۹ تک۔ ایک بیان میں تو ربقہ کی ایک غرض بیان ہوئی اور دوسرے میں بالکل اور غرض۔ پیدائش ۲۸:۱۹۔ اور ۳۵:۹ سے ۱۵ میں بیت ایل کے نام کی مختلف وجہ تسمیہ دی گئی ہیں۔ پیدائش ۳۵:۱۰+ ۳۲:۲۸ - نیز مقابلہ کرو۔ خروج ۳:۱ سے ۶:۱ کا ۶:۲ سے ۷:۱۳ تک سے جہاں دوسرے بیان نے پہلے بیان کا کچھ لحاظ نہیں کیا بلکہ فرعون کی طرف رسالت کے قصہ کو نئے طور سے شروع کیا گویا کہ ۳:۱ سے ۶:۱ تک کبھی موجود ہی نہ تھا +

(۲) ان کتابوں کے شرعی حصوں میں ظاہرا متضاد بیانات ملتے ہیں اور یہ اختلاف چھوٹی یا خفیف تفصیلوں میں نہیں بلکہ بڑے اصولی معاملات میں۔ اور صرف ایک ہی طریقہ اس مسئلہ کے حل کرنے کا ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ ان کتابوں میں (خاصکر خروج سے استثنا تک) ایسی شریعتیں قلمبند ہوئیں جو قومی تاریخ کے مختلف زمانوں میں ملی تھیں جن کا تعلق زندگی کے مختلف حالات سے تھا۔ مثلاً خروج ۲۰ سے ۲۳ تک اس شریعتوں کا ذکر ہے جو ایسے زمینداروں اور چوپانوں کے مناسب حال تھیں جو اپنے گلے اور ریوڑوں کے ساتھ بہت سارے ملک میں منتشر تھے۔ یہ شریعت بہت سادہ اور عملی قسم کی ہے۔ جو صداقت اور راستبازی کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے جن کا تعلق سوسائٹی کی ابتدائی حالت کے ساتھ ہے۔ اس لئے عبادت بہت سادہ ہے مذبح مٹی یا ان گھڑے پتھروں کے ہر کہیں تعمیر کر سکتے تھے۔ جہاں خدا نے ان کو برکت دی ہو (۲۰:۲۴ سے ۲۶) پہلوٹھے اور پہلے پھل آٹھویں روز نذر گذرانے جاتے

(۲۲: ۲۸ سے ۳۰) انتقام کا قانون ”آنکھ کے بدلے آنکھ“، ”دانت کے بدلے دانت۔ جان کے بدلے جان“ (۲۱: ۱ سے ۱۲) قتل کی یہ سزا تھی کہ قاتل سنگسار کیا جائے۔ لیکن اگر کسی سے اتفاقی قتل سرزد ہو تو مذبح کے پاس پناہ لے (۲۱: ۱۲ سے ۱۴) بیلوں اور بھیڑوں۔ تاکستانوں اور اناج کے کھیتوں کی طرف خاص اشارہ ہے اور نقصان کی تلافی پر زور دیا گیا (۲۱: ۳۳ سے ۲۳: ۷)۔ پھر غریبوں کے لئے کھیتوں کی ہر ساتویں سال کی پیداوار مخصوص کی گئی (۲۳: ۱۰ و ۱۱) ساتواں دن سبت کا مقرر ہوا۔ انسان اور حیوان کے لئے آرام کا دن (۲۳: ۱۲) تین عیدوں کے ماننے کا حکم ملا۔ ان میں سے دو تو زراعت سے علاقہ رکھتی تھیں مثلاً بے خمیری روٹی کی عید خروج کی یادگار ہیں۔ اور فصل کاٹنے اور جمع کرنے کی عیدیں۔ یہ شریعتیں زندگی کے اُن حالات کے مناسب ہیں جن کا تجربہ بنی اسرائیل نے بیابان میں کیا تھا۔ اور کنعان میں بسنے کے ابتدائی ایام میں +

استثنا کی کتاب میں زیادہ اعلےٰ قسم کی شریعت پائی جاتی ہے جو مختلف حالات زندگی کے مناسب ہے۔ بہت حکم دُہرائے گئے اور بہت تبدیل بھی ہوئے البتہ اصول وہی ہیں جو پہلی شریعت میں پائے جاتے تھے لیکن قانونوں میں بہت کچھ تبدیلی ہوئی۔ استثنا وہ موسوی شریعت ہے جو مابعد اور زیادہ پیچیدہ زمانہ کی حالت کے مطابق ہیں چنانچہ اب یہ حکم ملا کہ عبادت صرف ایک ہی جگہ میں ہو اور مقامی مذبحے گرا دیئے جائیں (استثنا ۱۲: ۴ سے ۱۳ و ۲۶ سے ۲۸) کیونکہ انکے متعلق کچھ خرابیاں برپا ہو گئی تھیں۔ پہلوٹھے بجائے آٹھویں دن کے سال میں ایک دفعہ گزرانے جائیں اور مقامی مذبحوں کی جگہ پناہ کے شہر مہیا کئے گئے ”جو کوئی اپنے ہمسایہ کو نادانستگی سے مارے“ (استثنا ۱۹: ۴)۔ زندگی کے حالات اُن سے متفرق ہیں جو خروج ۲۰ سے ۲۳ میں پائے جاتے تھے۔ اب یہ لوگ شہروں میں بستے ہیں نہ کہ خیمہ گاہ میں (استثنا ۱۳: ۱۲ سے ۱۵ + ۱۷: ۱۴

۲۱: ۶ وغیرہ)۔ قوم میں کچھ تجارت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا (۲۳: ۱۹ و ۲۰ و ۲۵: ۱۳ سے ۱۶) اور غیر ملکی لوگوں کے ساتھ راہ و ربط پیدا ہو جانے کے ذریعہ دین کو نیا خطرہ پیدا ہو گیا تھا (۱۳: ۶ و ۷ + ۱۷: ۳ و ۴) +

پھر احبار کی کتاب اور خروج اور گنتی کے بعض حصوں میں ایک اور طرح کی شریعت ملتی ہے لیکن وہ بھی اُنہیں موسوی اصولوں پر مبنی تھی۔ لیکن زیادہ مفصل۔ زیادہ کاہنی اور خروج ۲۰ سے ۲۳ یا استثنا کی شریعت سے زیادہ سخت تھی۔ یہاں ہیکل کی رسوم کے اور کاہنوں کی تقدیس کے لئے اور زندگی کے بعض امورات کے لئے زیادہ مفصل قوانین پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض دوسری شریعتوں میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن بعض نئے ہیں (مثلاً احبار ۲۳ کی عیدیں)۔ ان سے پتا لگتا ہے کہ اس نشو و نما میں بہت عرصہ لگا۔ عبادت اعلیٰ درجہ تک ترقی کر گئی اور اس کا مرکز ہیکل بن گئی۔ اب مذبح بڑے تکلف سے بنایا جاتا تھا (خروج ۲۷: ۱ سے ۸)۔ کاہنوں اور لیویوں کے فرائض کی تفصیل بڑے احتیاط سے دی گئی اور لیوی کاہنوں کے آگے بطور خادم کے قرار دیئے گئے (گنتی ۸: ۱۹ + ۱۸: ۱ سے ۷) +

(۳) توریت کے مختلف حصوں کے الفاظ اور طرز تحریر میں بھی فرق پایا جاتا ہے ان اختلافوں خاصکر الفاظ کے اختلافوں کا امتیاز صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عبرانی سے واقف ہو۔ لیکن اتنا تو ہر کوئی معلوم کر سکتا ہے کہ استثنا کی کتاب دوسری کتابوں مثلاً احبار کی کتاب کی نسبت زیادہ بلاغت سے لکھی گئی اور اسکی اعلےٰ اور پر جوش فصاحت کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ پھر ایک قسم کے دیگر مقامات ہیں جن کا نمونہ پیدائش ۱: ۲ سے ۴ ہو سکتا ہے۔ قادر مطلق خدا (عبرانی۔ الوہیم) کہلاتا ہے اور دیگر مقامات میں جن کا نمونہ ۲: ۴ سے ۲۴ ہے وہ خداوند (عبرانی یاہواہ

کہلاتا ہے۔ اسی طرح کئی دیگر امورات میں فرق ہے جن کی تشریح تسلی بخش طور سے یونہی ہوسکتی ہے کہ توریت کے مصنف نے اپنی تصنیف میں ان تحریروں کو استعمال کیا جو شروع میں بالکل الگ الگ تھیں +

ان اختلافوں کے ذریعہ جو سراغ ہم کو مل گیا علما نے کوشش کی کہ ان الگ الگ تحریروں کو جن سے توریت تالیف کی گئی جدا کرسکیں۔ ان کی تحقیقات کے نتائج کا مختصر خاکا اب دیا جائیگا +

۴۔ چشمے

(۱) اول تو وہ چشمہ ہے جسے ہم ابتدائی چشمہ کہیں گے (یہ بھی اپنی ماقبل تحریروں پر مبنی تھا)۔ اس کا نام جے۔ای (J-E) رکھا۔ بعض اوقات اسے نبیانہ تحریر بھی کہا۔ کیونکہ اس میں اسی قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں جو زیادہ اعلےٰ صورت میں نبیوں کی تصنیفات میں مندرج ہیں۔ خاصکر ان کی دینی اور اخلاقی تعلیم۔ بعض اس چشمہ کو قبل از انبیاء Pre Prophetic بھی کہتے ہیں کیونکہ بلحاظ زمانہ کے یہ انبیا سے پیشتر اور زیادہ سادہ صورت میں تھا +

یہ پیدائش ۲: ۴ سے شروع ہوتا ہے اور پیدائش۔ خروج۔ گنتی کے ایک حصے اور یشوع کی کتاب کے پہلے بارہ بابوں میں جو مفصل اور عمدہ بیانات آتے ہیں وہ اسی چشمہ سے ہونگے۔ آدم اور حوا کے گرنے۔ قائن اور ہابیل کے احوال اور ابراہیم کی آزمائشوں اور آوارگیوں کی تفصیل۔ سدوم اور عمورہ۔ اضحاق اور ربقہ کے حالات۔ یعقوب کا فریب اور حاران کی طرف اس کا سفر کرنا اور اس کا کامیاب ہونا۔ اور یوسف کی زندگی کا احوال اسی چشمہ کی بدولت ہم کو حاصل ہوا۔ اس ابتدائی چشمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدیم اشیا کا بڑا مشتاق ہے (وہ بہت قدیم زمانہ تک جا پہنچتا ہے۔ اور اُن روایتوں اور تاریخوں کا بیان کرنے سے خوش

ہوتا ہے جو اس قوم کے بزرگوں کی نسبت مشہور تھیں۔ اسی نسخے میں اُس قدیم شریعت کا ذکر ہے جس کی طرف اشارہ ہوچکا ہے (خروج ۲۰ سے ۲۳) جس میں مقامی مقدسوں کی اجازت ہے۔ اسی میں دس احکام قلمبند ہوئے۔ اسی میں لمک اور موسیٰ کے گیتوں اور اسرائیلیوں کی فتوحات کا ذکر ہے۔ (گنتی ۲۱: ۱۴ او ۱۵ و ۱۷ و ۱۸ و ۲۷ سے ۳۰)۔ اور اپنے بیان کے شروع ہی سے خدا کے لئے یاہوواہ استعمال کیا۔ بعضوں نے یہ سعی بھی کی کہ اسے بھی دو نسخوں سے مرکب ثابت کریں یعنی جے (J) اور ای (E) سے۔ لیکن اس کے لئے کسی بڑی کتاب کو دیکھنا چاہئے۔ بہرحال یہ رشتے باہم ایسے پیوستہ ہیں کہ ہم اپنے مقصد کے لئے انہیں ایک ہی خیال کرینگے +

اس چشمہ میں بہت سادہ صاف اور عمدہ بیان دیا گیا ہے اور خاص کر خدا کا ذکر انسانی پیرایہ میں ہوا ہے۔ یعنی خدا کے لئے جو عبارت مستعمل ہوئی وہ انسان پر بھی صادق آسکتی ہے۔ مثلاً اس میں ذکر ہے کہ خدا باغبانی کرتا اور ٹھنڈے وقت باغ میں چلتا ہے۔ (پیدائش ۲: ۵-۳: ۸)۔ وہ اترتا ہے تاکہ دیکھے کہ لوگ زمین پر کیا کر رہے ہیں (پیدائش ۱۱: ۵ + ۱۸: ۲۱)۔ کہ نوح کے اندر جانے کے پیچھے اُس نے دروازہ بند کردیا (پیدائش ۷: ۱۶)۔ اور قربانی کی خوشبو کو سونگھتا ہے (پیدائش ۸: ۲۱)۔ اور ایسے جذبات کا اظہار کرتا ہے جن میں انسان مبتلا ہوتے ہیں (پیدائش ۶: ۶) وغیرہ۔ یہاں یہ کہنا چاہئے کہ خدا کے بارہ میں ایسا کہنے کی جرأت کسی بے ادبی یا بے تکلفی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ سرگرم دینی طبیعت کا نتیجہ تھی جس کے باعث انسان کو خدا کی عین حضوری اور دنیا میں اس کی قدرت کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اس ابتدائی نسخہ نے بھی بڑی بزرگوں کے اخلاقی قصوروں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ مفصلہ ذیل مقامات کا مطالعہ کرنے سے اس نسخہ کی

طرز عبارت اور خصوصیت کسی قدر معلوم ہو سکتی ہے۔ پیدایش ۲: ۴ سے ۳: ۲۴+ ۲۰:۹ سے ۲۷+ ۱۱: ۱ سے ۹ و ۱۸ و ۱۹ و ۲۰ و ۲۲ و ۲۴ و ۲۷۔ اور یوسف کی تقریباً ساری تاریخ +

گمان غالب ہے کہ اس ابتدائی نسخہ یا نبیانہ بیان میں جن قدیم تحریروں سے کام لیا گیا وہ ۸۵۰ ق م کے بعد کی نہ ہونگی بلکہ شاید اس سے بھی ایک صدی پیشتر کی اور یہ قدیم تحریریں بھی غالباً ایسی تحریروں پر مبنی ہونگی جیسے "خداوند کا جنگ نامہ یا "الیاشر کی کتاب" اور ایسی روایتوں پر جو اسرائیل کے فرقوں میں پشت بہ پشت چلی آئی تھیں۔ قدیم نبیوں نے بار بار گذشتہ تاریخ اور بزرگوں کے ساتھ خدا کے اُن وعدوں کا حوالہ دیا جو اس ابتدائی بیان میں قلمبند ہے۔ مقابلہ کرو۔ ہوسیع ۹: ۱۰+ ۱۱: ۱+ ۱۲: ۳۔ ۴ و ۹ و ۱۲+ عاموس ۲: ۹+ ۳: ۱+ ۵: ۲۵+

(ب) دوسرا وہ کاہنی نسخہ ہے (جو عموماً پ (P) کے نام سے مشہور ہے) یہ نام اس نسخہ کو اس لئے دیا گیا۔ کیونکہ اس میں اسرائیل کی تاریخ کاہنی (پادری) نقطہ خیال سے دی گئی۔ اور چونکہ اس میں کاہنی اور رسمی شریعت کا بڑا حصہ مندرج ہے۔ جو خروج۔ احبار۔ اور گنتی میں آیا ہے۔ یہ کچھ خشک اور رسمی طرز میں لکھا گیا اور شاعرانہ مذاق یا صنعت وغیرہ سے معرا ہے۔ البتہ بعض حصوں میں (مثلاً پیدایش کے بیان میں) طرز عبارت زیادہ اعلےٰ اور مضمون کے مناسب ہے۔ اس نے قدیم زمانہ سے شروع کرکے اسرائیل کی تاریخ کا خاکہ دیا ہے۔ لیکن معمولاً یہ بہت ہی خفیف ہے۔ بہت ایسے واقعات ہیں جن کا مفصل بیان ابتدائی نسخہ میں ہوا۔ لیکن اس میں اس کا محض ذکر ہی ہے اور بہت زمانوں کو صرف مشہور اشخاص کی فہرست دیکر ہی چھوڑ دیا۔ (پیدایش ۱۱: ۱۰)۔ لیکن جب کبھی کسی مشہور ضابطہ کے آغاز یا مشہور واقعہ کا ذکر ہے تب مصنف نے مفصل بیان کیا (مثلاً پیدایش ۱: ۱

سے ۲: ۴+ خروج ۱۲: ۱ سے ۲۰) مگر اس تحریر میں اسرائیل کے بحیثیت الٰہی سلطنت برپا ہونے اور ترقی کرنے کا سلسلہ وار بیان ہے۔ قوانین اور ضوابط کی طرف خاص توجہ کی گئی اور جن امورات کا تعلق رسمی شریعت۔ قوم کے فرقوں میں تقسیم ہونے اور ان کے درمیان موعود زمین کے تقسیم ہونے سے ہے (مثلاً گنتی ۱ سے ۴ یشوع ۱۳: ۱۵ سے ۱۴: ۵ تک + ۱۵: ۱ سے ۱۳ و ۲۰ سے ۶۲ تک + اور ۱۷ سے ۲۲ تک کا بڑا حصہ) اس میں بہت سے نسب نامے ہیں (مثلاً پیدایش ۵ و ۹: ۲۲ سے ۲۹+ ۴۶: ۶ سے ۲۷) فہرستیں (مثلاً خروج ۲۵ سے ۳۱) اور تاریخی تفصیلیں (پیدایش ۱۱: ۱۰ وغیرہ) فہرست کے شروع میں یہ پسندیدہ جملہ آتا ہے "یہ تولد نامہ" ہے (پیدایش ۲: ۴+ ۵: ۱+ ۶: ۹+ ۱۰: ۱+ ۱۱: ۱۰+ ۲۵: ۱۲+ ۳۶: ۱) +

اس کاہنی نسخہ نے انسانی پیرایہ میں خدا کا ذکر کرنے سے بالکل اجتناب کیا اور اس امر میں یہ ابتدائی نسخہ جے۔ آئی سے بالکل متفرق ہے کیونکہ اس میں خدا کا ایسا بیان ہے کہ وہ انسان کی طرح خیال اور عمل کرتا ہے۔ دیکھو پیدایش ۱۸ و ۱۹+ خروج ۲۴: ۴ وغیرہ۔ نسخہ پی (P) میں خدا کے مکاشفات آشکارا ظہوروں کے طور پر نہیں بلکہ کلام کے طور پر ہیں (پیدایش ۱: ۲۸+ ۶: ۱۳ + خروج ۶: ۱+ ۱۲: ۱) سوائے اس ایک موقعہ کے جب خدا نے کوہ سینا پر اعلےٰ مکاشفہ عطا کیا (خروج ۲۴: ۱۶+ ۲۵ - ۲۲)۔ خدا کے متعلق اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس نے خدا کے لئے تقریباً دایل شدائے۔ پیدایش ۱۷: ۱+ ۲۸: ۳+ ۳۵: ۱۱+ ۴۸: ۳) ہمیشہ الوہیم (خدا یا الٰہ) استعمال کیا۔ جب تک کہ خروج ۶: ۳ میں خدا نے اپنا نام موسیٰ پر یا ہوواہ (خداوند) ظاہر کیا۔ اس نسخہ کا مصنف ضرور کاہنی فرقہ سے تعلق رکھتا ہوگا۔ اس کا مقصد بالکل دینی تھا۔ اس نے اسرائیل کی تاریخ کے خاکے سے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ "خدا اس کے درمیان تھا" +

علما کی یہ رائے ہے کہ جس صورت میں یہ نسخہ توریت میں مندرج ہے وہ غزراہ کے دنوں میں اسیری سے واپس آنے کے بعد کاہنوں اور دوسروں کی ہدایت کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس میں عبادت کا مرکز بالکل یروشلم ہے۔ کاہن صرف ہارون کے خاندان سے ہیں اور لیوی اُن سے متفرق ہیں اور قربانیوں اور عیدوں کا جو بیان ہے وہ استثنا کی کتاب کے بیان سے بھی زیادہ بڑھا چڑھا ہے (دیکھو ج)۔ خدا کا تصور زیادہ خالص ہے اور ایک عظیم الشان انسان جیسا نہیں۔ اس کاہنی نسخہ میں اُس سیاست اور طہارت کے آثار پائے جاتے ہیں جو اُس قوم کو جلاوطنی میں حاصل ہوئی اور اس واقعہ کے بعد اس کی تاریخ مناسب طور سے مقرر کی گئی ہے +

(ج) جو تیسرا نسخہ توریت کی تالیف میں مستعمل ہوا (یا ہکساٹیوک یا پہلی چھ کتابوں میں) یہ استثنا کی کتاب ہے۔ جو حرف ڈی (D) سے موسوم ہوتی ہے (کیونکہ انگریزی میں (Deuteronomy) (استثنا) کا پہلا حرف ڈی ہے اور اس سے شریعت کی وہی کتاب مراد لی جاتی ہے جو خلقیاہ کو شاہ یوسیاہ کے اٹھارھویں سال ۶۲۱ ق م (۲ سلاطین ۲۲) ہیکل میں ملی تھی۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا طرز عبارت بہت عالمانہ سلیس تکرار پسند اور فصیح ہے مثلاً استثنا ۱۱ اور ۱۲ + اس میں اس امر کی تاکید کی گئی کہ ایک خدا کی عبادت ایک ہی مقدس میں ہو اور اس میں اعلےٰ روحانی اخلاقی اور رفاہ عام مقاصد کا ذکر ہے۔ کئی طرح سے یہ ابتدائی نسخہ کی پہلی شریعت سے متفرق ہے۔ لیکن یہ فرق ہمیشہ تفصیل میں پایا جاتا ہے۔ اس کے قوانین مابعد زمانہ کے مناسب حال ہیں جب کہ سوسائٹی کی حالت زیادہ پیچیدہ تھی بہ نسبت اُس کے جو جے آئی میں پائی جاتی ہے۔ اُس وقت عبادت کا مرکز یروشلم ہے کیونکہ مقامی مقدسوں کا

لوگوں نے غلط استعمال کیا تھا۔ اور عبادت کا ایک مرکز ہونے کی وجہ سے تفصیل میں کئی تبدیلیوں کی ضرورت پڑی۔ یوں استثنا کی کتاب یا دوسری شریعت پہلی شریعت کی ترقی کی صورت ہے۔ موسوی اصولوں کو نئے حالات پر چسپاں کیا اس میں وہی رُوح جوش مارتی ہے جو ماقبل شریعت میں تھی عبادت کے اخلاص۔ یک دلی اور پاکیزہ زندگی کے لئے وہی تمنا پائی جاتی ہے جو پہلی شریعت میں پائی جاتی تھی +

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تین نسخے۔ ابتدائی نسخہ۔ کاہنی نسخہ اور استثنا کی کتاب مذکورہ بالا طریقے سے باہم ملائے گئے۔ اسرائیل کی تواریخ لکھنے کی پہلی کوشش غالباً نویں صدی قبل از مسیح انبیا کے سکولوں میں شروع ہوئی۔ اور ابتدائی نسخہ جے۔ آئی میں یہ کوشش تکمیل کو پہنچی۔ جس وقت کہ جے۔ ای تصنیف ہوا دوسری شریعت (ڈی) قلمبند ہو چکی تھی اور مشہور ہو گئی تھی جیسا کہ ۲ سلاطین ۲۲ میں مذکور ہے۔ بعد ازاں اسے ماقبل تحریرات کے ساتھ شامل کر دیا۔ یہ اس کی تاریخی بنیاد تھی۔ پھر جلاوطنی میں یا عین اس کے بعد کاہنی روایات کے مطابق رسمی شریعت مترتب ہوئی اور تاریخی خاکہ میں اس کو جگہ ملی جس کا نتیجہ یہ کاہنی نسخہ پی (P) ہوا۔ آخر کار کسی مابعد مورخ نے ان کو مستند تحریریں مانکر ان کے ذریعہ ایک اور کتاب تالیف کی اور جہاں کہیں ضرور معلوم ہوا۔ کچھ نوٹ اور تشریحیں ایزاد کیں۔ اس نے تاریخ کو اپنے الفاظ میں بیان نہیں کیا نہ اپنے نقطہ خیال سے پیش کیا جیسے کہ حال کے مورخوں کا دستور ہے۔ لیکن جن چشموں کو اس نے استعمال کیا اُن کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جن میں ایک ہی واقعات کا ذکر تھا۔ یوں نہ صرف ساری پشتوں کے لئے وہ تاریخ محفوظ رہی بلکہ عین وہ الفاظ بھی جن میں وہ اس تک پہنچے تھے۔ اس مصنف کی تصنیف میں عہد عتیق

نوشتوں کا پنٹاٹیوک ہمیں حاصل ہے +

جن علماء نے بائیبل کی ان کتابوں کا خوب غور سے مطالعہ کیا یہ اُن کی رایوں کا مختصر خاکا ہے۔ پنٹاٹیوک کی تصنیف کی نسبت ایسی رائے گو شروع میں ہمیں حیرت کا باعث ہو لیکن خدا کے عمل اور الہام کی نسبت زیادہ وسیع تصورات کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اُس کے ذریعہ ہمارا ایمان متزلزل ہونے کی بجائے زیادہ مضبوط ہوگا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ ان کتابوں کی تشریح کی بہت مشکلات رفع ہو جائینگی اور ان اختلافات کی تشریح کردیگی جن سے ہم سب ان کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ جب ہم یہ بخوبی سمجھ لیتے ہیں کہ اسرائیل نے صرف موسےٰ ہی کے ذریعہ تعلیم نہیں پائی بلکہ ذرہ حصہ بہ حصہ اور طرح بطرح ایسے معلموں اور ہادیوں کے ذریعہ جن کو اُسی کام کے مطابق الہام ملا تھا۔ جسے بجالانے کو وہ بھیجے گئے تھے تو ہمارے دلوں میں تو جہان پر اُس کی حکومت اور اپنی اُمت کی نگرانی و فکر کی نسبت اعلےٰ خیالات پیدا ہونگے۔ چونکہ پنٹاٹیوک کی شریعت سب کی سب ایک ہی دفعہ نہ ملی تھی بلکہ مختلف پشتوں کو ان کے حالات اور ضروریات کے مطابق تو اس امر سے یقیناً ہمکو یہ تعلیم ملیگی اس سے بہتر اور کہاں سے تعلیم مل سکتی ہے کہ خدا اسرائیل کا محافظ اونگھتا اور سوتا نہیں (۲) اور علماء نے جو رائے اِن کتابوں کے بارہ میں ہم پر ظاہر کی اُس سے پتہ لگتا ہے کہ اس کا الہام نہ ایک کو حاصل ہوا بلکہ بہتوں کو اور کہ اسرائیل کی تاریخ کے ہر زمانہ میں خاص لوگ اُس رُوح سے ملہم ہوئے جس نے ان کے استاد موسیٰ کو الہام دیا تھا اور وہ اپنے ہم جنسوں پر اُسے ظاہر کرنے کے بہت آرزومند تھے کہ خدا نے ایسے بڑے بڑے کام کئے اور ان کی خواہش تھی کہ امت میں اُس خدا کی وفاداری اور جان نثاری پیدا ہو جو ابراہیم اضحاق اور یعقوب کا خدا تھا اور جو اب بھی ان کا خدا ہونا چاہتا تھا +

خلقت کا بیان اور سائنس

بائبل میں جو دنیا کی پیدائش کا بیان ہے اس کی نسبت بہت سی مشکلات اس لئے محسوس ہوئیں کہ اس میں اور موجودہ سائنس کی معلومات میں کچھ اختلاف معلوم ہوا۔ اس لئے چند عام خیالات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ مشکلات رفع ہوں +

(ا) بہتوں کے دلوں میں موہوم سا خیال پایا جاتا ہے کہ دنیا کی پیدائش کی جو تاریخ بائبل میں مذکور ہے وہ درست نہیں۔ بلکہ دنیا اُس سے بہت پہلے پیدا ہوئی ہوگی۔ اس غلطی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بعض بائیبلوں کے حاشیہ میں دنیا کی پیدائش کی تاریخ ۴۰۰۴ ق م۔ لکھی ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ حاشیہ بائبل کا جز نہیں۔ اس غلطی کا آغاز اس طرح ہوا کہ بعض یہودی اور مسیحی علماء نے سالوں کا ایسا اندازہ لگایا جسے ہم سب جانتے ہیں کہ وہ حساب ناقص علم پر مبنی تھا۔ مقدس مصنف نے پیدائش کی کتاب میں وقت کی کوئی خاص میعاد مقرر نہیں کی۔ اُس نے صرف یہ بیان کیا کہ پیدائش ابتدا میں ہوئی اور یہ لفظ اس قدر وسیع ہے کہ زمانہ حالات کے معلومات کو اس میں گنجایش ہو سکتی ہے

(ب) دوسری مشکل اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ پیدائش ۱ باب میں چھ دن میں دنیا کی پیدائش کا ذکر ہے حالانکہ سائنس اس کے خلاف رائے رکھتی ہے کئی ایک طریقوں سے اس مخالفت کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی کہ پیدائش کی کتاب کا یہ بیان تشبیہی یا مجازی ہے۔ مثلاً کسی نے یہ بیان کیا کہ کسی قدیم نبی کو خلقت کا یہ مکاشفہ رویتوں کی صورت میں چھ دن میں حاصل ہوا بعضوں

یہ وجہ بیان کی کہ جن دنوں کا یہاں ذکر ہے وہ ۲۴ گھنٹوں کے طبعی دن نہیں بلکہ طول طویل زمانے ہیں جن میں دنیا نے بتدریج ترقی کی۔ ان بیانات میں خواہ کچھ ہی سچائی کیوں نہ ہو۔ اور بعضوں کو ان سے خواہ کیسی مدد کیوں نہ ملتی ہو۔ لیکن جو لوگ بائبلی خلقت کے بیان کا زیادہ تسلی بخش جواب چاہتے ہیں وہ مفصلہ ذیل تین امور پر غور کریں۔ (۱) نوع انسان کی طفولیت کے وقت یہ قصہ قلمبند ہوا تھا جب کہ انسانی علم کا ابھی آغاز ہی تھا اور دنیا اور زندگی کے مسائل پر غور کرنے کے لئے لوگوں کے دل بیدار ہو رہے تھے۔ اُس زمانہ میں یہ صرف اُسی صورت میں قابل فہم ہو سکتا تھا کہ یہ سادہ اور طفلانہ طور پر بیان ہو۔ ایسے بیان نے جو اثر دنیا کے غور و فکر پر کیا اس سے ایسے طریقہ سے بیان کرنے کی حکمت ظاہر ہوتی ہے۔ (۲) اب عام طور پر لوگ یہ مانتے ہیں کہ پیدائش کی کتاب میں دُنیا کی پیدائش کا جو بیان ہے اس میں ایسے عقیدے کے آثار پائے جاتے ہیں جو پیدائش کی کتاب تحریر ہونے سے ہزارہا سال پہلے اہل بابل اور اہل آسور میں مروج تھے۔ اب تک یہ بحث جاری ہے کہ پیدائش کی کتاب کے اس بیان اور ان قدیم قوموں کی روایات کے درمیان کیا تعلق تھا۔ البتہ ان کا باہم مقابلہ کرنے سے ایک بات تو روشن ہو گئی کہ پیدایش کی کتاب کے بیان اور بابلی اور اسوری عقیدوں میں خواہ کچھ ہی مشترک حصہ ہو مصنف نے اس بیان کو ہر طرح کے ادنےٰ تصورات سے پاک کر دیا اور ایسے اعلےٰ خدا کی حضوری اور طاقت کو پیش کیا جو زمین اور آسمان کا اکیلا خالق تھا۔ (۳) پیدائش کے پہلے باب میں مصنف کا مقصد علمی نہ تھا بلکہ دینی تھا۔ ان کی سائنس دانی تو اُس زمانہ کی معلومات سے محدود ہو گی لیکن جن مذہبی صداقتوں کی اُس نے تعلیم دی وہ ناقابل اعتراض اور ابدی

ہیں۔ ایک اور طریقہ سے اس امر کو بیان کر سکتے ہیں۔ خلقت کی پیدائش کا سائنٹفک بیان خدا نے اپنی انگلی سے زمین کے پتھروں پر لکھ دیا اور لوگ آہستہ آہستہ اُس کے ہجے کر رہے ہیں۔ لیکن دنیا کی پیدایش کا دینی بیان پیدایش کی کتاب کے پہلے باب میں ایسے حروف میں قلمبند ہوا جن کو سب پڑھ سکتے ہیں۔ یہ دونوں بیانات خدا سے ملے ہیں اور ایسی حیثیت سے ان کو قبول کرنا چاہئے۔ جیسے ڈاکٹر مرکس ڈاڈس نے بیان کیا۔ جب لوگ ایک چیز کو ایک بیان میں تلاش کرتے ہیں جو دوسرے بیان میں ملتا ہے تو وہ سخت غلطی کرتے ہیں۔ وہ یا تو فطرت کی تصدیق پر دھیان کرنا نہیں چاہتے یا یہی خیال کر وہ بائبل کے بیان کے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے۔ یا وہ فطرت کی تعلیم پر ہی قناعت کرتے ہیں گو یا جو کچھ ہمیں اپنی نسبت، دُنیا اور خدا کی نسبت معلوم کرنا چاہئے وہ سب کچھ فطرت ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ ابتدا میں دُنیا میں جو لوگ خدا کو ٹٹول رہے تھے اور کثرت الٰہ العبد کی مشرکانہ تعلیم میں مبتلا تھے۔ ان کو اس حالت سے پھرانے کیلئے اس عرفان کی ضرورت تھی کہ خدا پاک اور نیک ہے۔ جس نے ساری چیزوں کو بنایا۔ اور اس کی صفتوں کا شارح انسان ہے۔ یہی عرفان پیدایش کی کتاب میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے حقیقی سوال یہ ہے کہ کیا پیدایش کی کتاب کا یہ بیان اپنے اس مقصد کو ایسے طور سے سرانجام دیتا ہے کہ صرف الہام الٰہی ہی کے ذریعہ سے یہ پورا ہو سکتا تھا؟ یہ سوال کرنا کہ کیا یہ پیدایش کا بیان پورے طور سے سائینس کے مطابق ہے؟ درست سوال نہ ہوگا۔

(ج) ان غور و فکروں کو دل میں رکھنا چاہئے کیونکہ ان کے ذریعہ ایک تو اس مزید مشکل کے حل کرنے میں مدد ملیگی جس کا تعلق قانون ارتقا کے ساتھ ہے اور ان کے عجیب جدید دریافتوں کے ساتھ سائینس اب یہ تعلیم دے رہی ہے

کہ دنیا کی ترتیب اور خوبصورتی ایک بے وساطت خالقی فعل کا نتیجہ نہیں بلکہ عرصہ
دراز کے بتدریج عمل کا نتیجہ ہے جس میں ہزارہا اور لکھوکہا سال لگے ہونگے۔ اور
کہ فطرت کی بوقلمون زندگی وہی نہیں جو بعد ابتدا میں مقرر ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ
طول طویل زمانوں کے دوران میں ادنےٰ حالتوں اور اصلی اصولوں میں ترقی کرتی گئی۔
سرسری نظر سے یہ تعلیم بائبل کی تعلیم کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور خاصکر پیدایش کی
کتاب کے اس بیان پر شک پیدا کرتی ہے۔ پہلے پہل تو یہ ایسی ہی مان لی گئی۔ لیکن
حال ہی میں جب لوگوں نے پیدایش کے اس پرانے قصہ پر سائینس کی روشنی میں
ازسرنو غور کرنا شروع کیا تو ان کی مشکلات اور حیرانگی بہت کچھ کافور ہوگئیں۔ جن
امور کا ذکر (ب) میں ہوا۔ اُن کو مدنظر رکھکر اُن کو یہ معلوم ہوگیا کہ خواہ یہ خلقت
بتدریج بنی ہو یا ایک دم میں کامل بن گئی ہو۔ یہ الٰہی اور معجزانہ کام ہے۔ جو طاقت
اس امر کے لئے درکار ہے کہ دنیا میں ترقی کے طویل اور لگاتار عمل کو شروع کرے
اور سنبھالے رکھے وہ اس سے کچھ کم نہ ہوگی جس کے ذریعے ایسا جہان ایک لحظہ میں
پیدا ہو جائے اور اس کی ترتیب کو سنبھالے رکھے۔ بلا کلام خدا ایک لحظہ میں عظیم الشان
بلوط کا درخت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اُس سے کچھ عجب نہیں کہ وہ اُسے رفتہ رفتہ
بنائے کہ وہ ایک چھوٹے بیج سے پیدا ہو۔ جس کو درجنوں ہم اپنے ہاتھ میں لیجا سکتے
ہیں۔ حالانکہ اُن میں سے ہر ایک میں ایک ایسی پوشیدہ قوت ہے کہ آئندہ زمانوں میں
عالیشان بلوط پیدا ہوتے ہیں۔ مسئلہ ارتقا سے جو مشکل پیدا ہوتی ہے وہ اس امر
کے دریافت کرنے سے بہت کچھ حل ہو جاتی ہے اور بائبل پر صحیح ایمان رکھنے میں خلل
ڈالنے سے باز رہتی ہے۔ بائبل پر ایمان رکھنے والے شخص کی تائید کے لئے ایک مزید
خیال کو بھی لا سکتے ہیں۔ ارتقا نہ محض ایک رائے (Theory) ہے جو زمانہ آئندہ
میں کچھ بدل سکتی ہے اور جس کی جگہ کوئی دوسری رائے قایم ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ

رائے خلقت کے آغاز کے بارے میں سچ اور قطعی بھی ہو تو بھی ہم کم ازکم اتنا کہہ سکتے ہیں
کہ یہ پیدایش کی کتاب کا بیان اس کے نقیض نہیں۔ خلقت کا بتدریج عمل جیسا کہ
پیدایش کی کتاب میں مندرج ہے۔ اگر اس کا مطالعہ نئی سائنٹفک تعلیم کی روشنی
میں کیا جائے تو مسلسل ترقی کا قانون ہم پر منکشف کریگا اور یہ کم ازکم ارتقا کے عمل
کا پیش خیمہ ہے۔ یوں یہ ظاہرا اختلاف گو بالکل جاتا نہ رہے بہت ہی گھٹ جائیگا۔
یہ لکھا ہے کہ "یہ آسمان اور زمین کی پیدایش کا بیان ہے"۔ جب وہ پیدا ہوئے تو
ملہم مورخ نے کسی قادر مطلق ہاتھ کو نہیں دیکھا جو خلقت کے چوبارے بنا رہا ہو۔ اُسنے
نہ کسی ہتھوڑے کی آواز سنی۔ نہ کاریگروں کے شور وغل کی۔ خداوند کا رُوح گہراؤ کی
سطح پر جنبش کر رہا تھا۔ اس کے ملہم دل کے سامنے ویرانی نے صورت اور زینت
اختیار کی اور نظام شمسی دنوں کے تواتر کے وسیلے موجودہ ترتیب اور خوبصورتی کی
حالت میں آگیا۔ آخرکار جب ساری چیزیں بن چکیں۔ ہمیں معلوم نہیں کتنے ہزار یا لاکھ
برس اس کام میں لگے۔ تو آدمی ظاہر ہوا جو ساری خلقت کا سرتاج تھا۔ کیونکہ خدا نے
اُس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا سو آدم جیتی جان ہوا"۔

پیدائش اور بابلی کتبے

گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں بابل کے علم ادب کے بارہ میں جو علم اور معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے ذریعہ پیدائش کی کتاب کے پہلے چند بابوں پر بہت ہی روشنی پڑی ہے۔ اسوری بادشاہ آسر بنی پال نے جو ساتویں صدی قبل از مسیح کے وسط میں حکمران تھا یہ حکم دیا کہ ملک کے سارے کتب خانوں میں سے بے شمار کتابوں کی نقل اس کی ننوہ کی لائبریری کے لئے کی جائے۔ ان میں سے بعض تصنیفات اس واقعہ سے صدہا سال پہلے کی ہونگی۔ یہ کتابیں دین۔ تاریخ۔ ریاضی۔ شریعت جادو اور نجوم کے متعلق تھیں۔ یہ نقلیں اصل کتابوں کی طرح باریک مٹی کی تختیوں پر جب وہ نرم ہی تھی لکھی جاتیں۔ برچھی کی شکل کے حروف ان پر کندہ ہوتے اور بھٹی میں وہ پکائی جاتیں حتیٰ کہ وہ سخت اور خشک ہو جاتیں۔ یہ مٹی کی تختیاں حجامت کی ہیں ایک انچ سے لیکر ایک فٹ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور یوروپ اور امریکہ کے عجائب گھروں میں ان کی ہزاروں جلدیں موجود ہیں جو آسر بنی پال کی لائبریری اور دوسرے مقاموں سے جمع کی گئیں۔ اب تک کھدائی کا کام جاری ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال نئی نئی کتابیں ملتی جاتی ہیں۔ ۱۸۷۲ء میں مسٹر جارج سمتھ نے بعض تختیوں پہ خلقت کی پیدائش اور طوفان کا بیان دریافت کیا جو اہل بابل کے دینی نقطہ خیال سے لکھا گیا تھا۔ یہ تختیاں اب انگریزی عجائب گھر میں دھری ہیں۔ اس بیان اور پیدائش کی کتاب کے پہلے بابوں کے بیان میں کئی ایک مشابہتیں پائی جاتی ہیں اور یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ عبرانی اور بابلی قومیں سیم کی بڑی نسل کی رشتہ دار شاخیں تھیں۔ اور یہ بھی بات تھی کہ دنیا کے آغاز کے بارہ میں ان کے خیالات مشابہ ہوں اور

ان کی روایات دنیا کی قدیم تاریخ کے بارہ میں بہت کچھ مشترک ہوں۔ لیکن ان بابلی تحریروں نے جن کے ذریعہ پیدائش کی کتاب کے قدیم بیان پر ایسی روشنی آ گئی ہے۔ پیدائش کی کتاب کے الہامی ہونے کی اور ان کی خاص دینی وقعت کی تصدیق کی ہے۔ بائبل کے ان بیانات کا اگر دیگر مشابہ بیانات سے مقابلہ کیا جائے تو بہت فرق بھی معلوم ہونگے جو مشابہتوں کی نسبت زیادہ دلچسپ ہیں۔ اور انہیں فرقوں کے ذریعہ ان کی روحانی قدر و قیمت منکشف ہوتی ہے۔ بابلی قصوں میں ہنسی انگیز اور کثرت الالہ کے خیالات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ بائبل کے بیانات میں ایک زندہ اور حقیقی خدا کا ذکر ہے۔ پہلے بیان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے ذریعہ یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مقدس نوشتوں میں زیادہ صحیح اور زیادہ اعلیٰ دینی خیال کو مدنظر رکھا ہے۔ ان کے ذریعہ عبرانیوں پہ اور اب تک ہم پر خدا کی نسبت اور اس کا جو رشتہ جہان اور انسان سے ہے اس کی نسبت شایاں تصورات منکشف ہوتے ہیں۔ وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ قوم اسرائیل کو حقیقی خدا کا خاص مکاشفہ حاصل تھا۔ اگر عبرانیوں کا عام علم دیگر قوموں کی طرح بہت باتوں میں فطرت اور تاریخ کے موجودہ علم کے خلاف نظر آتا ہے تو بھی وہ ان کے درمیان بہت خالص اور خدا کی روح کی ہدایت کے ماتحت اور بت پرستی کے داغ سے مبرا تھا جیسا کہ پیدائش کی کتاب کے پہلے بابوں میں قلمبند ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو یہوواہ کے دین یا یسوع مسیح کے مفصل مکاشفہ کے نقیض ہو۔

۱۔ خلقت کا بابلی بیان ۔خلقت کی پیدائش کے متعلق دو بابلی قصے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو زیادہ طویل اور زیادہ اہم ہے وہ سات تختیوں پر کندہ ہے جن میں سے بعض ناکامل ہیں۔ اس کے مطابق ساری چیزیں تیامت نے پیدا کیں جو ابتدائی سنسان اور ویران حالت کا تشخص تھا۔ اس کو ایک قوی الجثہ

اژدہا کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ دیوتا یکے بعد دیگرے ایک طویل تواتر سے پیدا ہوئے۔ لیکن آخر میں اُن میں اور تیامت میں دشمنی پیدا ہو گئی۔ اس موخر الذکر نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے دیو پیدا کر دیئے۔ مردوک کو جو شمسی دیوتا تھا جس کا دوسرا نام بیل تھا اور شہر بابل کا اعلےٰ اور موکل دیوتا تسلیم کیا گیا۔ دیوتاؤں نے اپنی مدد کے لئے چنا۔ اس نے تیامت کو مغلوب کیا اور اس کے جسم کے دو ٹکڑے کئے اور ایک نصف سے اُس نے فضا بنائی جو آسمان میں بالائی پانیوں کو سنبھالے تھی۔ دیکھو پیدائش ۱-۶ سے ۸ کی تفسیر۔ تب مردوک نے آسمان میں منطقۃ البروج قایم کئے تاکہ بڑے دیوتاؤں کے لئے مسکن بنیں اور چاند کو آسمانوں میں رکھا تاکہ مہینوں کا اندازہ لگائے۔ ان تختیوں کا دوسرا حصہ کچھ ٹوٹا پھوٹا ہے۔ لیکن اس میں آسمانوں کی پیدائش کا بیان ہے۔ ساتویں تختی پر ایک گیت مردوک کی تعریف میں ہے۔ بابلی خلقت کے بیان کے قصے سے یہ چند مقامات اقتباس کئے ہیں۔ یہ مقامات عموماً ٹی جی پنچز (T. G. Pinches) کے ترجمہ سے ہیں:-

"جب اوپر آسمان کا نام نہ رکھا گیا تھا۔
نیچے زمین پر کوئی نام نہ تھا۔
سمندر جو ابتدا میں تھا وہ ان کا پیدا کرنے والا تھا۔
ہنگامہ تیامت اُن سب کی ماں تھا۔
ان کے پانی جمع ہو کر ایک ہو گئے۔
تب دیوتا پیدا ہوئے تھے۔
لہمو لہمو نکل آیا۔
آنشر۔ دیوتا انو
باقی حصہ کچھ ٹوٹا پھوٹا ہے +

دوسری تیسری اور چوتھی تختیوں پر مردوک اور تیامت کے درمیان جھگڑے کا بیان ہے۔ اول الذکر کی فتح سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ نور اور ترتیب نے تاریکی اور ویرانی پر فتح حاصل کی۔ تب تیامت کے بدن سے فضا کے بننے اور آسمانوں کی پیدائش کا ذکر ہے کہ وہ آسمان دیوتاؤں کے لئے مسکن ہوں

اُس نے اُسے چیر کر دو ٹکڑے کیا جیسے مچھلی کے۔
اُس نے نصف کو نصب کیا اور اُسے آسمان کے لئے پردہ بنایا۔
اُس کے آگے باڑ لگائی اور ایک چوکیدار وہاں مقرر کیا
اور اُسے حکم دیا کہ پانیوں کو نکلنے نہ دے۔
تب بیل (یعنی مردوک) نے گہراؤ کی وسعت کو ماپا۔
اس کی صورت پر ایک محل اسارہ کی بنیاد ڈالی۔
یہ محل اسارہ جو اس نے بنایا آسمان ہے۔
جو انو۔ بیل اور اِی کا مسکن ہے۔

پانچویں تختی پر اجرام فلکی کی خلقت اور ترتیب کا بیان ہے۔ اُس نے (مردوک نے) بڑے دیوتاؤں کے لئے مقامات بنائے +

اور ان کی تشبیہ پر ستارے۔ اُس نے منطقۃ البروج کو قایم کیا +
اُس نے سال کو مقرر کیا اور اُن کی تقسیم ٹھہرائی۔
بارہ مہینے اُس نے مقرر کئے اور ہر ایک کے ساتھ تین ستارے۔
اُس نے حکم دیا کہ چاند چمکے اور رات پر حکمرانی کرے وغیرہ"

باوجود چند خیالات کی مطابقت کے پیدائش کی کتاب کا پہلا باب اُس بیان سے بہت اعلےٰ ہے جو بابلی قصوں میں دُنیا کے آغاز کے بارہ میں دیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب نہایت موزوں اور سادگی عالیشان ہے۔ بمقابلہ ان طفلانہ اور ہنسی خیز

قصوں کے۔ لیکن ان سب سے بڑھکر اس کی دینی تعلیم اور بابلی قصوں کی تعلیم میں دن اور رات کا فرق ہے۔ یہاں دیوتاؤں کی کثرت پائی نہیں جاتی۔ لیکن ایک زندہ اور حقیقی خدا ہے اور نہ یہاں ابتدائی مادہ ہے جس سے دیوتا پیدا ہوتے ہیں۔ صرف اتنا ذکر ہے "ابتدا میں خدا نے"۔ یہاں اجرام فلکی دیوتا نہیں کہ جن کی پرستش کرنی چاہیے لیکن وہ خدا کی صنعت ہیں۔ یہاں انسان خلقت کا سر ہے۔ کیونکہ اس میں خدا کی صورت ہے۔

۲۔ **طوفان کا بابلی قصہ**۔ یہ قصہ پیدائش کی کتاب کے قصہ سے بہت مشابہ ہے۔ اس کا ایک ترجمہ بیروسس (Berossus) کی تصنیف میں محفوظ ہے۔ لیکن اب یہ اس سے زیادہ مکمل اور مستند صورت میں مل گیا ہے۔ اسور بنی پال کی لائبریری میں کئی تختیاں (Cuneiform Tablets) ملی ہیں جو میخ کی صورت کے حروف میں لکھی ہیں۔ اُن میں یہ قصہ ملتا ہے۔ ان تختیوں میں ایک قدیم بابلی شاہ کا جنگ نامہ مندرج ہے۔ اور اس میں مشہور بہادر گلگمیش ہے جس کی مہموں کا ذکر بارہ جلدوں میں بیان ہوا ہے۔ گیارھویں کتاب میں بیان ہے کہ کیسے گلگمیش نے اُت نپشتم (Ut-Napishtim) دیوتا سے ملاقات کی اور اس سے طوفان اور اس سے رہائی پانے کا قصہ سُنا۔ جب دیوتاؤں انو (آسمانی سمندر کا خداوند)۔ بیل (ہوا کا خداوند)۔ ننیب (انسان کا دیوتا) اور انوگی نے ارادہ کیا کہ نوع انسان کو طوفان کے ذریعہ فنا کریں۔ آئی (Ea) دیوتا نے (زمین کا دیوتا) اُت نپشتم اپنے پرستار کو آگاہ کیا کہ ایک جہاز بنا کر اس سے مخلصی حاصل کرے اور اُسے بتایا کہ جب لوگ تم سے پوچھیں کہ تم یہ کیا کر رہے ہو تو کیا جواب دینا۔ اُت نپشتم نے جہاز بنایا اور رال کے ذریعہ کچ کیا تاکہ اس کے اندر پانی نہ جاسکے۔ اس میں خورش و نوش کا سامان جمع کیا اور سب قسم کے زندہ

مخلوق معہ اپنے خاندان کے اور کاریگروں اور ملاحوں کے اس کے اندر گیا۔ سورج دیوتا شمس نے طوفان کا وقت مقرر کیا۔ ہوا اور مینہ کا سخت طوفان سات دن تک برپا رہا جس کی وجہ سے دیوتا آسمان کو بھاگ گئے اور ڈر کر چلّانے لگے۔ اشتر (عشتارات۔ زہرہ) نے آدمیوں کے لئے سفارش کی اور مینہ موقوف ہوا۔ اُت نپشتم نے اپنے جہاز سے باہر نظر کی اور دور سے خشکی کو دیکھا۔ اور نذیر کی سرزمین میں دریائے دجلہ کے مشرق کی طرف جہاز پہاڑ پر ٹک گیا۔ اور سات دنوں کے بعد اُت نپشتم نے یکے بعد دیگرے کبوتر۔ ابابیل۔ اور کوّے کو باہر چھوڑ دیا۔ پہلے دو جانور تو واپس آگئے۔ لیکن آخری جانور واپس نہ آیا۔ اس کے بعد اُت نپشتم نے سارے جانوروں کو باہر نکال دیا اور پہاڑ کی چوٹی پر قربانی چڑھائی۔ دیوتا اس کے گرد مکھیوں کی طرح جمع ہو گئے۔ اشتر نے آن کر اُن قہروں کو پکڑ رکھا جو انو نے بنائی تھیں۔ اُس نے اپنے گلے کے ہار کی قسم کھائی کہ وہ اس وقت کو ہمیشہ یاد رکھیگی۔ اور اُس نے کہا کہ بیل کو قربانی پر آنے کی اجازت نہ ملے۔ مگر بیل آگیا۔ اور اُت نپشتم کی مخلصی کی وجہ سے اُس پر ناراض ہوا۔ لیکن آئی (Ea) نے بیل کو طوفان بھیجنے کی وجہ سے ملامت کی اور اُسے نصیحت کی کہ کسی اور طریقہ سے (شیروں، چیتوں، کال اور مری) آیندہ کو انسانی آبادی کو روکے اس پر بیل راضی ہو گیا اور اُت نپشتم کو بقا کا انعام عطا کیا اور اُسے بیوی بھی عطا کی اور دریاؤں کے دہانوں سے پرے مسکن عنایت کیا۔"

مفصلہ ذیل اقتباسات سے بابلی بیان اور پیدائش کی کتاب کے بیان میں مقابلہ ہو سکیگا۔

شورپک جس شہر کو تو جانتا ہے۔

دریائے فرات کے کنارے پر واقع ہے۔

وہ شہر قدیم تھا اور دیوتا اس کے اندر رہتے تھے۔
بڑے دیوتاؤں نے اپنے دلوں میں فیصلہ کیا کہ زمین پر طوفان بھیجیں۔
وہاں ان کا باپ انو تھا۔
ان کا مشیر اور جنگی مرد بیل؛
دیوتا آی (دہ یا) نے اُت نپشتم کو آگاہی دی کہ اپنے تئیں بچائے۔
سورِ پکائشت۔ اُمبر توتو کا بیٹا۔
اپنا گھر ترک کر اور ایک جہاز بنا
جو کچھ تیرے پاس ہے اُسے چھوڑ اور اپنی جان کی فکر کر
اور جہاز میں زندگی کا بیج لیجا،
پھر اس طوفان کا ایک صاف بیان آیا ہے۔
"د ترہ کا ہوتے ہی علی الصباح
آسمان کے کناروں سے ایک تاریک بادل اُٹھا
اس کے بیچ رمان گرجا۔
تب ننپ نے بربادی نازل کی
انگی (زمین کی ارواح) نے اپنی مشعلیں اونچی کیں۔
ان کے نور سے اُنہوں نے زمین کو روشن کر دیا۔
ہر درخشاں شے تاریکی سے مبدل ہوگئی؛
آسمان میں دیوتا طوفان سے ترساں تھے۔
وہ بھاگ گئے اور انو کے آسمانوں پر چڑھ گئے
دیوتا کتوں کی طرح اُن احاطوں میں دبکے پڑے تھے۔
. . . .

چھ دن اور چھ راتیں ہوا چلتی رہی۔
پرلو اور طوفان نے زمین کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔
جب ساتواں دن آیا تو طوفان موقوف ہوا۔
سمندر سکڑ گیا اور آندھی بند ہوگئی۔
دلدل کے سرکنڈے میخوں کی طرح دکھائی دیئے۔
میں نے دریچہ کو کھولا اور روشنی میرے مُنہ پر پڑی
میں چکا چوندی کھا کر پیچھے گر پڑا۔ میں بیٹھ گیا اور میں رویا۔
میں نے اس طبقہ کو دیکھا۔ سمندر کے ساحل کو۔
جہاز نذیر کی سرزمین میں ٹھہر گیا۔
میں نے ایک کبوتر کو باہر نکالا اور وہ چلا گیا۔
لیکن کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہ تھی اس لئے وہ لوٹ آیا۔
میں نے ایک ابابیل کو بھی باہر نکالا۔ وغیرہ
میں نے ایک کوے کو باہر نکالا اور وہ چلا گیا؛
اس نے کھایا۔ یہ پانی میں سے گزرا اس نے غائیں غائیں کی۔ یہ واپس نہ آیا۔
میں نے (حیوانوں کو) چاروں سمت روانہ کیا۔
میں نے پہاڑ کی چوٹی پہ نذر گزرانی۔
سات اور سات عود سوز میں نے وہاں دھرے۔
دیوتاؤں نے خوشبو سونگھی۔
وہ مکھیوں کی طرح قربانی پہ جمع ہوگئے۔

جیسے خلقت کی پیدائش کے بیان میں ویسے یہاں بابل کے بیان کی نہایت دینی اور اخلاقی عظمت سارے پڑھنے والوں پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہاں نہ دیوتاؤں

کی کثرت ہے جن کی صلاح و مشورت میں اختلاف ہو۔ جو خوف زدہ ہو کر چلاتے ہوں اور بچوں کی طرح جھگڑتے ہوں۔ اور پل بھر میں مہربان ہو جاتے ہوں اور پل بھر میں قہر دان ہو جاتے ہوں۔ خدا کی وحدت۔ اُس کا بدی سے عداوت رکھنا اس کا راستبازی سے الفت رکھنا۔ اس کی رحمت اور وفاداری بمقابلہ بت پرستوں کے بیہودہ خیالات کے ظاہر ہوتی ہیں +

اب ایک یا دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ خلقت کی پیدائش اور طوفان کا جو بیان پیدائش کی کتاب میں مذکور ہے اور ان کے جو بیان بابل کی روایات میں پائے جاتے ہیں اُن میں عام رشتہ کیا ہے۔ کیا ایک قسم کی روایات براہ راست دوسری قسم کی روایات سے لی گئیں؟ اور اگر ایسا ہوا تو اُن میں سے اصلی کونسی روایات ہونگی اور کونسی روایات عاریت سمجھی جائیں؟ یا ان دونو قسم کی روایات کا چشمہ کچھ اور ہوگا جو ان دونو قسم کی روایات سے پیشتر ہوگا؟ یہ تو گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اہل بابل نے یہ روایات عبرانیوں سے نقل کیں۔ جن تختیوں پر خلقت کی پیدائش اور طوفان کا بیان لکھا ہوا ہے وہ آسوری بادشاہ آسر بنی پال کے کتب خانہ سے ۱۸۷۲ء میں ملیں۔ یہ بادشاہ ۶۶۸ ق م سے ۶۲۶ ق م تک زندہ تھا۔ اس تاریخ سے ظاہر ہے کہ جو روایات ان تختیوں پہ لکھی گئیں وہ بابل میں کم از کم ایک سو برس جلا وطنی سے پیشتر مروج تھیں۔ علاوہ ازیں جو علم ادب آسر بنی پال کی لائبریری میں محفوظ رہا وہ تقریباً سب کا سب بابل کی تصنیفات کی نقلیں ہیں جن کا تعلق غالباً اس زمانہ سے ہوگا جو عبرانی قوم کے آغاز سے پیشتر تھا اور جو مقامی اشارے ان میں پائے جاتے ہیں۔ اُن سے بھی یہ پتہ لگتا ہے کہ ان روایات کا اصل وطن بابل ہی تھا۔ اگر برعکس اس کے عبرانیوں نے یہ روایات اہل بابل سے لیں تو یہ جلا وطنی کے زمانہ میں نہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ ابتدائی تحریر جس میں طوفان

کا بیان ہے وہ اس وقت سے پیشتر احاطہ تحریر میں آئی۔ جیسا کہ تل العمرنا تختیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلسطین دو ہزار برس قبل از مسیح اہل بابل کی زیر تاثیر تھا۔ تو یہ ممکن ہے کہ یہ زیر بحث روایات اہل بابل سے اہل کنعان کو حاصل ہوئیں۔ اور اُن سے کنعان کی فتح کے بعد عبرانیوں کو ملیں۔ لیکن چونکہ ابراہیم جو عبرانیوں کا جد امجد تھا بابل ہی سے آیا تھا تو یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے یہ بیانات ایسے شخصوں کے ذریعے براہ راست اس قوم کو حاصل ہوئے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ موجودہ صورت میں جو فرق ان دو قسم کے بیانوں میں پائے جاتے ہیں ان کی کیا وجہ ہوگی؟ کیا یہ بابلی وسواس اور کثرت الالہ کے خیالات شروع سے اُن میں پائے جاتے تھے؟ اور عبرانیوں نے ایسے خیالات چھانٹ کر نکال دئے؟ پیشتر اس سے کہ وہ بائبل میں قلمبند ہوئے۔ یا بابلی قصوں کی موجودہ صورت اصلی خالص بیان کی بگڑی صورت ہے جو بائبل میں زیادہ صحت اور دینی پیرایہ میں محفوظ رہی؟ غالباً اصل حقیقت ان دونو رایوں کے بین بین ہوگی ایک طرف تو بابلی تحریروں کی شہادت اور دوسرے دینوں کی تشبیہ سے یہ خیال گزرتا ہے کہ کثرت الالہ کے جو بیہودہ خیالات بابلی روایات میں پائے جاتے ہیں شروع میں وہ بہت سادہ تھیں اور کچھ کچھ توحید کا عقیدہ ان میں پایا جاتا ہوگا اور دوسری طرف ہم یہ مان نہیں سکتے کہ شروع ہی میں کوئی ایسا لاعلے دین ہوگا جو اُس مکاشفہ کی حقیقت کو رد کر دے جو اسرائیل کی مابعد تاریخ میں پایا جاتا ہے اور جو عہد عتیق میں قلمبند ہوا۔ عبرانی قوم کو خدا نے محض اس لئے علیحدہ نہ کیا تھا کہ قدیم صداقت کو محفوظ رکھے یا اس کو تر و تازہ کرے بلکہ اس لئے کہ خدا کی سیرت اور مرضی کا مکاشفہ بتدریج حاصل کرے۔ قدیم زمانوں کے بارہ میں جو بابلی اور بائبلی بیانات ہیں وہ روایات کے دو سلسلے یا ندیاں ہیں جو ایک ہی

چشمے (بابلی چشمہ) سے نکلیں اور اپنے اپنے رُخ پر بہنے لگیں۔ اول الذکر میں جو دینی قدر و قیمت تھی وہ تو جاتی رہی اور موخر الذکر نے جو کچھ صداقت اُن میں تھی اُسے محفوظ رکھا اور خدا کی رُوح کی زیر ہدایت اُس میں ترقی ہوئی حتیٰ کہ یسوع مسیح میں وہ مکاشفہ کمال تک پہنچ گیا ✦

حمورابیؔ کی شریعت

پیدایش کی کتاب کے چودھویں باب میں ایک شخص امرافل نامی کا ذکر ہے جو شنعار کا بادشاہ تھا۔ یہ ابراہیم کا ہم عصر تھا۔ عموماً یہ متفق علیہ امر ہے کہ یہ امرافل ہی حموربی تھا جو بابل کے پہلے خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا۔ اس کے عہدِ سلطنت میں پہلی دفعہ سلطنت متحد ہو گئی اور بابل اس کا دار الخلافہ تھا۔ مدت سے یہ معلوم ہے کہ ایک قدیم شریعت موجود تھی جس کا نام یہ تھا "حموربی کے فیصلے"۔ اس شریعت کے بعض حصے اُن تختیوں پر ملے جو آسر بنی پال کے زمانہ میں لکھی گئیں (شاید سرڈناپولس یا آسناپور عزرا ۴-۱۰)۔ یہ آسر بنی پال آسور کا بادشاہ تھا جو ۶۶۸ سے ۶۲۵ ق م تک سلطنت کرتا رہا۔ اب یہ تختیاں لندن کے عجائب گھر اور برلن کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔ لیکن اس قدیم شریعت کے بارہ میں جو ہمیں علم حاصل تھا اُس میں بہت ترقی ہوئی۔ جب فرنچ اکسپلوریشن سوسائٹی (Exploration Society) کو دسمبر ۱۹۰۱ء سے جنوری ۱۹۰۲ء کے عرصہ میں ایک سیاہ پتھر کا ستون ملا جو آٹھ فٹ بلند تھا۔ اُس کی ایک طرف سولہ اور دوسری طرف ۲۸ کالم کی تحریر تھی اور اس میں کل ۳۶۵۴ سطریں تھیں۔ یہ ستون بمقام سوسہ دریافت ہوا۔ آستر کی کتاب کے ۱-۲ میں اس شہر کا نام سوسن آیا ہے اور یونانی میں اسے پرسی پولس (Persepolis) کہتے ہیں۔ یہ شہر قدیم ایلامی سلطنت کا دار الخلافہ تھا۔ اور بابل کی سلطنت کا حریف تھا۔ اس تحریر کو جب علماء نے پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ حموربی کی شریعت تھی جو مدت سے گم ہو گئی تھی۔ شروع میں سرورق پر شاہ حمورابی کی تصویر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ وہ شریعت سورج دیوتا شمس سے حاصل کر رہا ہے ✦

یہ شریعت اپنی قدامت کے باعث بہت قدر و منزلت کے لایق ہے۔ دُنیا میں جو شریعتیں ہمیں معلوم ہوئی ہیں اُن میں سے یہ سب سے زیادہ قدیم ہے۔ غالباً یہ موسیٰ کے زمانہ سے ہزار برس پہلے کی ہے۔ اور اس شریعت کے یہ قوانین ایک جلد میں مجلد ہوئے۔ اور حمورابی کے ذریعہ اشاعت پانے سے بہت مدت پہلے سے مروّج ہو گئے۔ گو یہ شریعت بہت قدیم ہے تو بھی ایک اعلےٰ درجہ کی تہذیب اور شایستگی کی موجودگی پر شاہد ہے۔ ایک صدر حکومت تھی اور اس کی انتظامی باقاعدہ شاخیں جا بجا قایم تھیں۔ اہل علم و کسب و حرفت اشخاص کا بھی ذکر ہے بمثلاً کاہن۔ عالم شرع۔ طبیب۔ کاروباری۔ تاجر۔ کسان۔ اینٹ بنانے والے معمار نجار۔ درزی۔ سوداگر۔ ملاح اور غلاموں کا ذکر ہے۔ ہر جماعت کے لوگوں کے فرایض مقرر ہیں۔ ان کی فیس۔ مزدوری۔ کرایہ اور قیمت کی شرح سرکار کے ذریعہ مقرر ہے۔ بار بار ایسے قدیم قوانین کا ذکر ہے جن میں زمانہ حال کی رُوح موجزن معلوم ہوتی ہے۔ بائبل کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ شریعت خاص دلچسپی رکھتی ہے ابراہیم کسدیوں کے اُور سے آیا تھا۔ اور اگر یہ درست ہو کہ امرافل اور حمورابی سے ایک ہی شخص مراد ہے تو یہ قرین قیاس ہے کہ عبرانی قوم کا جد امجد نہ صرف اس شریعت سے واقف ہوگا۔ بلکہ ایک حد تک یہ قوانین کنعان میں مروج ہونگے جہاں اہل بابل کی تاثیر بہت غالب تھی۔ اس لئے یہ ظن غالب ہے کہ حمورابی کی شریعت عبرانی قوم کی اصلی روایت کا جز ہوگی۔ اس سوال پر بہت بحث ہو چکی ہے کہ موسیٰ کی شریعت اور اس بڑے مشرقی بادشاہ کی شریعت کے درمیان کیا تعلق تھا اور اس پر بھی کہ شاید موسیٰ کی شریعت بعض باتوں میں حمورابی کی شریعت پر منحصر ہو۔ اور اس مضمون پر بہت کتابیں لکھی جا چکی ہیں +

جو تھوڑا وقت اور جگہ ہمیں ملی ہے اُس میں اس قدیم شریعت کے متعلق صرف

چند دلچسپ باتوں کا ذکر کر سکتے ہیں۔ خاص کر ایسی باتوں کا سراغ موسیٰ کی شریعت میں بھی پایا جاتا ہے +

یہ عجیب بات ہے کہ گو بابل جادوگری اور سحر کا گھر سمجھا جاتا تھا تو بھی اس شریعت کے شروع میں دو فتوے جادوگری کے خلاف ہیں۔ "اگر کوئی انسان ایک سحر کو چُنے اور کسی کی جان کے خلاف حکم لگائے اگر وہ اپنے تئیں صادق نہ ٹھہرائے۔ تو وہ جان سے مارا جائے"۔ اس کے ساتھ ہم خروج ۲۲-۱۸ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دوسری فصل میں پانی کے ذریعہ امتحان کرنے کا ذکر ہے۔ "اگر کسی شخص نے کسی پر جادو کیا ہو اور اُس نے اپنے تئیں صادق نہیں ٹھہرایا تو جس شخص پر جادو کیا گیا ہو۔ وہ پوتر دریا میں غوطہ مارے۔ اور اگر وہ دریا میں ڈوب جائے تو جس نے وہ جادو کیا تھا اس کے گھر پر قبضہ کرے۔ لیکن اگر پوتر دریا اُس آدمی کو معصوم ٹھہرائے اور اُس کی جان بچائے تو جس نے جادو کیا ہو وہ مارا جائے"۔ فصل ۱۳۲ میں بھی یہی امتحان مقرر ہے ایسی عورت کے متعلق جس پر بے وفائی کا شک ہو۔ اُس کے ساتھ مقابلہ کرو گنتی ۵-۱۲ + پھر کئی دوسرے قصوروں کا ذکر ہے جن کی سزا موت ہے۔ ان میں یہ باتیں بھی داخل ہیں مثلاً کسی کو ڈرانا۔ یا گواہوں کو رشوت دینا۔ نقب لگانا چوری یا دزدی کے مال کا بحال کرنا۔ ان میں سے ہم فصل ۲۱ کا ذکر کر سکتے ہیں "اگر کسی نے کسی کے گھر میں نقب لگائی ہو تو گھر توڑنے سے پیشتر کوئی اُس کو مار دے اور اس میں دفن کر دے (۹)"۔ مقابلہ کرو خروج ۲۲: ۱ سے ۴ + فصل ۱۴ "اگر کسی شخص نے کسی آزاد آدمی کا بیٹا چرایا ہو تو وہ جان سے مارا جائے"۔ خروج ۲۱: ۱۶ سے مقابلہ کرو۔ اگر کسی مفرور غلام کو کوئی چھپا رکھے تو اس کی بھی یہی سزا ہے"۔ مابعد دلچسپ فصلوں میں ان افسروں یا کنسٹبلوں کے ان فرائض اور حقوق کا ذکر ہے جو بادشاہ یا پبلک کی طرف سے کسی خاص کام کے لئے بھیجے گئے ہوں +

یہ ایک قسم کے ڈاک خانے کا انتظام تھا۔ زراعت کے متعلق قوانین بہت مشرح ہیں۔ کسی باغ کا کرایہ اُس کی پیداوار کا دسواں حصہ ہے۔ پانچویں سال کی فصل مالک اور کرایہ دار میں نصفا نصف تقسیم کی جائے۔ فصل ۵۳ میں یہ ذکر ہے "اگر کسی شخص نے اپنی نہر کے کناروں کو پختہ بنانے میں غفلت کی ہو ... اور پانی کھیت کو بہا لیجائے جس آدمی کے کنارہ میں وہ دراڑ کھل گئی ہو وہ شخص اس تلف شدہ غلہ کی تلافی کرے" فصل ۵۷ میں اسی قسم کا قانون ہے جو خروج ۲۲: ۵ میں پایا جاتا ہے "اگر کوئی اپنی بھیڑوں کو چھوڑ دے کہ وہ سبز غلہ کھا جائے ..... کھیت کے مالک کی بے رضامندی کھا جائیں تو وہ کھیت کے مالک کو فی گر غلہ کے ۲۰ گر ادا کرے" فصل ۱۲۰ میں امانت کے متعلق اسی قسم کا قانون ہے جو خروج ۲۲: ۷ میں پایا جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو یہ سزا پانچ گنا ہے اور بعض میں تین گنا۔ فصل ۱۲۵ میں ذکر ہے "اگر کسی شخص نے اپنے مال و متاع میں سے کسی کے پاس کچھ امانت رکھا ہو۔ اور جہاں اُس نے یہ شے رکھی تھی۔ اس میں سے کچھ بذریعہ نقب زنی یا بغاوت کے معہ مالک مکان کی اشیاء کے کھو گئی ہو تو مالک مکان اُس کی تلافی کرے اور مالک شے کو وہ شے ادا کرے۔ اور مالک مکان کا جو کچھ کھو گیا ہو اُس کی تلاش کرے۔ اور چور سے حاصل کرے" فصل ۱۲۸ میں بیاہ طلاق اور زنا وغیرہ کے متعلق قوانین ہیں۔ فصل ۱۲۸ "اگر کسی مرد نے کسی عورت سے شادی کی۔ اور اس کا مہر مقرر نہ کیا تو وہ عورت اس کی بیوی نہیں" "اگر وہ عورت زنا کرتی پکڑی جائے تو وہ معہ اُس مرد کے غرق کر دی جائے" مقابلہ کرو ۲۰: ۱۰ + استثنا ۲۲: ۲۲ + حرامکاری کی سزا عموماً موت ہے +

انتقام اور تلافی کی شریعت خروج کی کتاب کی شریعت سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ مثلاً "اگر کسی شخص نے کسی شریف آدمی کی آنکھ کا نقصان کیا ہو تو اس کی ایک آنکھ نکالی جائے" "اگر کسی نے کسی اپنے ساوی شخص کے دانت کا نقصان کیا ہو تو اس شخص

کا وہی دانت نکالا جائے" مقابلہ کرو خروج ۲۱: ۲۴ سے ۲۷۔ اگر کسی غریب شخص کی آنکھ دانت وغیرہ کو نقصان پہنچایا ہو تو نقد روپیہ کے ذریعہ اُس کی تلافی کی جائے پھر اگر کسی شخص نے جھگڑے میں کسی شخص کو مارا ہو جس سے اُس کو زخم آ گیا ہو تو وہ آدمی قسم کھا کر کہے کہ "میں نے اُس کو دانستہ نہیں مارا تھا" اور طبیب کے لئے جواب دے" مقابلہ کرو خروج ۲۱: ۱۸ و ۱۹ "اگر کوئی شخص کسی شریف آدمی کی بیٹی کو مارے جس سے اُس کا اسقاط ہو جائے تو وہ دس مثقال چاندی کے ادا کرے۔ اگر وہ عورت مر جائے تو اُس شخص کی بیٹی جان سے ماری جائے" مقابلہ کرو خروج ۲۱: ۲۲ و ۲۳۔ فصل ۲۱۵ سے ۲۲۳ تک میں اُن فیسوں کا ذکر ہے جس کا ایک جراح عمل جراحی کے لئے حقدار ہے۔ اور سزا کی انتہا یہ ہے کہ اگر عمل جراحی میں انسان مر جائے تو اس جراح کے دونو ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ مفصلہ ذیل قوانین موسوی قوانین سے بہت مشابہ ہیں "اگر کسی معمار نے کوئی گھر تعمیر کیا ہو لیکن اُس کا کام پختہ نہ ہو اور جو گھر اُس نے بنایا تھا وہ گر جائے۔ اور اس کے باعث مالک مکان کی جان جاتی رہے تو وہ معمار جان سے مار دیا جائے" استثنا ۲۲: ۸ "اگر بیٹا یا غلام اسی طرح سے مر جائے تو معمار کا بیٹا یا غلام جان سے مارا جائے" "اگر کسی آوارہ سانڈ نے کسی آدمی کو سینگ مارا اور وہ آدمی جان سے مر گیا تو ایسی صورت میں کوئی علاج نہ تھا۔ اگر بیل نے کسی آدمی کو دھکیلا ہو اور اس دھکیلنے کے ذریعہ اس کی بدی ظاہر ہوئی ہو اور اس نے اُس کے سینگوں کو کند نہ کیا ہو اور اپنے بیل کو اُس نے نہ باندھا ہو اور اس بیل نے کسی شریف النسل انسان کو سینگ سے مارا ہو جس سے کہ وہ آدمی مر جائے تو وہ نصف منا چاندی کا ادا کرے۔ اگر وہ شریف آدمی کا خادم ہو تو وہ منا کا تیسرا حصہ چاندی ادا کرے" مقابلہ کرو خروج ۲۱: ۲۸ سے ۳۲ تک "اگر کسی سے بیل یا بھیڑ کھو جائے

جو اس کے پاس امانتاً رکھے گئے تھے تو وہ بیل کے عوض بیل اور بھیڑ کے عوض بھیڑ مالک کو دے ؛" اگر بھیڑ سالہ میں خدا کی طرف سے مری یا دبا آئی ہو یا شیر ببر نے ان کو مارا ہو تو گڈریا اپنے تئیں خدا کے سامنے پاک کرے اور مالک مویشی اس نقصان کو اٹھائے (خروج ۲۲: ۹ سے ۱۳) اگر کوئی شخص اپنے باپ کو مارے تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں (مقابلہ کرو خروج ۲۱: ۱۵) آخرکار ان قدیم قدیم ایام میں پولیس کا جو انتظام تھا اس کے متعلق کچھ ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ فصل ۹۔۱۰۹ اگر شراب کے سوداگر نے اپنے گھر میں شرابیوں کا مجمع جمع کیا ہو اور اُس نے اُن شرابیوں کو پکڑ کے محل کی طرف نہ نکال دیا ہو تو وہ سوداگر جان سے مارا جائے ؛"

اس دلچسپ اور عجیب ضابطۂ قوانین سے یہ چند مثالیں اقتباس کی گئیں جو چار ہزار برس پہلے مروج تھا اور جس میں زمانہ حال کی روح موجزن تھی۔ اس کے پڑھنے سے اس قدیم بزرگ حاکم کی تعظیم کا نقش دل پر ہو جاتا ہے جس نے راست فخر کے ساتھ اس ضابطہ کے دیباچہ میں یہ کہا کہ "اُس نے سرزمین میں شریعت اور انصاف کو قایم کیا اور ان ایام میں نوع انسان کو خوشحال کیا؛" "اُس روز مجھ حموربی عالیشان بادشاہ اپنے خدا کے پرستار نے سرزمین کے لئے۔ گواہوں کے لئے۔ مدعی اور مدعا علیہ کے لئے عدل و انصاف کا حکم جاری کیا۔ تاکہ شریر ظالموں کو نیست کرے تاکہ وہ کمزوروں پر ظلم نہ کریں۔ سورج دیوتا کی طرح میں نے ان کی اشاعت کی ؛"

اب رہا اس رشتہ کا ذکر جو اس قدیم شریعت اور موسوی شریعت کے درمیان ہے جو کوہ سینا پر دی گئی تھی اسکے لئے دیکھو خروج کی کتاب کا دیباچہ فصل ۴ جو علم ہم کو اس وقت حاصل ہے اس کے رو سے کوئی خاص حکم لگانا خالی از نقصان نہ ہوگا ان دونوں شریعتوں میں مشابہتیں بھی ہیں اور فرق بھی ہیں مشابہتیں اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ موسوی شریعت کی یہ باتیں بالضرور حمورابی کی شریعت سے اخذ کی گئی ہوں؛

کیونکہ وہ اکثر قوانین جن میں ایسی مشابہت پائی جاتی ہے ایسے ہیں جنہیں کوئی شارع جو عدل و انسانیت کا تصور اعلےٰ درجہ تک رکھتا ہو شائع کر سکتا ہے۔ برعکس اس کے اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ موسوی شریعت نے اس قدیم شریعت سے اخذ کیا۔ فرق بھی اس قدر اور اس کثرت سے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ موسوی شریعت کا حصر اس پر نہیں تھا بلکہ وہ بذات خود آزادانہ طور پر تیار ہوئی بحیثیت مجموعی موسوی شریعت میں حموربی کی شریعت کی نسبت رحم زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس میں اس قسم کے تمدنی فرق بہت کم ہیں۔ مثلاً "شریف" "غریب" اور "غلام"؛ اس کے سارے تقاضات کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کے ممنون اور اس کے آگے جواب دہ ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ حموربی نے اپنی شریعت سورج دیوتا سے منسوب کی اور جس کی اُس نے نادانستہ اس نشان کے ذریعہ پرستش کی وہ فی الحقیقت حقیقی نور ہو جو دنیا میں آتے ہوئے ہر ایک آدمی کو منور کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ شریعت اس صداقت کی ایک اور بڑی مثال ہے کہ خدا نے "اگلے زمانے میں سب قوموں کو اپنی اپنی راہ پر چلنے دیا۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو بے گواہ نہ چھوڑا؛" +

غیر اقوام کے جن مذاہب کا بائیبل میں ذکر آیا ہے

جو شخص بائیبل کا غور سے مطالعہ کرتا ہے وہ یہ معلوم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کتنی اور کس قسم کی بت پرستی سے اہل اسرائیل کو واسطہ پڑا۔ یہ محض بیرونی تعلق نہ تھا۔ اس امت کی اپنی سیرت میں کچھ ایسی شے تھی جس کی وجہ سے بت پرستی اور اس کی لازمی خرابیاں ان کے دل پر حد سے زیادہ اثر کرتی رہیں۔ اس داغ سے رہائی پانے کے لئے اس حادثہ عظیم کی ضرورت پڑی جس نے ۵۸۶ ق م میں ان کی قومی زندگی کو بھی برباد کر دیا۔

اس کے بارہ میں بہت اختلاف رائے ہے کہ غیر اقوام کے ان مذاہب کا آغاز کس طرح سے ہوا جو اُن اقوام میں مروج تھے جن سے عبرانیوں کو واسطہ پڑا۔ بعضوں نے یہ سمجھا کہ ان کا چشمہ مردہ آباؤ اجداد کی پرستش تھا۔ بعضوں نے خیال کیا کہ ان میں ایسے حیوانات کی تعظیم کے بہت آثار ملتے ہیں جن کی نسبت خیال ہے کہ وہ ان قوموں سے رشتہ رکھتے تھے جو ان کی پرستش کرتی تھیں۔ بعضوں کا گمان ہے کہ سب سے زیادہ ان کی تہ میں عالم ارواح کا عقیدہ تھا۔ خوابوں اور نادانی کے تجربوں سے یہ خیال پیدا ہوا۔ ارواح اپنی طاقت فطرت میں ظاہر کرتی ہیں۔ وہ درختوں یا حیوانوں میں اپنا مسکن رکھتی ہیں۔ چشموں اور دریاؤں میں تاثیر کرتی ہیں ہوا اور طوفان میں سیر کرتی ہیں۔ لیکن ہر قوم کے عقیدوں کا مطالعہ الگ الگ کرنا چاہئے اور جب ایسا کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ شاید ایک سے زیادہ اسباب کا یہ نتیجہ ہیں۔

یشوع کی نسبت (۲۴: ۲-۳) لکھا ہے کہ وہ اسرائیلیوں کو یاد دلاتا تھا کہ

"تمہارے باپ دادا تارح ابرہام کا باپ اور نحور کا باپ قدیم زمانے میں نہر کے پار رہتے تھے اور وہ غیر معبودوں کی بندگی کرتے تھے"۔ اس سے ہماری توجہ اس سرزمین کے مذہب کی طرف منعطف ہوتی ہے جہاں سے غالباً ابراہیم نکل کر گیا اور وہاں (یعنی بابل میں) دو طرح کا عقیدہ اور دستور پایا جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ لوگ بے شمار دیوی دیوتاؤں کو مانتے تھے اور ان کے الگ الگ نام تھے اور وہ فرداً فرداً علیحدہ مانے جاتے تھے۔ مٹی کی ایک تختی اب تک موجود ہے جس کی ہر ایک طرف چھ چھ کالم ہیں اور ہر ایک کالم میں کم از کم ۵۰ سطریں ہیں اور تقریباً ہر سطر پر کسی نہ کسی دیوتا کا نام کندہ ہے۔ ان دیوی دیوتاؤں کی نسبت یہ خیال تھا کہ ان کی صورت و صفات انسانی تھیں۔ ان میں سے اکثر بہت ہی طاقتور تھے اور ان میں جذبات بھی انسانوں کی طرح جوش مارتے تھے اور اکثر ایسے کام بھی کرتے جن کو رشک صرف اہل بابل ہی کر سکتے تھے۔ وہ گویا بڑے پیمانہ کے انسان تھے۔ برعکس اس کے وہ قوائے فطرت کا تشخص تھے۔ ان میں سے ایک سے سورج کی حرکات منسوب تھیں۔ دوسرے سے چاند کے انقلابات۔ ایک اور سے آندھی طوفان ہر شہر کا ایک ہوکل دیوتا تھا اور جب ایک شہر اپنے حریف شہروں پر غلبہ حاصل کرتا تو ان کے دیوتاؤں کا درجہ بھی اونچے ابھرتا۔ سب سے بڑے دیوتا تین تھے۔ انو۔ آسمان کا دیوتا۔ انلیل (جو پیچھے بیل کہلایا) زمین کا اور نوع انسان کا دیوتا تھا۔ آئی (یہ عے) جو پانیوں کے گہراؤ پر حکمران تھا۔ ان کے بعد سن چاند دیوتا تھا۔ شمس سورج دیوتا۔ رمان کرہ ارض کا دیوتا۔ جب بابل کو اعلےٰ عروج حاصل ہوا تو اس کا دیوتا مردوک دیوتاؤں کا سردار بن گیا۔ اور پیچھے یہی دیوتا بیل سمجھا گیا۔ اور نبو بورسپا کا دیوتا تو اس کا وزیر ٹھیرا۔ کیونکہ بورسپا دارالخلافہ کی گویا نواح بن گیا۔ (یسعیاہ ۴۶: ۱) اشتر کے سوا بابل کی باقی سب دیویاں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ وہ محبت۔ جادو اور جنگ پر حکمران تھی۔ بمقام ایرک

([illegible]) جہاں اس دیوی کا خاص مندر تھا۔ اس کی خادمہ بہت کنواری کاہنہ تھیں۔ جنہوں نے اپنی عفت و پاکدامنی کو اس کے جلال کی خاطر قربان کر رکھا تھا۔ شروع میں اشتر صبح اور شام کے ستارہ کی دیوی تھی۔ اس قرینہ میں ہم اُس عبادت کا خیال کر سکتے ہیں جو اجرام فلکی کی کی جاتی تھی۔ یہ عبادت بابل سے مغرب کی طرف رواج پکڑ گئی۔ ۲۔سلاطین ۲۳: ۱۱ میں جو سورج کی رتھوں کا ذکر ہے اُس سے سورج کی گاڑی یاد آتی ہے جس کے آگے بمقام سپرا واقعہ بابل میں قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں (نیز دیکھو ۲سلاطین ۲۳: ۵+حزقیل ۸: ۱۶)+

بابل کے مذہب کا دوسرا تاریک پہلو غالباً وہاں کے قدیم اصلی باشندوں سے آیا۔ اس کی تہ میں یہ عقیدہ تھا کہ روحوں کا ایک وسیع جہان ہے جن کا نام نہیں دیا گیا اور نہ ان کی شخصیت کا ذکر ہے۔ ان میں سے اکثر انسان کی مخالف تھیں اور نادانستہ قصوروں کے ذریعہ وہ چڑ جاتی تھیں۔ ان بھوتوں کی صورت شکل بہت گھناؤنی تھی۔ ایک منحوس لفظ ان کا غضب وارد کرنے کے لئے کافی تھا۔ ان کی ناراضگی دور کرنے کے لئے جادو اور منتروں کی ضرورت تھی۔ اس لئے مٹی کی اکثر تختیوں پر جو بابل کی مدفون لائبریری سے ملی ہیں جہاں تک کہ ان کو پڑھ سکے ہیں یہ منتر جنتر کندہ ہیں۔ اُن کے مذہب کے اس تاریک پہلو کا اثر عوام الناس پر بہت تھا اور اس لئے وہ لوگ بہت اداس اور تنگ حال ہو گئے۔ اور عبرانیوں کے مذہب کی تاریخ میں بہت باتیں ایسی ہیں جو ان وسواس کی یاد دلاتی ہیں۔ ترافیم متوفی اجداد کی مورتیں تھیں جن سے مشورت لی جاتی تھی (پیدائش ۳۱-۱۹ و ۳۴ و ۳۵+ ۱سموئیل ۱۹-۱۳ و ۱۶+ حزقیل ۲۱: ۲۱+ نیا ترجمہ)۔ افود بھی (قضاة ۸: ۲۶) ایک مورت ہی تھا جس سے غیب کی خبر دریافت کی جاتی تھی۔ (۱سموئیل ۱۴-۱۸ ح R.V. ۲۳-۹+ ۳۰-۷)۔ مردوں کے زندہ کرنے کی ناپاک تجارت وہ لوگ جاری رکھتے تھے جن کے یار دیو تھے (استثنا ۱۸: ۱۱+ ۱سموئیل ۲۸: ۷+ یسعیاہ ۸: ۱۹)۔ جادوگرنیوں

اور ڈائنوں نے بھتوں کو اُلو کر رکھا تھا۔ (احبار ۱۹: ۳۱+ ۲۰: ۶+ ۲سلاطین ۲۱: ۶+ ۲۳: ۲۴)+

بحیثیت مجموعی آسور یا کا دین بابل کے دین سے جو اس کا چشمہ تھا بہت مشابہ تھا۔ لیکن اس میں یہ زبردست میلان تھا کہ ایک ہی دیوتا آسور کو مانیں اور اس کی پرستش کریں۔ یہ دیوتا اس ملک یا حکومت کا نمائندہ تھا اور بادشاہوں نے اس کی ایسے الفاظ میں تعریف کی جنہیں عبرانی لوگ صرف **یاہوواہ** ہی کے لئے استعمال کرتے۔ اس کی خاص صفات جنگی تھیں۔ کیونکہ اس کی تعریف ان فتوحات کے باعث کی گئی جو آسور کے بادشاہ اس کے بیٹے اور خادم کو حاصل ہوئی تھیں+

مصری مذہب کا مطالعہ کرنے والا اس میں تین اُلجھے ہوئے دھاگے دریافت کرتا ہے۔ وہ ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ ان کو سلجھانا اور الگ الگ کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ اس مذہب میں جو سب سے اعلےٰ عنصر ہے اس کا تعلق اسائرس ([illegible]) کے نام سے ہے جو شروع میں شاید ایک انسانی بادشاہ تھا۔ یہ دوسرے جہان اور قیامت کا دیوتا تھا۔ اُسی خوشی کے جہان میں داخل ہونے کی ایسی شرائط تھیں جنہیں مسیحی معلم اخلاق قبول کرنے میں کچھ تامل نہ کرے گا لیکن تعویذوں، جادوؤں اور لفظوں کی جو قدر کی گئی اس کے ذریعہ ایسے عقیدہ کے نتیجہ میں بہت فرق آگیا اور فرعون کو دیوتا بنانے کی جو سخت عادت ان لوگوں کو پڑ گئی اس کے ذریعہ پرلے درجہ کی غلامی اور پستی ان کو نصیب ہوئی۔ دو شہروں کے عامل اپنے خطوں میں اُس کو یوں مخاطب کیا کرتے تھے "بنام بادشاہ میرے خداوند میرے خدا۔ میرا آفتاب۔ آفتاب جو آسمانوں سے آتا ہے ۔۔۔ میں اپنے بادشاہ اپنے خداوند کے آگے سربسجود ہوتا ہوں۔ سات دفعہ بلکہ چودہ دفعہ پشت پر اور سینہ پر گر کے"۔ دوم۔ سورج دیوتا را (Re) کی سرکاری طور پر تعظیم و پرستش تھی جس نے باقی سبھوں کو نگل لیا۔ باقی سارے

دیوتا اُسی کا مختلف ظہور اور صورتیں سمجھی گئیں۔ اس کی وجہ سے بعض حال کے علما نے یہ سمجھا کہ مصریوں کا پختہ ایمان ایک واحد قادر مطلق خدا پر تھا۔ لیکن یہ عقیدہ ایک موہوم سا تھا جس کی وجہ سے یہ اُس عقیدہ کی مانند نہ تھا جسے ہم خدا کی وحدت اور بے تبدیلی کا عقیدہ کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس صداقت کو سمجھنا مشکل ہو گیا بحیثیت مجموعی اس سے عموماً قوائے قدرت کی پرستش مراد تھی۔ خدا میں جو کچھ اعلیٰ ہے اُس کی طرف توجہ نہ دلائی گئی بلکہ ادنےٰ کی طرف۔ جو قوت خلقت میں آشکارا ہوئی وہ گو قادر مطلق ہو وہ راستبازی اور محبت کے درجہ تک نہ پہنچی تھی۔ رسوم لا کلام اس کا آغاز ادنےٰ لوگوں سے ہوا۔ لیکن پیچھے کاہنوں نے بھی اسے مان لیا۔ حیوانوں کو بھی خدا بنا لیا۔ مثلاً بلیوں۔ شیروں۔ سانڈوں۔ گبریلوں۔ مگرمچھوں وغیرہ کو۔ تعلیم یافتہ لوگوں نے ان کو دیوتا کے نشان سمجھ لیا ہوگا۔ اور ناتعلیم یافتہ لوگوں نے ان کو فی الواقعہ دیوتا مان لیا۔ یہ خیال غالب ہے کہ ہارون کا سنہری بچھڑا (خروج ۳۲: ۴ سے ۶) اور وہ دو بچھڑے جن کو یربعام نے نصب کیا (۱ سلاطین ۱۲: ۲۸ و ۲۹)۔ ان کا خیال سانڈ ایپس (Apis) بمقام ہیلیوپولس کی پرستش سے نہ آیا ہوگا۔ بہت قدیم لوگوں کی نظر میں سانڈ قوت خالقہ کا نشان تھا۔ ہارون اور یربعام کا یہ منشا ہوگا کہ یاہوہ کی پرستش اس مورت کے وسیلے کی جائے۔ مگر مابعد ایام میں جب عبرانیوں کو یہ فکر تھی کہ اپنے مذہب کے لئے مصالحہ ہر جگہ سے تلاش کریں تو مصریوں نے یہ مصالحہ بہم پہنچایا۔ وہ کیڑے جو رینگتے پھرتے ہیں اور کریہ جانوروں کی سب صورتیں جیسے حزقیل نے ہیکل کی دیواروں پر نقش دیکھا (حزقیل ۸: ۱۰)۔

ہر فینیکے قصبہ کا ایک دیوتا تھا جس کو اکثر بعل کہا کرتے تھے۔ اس لفظ کے معنی خداوند یا مالک کے ہیں۔ اس لئے کتبوں پر یہ نام آتے ہیں صور کا بعل۔ صیدا کا بعل۔ ترسوس کا بعل۔ لبنان کا بعل۔ آسمان کا بعل۔ اس قسم کے نام بھی آتے ہیں۔ آشمون۔ تنیت

(کارتھیج کی دیوی وصور کی مل کرت) سورج۔ بعض چشمے۔ دریا۔ پہاڑ اور درخت مقدس مانے جاتے تھے۔ اونچی جگہوں پر لوگ قربانی چڑھایا کرتے تھے۔ جن کو بائیبل میں "اونچے مکان" کہا ہے۔ کیونکہ ان جگہوں کو آسمان کے زیادہ قریب خیال کرتے تھے۔ دو سخت گھناؤنے کاموں کا بھی ارتکاب ہوتا تھا۔ اول بچوں کی قربانی۔ کارتھیج میں ایل (El) کی مورت (جو فینیکی آبادیوں میں سب سے زیادہ مشہور تھی) وہ دھات کی بنی تھی اور اس کے اندر آگ جلائی جاتی تھی۔ اس کے گود میں بچہ رکھتے اور آگ پر جو نیچے جل رہی تھی پھرائے جاتے تھے۔ تاریکی اور جوش مذہبی کے دنوں میں اسی قسم کی گھناؤنی قربانیاں عبرانی لوگ بھی کرتے رہے (استثنا ۱۲: ۳۱ و ۲ سلاطین ۱۶: ۳ و ۲۳: ۱۰ یرمیاہ ۱۹: ۵ و میکہ ۶: ۷)۔ ان سب سے بڑھکر نفرتی قربانی عزت و ناموس کی تھی۔ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ ایرک (Erech) واقعہ بابل میں کیسی عیاشی عمل میں آتی تھی۔ اُس جگہ کی دیوی اشتر ایل فینیکے عستارات کے نام سے مانی جاتی تھی۔ صیدا کی یہ بڑی دیوی تھی (۱ سلاطین ۱۱: ۵ و ۳۳ و ۲ سلاطین ۲۳: ۱۳) اور یہ زناکاری کی ہولکل دیوی سمجھی جاتی تھی۔ ادونیس (Adonis) کے لئے گریہ زاری جو فینیکی عبادت کی ایک مشہور صفت تھی وہ بھی اسی چشمہ سے نکلی اور اسی کے مشابہ تھی۔ بابل میں تاموز (Tammuz) کے لئے ماتم اشتر کیا کرتی تھی۔ یہ تاموز چشمہ اور سرسبزی کا دیوتا تھا جسے موسم گرما کے تیز سورج نے قتل کر دیا تھا۔ فینیکے میں ادونیس عستارات کا خاوند مانا جاتا تھا جسے ایک جنگلی سور نے اپنی تھوتھنی کے ذریعہ مار ڈالا تھا اس پر سال بسال نوحہ کیا جاتا تھا۔ شہر بیبلس کی ساری عورتیں ایک جوشیلے جلوس میں ہو کر آفکا واقع لبنان کو جاتیں اور وہاں ایسی شرمناک رسوم عمل میں آتیں جنہیں قسطنطین اعظم نے آخر کار زبردستی سے موقوف کرایا۔ اسی قسم کے ناپاک دستور اسرائیل میں بھی جاری ہو گئے تھے۔ عورتیں تاموز کے لئے گریہ وزاری کیا کرتی تھیں (حزقیل

۸:۱۴ + زکریاہ ۱۲:۱۱) نیز دیکھو ۱سلاطین ۱۴:۲۳ + ۱۵:۱۲ + ۲سلاطین ۲۳:۷ + پیدائش ۳۸:۲۱ و ۲۲ R.V. + ہوسیع ۴:۱۴ وغیرہ۔ استثنا ۲۳:۱۷ و ۱۸) اس سے ظاہر ہے کہ زیادہ بہتر ایمان والے لوگ ایسے رسوم سے کیسے سخت ناراض تھے۔

خود کنعان میں حالات بہت کچھ فینیکے کے حالات سے مشابہ تھے۔ مقامی دیوتاؤں کو بعالیم کہا کرتے تھے جو مختلف شہروں اور ضلعوں کے متعلق تھے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علاقہ کی زرخیزی کا ذمہ وار تھا (ہوسیع ۲:۵ سے ۸) عستارات بھی بہت ساری تھیں (۱سلاطین ۷:۴ + قاضی ۲:۱۳ + ۱۰:۶) اونچے مکانوں کی کثرت تھی اور عبرانی جاتری دور دور سے ان کی جادو بھری مہلک کشش کا شکار بن گئے تھے۔ اونچے مکان پر مذبح کے قریب ایک آشیر الصب تھی جس کا ترجمہ پرانے ترجمہ میں غلطی سے باغ کیا گیا۔ ایک مقدس بلّی زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے جو اس درخت کا نشان تھا جس کی نسبت وہ لوگ مانتے تھے کہ قدیم زمانوں میں اس دیوی کی زندگی سرایت کر گئی تھی۔ وہاں ایک مذبح یا ستون بھی ہوا کرتا تھا جس کا ترجمہ غلطی سے مقامات ذیل میں گھنے باغ یا مورت ہوا ہے (استثنا ۱۶:۲۱ + ہوسیع ۳:۴ + ۱۰:۱ و ۲) شروع میں یہ ستون محض ایک پتھر ہوتا ہوگا (پیدائش ۲۸:۱۸ و ۲۲) جس کی نسبت ان کا ایمان تھا کہ وہ دیوتا کا مسکن تھا۔ بعد ازاں اس نے ستون کی صورت اختیار کی۔ بعد ازاں یہ مذبح جس کا آغاز فینیکے سے ہوا اور جس کا تعلق سورج کی پرستش سے تھا سورج کا ستون ہو گیا۔ (یسعیاہ ۱۷:۷ + ۲۷:۹ + ۲تواریخ ۱۴:۳ وغیرہ)۔ ان اونچے مکانوں پر سخت بدکاری عمل میں آتی تھی۔ (ہوسیع ۴:۱۳ + عاموس ۲:۷)۔

سوریا کے مذہب کے بارہ میں بہت کم معلوم ہے۔ ایسا ہی چھوٹی اقوام کے مذاہب کے

بارہ میں جو اسرائیل کے قرب و جوار میں تھیں۔ دمشق کے سوریانی ہدد کو اپنا اعلیٰ دیوتا مانتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے وہ لوگ سورج دیوتا سمجھتے تھے۔ لیکن اکثر ان کا خیال تھا کہ یہ رمّان گرج ہوا کا دیوتا تھا جس کی تعظیم اسوری لوگ بہت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شمس۔ آیل۔ رصف (یعنی آگ کا دیوتا) اور رکب آیل وغیرہ دیوتا بھی تھے۔ موآبیوں کا خاص معبود کموش تھا۔ اور ۲سلاطین ۳:۲۷ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر انسانی قربانیوں کی زیادہ تاثیر ہوا کرتی تھی۔ موآبی پتھر پر جس پر میشع کا ایک کتبہ کندہ ہے (۲سلاطین ۳:۴ و ۵) جو اخیاب کا ہمعصر تھا۔ اِشتر کموش کا بھی ذکر ہے اور کموش کا بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دو نو نام ایک ہی دیوتا کے تھے اگرچہ کموش مذکر دیوتا تھا تو بھی ایک ہی کے یہ دو نام ہونے کے خلاف کچھ نہیں کیونکہ خود بابل میں بعض اوقات اِشتر مذکر اور کبھی مونث بیان ہوتی ہے۔ اور عرب میں یہ مذکر تھی۔ انسانی خیالات کے یہ ڈھکوسلے کیسے بدلتے رہتے ہیں!

اموّنی لوگ ملکم دیوتا کی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ نام لفظ مَلِک (بادشاہ) کی ایک دوسری صورت تھی۔ مولک بھی اس کی ہی ایک صورت تھی جس کا ذکر عہد عتیق میں بار بار ہوا ہے۔ لیکن ہم یہ کہنے کے مجاز نہیں کہ جو بچے ہنوم کی وادی میں جلائے جاتے تھے (۲سلاطین ۲۳:۱۰) وہ اموّنی دیوتا کے آگے ہی قربانی چڑھائے جاتے تھے۔ ۱۳ آیت میں وہ ایک الگ دیوتا ہے۔ آیت ۱۰ میں مولک یا ہوا کا نام تھا۔ تو بھی یہ جملہ "بنی امون کا نفرتی ملکوم" یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی عبادت کی رسوم میں بہت مکروہات عمل میں آتی تھیں۔ جن ادومی دیوتاؤں کا ذکر آیا ہے۔ ان کے نام غیر ملکی ہیں۔ ہدد سوریا سے آیا۔ اور آ (A) زیادہ مشرق سے دجون فلسطیہ میں اعلیٰ دیوتا تھا۔ وہ زراعت کا دیوتا تھا۔ اور اس نے اپنے پرستاروں کو ان کے دشمنوں پر فتحیاب کیا (قاضی ۱۶:۲۳ وغیرہ)۔ عکرون

میں بعل زبوب (مکھیوں کا خداوند) کی تعظیم وتکریم ہوتی۔ اور اس کی مرضی دریافت
کی جاتی تھی (۲ سلاطین ۱: ۲و۳)۔ یہ تو ہمیں ٹھیک معلوم نہیں کہ اس کو کیوں
یہ نام دیا گیا۔ عستارات کا مندر بھی فلسطیوں کے ایک شہر میں تھا۔ (۱ سموئیل ۳۱: ۱۰)

یونانیوں اور رومیوں کے مذاہب کی بحث کی یہ جگہ نہیں۔ جب اسرائیل
کو پہلے پہل یونانیوں سے واسطہ پڑا۔ تو اس وقت ان پر بہت کچھ مشرقی خیالات
کا اثر ہو گیا تھا۔ انتی اوخس چہارم سوریا کے یونانی بادشاہ نے بہت کوشش کی
کہ یونانی مذہب کو یہودیوں میں زبردستی مروج کرے (۱۶۸ ق م) کچھ تعجب نہیں
کہ انہوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ یروشلم کی ہیکل غیر قوموں کی عیاشی اور
شراب خوری سے معمور ہو گئی اور عین مقدس احاطہ میں لوگ زناکاری اور رنڈی
بازی کرتے تھے (۲ مکابی ۶: ۴)۔ پھر کچھ بعد زمانہ میں جب یونانی دیوی ارتمس
کے نام کا ذکر آتا ہے یا جیسے بائبل میں وہ افسس کی ڈائنا کے نام سے مشہور ہے
(اعمال ۱۹: ۲۸) تو یہ دیوی سیرت میں زیادہ مشرقی نظر آتی ہے نہ یونانی۔ اس
مورت پر بیشمار ممّوں کی شکل بنی ہوئی تھی جو فطرت کی سنبھالنے اور پیدا کرنے والی
قوت کا نشان تھے۔ اس کی عبادت کے وقت وحشیانہ ناپاک رسوم ادا
ہوتی تھیں۔ ڈفنے (Daphne) میں بھی جو انطاکیہ واقع سوریا کے
نزدیک تھا۔ جہاں یونانی دیوتا اپولو کی تعظیم ہوتی اور اس سے غیب کی باتیں
دریافت کی جاتی تھیں۔ جو کچھ فطرت اور فن میں خوبصورت تھا اس سے
بدی کے دائمی تیوہار کے لئے ایک مقدس تیار ہو گیا تھا۔ یہ کسی مسیحی مصنف کی
تحریر نہیں بلکہ چوتھی صدی مسیحی کے ایک علامہ عصر غیر قوم مصنف کی تحریر ہے
جس نے انطاکیہ کے سالانہ بڑے میلے کا بیان لکھا کہ جو کچھ ناپاک اور شرمناک
اور ہر شائستگی اور عفت کے ذرات سے معرا ہے وہ سب کچھ اس میلے میں

واقع ہوتا ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جب یہودی روم کی اطاعت
میں آئے اس وقت روم کا مذہب سراسر رومی سلطنت کی پرستش پر مشتمل تھا۔
وہ شہر بھی دیوتا سمجھا گیا اور وہ قیصر بھی دیوتا مانا گیا۔ جب ہیرودیس اعظم نے
قیصریہ میں ایک مندر روم کے لئے اور ایک آگستس کے لئے بنایا۔ تو یہودیوں
کی نظر میں وہ ایسے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا جس کی تلافی ہیرودیس کی فیاضی سے
بھی نہ ہو سکی۔ ہزارہا یہودی مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ جب پلاطوس نے
کوشش کی کہ مقدس شہر میں فوجی جھنڈے کھڑے کرے جن پر قیصر کی تصویر
بنی ہوئی تھی۔ تو اس کو گوارا نہ کیا۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ سپاہی اُن مورتوں
کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ان کے حاکموں کے مذہب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ
نفس نفیس (Self) کی پرستش کریں۔ طاقت کی تعظیم کریں اور انسانی فخر کو
مقدس ٹھہرائیں۔

مسیحی سن کے شروع کے قریب یہودی اسی لئے نفرت کی نگاہ سے دیکھے
جاتے تھے کہ وہ اپنے قرب وجوار کے مذاہب اور رسوم میں کسی طرح شریک
نہ ہوتے اور نہ ان سے میل جول رکھتے تھے۔ ان میں یہ صفت ان کے اپنے
گذشتہ افسوسناک تجربہ اور ان کی مقدس کتابوں کی تعلیم سے پیدا ہوئی تھی۔
شاید زمانہ حال کے محقق کبھی تعجب کریں کہ عہد عتیق کے شاعروں اور نبیوں
نے بت پرستی پر از حد نفرت اور سخت ملامت کیوں نہیں کی؟ لیکن مخفی نہ رہے
کہ وہ ایک ایسی جنگ میں مصروف تھے جس پر ان کی زندگی و موت موقوف تھی۔
اگر توحید نے (یعنی ایک واحد خدا پر ایمان رکھنا) ایسا سخت مقابلہ نہ کیا ہوتا تو
وہ "بہت خداؤں اور بہت خداوندوں" کے طوفان میں غرق ہو گئی ہوتی۔ اور انسان
کی روح کو کوئی مستقل اطمینان حاصل نہ ہوتا۔ اگر کسی نے ایک خدا کو مان لیا ہو

لیکن دوسرا خدا اس سے ناراض ہو تو اُسے امن کب نصیب ہوتا۔ اہل بابل کی دعا میں اسی طرح کی بے چینی اور بے قراری پائی جاتی ہے۔

"جس دیوتا کو میں نہیں جانتا ہوں کاش کہ وہ خوش ہو جائے۔

جس دیوی کو میں نہیں جانتا کاش کہ وہ خوش ہو جائے۔

جس دیوتا کو میں جانتا ہوں اور جسے میں نہیں جانتا کاش کہ وہ دونو خوش ہو جائیں"

اس کے ساتھ ہی عقل میں بھی پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر یہ مانا جائے کہ جہان کو کئی ایک خود مختار طاقتوں نے پیدا کیا اور وہی اُن کو سنبھال رہی ہیں تو عقلی طور پر یہ ماننا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیسے یہ انتظام برابر جاری رہتا ہے۔ فطرت کا یکساں قایم رہنا خدا کی وحدت پر مبنی ہے۔ قوائے فطرت (قدیم بت پرستی کی تہ میں یہی پائیں پائی جاتی ہیں) اور خدا کی ذات کے متعلق اعلےٰ خیالات میں بہت انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ سب سے اعلےٰ تعلیم جو خدا کی نسبت ہم حاصل کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ زندہ شخص پاک۔ عادل اور نیک ہے۔ اور جیسا ہم نے کافی طور سے بیان کر دیا کثرت الالٰہ کی پرستش کا نتیجہ عیاشی اور بدکاری نکلا۔ اگر فطرت کے قوائے خالقہ کی تصویریں بت پرستوں کے مندروں پر برابر کھینچی جاتی تھیں۔ اگر اعلےٰ وجود عفت شعاری سے معرا تھے۔ اگر حرامکاری ان کی عبادت کا جز تھا تو اخلاق کا کیا ٹھکانا تھا؟ سلیمان کی حکمت نے اس کا درست بیان کیا (۱۴: ۲۷)

"کیونکہ گمنام بتوں کی پرستش

ہر بدی کا آغاز سبب اور انجام ہے"

پھر جب کوئی شخص خواہ وہ بادشاہ یا قیصر ہو۔ خواہ وہ بابلی یا آسور کا بادشاہ ہو یا مصر کا فرعون ہو۔ یا سوریا کا انتی اوخس تھیاس (خدا) ہو۔ یا روم کا بے ذمہ وار حاکم ہو جب کبھی وہ خدا مانا گیا اور ان کی وفات کے بعد اس کی تعظیم میں مندر تعمیر

مندر تعمیر کئے گئے۔ یا ان کے جیتے جی بھی ایسا کیا گیا تو یہ آزادی اور ترقی کی راہ میں سدراہ ہو گیا۔ عہد عتیق کے مذہب نے جب یہ تعلیم دی کہ خدا واحد ہے۔ اس کی عظمت قیاس سے پرے ہے جس کے سامنے کل نوع انسان مساوی ہیں اور جو کچھ ناپاک اور ظالم ہے اس کے نام کی خاطر ترک کریں تو اُس نے انسانوں کو نعمت عظمیٰ عطا کی عہد جدید کے مذہب نے ان ساری کثیف صفات کو لطیف بنا دیا۔ اور انسان سے ایک اعلےٰ وجود کے لئے جو جائز تقاضات تھے ان کو پورا کیا۔ اور اُس الٰہی انسان۔ درمیانی۔ راہ۔ حق اور زندگی کے مکاشفہ کے ذریعہ اُس سے اعلےٰ درجہ کی قربت حاصل کرا دی۔

عبرانی نبوت کا دیباچہ

۱- قانون میں نبیانہ کتابوں کی جگہ۔ عہد عتیق کے یہودی قانون کا دوسرا یا نبیانہ حصہ ان کتابوں پر مشتمل ہے۔ یشوع۔ قاضیوں۔ سموئیل کی پہلی اور دوسری۔ سلاطین کی پہلی اور دوسری (مقدم انبیا) کتابیں اور نیز وہ کتابیں جو زیادہ ٹھیک طور سے نبیانہ کہلاتی ہیں (موخر انبیا)۔ ان کتابوں کا یہ دوسرا گروہ اس دیباچہ کا خاص مضمون ہے۔ مگر اس قرینہ میں یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ کیوں مذکورہ بالا تاریخی کتابیں قانون کے نبیانہ حصہ میں داخل کی گئیں۔ موخر انبیا میں یہ کتابیں داخل ہیں۔ یسعیاہ۔ یرمیاہ۔ حزقیل اور بارہ انبیائے صغیر کی کتابیں۔ بارہ انبیا میں ہوسیع سے ملاکی تک کی کتابیں داخل ہیں جو غالباً مختصر ہونیکی وجہ سے انبیائے صغیر کے نام سے نامزد ہوئیں۔ دانیال کی کتاب نبیانہ کتابوں میں داخل نہیں بلکہ قانون کے تیسرے حصہ [illegible]

۲- نبوت کی قدیم تاریخ۔ عہد عتیق کی نبیانہ کتابیں سب کی سب اُس زمانہ سے متعلق ہیں جو آٹھویں صدی قبل از مسیح کے وسط سے پانچویں صدی قبل از مسیح کے آخر تک ہے۔ لیکن اسرائیل میں نبوت کا آغاز اس سے بہت زمانہ پہلے سے ہوا۔ نبوت کا انعام موسٰے سے منسوب ہے (استثنا ۳۴: ۱۰۔ ہوسیع ۱۲: ۱۳)، اور مریم سے (خروج ۱۵: ۲۰)۔ اور دبورہ سے (قاضی ۴: ۴)، اور سموئیل سے (۱ سموئیل ۳: ۲۰)۔ سموئیل کے زمانہ سے لیکر آیندہ کو نبیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً ناتن۔ جاد۔ اخیاہ۔ شمعیاہ یاہو ابن حنانی وغیرہ سے جو داؤد اور مابعد بادشاہوں کے مشیر اور صلاح کار تھے۔ آٹھویں صدی کے شروع میں۔ میکایاہ۔ ایلیاہ۔ الیشع مشہور نبی گزرے ہیں گو ان کے نام کی کوئی کتاب نہیں۔ قدیم زمانوں میں نبی کا نام غیب بین تھا۔ اور پریشانی کے وقت ان سے مشورت لی جاتی اور عملی امور کے بارہ میں بھی۔ اور ان کی خدمات کا اجر دیا جاتا تھا (۱ سموئیل ۹: ۷ سے ۹)

ان دنوں میں نبیوں کے گروہوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ جن کو وجد کی حالت ہو جاتی اور یہ حالت مرض متعدی کی طرح دوسروں پر بھی اثر کرتی تھی۔ (۱ سموئیل ۱۰: ۱۰ سے ۱۲ و ۱۹: ۱۸ سے ۲۴) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سموئیل نے یہ جوشیلے گروہ بنائے اور خود اُس کا سرگروہ بنا۔ اور نیوت واقع رامہ اُن کا صدر مقام تھا۔ مابعد زمانوں میں نبیوں کی ایک انجمن کا ذکر آتا ہے جن کا نام "انبیا زادے" آیا ہے۔ اس انجمن کی شاخیں کئی ایک جگہوں میں تھیں۔ مثلاً بیت ایل اور یریحو میں (۲ سلاطین ۲: ۲ و ۳ و ۱۵) مگر قانونی (Canonical) انبیا کا کوئی تعلق براہ راست ان نبیانہ انجمنوں سے نہ تھا۔ یہ انجمنیں آخر کار جھوٹی نبوت کا مولد بن گئیں۔ خاصکر عاموس نے اپنے تئیں ایسی انجمن سے علیحدہ ظاہر کیا (عاموس ۷: ۱۴)۔

قدیم اسرائیل کے "غیب بین" نے کئی ایک ایسے کام کئے جو دوسری قوموں کے جادوگروں کے کاموں سے مشابہ تھے۔ مگر شگون لینے اور دیگر اسی قسم کے دستوروں کی مخالفت اُس مکاشفہ کے ذریعہ سے ہوئی جو یہوواہ نے اپنے بارہ میں اسرائیل پر ظاہر کیا۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا حقیقی نبیوں کا کام زیادہ زیادہ اخلاقی اور روحانی ہوتا گیا۔ غیر قوموں کے دیوتاؤں کے بھی نبی تھے۔ جو کئی طبعی وسایل سے وجد کی حالت پیدا کر لیتے تھے۔ (۱ سلاطین ۱۸: ۱۹ سے ۲۹) اور جھوٹے نبی بھی تھے جو یہوواہ کے نام سے بولنے کا دعوٰے کرتے تھے۔ گو ابتدا میں نبوت میں ایسی باتیں پائی جاتی تھیں جو اسرائیل کی گرد و نواح کے مذاہب میں بھی ملتی تھیں اور اگرچہ مابعد زمانوں میں بھی ویسی ہی نبوتیں یا ان کی نقلیں مروج تھیں تو بھی اصلی اور کامل صورت میں یہ ایک لاثانی واقعہ تھا اور براہ راست اعلائے الٰہی مکاشفہ کا یہ وسیلہ ہو گئی۔

۳- نبیانہ کتابوں کی ترتیب۔ ہماری بائیبل میں یہ کتابیں وقت کی ترتیب کے مطابق نہیں رکھی گئیں۔ تین طول طویل کتابیں بارہ چھوٹی کتابوں سے پہلے آتی ہیں اور یہ پچھلی بارہ بھی تاریخی ترتیب کے مطابق نہیں۔ علاوہ ازیں یسعیاہ اور زکریاہ

کی کتابوں میں ایک سے زیادہ مصنف کی تصنیفات شامل ہیں اور وہ ایک ہی زمانہ سے علاقہ نہیں رکھتیں بلکہ مختلف زمانوں سے۔ اگلے صفحہ پر جو نقشہ دیا گیا ہے اُن سے اُن کی تاریخی ترتیب معلوم ہو سکتی ہے ◆

یوایل اور عبدیاہ کی کتابوں کی تاریخ ٹھیک معلوم نہیں۔ بعض اُن کو سب سے قدیم نبیوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور بعض ان کو جلاوطنی کے بعد کے نبیوں میں۔ زکریاہ ۹ سے ۱۴ تک پر بھی یہی صادق آتا ہے۔ یونہ نبی آٹھویں صدی (ق م) (۲۔ سلاطین ۱۴: ۲۵) میں زندہ تھا۔ لیکن جس کتاب پر اُس کا نام آتا ہے وہ جلاوطنی کے بعد کی تصنیف سمجھی جاتی ہے ◆

۴۔ **نبی کا الہام اور کام**۔ نبی کی عام تعریف یہ ہے ”جو آیندہ کی پیشین گوئی کرے“ غیر قوموں میں الہامی کلاموں کی نسبت یہی تصور تھا اور عہد عتیق کے انبیاء کے بارہ میں ابتدائی مسیحی کلیسیا میں یہی رائے تھی لیکن ایسی رائے بہت تنگ اور گمراہ کرنیوالی ہے۔ نبی تو وہ ہے جو خدا کی طرف سے کلام کرے، کسی کے آگے بولے، نہ کہ محض آگے کی بولے۔ چنانچہ خروج ۷: ۱ سے یہی پتہ لگتا ہے۔ کیونکہ ہارون کا رشتہ موسٰے سے یہی تھا کہ وہ موسٰی کی طرف سے کلام کرتا تھا جیسا نبی خدا کی طرف سے۔ نبی ایسے لوگ تھے جن کا یہ دعوٰے تھا کہ ہمیں خدا سے جو تعلیم ملی وہ ہم اس کے نام سے سناتے ہیں۔ اور اس بنیاد نہ الہام کا عطا ہونا اس جملہ کے ذریعہ بیان ہوا ”یا ہواہ کا کلام آیا“ ان کے پیغام کے شروع میں عموماً یہ جملہ آتا ہے ”یاہواہ یوں فرماتا ہے“۔ نبی کا الہام وہ عمل تھا جس کے ذریعہ وہ تعلیم الٰہی روح کے وسیلے اس کے دل پر نقش ہو جاتی تھی اگرچہ ہم اس کی تحقیقات نہیں کر سکتے لیکن اس کے ادراک میں یہ ایک بلا ریب حقیقت تھی۔ اس کے نزدیک خدا کا کلام اس کے اپنے خیالوں اور خواہشوں سے الگ تھا (یرمیاہ ۱۴: ۱۵)۔ اور نیز فریب دہندہ خوابوں سے جدا (یرمیاہ ۲۳: ۲۸)

یہ اپنی ذاتی صداقت اور اٹل طاقت کے ساتھ آتا تھا (یرمیاہ ۲۳: ۲۹ و ۳۰۔ عاموس ۳: ۸)۔ باوجود طبعی تامل اور خوف کے یہ نبی کو اس کلام کے کہنے پر مجبور کرتا تھا (یرمیاہ ۲۰: ۹)۔ یہ الٰہی کلام کبھی رویت کی صورت میں ملتا (یسعیاہ ۶۔ حزقیل)۔ یا کسی روزمرہ کے نظارہ کے ذریعہ پیش کیا جاتا (یرمیاہ ۱۸: ۱-۵)۔ یا کسی خاص ماجرے کے ذریعہ جسے خدا کے الہام نے نئے معنی دیئے (یرمیاہ ۳۲: ۸)۔ اس کو صاف لفظوں میں بیان کرتے یا تمثیلوں میں۔ یا تشبیہی کاموں کے ذریعہ۔ لیکن ہر حالت میں یہ بیان خدا کے نام سے پیش کیا جاتا تھا ◆

زمانہ	اسرائیل	یہوداہ	صدی
آسوری	عاموس ۷۶۰ سے ۷۵۰ ق م	یسعیاہ ۷۴۰ سے ۷۰۰ ق م	آٹھویں
	ہوسیع ۷۵۰ سے ۷۳۵ ق م	میکہ ۷۲۴ سے صفنیاہ ۶۲۷ ق م	
		ناحوم ۶۱۰ سے ۶۰۸ ق م	ساتویں
کلدی	یروشلم میں	حبقوق ۶۰۵ سے ۶۰۰ ق م یرمیاہ ۶۲۶ سے ۵۸۶ ق م	چھٹی
		حزقیل ۵۹۳ سے ۵۷۳ ق م	
	بابل میں	یسعیاہ ۱۳ و ۱۴ و ۳۴ و ۳۵ و ۴۰ - ۶۶ سے ۵۴۰ ق م	
فارسی		حجی زکریاہ ۱ سے ۸ — ۵۲۰ ق م	پانچویں
		ملکی ۴۶۰ سے ۴۵۰ ق م	

نبیوں کا کام تین حصوں پر منقسم تھا۔

(۱) سب سے مقدم اور خاص امر یہ ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں کے سامنے واعظ تھے۔ انہوں نے ملکی۔ تمدنی اور دینی حالات کے مطابق لوگوں سے کلام کیا۔ ان کی

تصنیفات کا ایک بڑا حصہ بلا ان حالات کے جانے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن اس علم کی روشنی میں زیادہ دلچسپ اور پرمعنی ہو جاتا ہے۔ ہر کتاب اور نبوت کا مطالعہ اُس کی تاریخ کے مطابق کرنا چاہئے۔ کتاب مقدس کے تاریخی نوشتوں کی مدد سے ایسا کر سکتے ہیں اور اُن نبوتوں میں جو اشارے تاریخ اور واقعات کی طرف ہیں۔ اُن کو بھی ساتھ لیں اور جو اندرونی شہادت اُن حالات کی حاصل ہوتی ہے اُس کو بھی۔ نبیانہ کتابیں اکثر تاریخی کتابوں کے تتمہ کا کام دیتی ہیں۔ اس لئے کسی زمانہ کی اسرائیل کی تاریخ ان دو نوشتوں کے ذریعہ جو خبر ملی ہے اُس کے ملانے کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ جب ان تصنیفات کو اس طریقہ سے پڑھتے ہیں۔ تو یہ انبیا راستبازی کے واعظ دکھائی دیتے ہیں خواہ وہ ملکی مشیر کار رہوں یا تمدنی یا دینی مصلح ✦

(۲) وہ گذشتہ زمانہ کے بھی مفسر تھے۔ انہوں نے اسرائیل کی ماقبل تاریخ پر نظر ڈالی اور اُس کے ایسے معنی کو ظاہر کیا جس کے معلوم کرنے میں اس کے ہم وطن قاصر رہے تھے۔ یوں یرمیاہ نے شیلاہ کی تباہی سے سبق نکالے (یرمیاہ ۷: ۱۲ سے ۱۵) اور حزقیل نے اسرائیل کی گذشتہ بغاوتوں اور خدا کی صابر محبت کا بار بار ذکر کیا (حزقیل ۱۶: ۲۰)۔ زمانہ سابق کی یہ نبیانہ تاثیر ضروری تھی۔ کیونکہ جو عام تفسیر لوگوں نے کی تھی وہ اس سے بہت مختلف تھی۔ یوں یرمیاہ ۴۴ میں نبی نے یروشلم کی تباہی کا سراغ اسرائیل کی بت پرستی میں نکالا (۲ سے ۶)۔ حالانکہ عوام کا یہ خیال تھا کہ چونکہ انہوں نے آسمان کی ملکہ کی پرستش ترک کر دی تھی اس لئے یہ مصیبتیں اُن پر وارد ہوئیں (آیت ۱۸)۔ نبیوں نے جو بڑا سبق اسرائیل کی تاریخ سے نکالا وہ ایک طرف تو گناہ اور مصیبت کا باہمی تعلق تھا اور دوسری طرف اطاعت اور بختاوری کا۔ اور چونکہ عہد عتیق کی تاریخی کتابیں سب سے بڑھ کر

ایسی صداقت پر زور دیتی ہیں وہ نبیوں کے کام کے اس پہلو کی محض توسیع ہیں۔ وہ محض مؤرخ کے نقطہ خیال سے تحریر نہیں ہوئیں بلکہ نبی کے نقطہ خیال سے۔ اُن میں سے بعض کتابوں کو جو یہ نام "ابتدائی انبیا" دیا گیا اس سے ان کی حقیقی سیرت ظاہر ہوتی ہے ✦

(۳) آخرش یہ نبی آیندہ کی خبریں دینے والے تھے۔ بعضوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ نبیوں کا صرف یہی ایک کام تھا۔ ان کے کام کا یہ ایک حقیقی جز تو تھا لیکن موخر یا ادنیٰ جز تھا۔ نبیوں کی پیشین گوئی دو قسم کی تھی:-

(۱) بعض پیشین گوئیاں تو محدود اور مخصوص تھیں۔ اُن کا تعلق قریب زمانہ مستقبل سے تھا۔ مثلاً جب آسوری طاقت مغربی ایشیا میں نمودار ہوئی تو عاموس اور ہوسیع نے پیشین گوئی کی کہ یہ اسرائیل کے زوال کا آلہ ہوگی۔ جب سنحریب نے یہوداہ پر حملہ کیا۔ تو یسعیاہ نے پیشین گوئی کی کہ بادشاہ اور رعیت دونوں کو دنیاوی اتحادوں کے وسیلے سے سخت خطرہ پیش آئیگا۔ لیکن آخر میں وہ پست ہو جائینگے اور خدا کی مدد ڈھونڈھینگے اور مخلصی حاصل کرینگے۔ جب بنوکدنضر نے یروشلم کا محاصرہ کیا تو یرمیاہ اور حزقیل دونوں نے خبر دی کہ شہر کا تسخیر ہونا اٹل تھا۔ اور کہ جلا وطنی گو یقینی تھی لیکن صرف محدود عرصہ تک رہیگی۔ جب خورس نے اپنی فتوحات شروع کیں تو یسعیاہ ۴۰ سے ۶۶ کے مصنف نے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ بابل کو فتح کریگا اور یہودیوں کو اسیری سے مخلصی دیگا۔ ایسی پیشین گوئیوں کا تعلق انہیں لوگوں سے تھا جو اس وقت زندہ تھے۔ ایسی قوموں سے جو اس وقت موجود تھیں۔ اُن تحریکوں کے نتیجوں سے جو اس وقت اپنا عمل کر رہی تھیں۔ اُن کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انسان کی اعلیٰ دور اندیشی و تیز فہمی کا نتیجہ تھیں۔ بلکہ ان کو نبی کے الٰہی الہام سے ہی منسوب کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیں کہ وہ الگ

آیندہ واقعات کے غیر مفہوم اور اعجازی مکاشفے نہ تھے۔ یہ وہ نتیجے تھے جو انبیا ان بڑی صداقتوں کے ذریعہ نکالنے کے قابل ہو گئے جو خدا کی سیرت کے بارہ میں اور اسرائیل کے ساتھ خدا کے ارادہ کے بارہ میں ان پر منکشف ہوتے تھے۔ انبیا کے الہام کی حقیقت اس پر مشتمل تھی کہ انہوں نے اِن اصولوں کو گرفت کر لیا اور اُن کو یہ طاقت ملی کہ ان اصولوں کو اس حالت پر چسپاں کریں جس میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔

عہد جدید کے مصنفوں کی نظر میں نبیوں کی بعض خاص محدود پیشین گوئیاں بیان شدہ زمانہ سے زیادہ وسیع تھیں اور اُن میں دور کے زمانہ مستقبل کے خاص واقعات کی طرف اشارے تھے۔ مثلاً ہوسیع ۱۱: ۱ میں جہاں ابتداً مصر کی غلامی سے اسرائیل کے مخلصی پانے کا ذکر ہے اُس کی نسبت یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اُس میں ہمارے خداوند کے مصر میں بھاگ جانے کی بھی پیشین گوئی ہے (متی ۲: ۱۵)۔ یرمیاہ ۳۱: ۱۵ جو ابتداً راخل کے غم کی تصویر ہے (بلحاظ اس کے کہ وہ اسرائیل کی والدہ ماجدہ تھی) جب یہ جلاوطن رامہ سے روانہ ہوئے تھے (دیکھو یرمیاہ ۴۰: ۱) لیکن وہ بیت لحم کے معصوموں کے قتل کی پیشین گوئی بھی سمجھی گئی (متی ۲: ۱۸) اور میکہ ۵: ۲ میں نہ صرف اس امر کی پیشین گوئی ہے کہ داؤد کے خاندان سے ایک حاکم برپا ہوگا جو یہوداہ کو اسوریوں سے مخلصی دیگا (دیکھو آیات ۵ و ۶) بلکہ بیت لحم میں مسیح کی پیدائش کی پیشین گوئی بھی سمجھی گئی (متی ۲: ۶)۔ یہ تو شاید مشکل سے خیال میں آ سکتا ہے کہ ان پیشین گوئیوں کی یہ موخر تکمیل نبیوں کے دلوں میں فی الحقیقت موجود تھی تو بھی اس قیاس اور ان نبوتوں کی اس جائز تفسیر کا کہ ہمارے خداوند کی زندگی کے واقعات کے گویا پرتو تھے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسا انکار کرنے سے ہم خدا کی رُوح کے آزادانہ کام پر گستاخانہ حد لگا دیتے ہیں۔

(ب) دیگر پیشین گوئیاں زیادہ عام قسم کی ہیں اور زیادہ دور کے آیندہ زمانہ میں ان کی تکمیل کی امید تھی۔ ان میں انبیا نے اپنے مبہم تصورات کو پیش کیا۔ مثلاً ایک کامل بادشاہ کے (یسعیاہ ۱۱: ۱ سے ۱۰ + ۳۲: ۱ سے ۸)۔ ایک تائب معاف شدہ، متفق اور بحال شدہ قوم کے (حزقیل ۳۶ و ۳۷)۔ خداوند کے راستباز بندہ کے جو پہلے دُکھ اُٹھاتا ہے اور پیچھے سرفراز ہو جاتا ہے (یسعیاہ ۵۳)۔ ایک الٰہی چوپان کے (حزقیل ۳۴)۔ اور خدا کی عالمگیر سلطنت کے (یسعیاہ ۲: ۲ + میکہ ۴: ۱ سے ۷)۔ خدا اور اس کی امت کے درمیان ایک نئے اور روحانی رشتہ کے (یرمیاہ ۳۱: ۳۱ سے ۳۴)۔ ایسی نبوتوں کو مسیانک (messianic یا مسیحی۔ یا مسیح کے بارہ میں) کہتے ہیں۔ کیونکہ ان میں یسوع مسیح کی طرف اور عہد جدید کے زمانوں کے دینی حالات کی طرف اشارہ ہے۔

ہمارے خداوند کے دنوں میں ایک بڑے نجات دہندہ (جو مسیح کے نام سے مشہور تھا) کی امید یہودیوں کے درمیان بہت مروج تھی اور اس کی بنیاد کلام عہد عتیق کی نبوت تھی۔ یہ تو سچ ہے کہ کسی نبی نے بھی یہ لقب کسی خاص مستقبل شخص کے لئے استعمال نہیں کیا۔ البتہ جو یہودی مصنف عہد عتیق اور عہد جدید کے درمیانی عرصے میں گزرے اُنہوں نے ایسا کیا۔ لیکن جو تصورات نبیوں نے ظاہر کئے وہ مسیح کے خیال کی بنیاد ٹھہرے اور ہمارے خداوند نے اسے سچ سمجھ کر اختیار کیا اور اپنی تعلیم کے مطابق یہ لقب اُسی میں اور اُس کے کام میں صادق ٹھہرا (متی ۱۱: ۲ سے ۶ + لوقا ۴: ۱۷ سے ۲۱ + یوحنا ۴: ۲۵ و ۲۶)۔ مسیحی دین کی صداقت کی حمایت میں نبوت سے دلیل لانے کا زور کچھ گھٹ نہیں گیا۔ البتہ ہم انہیں لفظوں میں اسے بیان نہیں کر سکتے جن میں کہ اُن کو پہلے کیا کرتے تھے۔ ان کا زور اُن خاص آیندہ واقعات کی الگ الگ پیشین گوئیوں پر منحصر نہیں لیکن اُن روحانی پیش خبریوں کے بہت متوازی سلسلوں پر جن کے ذریعہ انبیا آیندہ زمانے پر نظر ڈالتے تھے اور وہ سارے سلسلے یسوع مسیح میں آ ملتے ہیں

۵۔ جھوٹے نبی۔ سچی نبوت کی حقیقت کی مزید تائید ہوتی ہے جب اس کا مقابلہ نبوت کی اس جعلی صورت سے کیا جاتا ہے جو سایہ کی طرح اس کے ساتھ لگی چلی آتی تھی۔ جن نبیوں کا نبوت پیشہ بن گئی وہ بگڑتے بگڑتے جھوٹوں کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ ان کا خاص لباس دھوکے کی ٹٹی بن گیا اور ان کا اپنے تئیں زخمی وغیرہ کرنا شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا (زکریاہ ۱۳: ۴ و ۶)۔ یہ جملہ "خداوند کا بوجھ" ان کی زبان پر ایک بناوٹی اور فریب دہ تھا (یرمیاہ ۲۳: ۳۳ سے ۴۰)۔ جھوٹے نبی بھی یہواہ کے نام سے کلام کرتے تھے لیکن ان کو کوئی حقیقی الہام حاصل نہ تھا (یرمیاہ ۲۳: ۲۱ + حزقیل ۱۳: ۶)۔ بعض صورتوں میں وہ دانستہ دھوکے باز تھے۔ یا عمداً زمانہ ساز لیکن بعض صورتوں میں وہ اپنی باتوں کو خلوص قلبی سے صحیح مانتے تھے۔ لیکن ان کے پیغام اکثر سچے نبیوں کے پیغام کے صریح خلاف تھے۔ مثلاً اخیاب کے نبیوں نے رامات جلعاد کی مہم کی کامیابی کی نبوت کی (۱ سلاطین ۲۲: ۶)۔ حنانیاہ نے خبر دی کہ یہودی جلاوطن بابل سے بہت جلد واپس آئینگے (یرمیاہ ۲۸: ۱ سے ۴)۔ بابل میں بھی نبیوں نے یہی پیشین گوئی کی (یرمیاہ ۲۹: ۸ و ۹ + حزقیل ۱۳: ۱۶)۔

اب یہ سوال لازم آتا ہے کہ عوام الناس ان سچے اور جھوٹے نبیوں میں کیسے امتیاز کریں۔ کتاب مقدس میں کئی ایک نشان ان کے پرکھنے کے لئے ظاہر کئے ہیں۔ جب پیشین گوئیاں زیر بحث تھیں تو سب سے آسان معیار ان کی تکمیل تھا (استثنا ۱۸: ۲۱ و ۲۲)۔ لیکن پیشین گوئی کی تکمیل تک اس معیار سے فایدہ نہ اٹھا سکتے تھے۔ یرمیاہ ۲۸: ۸ و ۹ میں اس سے بھی گہرے معیار کا ذکر ہے۔ عموماً سچے نبیوں کو آگاہی و تنبیہ کے پیغام ملے۔ جو نبی امن و سلامتی کی پیشین گوئی کرتے تھے وہ شک کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور جب تک ان کی نبوت کی تکمیل نہ ہو اس کے ماننے کا حکم نہ تھا۔ اس لئے کسی نبوت کی صداقت کا اندازہ لگانے کے لئے پیغام کے نفس مضمون کا لحاظ کرنا ضرور تھا۔ یرمیاہ

۲۳: ۲۲ میں اس اصول کی زیادہ تشریح ہے۔ جو نبی گناہ پر ملامت کرتا اور لوگوں کو اس سے ہٹانے کی کوشش کرتا وہ سچا نبی تھا۔ فی الحقیقت سچے اور جھوٹے نبیوں کے درمیان جھگڑا ان مختلف تصورات سے پیدا ہوا جو وہ خدا کی سیرت اور اسرائیل کے ساتھ اس کے رشتہ کے متعلق رکھتے تھے۔ جھوٹے نبیوں کی یہ تعلیم تھی کہ وہ محض ایک قومی خدا تھا اس لئے اس کا فرض تھا کہ وہ ہر حالت میں اپنے لوگوں کی حفاظت اور ان پر مہربانی کرے۔ حالانکہ سچے نبی اس کو زندہ خدا جانتے تھے جو سارے جہان پر راستبازی سے حکومت کرتا ہے۔ اس نے اسرائیل کو اس لئے چنا تاکہ وہ راستباز قوم بنے اور اگر وہ گناہ میں پڑیں تو وہ بجز سزا کے اور کچھ توقع نہ رکھیں (عاموس ۳: ۱ و ۲)۔

۶۔ نبوت کی تفسیر اور تکمیل۔ اگرچہ نبیوں کے ہمعصر ان کی نبوتوں پر تکمیل کا معیار عاید نہ کر سکتے تھے لیکن ہم اس معیار سے فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ بہت ساری باتوں میں بلکہ بحیثیت مجموعی نبیوں کی باتیں آیندہ کے بارہ میں سچ ثابت ہوئیں۔ البتہ بعض ایسی پیشین گوئیاں ہیں جو لفظی طور پر نہ پوری ہوئیں اور نہ اب پوری ہو سکتی ہیں۔ اور تفسیر کے چند اصول ہیں جو ان سے خاص علاقہ رکھتے ہیں اور جو عموماً ساری نبوت پر عاید ہو سکتے ہیں:-

(۱) نبیوں کی زبان عموماً شاعرانہ اور مجازی ہے۔ مثلاً یسعیاہ ۱۱: ۶ سے ۹ میں فطرت کی تبدیلی کی تصویر عالمگیر صلح کا ایک شاعرانہ بیان ہے اور اسے لفظی طور پر نہ لینا چاہئے۔ یہی حال اور بہت سارے مقامات کا ہے۔

(۲) نبیوں کی پیشین گوئیاں مشروط تھیں وہ زمانہ حال میں راستبازی کی تائید میں پیش کی گئیں۔ انہوں نے ایک طرف تو گناہ کے نتائج کی پیش خبری دی اور دوسری طرف راستبازی کی۔ توبہ کے ذریعہ سزائیں ہٹ سکتی تھیں۔ نافرمانی کے ذریعہ برکتیں چھن سکتی تھیں۔ یرمیاہ ۱۸: ۷ سے ۱۰ میں یہ اصول صاف طور پر بیان

ہوا ہے اور عالمگیر اطلاق کا حکم رکھتا ہے۔ جہاں کہیں حرف شرط اگر عبارت میں آیا بھی نہیں وہاں بھی یہ مفہوم ہے۔ اسی طرح یوناہ نبی کی پیشین گوئی کہ نینوہ چالیس روز میں برباد ہو جائیگا پوری نہ ہوئی تو بھی یوناہ جھوٹا نبی نہ تھا۔ کیونکہ یہ دھمکی اسی قیاس پر دی گئی تھی کہ اگر نینوہ توبہ نہ کریگا تو یہی حال ہوگا۔ اور کہتے ہیں کہ ایسی پیشین گوئیاں اس لئے نہ کی گئی تھیں کہ وہ پوری ہوں بلکہ اس لئے کہ وہ پوری نہ ہوں۔ کیونکہ ان کے کئے جانے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا کہ لوگ تائب ہو گئے) +

(۳) مستقبل پر جو نظر ان نبیوں نے ڈالی وہ ان نبیوں کے زمانہ کے حالات سے محدود تھی۔ چنانچہ پیٹرسن صاحب کا یہ مقولہ راست ہے کہ "نبوت تاریخی بنیاد کو کلی طور پر ترک نہیں کرتی۔ خواہ آیندہ کا نظارہ کتنا ہی وسیع اس کے آگے کھلا ہو۔ لیکن اس کا آغاز نبیوں کے قدموں سے ہوتا ہے۔ زمانہ حال اس کے وطن اور کوچ کا مقام ہے گو وہ سارے زمانوں کا مالک ہو جائے"۔ اس لئے نبیوں نے خدا کی بادشاہت کا تصور اسی قومی حکومت سے حاصل کیا جس سے کہ وہ آشنا تھے۔ مستقبل کے جو بیانات اُنہوں نے کئے وہ اکثر ایسے حالات کے لحاظ سے ظاہر کئے گئے جو بدلنے اور گزر جانے والے تھے۔ مثلاً میکہ نے یروشلم کا ذکر کیا کہ وہ خدا کی امن کی بادشاہت کا مرکز تھا (۴: ۱ و ۲) حزقیل نے الٰہی مستقبل سلطنت کا ذکر اس صورت میں کیا کہ وہ بحال شدہ اسرائیل ہے۔ معہ ہیکل اور اُس کی قربانیوں کے (۴۰ سے ۴۸ باب تک)۔ اور اُس کی دشمن وہی قومیں ہیں جنہوں نے زمانہ سابق میں یہوواہ کو دق کیا تھا (۲۸: ۲۵ و ۲۶) یرمیاہ نے بھی جس نئے عہد کا ذکر کیا وہ اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ ہے (۳۱: ۳۱)۔ اس لئے جو کچھ اس انبیاء کے دلوں میں لفظی طور سے خیال تھا اُسے ہم بہت کچھ مجازی اور تشبیہی سمجھیں۔ جس عارضی اور خارجی صورت میں ان باتوں کا بیان ہو اس میں دائمی روحانی معنی علیحدہ کریں +

(۴) مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آیندہ کے بارہ میں انبیا نے اکثر مستقل تاریخ کا چنداں لحاظ نہیں کیا۔ یعنی خدا کی آیندہ سلطنت کا نظارہ ان کے دلوں پر ایسا آشکارا ہو رہا تھا کہ جو واقعات اس اثنا میں حائل ہونے والے تھے اُن کو نظر انداز کیا۔ ان سبھوں نے اُس سنہری زمانہ کا ایسا ذکر کیا ہے کہ گویا وہ ان کے زمانہ کے عین بعد شروع ہونے والا تھا۔ یسعیاہ نے جو اس زمانہ کی تصویر کھینچی وہ آسور سے مخلصی پانے کی پیشین گوئیوں سے علاقہ رکھتی ہیں۔ حزقیل اور یسعیاہ ۴۰ سے ۶۶ بابوں کے مصنف نے یہ دکھایا کہ وہ زمانہ بابل سے واپس آنے کے بعد ہی شروع ہوگا۔ اعلیٰ قسم کی مسیحانہ نبوت کا تعلق قریب زمانہ آیندہ کی پیشین گوئیوں سے وابستہ ہے۔ چنانچہ یسعیاہ نے جس بادشاہ کو **عمانوئیل** ظاہر کیا وہ نبی کے اپنے ہی زمانہ میں ظاہر ہونیوالا تھا جس نے آسور کے حملہ کی مصیبتوں میں حصہ لینا تھا اور آخرکار اُس نے اُس ظالم پر فتح حاصل کرنی تھی۔ لیکن اُس بادشاہ کا بیان ایسے اعلیٰ الفاظ میں ہوا جو یہوداہ کے کسی بادشاہ پر صادق نہیں آسکتے تھے اور صرف یسوع مسیح ہی میں اُن کی ٹھیک طور سے تکمیل ہوئی۔ نیز دیکھو "مسیحانہ امید" +

مسیحانہ امید

ٹھیک طور سے مسیحانہ امید مسیح کے لئے اسرائیل کی توقع تھی۔ ایمانداروں کو یہ پورا یقین تھا۔ اور نبیوں نے یہ خیال اُن میں ڈالا تھا کہ داؤد کی نسل کا ایک بادشاہ اور مخلصی دہندہ خدا کی طرف سے بھیجا جائے گا جو اُن کو ان کے ظالموں کے پنجہ سے چھڑائیگا۔ اور جو مصیبتیں اس قوم پر نازل ہوئی تھیں اُن سب کو دُور کر دیگا اور امن چین اور فارغ البالی کا ایسا زمانہ لے آئیگا جو جہان کو پہلے کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ لیکن وسیع معنوں میں ان الفاظ سے یہ مراد لے سکتے ہیں۔ کہ زمانہ آئندہ میں خدا ایسی مخلصی اور خوشحالی عطا کریگا جس کا حصر کسی خاص بادشاہ پر نہ ہوگا۔ ابتدائی بیانات میں یہ سارا مضمون موہوم اور مختلف سا ہے۔ اس امید نے کبھی ایک صورت اختیار کی اور کبھی دوسری۔ دینی معلم تو مثلاً انبیا اس خیال کا بہت ذکر کرتے ہیں لیکن دوسرے معلموں مثلاً حکمت کی کتابوں کے مصنفوں نے اسے بالکل نظر انداز کیا لیکن ان مصنفوں نے حکمت کی تصویر ایسی کھینچی ہے گو اُسے ہم مسیحانہ تصویر نہیں کہہ سکتے لیکن یہ ایک خیال تھا جسے مسیحیوں نے سمجھا کہ وہ صرف یسوع مسیح ہی میں پورا ہو سکتا تھا۔ ٹھیک جیسے ایک مخلصی دینے والے بادشاہ کا تصور۔ ایک اور طرح سے ہم اس کو بیان کر سکتے ہیں کہ ہمارے خداوند نے اپنی ذات میں اسرائیل کی بہت سی الگ الگ امیدوں اور تصوروں کو جمع کیا۔ اور اُن کی اپنے ہی طریقے سے تکمیل کی۔ گو پہلے خواب بینوں نے جس طریقے سے اُس کے تکمیل کی توقع کی تھی ہمیشہ اس طریقے سے وہ نہ ہوئی بلکہ زیادہ کامل۔ زیادہ بسالم اور زیادہ اعلےٰ طریقہ سے ✦

اس کل مضمون کے عام خیال کے ساتھ ہم اس کی خاص شاخوں کا خاکا کھینچینگے اور اس سے نشو ونما کا سراغ لگائینگے جب تک کہ ماقبل مکاشفہ کی علیحدہ علیحدہ شعاعیں مجتمع نہ ہو جائیں اور انجیل کی تاریخ میں اپنا مرکز نہ پائیں ✦

پہلے تو قدیم اسرائیلی بادشاہ کی مقدس سیرت کا ذکر ہے۔ سموئیل کے ذریعہ ساؤل کے ممسوح ہونے کا جو قدیم بیان ہے (۱ سموئیل ۹: ۱۶) اس میں یہ سیرت صاف طور سے بیان ہوئی۔ اس بیان میں یہ ذکر ہے کہ خدا نے بادشاہ کو چنا تاکہ خدا کا نبی اُسے مسح کرے۔ یہ الٰہی تقرر کا نشان تھا جس کے ذریعہ اُس کو یہ اختیار ملا کہ امت کو اس کے دشمنوں سے رہائی دے۔ اس لئے ان اعلےٰ امیدوں کے درمیان وہ تخت قایم ہوا۔ لیکن ان امیدوں میں بہت جلد مایوسی حاصل ہوئی۔ ساؤل اپنی مرضی کی راہ چلا اور سموئیل نے غصہ میں اُس کو کہا کہ خدا نے اُسے رد کر دیا ہے۔ پھر اس طریقے سے داؤد کا انتخاب اور مسح ہوا۔ اور اس سے زیادہ بہتر نتائج نکلے۔ اسرائیل کا دوسرا بادشاہ جو پہلے بڑا جنگی مرد تھا وہ اثنائے زمانہ میں بڑا بادشاہ بھی ہو گیا اور اُس قوم کو قرب وجوار کی قوموں کے تاخت وتاراج سے رہائی حاصل ہوئی۔ اس کی حدود وسیع ہو گئیں اور ایک بڑی عالمگیر سلطنت کی امید پیدا ہو گئی۔ اس دنیاوی شان وشوکت نے کچھ عرصہ کے لئے لوگوں کی آنکھوں میں چکا چوندی پیدا کر دی لیکن بہت مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ اس سحر کا اثر جاتا رہا۔ سلیمان کا عہد سلطنت اس کے باپ کے عہد سلطنت سے بھی زیادہ شاندار تھا۔ لیکن یہ بھی مہنگا اور بار گراں ثابت ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سرکش اور مشیر بے تدبیر بیٹے کے زمانہ میں ایک مہلک بغاوت پھوٹ نکلی اور اسرائیل دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ان دو سلطنتوں کی مابعد تاریخ میں بھی یہی دو باتیں خلط ملط پائی جاتی ہیں۔ بعض بادشاہ تو نیک اور عظیم الشان تھے اور بعض شریر اور رفطرتی تھے۔

یسعیاہ کے زمانہ میں اہلِ یہوداہ اپنے سلطنت کے سنہری زمانہ پر نظر ڈالا کرتے تھے جو اپنی قدامت کے باعث اُن کو ایسا ذوالجلال اور عالیشان دکھائی دیتا تھا۔ یہ مجازی اور کامل داؤد ثانی حقیقی داؤد اول سے کہیں اعلےٰ شخص تھا۔ اس قومی بہادر یعنی داؤد اول نے جو ہولناک جرم کئے تھے وہ فراموش ہو گئے۔ صرف اس کی فتحیابیاں ہی یاد رہ گئیں۔ تب یہ امید پیدا ہوئی کہ داؤد ثانی پیدا ہوگا۔ اور مابعد زمانہ کے لئے ایسے کام کریگا۔ جو اس شاہی نسل کے بانی نے اپنے ایام میں کئے تھے۔ چونکہ فلسطیوں کی نسبت اسور کا بادشاہ زیادہ طاقتور اور خطرناک دشمن تھا اس لئے ان آسوریوں کو مغلوب کرنے کے لئے ایک بزرگ تر داؤد کی ضرورت تھی بہ نسبت اس جنگی بادشاہ کے جس نے فلسطیوں پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ اس موقعہ پر نبیوں نے اپنے الہامی کلام کے ذریعہ قوم کی مدد کی جس سے عام ضرورت پوری ہوئی۔ بلکہ عام امید کو محض پولیٹکل امیدوں سے اعلےٰ اور بلند بنا دیا۔ یسعیاہ یہ چلا اٹھا "یسی کے تنہ سے ایک کونپل نکلے گا اور اس کی جڑوں سے ایک پھلدار شاخ پیدا ہوگی اور خداوند کی روح اس پر ٹھیریگی حکمت اور خرد کی روح مصلحت اور قدرت کی روح معرفت اور خداوند کے خوف کی روح" (یسعیاہ ۱۱: ۱ سے ۵) یہ بڑا الہامی کلام سب سے پہلا کلام ہے جو ایسی صفائی سے بیان ہوا ہے اور خاص پیشین گوئی اس امر کی ہے کہ مسیح ابن داؤد ہوگا۔ آئندہ رہائی کے اشارے اور کنائے پہلی نبوتوں میں بیان ہو چکے تھے۔ اور ہونہار بادشاہوں کے بارہ میں تشبیہی خیالات مذکور ہوئے۔ لیکن اب آخرکار داؤد ثانی کا صاف وعدہ دیا گیا۔ اس نبوت کی دینی قدر و قیمت اس پر مشتمل ہے کہ اس میں مسیح کی اخلاقی اور روحانی سیرت کا مفصل نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ ایک فاتح حاکم سے کہیں بڑھکر ہے۔ یہ راستباز حاکم ہے۔ یہ عادل۔ رحیم اور صلح جو ہے کیونکہ خداوند کا خوف اس میں پایا جاتا ہے ۔

اس اعلےٰ کلام کی روشنی میں جو کہ اسرائیل کے مسیحانہ تصورات کی کلید ہے ہم دو ماقبل موہوم پیشین گوئیوں کی طرف توجہ منعطف کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یسعیاہ ۷ باب میں ہے۔ جہاں عمانوایل کی موعود پیدائش کا ذکر ہے۔ اس مقام کے بارہ میں یہ مشکل ہے کہ یہ پیشین گوئی اپنی ہمعصر تاریخ میں گہرے طور سے گڑی ہوئی ہے۔ اس میں صاف طور سے قریب زمانہ ہی میں بچہ کی پیدائش کی خبر ہے۔ بعضوں نے تو یہ خیال کیا کہ یہاں خود یسعیاہ کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی خبر ہے۔ بعضوں نے سمجھا کہ شاہی محل میں کوئی فرزند تولد ہونے والا تھا۔ لیکن جہاں ماقبل پیشین گوئیوں میں سے دوسری کو پڑھتے ہیں تو اس عجیب بچہ کا ذکر بہت عالیشان الفاظ میں پاتے ہیں۔ مثلاً عجیب۔ مشیر۔ خدائے قادر۔ ابدیت کا باپ۔ سلامتی کا شاہزادہ (یسعیاہ ۹: ۶) عہد عتیق میں جہاں کہیں مسیح کا ذکر ہوا۔ ان سب سے یہاں اعلےٰ القاب اُس کو دیئے گئے ہیں۔ کیا یہ القاب یسعیاہ کے زمانہ کے کسی بچہ پر عائد ہو سکتے ہیں؟ حالانکہ نویں باب کی پیشین گوئی کا علاقہ صاف طور سے ساتویں باب کی پیشین گوئی سے ہے جو کہ ہمعصر ہے ۔

جو مشکل یہاں پیدا ہوتی ہے اُس کا حل مسیحانہ نبوت کی ایک خاص صفت کی تشریح پر موقوف ہے۔ ہم دو باتوں میں امتیاز کریں اول تو یہ دیکھیں کہ اس میں کونسے اعلےٰ تصورات ظاہر کئے گئے۔ دوم اس امر کو دیکھیں کہ اس میں کیا کچھ مقامی۔ عارضی اور شخصی ہے۔ نبیوں کو بذریعہ الہام ایسے تصورات حاصل ہوئے جو فضا میں روشن ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے تھے لیکن اُن کو وقتوں اور میعادوں کا علم حاصل نہ تھا۔ خود ہمارے خداوند نے اس امر کا اقرار کیا کہ خدا نے اس کی دوسری آمد کا جو وقت مقرر کیا ہے اس کا اُس کو علم نہیں۔ پس کس قدر کم عہد عتیق کے نبیوں کی نسبت یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ انہیں اس امر میں ایسا ٹھیک وقت بتا دیا گیا ہو جو خود ابن آدم کو نہ بتایا گیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے تعجب نہیں کہ جس وقت یہ نجات دہندہ ظاہر ہوا اس سے کہیں پہلے

اس کی توقع کی جاتی تھی۔ چونکہ یہ جوشیلے اور سرگرم لوگ تھے جو کوئی ہونہار بادشاہ انہیں نظر آتا اُسی کی نسبت یہ سمجھ لیتے کہ اس میں خدا کے وعدوں کی تکمیل ہوئی۔ ان کی باطنی بصارت اور ان کے ایمان کی یہ حالت تھی۔ اس طریقہ سے یسعیاہ نے خیال کیا ہوگا کہ آرامی خطرہ اور نازک توقعہ کے وقت وہ بچہ پیدا ہوگا جس کا ذکر ساتویں باب میں تھا اور اُسی میں وہ اعلےٰ صفات پائی جائینگی جو نویں باب میں قلمبند ہیں اور وہی ایسا ظفریاب اور صلح جو حاکم ہوگا جس کا نقشہ گیارھویں باب میں دیا گیا تھا۔ لیکن تاریخ نے اس خیال کی تصدیق نہ کی۔ ان سرابوں کے ذریعہ جو ان کی اپنی محدود بصارت کا نتیجہ تھے۔ خدا اپنی اُمت اور اپنے نبیوں کی تعلیم و تربیت کرتا رہا۔ لیکن نبوت کے تصورات میں کوئی سراب یا دھوکا نہ تھا۔ اس سراب کا چشمہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک خاص زمانہ اور ایک خاص شخص میں وہ تکمیل سمجھ لی +

یہاں ہم مسیحانہ امید کی عجیب زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مایوسی اسے فنا نہ کر سکی بلکہ اس کے جوش کو بھی مستقل طور سے فرو نہ کر سکی۔ کئی شخصوں کی نسبت اُنہوں نے گمان کیا کہ ان میں ان تصورات کی تکمیل ہوئی۔ مثلاً حزقیاہ۔ زردبابل بلکہ بت پرست خورس اور مابعد محبِ قوم یہوداہ مکابی ہیں۔ ان سبھوں نے اس کے مطابق کچھ نہ کچھ فایدہ پہنچایا لیکن یہ تصور ایسا اعلےٰ تھا کہ ان میں سے کسی میں وہ پورا ہوتا نظر نہ آیا۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک زمانہ کے آخر پر یہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ توقع بر نہ آئی۔ تو بھی یہ توقع برابر زندہ رہی۔ برابر جاری رہی۔ انبیا اور اُمت پر یہ منڈلاتی رہی۔ یہ الٰہی تصور تھا جس کی تکمیل کی تاخیر کی وجہ سے زیادہ صبر کی برداشت نہ رہتی تھی۔ لیکن اس پوشیدہ اٹل زندگی کی وجہ سے یہ امید کو برابر مشتعل کرتی رہتی تھی +

ایمان اور مایوسی کے اس عجیب اتحاد کے لحاظ سے کتاب مقدس کے ان بہت مقاموں پر غور کریں جو کہ عموماً مسیحانہ سمجھے جاتے ہیں گو وہ صورتاً میں نبیانہ نہیں۔ مثلاً

دوسرے مزمور کو بہت علمائے مختلف شخصوں پر عائد کیا ہے داؤد۔ سلیمان۔ یہوسفط۔ آخز حزقیاہ۔ اسکندر جانیوس۔ لیکن جس ذوالجلال الٰہی بادشاہ کا اس میں ذکر ہوا وہ ان شخصوں میں سے کسی پر صادق نہ آسکتا تھا۔ تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی مصاحب کی تملق آمیز عبارت ہے۔ یہ چاپلوسی کے الفاظ نہیں بلکہ یہ ایمان کا کلام ہے۔ مزمور نویس محض اپنی وفاداری کو مبالغہ سے بیان نہیں کر رہا۔ خدا پر توکل کرکے اُسے صاف معلوم ہے کہ جس کا نقشہ وہ یہاں کھینچ رہا ہے وہ خدا کے حقیقی بادشاہ کی ذات پاک میں ضرور پورا ہوگا۔ جب اس نے بادشاہ کی نسبت کہا کہ وہ فرزند خدا ہے تو اُسے اس راز کی اعلےٰ رویت تک رسائی نہ ہوئی تھی جو مقدس پولس اور مقدس یوحنا کو حاصل تھی جسکے ذریعہ اُنہوں نے مجسم مسیح کا ادراک کیا۔ لیکن وہ امید کے روشن بادلوں پر سوار ہوکر آگے بڑھا چلا جاتا ہے اور ایک دن اُسے خاص مسیحی مکاشفہ کی برکت حاصل ہوگی۔ اسی طرح ۷۲ مزمور کو لوگوں نے سلیمان۔ حزقیاہ اور دوسروں پر عائد کیا۔ لیکن پورے طور سے وہ ان میں سے کسی پر بھی صادق نہیں آتا۔ ان بڑے بادشاہوں میں جزوی طور پر تو وہ تصورات پورے ہوئے لیکن ان کی پوری تکمیل کے لئے ایسے مسیح کی ضرورت تھی جو یسوع کی پیدایش تک کبھی ظاہر نہ ہوا تھا +

جسے ہم مسیحانہ امید کہتے ہیں گا ہے گا ہے وہ صرف اتنا ہی یقین ہے کہ داؤد کے خاندان کے بادشاہوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مزمور ۸۹ اسی رُوح میں لکھا گیا۔ یہاں بھی یہ قابل لحاظ ہے کہ جو امید داؤد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی وہ ایسی معتمد اور متواتر ہو +

برعکس اس کے بہت سی نبوتیں ایسی ہیں جن کا تعلق شخص مسیح کے تصور کے ساتھ کچھ بھی نہیں تو بھی ان میں نجات اور مخلصی کی پیشین گوئی ہے۔ ایسی نبوتوں کا مرکز "خداوند کا دن" ہے۔ یہاں خدا ہی نجات دہندہ ہے۔ کسی انسانی وسیلے کی کوئی گنجایش

ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اُس نے یہ کوشش نہ کی تھی کہ چونکہ لوگوں کی امید پہلے سے یہ چلی آئی ہے یا میرے ہمعصر یہودیوں کی آرزو ایک نئے اور بزرگ تر داؤد کے لئے ہے یا ایک مکابی کے لئے جو اُن کی گردن سے بت پرستوں کا جؤا اتار پھینکے اس لئے مجھے ایسا دعوے کرنا چاہئے۔ لیکن وہ تو بادشاہ ہوکر آیا وہ خدا کی بادشاہت کو دنیا میں لایا کہ باطنی تاثیرات کے وسیلہ سے سوسائٹی پر حکومت کرے۔ اور نجات دہندہ ہوکر آیا۔ کیونکہ وہ گناہ سے بچانے آیا۔ یہ گناہ اپنی سزا سے بدتر تھا اور ساتھ ہی اعلیٰ نبی یا خدا کی مرضی کا کاشف ہوکر آیا۔ اور خداوند کا دُکھ اٹھانے والا بندہ اور نئے عہد کا بانی ہوکر۔ انجیل کے بیان کو درہم برہم کئے بغیر ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ یسوع نے مسیح ہونے کا دعوے کیا تھا البتہ ایک مشہور عالم ڈاکٹر ریڈے (Wrede) نامی نے ایسا انکار کیا۔ لیکن اس کو کافی جواب دیا گیا۔

ہمارے خداوند کو وہ لوگ بھی فی الحقیقت مسیح تسلیم کرینگے جو خیال کرتے ہیں کہ مسیحیت کی روحانی ذات اس کا حیات بخش عنصر ہے۔ جو یاد رکھتے ہیں کہ گو اُس نے خارجی صورت کے عوارضات کو اتار پھینکا۔ لیکن یہ تصورات اس پر ایزاد کئے یعنی خداوند کا دن۔ الٰہی نجات دہندہ۔ نبیانہ۔ دُکھ اُٹھانے اور نئے عہد کے تصورات عہد عتیق نے ان تصورات کو مسیح کے تصور سے ملحق نہ کیا تھا۔ لیکن اس نے اُن کی ان ساری امیدوں کو پورا کیا۔

دونو عہد ناموں کے درمیانی عرصہ میں یہودیوں کی تاریخ تصنیفات اور دینی ترقی

اوّل مختصر یہودی تاریخ

اسیری سے لیکر یروشلم کی تسخیر (۷۰ء) تک

۱۔ دیباچہ۔ نئے عہد نامہ کے مصنّفوں نے حوالے دئے ہیں اور ان کے زمانہ میں جو حالت تھی اُس کی توضیح کے لئے اور دونو عہد ناموں کے درمیان جو عرصہ حائل ہے اُس پر پل باندھنے کے لئے یہودی تاریخ کا مختصر بیان کرنا ضروری ہے۔ ہم اس وقت سے شروع کرینگے جب سلیمان کی وفات کے بعد داؤد کی سلطنت دو حصّوں میں منقسم ہوگئی۔ اہل یہوداہ نے اِسے بہت محسوس کیا۔ انہیں غیر منقسم سلطنت کی شان و شوکت فراموش نہ ہو سکتی تھی اور نہ وہ اس امید سے باز رہ سکتے تھے کہ ایک دن یہ سلطنتیں پھر ایک ہو جائینگی۔ یہوسفط کے ایام میں چند روز کے لئے اتحاد تو ہوگیا تھا لیکن اس کے سوا ان دونو سلطنتوں میں برابر دشمنی جاری رہی اور جیسے زمانہ گزرتا گیا ان دونو سلطنتوں نے نہ صرف آدمی بادشاہوں کے ساتھ جنگ کرنے میں اپنی قوت کو ضائع کیا۔ بلکہ باہمی جنگ و جدل اور خانگی بغاوتوں میں بھی۔

۲۔ اسرائیل کا مغلوب ہونا۔ شمالی سلطنت کی روز افزوں بت پرستی اور روحانی زوال پر عاموس اور ہوسیع نے سخت ملامت کی تھی۔ یہی سلطنت پہلے پہل بیرونی حملہ کا شکار ہوئی جس میں زبردست آسوری طاقت کا خطرہ

ان کی خود مختاری کو مدت سے لگا ہوا تھا۔ وہ ۷۳۴ق م میں ملک اسرائیل میں داخل ہوئی اور ۷۲۲ق م اس نے سامریہ کو تسخیر کر لیا جو عمری کے عہد سلطنت سے اس ملک کا دارالخلافہ تھا۔ اور آسوری بادشاہ سرگون نے وہاں کے رؤسا و شرفا میں سے ۲۷۲۹۰ باشندوں کو مسوپتامیہ اور میدیا کے علاقوں میں جلاوطن کر کے بھیج دیا اور ان کی جگہ وہ پردیسی لوگ بسا دیئے جو دریائے فرات کے میدان میں رہتے تھے۔ جو لوگ پیچھے سامری کہلائے وہ انہیں کی نسل سے تھے +

۳- یہوداہ کی اسیری۔ یہوداہ گو باجگذار بن گیا۔ لیکن یسعیاہ نبی کی نصیحت پر عمل کرنے کے ذریعہ حزقیاہ نے اپنی سلطنت کو تباہی سے بچا لیا۔ ۷۰۱ق م میں سنحریب سرگون کے جانشین نے ایک فوج یروشلم کے خلاف روانہ کی اور تقاضا کیا کہ یروشلم کو اس کے قبضے میں کر دو۔ لیکن یروشلم اُس لشکر کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوا کچھ عرصہ تک یہوداہ میں پولیٹکل رائے کا اختلاف رہا۔ ایک فریق تو اس کی تائید کرتا تھا کہ اسور یا مصر کے ساتھ اتحاد کیا جائے۔ دوسرا فریق جس میں انبیا بھی شامل تھے۔ قومی خیال بڑھانے اور غیر ملکوں کے ساتھ اتحاد وغیرہ سے کنارہ رہنے پر زور دیتا تھا۔ منسی تو پہلے گروہ میں شامل تھا اور آسوری بادشاہ کا باجگذار تھا۔ اس نے غیر ملکی عبادت اور رسوم کو داخل کرنے کے ذریعہ لوگوں کو بگاڑ دیا۔ مگر یوسیاہ نے اس کے برعکس پالیسی اختیار کی اور استثنا کی کتاب کے قوانین و شرع کی اشاعت اور تعمیل کے ذریعہ قوم کی اصلاح کی۔ اس کے زمانہ میں بابل کی بڑھتی طاقت کے آگے آسوری سلطنت پاش پاش ہونے لگی۔ اور مصر کے بادشاہ نیکو دوم کو موقعہ ہاتھ آگیا کہ جنوبی سوریا کو ملحق کرے۔ یوسیاہ نے اپنے ملک کو آزاد کرنے کی غرض سے بمقام مجدو نزد یزرعیل کے میدان میں اس سے جنگ کیا (۶۰۸ق م) لیکن میدان میں کام آیا۔ تھوڑے عرصے بعد نبوکدنضر دوم کے ماتحت اس کے

خلاف چڑھے اور کرکمیش (دواقع فرات) میں اس کو شکست دیکر (۶۰۵ق م) یہوداہ اور باقی حصہ سوریا کے مالک ہو گئے۔ مصر کی طرف سے تحریک پاکر یہودیوں نے دو دفعہ اہل بابل سے بغاوت کی۔ پہلے موقعہ پر نبوکدنضر نے یروشلم کا محاصرہ کیا اور نوجوان بادشاہ یہویاکین کو اطاعت پر مجبور کیا اور اس کی رعیت کے دیگر شرفا کے ہمراہ اُسے اسیر کر کے بابل بھیج دیا۔ ان اسیروں میں حزقیل نبی بھی تھا جس نے بابلی اسیری کا زمانہ اسی سال سے شمار کیا (۵۹۷ق م)۔ دوسرے موقعہ پر (۵۸۶ق م) اس سے بھی سخت انتظام کیا گیا۔ چونکہ یروشلم نے نبوکدنضر کا مقابلہ ڈیڑھ سال تک کیا اس لئے اب اس کو آگ لگا دی گئی۔ اس کی دیواریں گرادی گئیں بہتر سرغنوں کے سر قلم ہوئے اور صدقیاہ بادشاہ کو معہ یروشلم کے ۱۵۰۰۰ شرفا کے بابل کو جلاوطن کر دیا۔ اور جو غریب لوگ پیچھے رہ گئے ان کو خالی زمین کاشت کے لئے مل گئی۔ اُس زمانہ کی تکلیفوں سے بچنے کے لئے باقیماندہ بہت یہودی معہ یرمیاہ نبی کے مصر کو انتقال کر گئے +

یہودا تنہا اور بیکس رہ گیا۔ لیکن چونکہ اہل یہودا جیّد الطبیعت و روح کے لوگ تھے اس لئے انہوں نے پھر جلد ہی اپنے پرزے پرزے سنبھال لئے۔ خاندانوں اور فرقوں میں تقسیم کئے جانے کا قدیم طریقہ پھر جاری ہو گیا۔ ان رؤسائے خاندان اور فرقوں کے سپرد کاروبار کا اہتمام ہوا۔ ان میں جو لوگ زہد و تقوے کی طرف مائل تھے۔ وہ اطاعت توبہ اور اصلاح کے آرزومند تھے۔ اس پُرزور آرزو کے ذریعہ یہ نیا توکل پیدا ہوا کہ خدا قوموں کی عدالت اور اپنی امت کی حمایت کے لئے اٹھے گا۔ (نوحہ ۲ سے ۵ + زکریاہ ۷)۔ جو لوگ بابل میں اسیر ہو کر گئے تھے ان میں سے بعض تو وہاں ہی کے لوگوں میں مِل جُل گئے اور وہاں کی تجارت میں مستغرق ہو گئے اور اپنی قوم کے لئے معدوم ٹھہرے جیسے کہ شمالی فرقے جنہیں سارگون نے جلاوطن کیا تھا اور جن کا

اب کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔ لیکن بعض اپنی قدیم روایات میں وفادار رہے اور صیحون کی محبت اور وطن مالوف کی اُلفت اُن کے دلوں میں جاگزین تھی جہاں تک ممکن ہوا اُنہوں نے اپنی قدیم عبادات ودستورات کو قایم رکھا سوائے قربانیوں کے (کیونکہ وہ ناپاک سرزمین میں بستے تھے)۔ لیکن ختنہ۔ روزہ۔ سبت کا ماننا اور دعا کا دستور اُن میں جاری رہا (زبور ۱۳۷ + یسعیاہ ۴۰: ۳۱ + ۵۵: ۶ و ۷ + ۵۸: ۲ و ۳ و ۱۳ و ۱۴ + یرمیاہ ۲۹: ۴ سے ۹ + حزقیل ۳۶ + دانیال ۳ و ۶: ۱۰ ج)
اس وقت انہوں نے کتاب مقدس کا مطالعہ زیادہ سرگرمی سے کرنا شروع کیا اور کتاب مقدس کی نقلیں بہت ہونے لگیں۔ اس لئے فقیہوں کے فرقے نے بڑا عروج حاصل کیا۔ اپنی مصیبت کو اُنہوں نے خدا کی طرف سے سزا سمجھا اس لئے انکے حب الوطنی اور دینی خیالات زیادہ گہرے اور عمیق ہوتے گئے۔

(۴) فارسی حکومت۔ ۵۳۶ ق م میں فارس کے بادشاہ خورس دوم کے زور بازو کے سامنے بابل کی سلطنت مغلوب ہوگئی۔ دیندار یہودیوں نے اس انقلاب سلطنت کو خیر مقدم کہا اور اس پر خوشی منائی اور یہ زمانہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ خورس زردشت مذہب کا پیرو تھا اس لئے وہ دوسرے مذاہب کی عزت وتوقیر اور حفاظت کرنے کا مجاز تھا۔ اس نے ملک پر قابض ہوتے ہی فوراً ایک یہودی رئیس شیش بزر نامی کو اُس کے معہ چند ہموطنوں کے یروسلم بھیجا اور اُسے اختیار دیا کہ ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرے فلسطین کے یہودیوں اور ان کے قرب وجوار کے لوگوں اور سامریوں نے اس تعمیر کے کام میں ان کی مخالفت کی اور کام کو روکنا چاہا لیکن پھر بھی یہ کام ۵۱۵ ق م میں سرانجام کو پہنچا۔ اس کام میں حجی اور زکریاہ نبی زر بابل۔ یہوداہ کا فارسی حاکم اور یہوشع سردار کاہن شریک ومددگار تھے مگر یہ معلوم ہوا کہ ہیکل کی ترتیب اور عبادت کو تسلی بخش طور سے قایم رکھنا ناممکن تھا۔ اور یروسلم کی حالت

آگے سے بدتر ہوتی گئی۔ نحمیاہ اور عزراہ کے زمانہ تک (۴۴۴ سے ۴۳۰ ق م) اس قوم کی رہائی مکمل نہ ہوئی اور نہ ان کی روش زندگی اور دین مستقل بنا پر قایم ہوئے۔ اس وقت بابل کے یہودیوں کا ایک بڑا گروہ یروسلم کو واپس گیا۔ دیواریں دوبارہ تعمیر ہوئیں اور یہودیوں پر الٰہی شریعت کی اطاعت لازمی ٹھیری۔ اور ہیکل ان کی عبادت کا مرکز قرار پایا اور کاروبار کا انتظام جہاں تک کے دمشق کے فارسی صوبہ دار نے اس کی اجازت دی یہودیوں کے بزرگوں یا سرخاندان کے سپرد ہوا اور سردار کاہن ان سب کے اوپر تھا۔ ان کی حالت کی ترقی ایسی آشکارا تھی کہ سامریوں نے بھی ان کے انتظام کی نقل کی۔ توریت کو قبول کیا اور کوہ گرزیم پر ایک دوسری ہیکل تعمیر کی اور ایک سردار کاہن کو مقرر کیا (یوحنا ۴: ۲۰)+

اس کے مابعد سو سال تک ان کی حالت پر پردہ ظلمت چھایا رہا۔ البتہ اتنا کہل سکتے ہیں کہ نحمیاہ اور عزراہ کے قوانین جاری رہے اور سردار کاہن کے عہدہ کی عزت اور توقیر روز افزوں ہوئی۔ البتہ ایسے لوگوں کا شمار بمقابلہ دوسرے یہودیوں کے بہت مفقود تھا اور وہ بھی یروسلم کے دس پندرہ میل کے فاصلہ کے اندر ہی اندر جو اپنی یہودی خصوصیت اور عبادت اور آباواجداد کے دستورات کو قائم رکھ سکتے تھے۔

۵۔ اسکندر اعظم اور اُس کے جانشین۔ اسکندر اعظم کی فتوحات نے (۳۳۴ سے ۳۲۳ ق م) فارسی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ جو فتوحات بتدریج بمقام گرانیکس (Granicus ۳۳۴ ق م)۔ اور اسس (Issus ۳۳۳ ق م) میں حاصل ہوئیں اور جو مہمات مصر اور مشرق میں متواتر ہوتی رہیں ان کے ذریعہ وہ سارے ایشیا کا مالک ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یروسلم صلح وامن کے ساتھ اس کے قبضہ میں آگیا یوسیفس نے اپنی تاریخ قدامت میں۔ بدورع سردار کاہن اور سرگروہ باشندوں کا بیان لکھا ہے کہ وہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ

اس کے استقبال کو نکلے اور اسکندر اعظم بہت تپاک اور عزت سے ان کے ساتھ پیش آیا۔ لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ یہ قصہ مابعد زمانہ کی گھڑت ہے۔ بہر حال اُس نے اپنے تئیں یہودیوں کا حامی ظاہر کیا اور اُن میں سے بعضوں کو اپنے نئے دارالخلافہ اسکندریہ میں آباد کیا اور کئی خاص حقوق اُن کو عطا کئے۔ یہاں ان لوگوں نے بڑی ترقی کی اور ایک بڑی اور سرسبز بستی بن گئی۔ اسکندر اعظم کے ذریعہ بہت سے نئے خیالات اور مغربی طرز زندگی کا دور دورہ ہو گیا اور جن لوگوں کو اُس نے فتح کیا تھا اُن میں یہ خیالات بہت سرایت کر گئے۔ یونانی زبان اور علم ادب کا ان میں بہت رواج ہو گیا اور یونانی شہروں کے انتظامات وغیرہ کو انہوں نے اختیار کر لیا۔ پہلے پہل تو اہل یروشلم نے ان یونانی رغبتوں کی بہت مخالفت کی لیکن اثنائے زمانہ میں دوسری جگہوں کی طرح خود یروشلم میں ان کا رواج ہو گیا اور اس وقت کے واقعات پر انکا بہت اثر ہوا +

اسکندر کی وفات کے بعد (۳۲۳ ق م) اس کے مقبوضات کی نسبت اُس کے جرنیلوں میں سخت جنگ وجدل ہوا اس ابتری میں سے دو نئی سلطنتیں نکلیں۔ مصر کی اور سوریا کی۔ ان دونو کے درمیان فلسطین واقعہ تھا۔ اس کی نسبت دیر تک تنازعہ رہا۔ لیکن ایپسس کی لڑائی (۳۰۱ ق م) کے بعد یہ آخر کار مصر کے ہاتھ آ گیا +

۶۔ بطلیمی۔ مصر میں یونانی خاندان کا بانی بطلیمی تھا۔ اُس کے جانشینوں نے یہی لقب اپنے لئے اختیار کیا۔ اور امتیاز کے لئے خاندانی نام بھی اس پر مزید کیا۔ پہلے تین بطلیمی کے عہد سلطنت میں یہودی قناعت سے رہے اور مالا مال ہوتے گئے اور مصر میں ان کی آبادیاں ترقی کرتی چلی گئیں۔ ان آبادیوں میں ان کو عام اجازت تھی کہ عبادت خانے بنائیں اور اپنے مذہبی رسوم بجا لائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانیت (Hellinism) سے انکا زیادہ گہرا تعلق ہو گیا اور اُسکے

ساتھ ان کی ہمدردی ہو گئی۔ جو یہودی یہاں آن کر آباد ہوئے تھے انہوں نے دینی اور تمدنی وجوہات سے یروشلم کے ساتھ اپنا راہ و ربط رکھا۔ اور بڑی عیدوں کے وقت گاہے گاہے وہاں چلے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے ذریعہ یونانی رغبتیں اور تاثیریں اس قوم میں سرایت کر گئیں۔ اسی عرصہ میں مقدس نوشتوں کا ترجمہ یونانی میں ہوا جو ستروں کے ترجمہ کے نام سے مشہور ہے۔ کم سے کم توریت کا ترجمہ مصری یہودیوں نے یونانی میں کیا ہوگا۔ بطلیمی دوم فلاڈلفیس کے عہد سلطنت میں (۲۸۴ سے ۲۴۶ ق م)۔

مگر یہ امن وامان کا زمانہ قایم نہ رہا اور جب بطلیمی چہارم فلوپیٹر مصر کے تخت پر بیٹھا تو فلسطین کے بارہ میں تنازعہ پھر برپا ہو گیا۔ چونکہ یہ بادشاہ کمزور اور عیاش تھا اس لئے سوریا کے بادشاہ انتی اوخس سوم کو جو اعظم کے لقب سے ملقب تھا موقعہ مل گیا اور اُس نے اس کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔ لیکن جب انتی اوخس کو بمقام رفیاہ (۲۱۷ ق م) میں شکست فاش ہوئی تو اُس نے اپنی تجویزوں کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا۔ اس سے یہودیوں کو خوشی حاصل ہوئی۔ جب فلوپیٹر نے وفات پائی اور اس کا نابالغ بیٹا بطلیمی پنجم اپی فینیس تخت نشین ہوا تو اُس سریانی بادشاہ نے از سر نو جنگ چھیڑ دی اور (۱۹۸ ق م) میں بمقام پنیم دریائے یردن کے چشموں کے متصل مصریوں پر کامل فتح حاصل کی۔ شاہان مصر کی بدنظمی اور بدنسقی کی وجہ سے اس انقلاب سلطنت کو یہودیوں نے اپنی خوش قسمتی سمجھا اور انہوں نے انتی اوخس کی مدد کی کہ مصری فوج کو یروشلم سے خارج کر دے +

۷۔ سیلیوکس۔ سوریا کا پہلا یونانی بادشاہ اسکندر کا سب سے اعلے جرنیل سلیوکس تھا۔ اس کے جانشینوں نے یا تو سلیوکس کا نام اختیار کیا یا انتی اوخس کا لیکن خاندان بحیثیت مجموعی سلیوکی کہلاتا ہے۔ انتی اوخس اعظم فلسطین کا نیا حاکم۔ اس خاندان کے بانی سے پانچواں تھا۔ یہودیوں کو جو حقوق مصری بادشاہوں نے عطا کئے

معاملے میں اس نے کچھ کمی بیشی نہ کی بلکہ ان سے بڑھکر عنایات کیں۔ اور مذہبی امور میں ان کو پوری آزادگی عطا کی۔ مگر اس سریانی حکومت کا یہ نتیجہ ہوا کہ خود یہودیوں میں نفاق پڑ گیا۔ اور وہ ایسی تکلیفات میں مبتلا ہوئے جن کا انہوں نے کبھی تجربہ حاصل نہ کیا تھا۔ انطاکیہ یعنی سریانی دار الخلافہ یونانیت (Hellenism) کا بڑا مرکز تھا۔ اور اس کے ساتھ جو آمدورفت کے وسایل حاصل ہو گئے تھے۔ اس کے ذریعہ یونانی راہ و رواج کا یہودیہ میں زیادہ دخل ہو گیا۔ جلد یروشلم میں ایک زبردست یونانی گروہ پیدا ہو گیا اور جو لوگ اب تک قومی تصورات پر قایم تھے اُن سے اُن کی مٹھ بھیڑ ہوئی۔ اور شرعی راستبازی کے بارہ میں جھگڑا ہوا۔ انتی اوخس اعظم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سیلیوکس چہارم فلوپے تُر (۱۸۷ ق م سے ۱۷۵ ق م) نے یروشلم کے معاملہ کو اور بھی مستقل کر دیا کیونکہ اس نے قومی فریق کو دبانے اور ہیکل کو لوٹنے کی کوشش کی۔ اس کے جانشین انتی اوخس چہارم اپی فینس کے عہد سلطنت میں (۱۷۵ سے ۱۶۴ ق م) یہ خرابی کمال تک پہنچ گئی۔ اونیاس سردار کاہن اور صحیح فریق کے پیشوا نے توبیاہ کے بیٹوں اور یونانی مائل یہودیوں کو یروشلم سے نکال دیا۔ اپی فینیس نے مداخلت کی اور اونیاس کو معزول کر کے اپنے ایک پروردہ یاسون نامی کو سردار کاہن بنا دیا۔ بعد ازاں منی لاؤس کو۔ اونیاس معہ دیگر دیندار یہودیوں کے مصر کو چلا گیا اور بمقام لیون ٹوپوکس ایک یہودی ہیکل تعمیر کی (۱۷۰ ق م) اب یروشلم باغیانہ خیالات سے بھرا تھا اور یہ افواہ مشہور ہو گئی تھی کہ اپی فینیس مصر میں لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اس کی وجہ سے یہودیوں نے علم بغاوت کو بلند کیا۔ اس بغاوت میں منی لاؤس کے حامی مارے گئے۔ اپی فینیس نے مصر سے واپس آنے پر نہ صرف بغاوت کو فرو کرنے کی کوشش کی بلکہ بغاوت کے چشموں کو بھی بند کرنا چاہا۔ باغیوں کے ساتھ اس نے بہت بے رحمی سے سلوک کیا اور ہیکل میں گھس گیا اور وہاں کے سارے

خزانے اور مقدس ظروف لوٹ لئے اور یونانی مذہب کے مطابق عبادت کو رواج دیا اور یونانی دیوتا زیوس کی مورت ہیکل میں نصب کی۔ کہتے ہیں کہ اس مورت کے خط و خال خود اس سے مشابہ تھے۔ ساتھ ہی اس چھوٹی ریاست کو یونانی جمہوری انتظام کے قالب میں ڈھالا اور اس پر ایک شاہی کمشنر مقرر کیا اور جو لوگ یہودی دستورات پر اصرار کرتے اور بت پرست دیوتا کے آگے قربانی چڑھانے سے انکار کرتے تھے ان کو سخت عذاب۔ شکنجہ و موت کی سزا دی۔ اس کی وجہ محض یہ نہ تھی کہ وہ یہودی دین کا ایسا مخالف تھا بلکہ وہ بغاوت و سرکشی کے خیالات کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے جن یہودیوں نے یہودی دستورات بدستور جاری رکھے اور بت پرست دیوتا کے آگے قربانی کرنے سے انکار کیا ان کو سخت عذاب و شکنجہ کی سزا دی ۔

اب ہم اس موقعہ پر پہنچ گئے ہیں جو یہودی تاریخ میں بالعموم سب سے اعلےٰ زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ محبان وطن کے فریق میں سے بہتوں نے جو حسیدیم یا راستبازوں کے لقب سے ملقب تھے۔ اپنی جانوں کو دینا قبول کیا لیکن اپنے اصولوں کو ترک نہ کیا۔ اس لئے آیندہ شہیدوں کے لئے عمدہ نمونہ چھوڑ گئے۔ ان میں سے بعض ملک کے بیابانوں میں بھاگ گئے اور اگر وہ سبت کے روز گرفتار ہوتے تو اپنے بچاؤ کی کوشش بھی نہ کرتے مبادا ان کے اس فعل سے سبت ٹوٹ جائے۔ اپنے ایذا دہندوں کے عداوت و ظلم کو خاموشی سے سہہ لیا۔ لیکن انسانی برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر کار تنگ آمد بجنگ آمد کا معاملہ ہوا اور آزادگی کے لئے بہادرانہ جنگ کی۔ ایک بوڑھے دیہاتی کاہن اور حشمون کے خاندان کے سر نے بمقام موڈین پہلی ضرب لگائی۔ یہ جگہ بیت حاران اور لدیا کے مابین واقع تھی۔ جب اس نے ایک یہودی کو بتوں کے آگے قربانی چڑھاتے دیکھا تو یہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے اس

یہودی کو معہ سوریانی افسر آپی کس کے کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد اپنے
پانچ بیٹوں کے ہمراہ بیابان کو بھاگ گیا اور اس نے دوسروں کو بھی اپنے پاس جمع کیا
اور علم بغاوت بلند کیا۔

۸۔ مکابی۔ متتھیاس تو ۱۶۶ قم میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کا
بیٹا یہوداہ نامی جو پیچھے مکابی (یعنی ہتھوڑا) کے نام سے مشہور ہوا ان کا سرگروہ بنا۔
اور دو سال سے کم عرصہ ہی میں بیت حوران۔ بیت صور میں بڑی فتوحات حاصل
کیں۔ یہودیہ کو سریانیوں سے پاک کر دیا۔ صرف یروشلیم کے قلعہ عکرا میں ایک دستہ
فوج رہ گیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۶۵ قم کو ہیکل کی ازسر نو تقدیس ہوئی اور اس کی
عبادت بحال کی گئی۔ جو عید تجدید یہودی اب تک مانتے ہیں وہ اسی کی یادگار
میں شروع ہوئی۔ ۱۶۳ قم میں لسیاس سوریا کا حاکم بادشاہ انتی آخس پنجم
یوپے ٹر کی طرف سے ایک فوج جرار لیکر عکرا کی فوج کی کمک کے لئے آیا لیکن یہوداہ
نے تسلی بخش شرائط اس کے ساتھ کیں۔ ان کے مطابق یہوداہ کے قلعے خالی کئے گئے۔
لیکن یہودی دین کے ماننے کی پوری آزادی حاصل ہوئی۔ اس عہد و پیمان کے
ذریعہ لڑائی کی دینی صورت جاتی رہی اور بیشتر حسیدیم میں یہودیوں نے ہتھیار
رکھ دیئے۔ لیکن یہوداہ نے اس پر قناعت نہ کی اور اس نے ارادہ کیا کہ جب تک
ملکی آزادگی حاصل نہ ہوگی میں لڑائی جاری رکھونگا۔ لیکن جب سوریانی بادشاہ
کے ایک پروردہ الکیمس نامی کو جو ایک عیاش یونانی مائل یہودی تھا۔ سردار
کاہن بنانے لگے تو یہوداہ نے سخت مخالفت کی اور سوریانی جرنیل نکانور پر
فتح پائی لیکن ۱۶۱ قم میں بمقام الیسح (Eleasa) بکی دیس کے سامنے
شکست پائی اور لڑائی میں کام آیا۔

یہوداہ کا بھائی یونتن سرگروہ مقرر ہوا اور الکیمس کی وفات کے

بعد (۱۶۰ قم)۔ سارے کاروبار کا اہتمام اس کے ہاتھ میں آگیا۔ چونکہ یہ بہادر
اور مستقل مزاج شخص تھا اس نے اس موقع سے خوب کام لیا۔ کیونکہ اس وقت
سریانی حکومت کو طرح طرح کی تکلیفوں سے سامنا کرنا پڑا اس لئے اس نے
یہودی حکومت کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ ۱۴۳ قم میں سریانی جرنیل ٹریفو
نامی نے اسے فریب سے مار ڈالا۔ اس لئے اس کی جگہ متتھیاس کا دوسرا بیٹا شمعون
نامی سرگروہ ہوا۔ اسی نے یروشلیم کے سریانی دستہ فوج کو یروشلیم سے نکل جانے پر
مجبور کیا اور یوں اس نے ملکی حکومت کے آخری بقیہ سے بھی اپنے ملک کو پاک و صاف
کر دیا۔ اس لئے لوگوں نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ اسے تیسرے عہدہ پر ممتاز
کیا۔ وہ سردار کاہن بھی ہوا اور سرلشکر اور بادشاہ (Ethnarch) بھی۔ اور
پہلے یہودی سکے اس کے نام سے جاری ہوئے (۱۴۱ قم)۔

آزادگی۔ جب سوریانی حکومت زوال پکڑ رہی تھی تو شمعون کو موقع مل گیا
کہ اس نئی یہودی حکومت کو مضبوط کرے اور اپنے رسوخ کو رومیوں کے ساتھ
بڑھائے اور ان سے دوستی پیدا کرے۔ ۱۳۵ قم میں اس کے حریص داماد
بطلیموس نے اسے اور اس کے دو بیٹوں کو یریحو کے متصل ڈاک کے قلعہ میں قتل کر دیا
اور اس کا تیسرا بیٹا یوحنا ہرکانیوس اس کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ اگرچہ سریانیوں نے
اپنی حکومت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہرکانیوس نے اپنی خود مختارانہ
حکومت قائم رکھی۔ بلکہ اسے توسیع دی۔ (۱) ایک تو اس نے سامریہ کو فتح کیا۔ اور
کوہ گرزیم کی سامری ہیکل کو مسمار کیا۔ (۲) ادومیہ کے علاقہ کو تسخیر کیا۔ اور انہیں
شریعت اور ختنہ کے ماننے پر مجبور کیا۔ اس کے زمانہ میں حشمونی آل خاندان نے
محبان وطن کے فریق کی ہمدردی کو کھو دیا۔ یہ فریق پیچھے فریسی کہلایا۔ اور صدوقیوں
کے ساتھ زیادہ راہ و ربط حاصل کیا۔ یہ صدوقی فریق صلح کل جیسے لوگ تھے۔ لیکن

دنیاوی اور حریص ۔

ہرکانیوس کے بعد اس کا بیٹا ارستوبولس اول جانشین ہوا۔ اُس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور غیر ملکی دربار کے طرز و طریق کو اختیار کیا۔ اِس نے صرف ایک سال سلطنت کی (سنہ ۱۰۴ ق م) لیکن اس عرصہ میں اُس نے اطوریا کے علاقہ کو ملحق کر لیا (جو انجیلوں میں جلیل کے نام سے مشہور رہے) اور وہاں کے لوگوں کو یہودی دین قبول کرنے پر مجبور کیا ۔

اُس کا بھائی اسکندر جانیوس (۱۰۳ سے ۷۶ ق م) ایک تند خو اور جنگ جو بادشاہ تھا۔ اِس نے اپنی سلطنت کی حدود کو اور بھی توسیع دی اور یہودیہ کو فلسطین میں ایک اعلےٰ طاقت بنا دیا۔ اس کے زمانہ میں حشمون کا خاندان عروج کی چوٹی تک پہنچ گیا۔ اور پھر اس کا زوال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یہ خاندان بالکل پست ہوگیا۔ چونکہ اس شخص کا مزاج اور چلن سردار کاہن کے عہدہ کے شایان نہ تھا اس لئے فریسی اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اُس نے بھی اُن پر بہت جور و ظلم کئے۔ اس لئے تقریباً تیس ہزار فریسیوں نے بھاگ جانے ہی میں اپنی سلامتی سمجھی اپنی وفات کے وقت اُس نے وصیت کی کہ اس کا بیٹا ہرکانیوس سردار کاہن بنے اور ملکی حکومت و اختیار اُس کی بیوی اسکندرہ کو۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی بیوی کو یہ صلاح دی تھی کہ فریسیوں کے ساتھ صلح کرے۔ اس ملکہ کے عہد سلطنت میں کاروبار کا اہتمام فریسیوں کے سپرد تھا۔ اور سلطنت کو جو وسعت میں داؤد کی حکومت کے لگ بھگ تھی امن و آرام حاصل ہوا۔ لیکن اُس کی وفات کے بعد (سنہ ۶۷ ق م)۔ اس کے بیٹوں ارستوبولس اور ہرکانیوس کے درمیان حکومت کے باعث میں سخت خانہ جنگی ہوئی۔ ان میں سے ارستوبولس تو بڑا چالاک اور بہادر مرد تھا لیکن ہرکانیوس کمزور و غیر مستقل اور ایک ادومی شخص انتی پیتر کے ہاتھ میں تقریباً کاٹھ

کی پتلی کی طرح تھا۔ چونکہ رومی حکومت اب آسیا میں قایم ہو چکی تھی اس لئے ہر دو فریق نے کوشش کی کہ تحفے تحایف اور نذر و نیاز کے ذریعہ ان کو اپنا حامی بنائے۔ سنہ ۶۳ ق م میں رومی جرنیل پمپی سے بمقام دمشق فریاد کی گئی۔ اور اُس نے فوراً یروشلم پر چڑھائی کی۔ اور ہرکانیوس کو سردار کاہن مقرر کیا اور تھوڑا علاقہ بھی اس کو دیدیا لیکن ارستوبولس کو اُس کے دو بیٹوں کے ہمراہ روم بھیج دیا ۔

۱۰۔ رومی حکومت۔ (۱) ہیرودیس ہرکانیوس دوم ورمیں سال سردار کاہن رہا۔ لیکن فی الحقیقت ساری قدرت و اختیار جو سوریا کے رومی گورنر کی طرف سے ملے تھے انتی پیتر کو حاصل تھے۔ اس عرصے میں چند شہر جو ساحل سمندر اور علاقہ پیریا میں واقع تھے یہودی تصرف سے نکل گئے۔ اور دکاپوس کے نام سے ایک علیحدہ ریاست قایم ہو گئی (متی ۴-۲۵)۔ ارستوبولس اور اس کے بیٹوں نے روم سے بھاگ آنے کی سعی بلیغ کی تاکہ کسی طرح سے تاج شاہی حاصل کریں لیکن ایسی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتی پیتر کا زور و اختیار اور بھی بڑھ گیا۔ سنہ ۴۳ ق م میں کسی یہودی رئیس نے اُسے زہر دیکر مار ڈالا۔ اُس کے مرنے کے بعد حکومت اُس کے بیٹوں ہیرودیس اور فسائیل (Phasael) میں منقسم ہوگئی۔ ان دونو نے بادشاہ (Tetrarch) کا لقب اختیار کیا۔ اس سے تھوڑے عرصے بعد پارتھیوں نے سوریا پر حملہ کیا اور رومیوں کو اپنے سامنے سے بھگا دیا۔ اور ارستوبولس کے بیٹے انتی گونس کو یہودی تخت پر مسلط کیا۔ فسائیل اسیر ہو کر مارا گیا۔ چونکہ ہرکانیوس کے کان کاٹے گئے تھے اس لئے وہ سردار کاہن کے عہدے کے لایق نہ رہا۔ ہیرودیس روم کو بھاگ گیا وہاں وہ مورد الطاف شاہی ہوا اور سینٹ (Senate) کی طرف سے یہودیوں کا بادشاہ نامزد ہوا۔ اور رومیوں کی کمک لیکر یہودیہ کو واپس آیا۔ اس نے جلد یروشلم کو فتح کر لیا اور انتی گونس کو مار ڈالا (سنہ ۳۷ ق م)۔ یہی زمانہ کے شروع ہونے

تک یہ اپنے منصب پر قایم رہا۔

ہیرودیس کی ظاہری شان وشوکت کی وجہ سے اُس کو اعظم کا خطاب حاصل ہوا لیکن یہ شخص نیک و بد کی چنداں امتیاز نہ کرتا تھا۔ ظالم مزاج اور عیاش طبع تھا اپنے زور و اختیار کو قایم رکھنے کی خاطر اُس نے اُن رومی فریقوں سے خوشامدانہ سلوک کیا جو یکے بعد دیگرے زور پکڑتے گئے کسی نہ کسی بہانہ سے اس نے حشمانی خاندان کے رہے سہے لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ ان مقتولوں میں ایک تو اسکی اپنی بیوی مریمنی تھی اور دو بیٹے جو اس بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ملکی سازش اور وحشیانہ قتل اس کے عہد سلطنت کے خاص نشان تھے۔ ساتھ ہی اُس نے جاہ و جلال پیدا کرنے کی کوشش کی اور رفاہ عام کے لئے کئی ایک عمارات تعمیر کروائیں۔ اور اپنی ساری سلطنت میں نظم ونسق کو قایم کیا اور آمد و رفت کو ترقی دی۔ اپنے آپ کو یونانی مائل یہودی (Hellinistic) بادشاہ دکھلانے کی غرض سے اس نے یونانی طرز کے کئی ایک نئے شہر بنوائے مثلاً قدیم سامریہ کی جگہ شہر (ق م) سباستا (Sebaste)۔ اور شہر قیصریہ ۲۲ سے ۱۰ ق م یہ شہر پیچھے سلطنت کا دوسرا شہر ہوگیا۔ اس نے یروشلم میں تماشا گاہ۔ مدور دنگل بنوائے کئی ایک مندروں برآمدوں اور حماموں کو غیر ملکی شہروں میں تعمیر کروایا۔ اُس کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اُس نے یروشلم کی ہیکل کی تعمیر از سرنو کی۔ یہ تعمیر ۲۰ ق م میں شروع ہوئی اور ہمارے خداوند کے دنوں میں بھی تکمیل کو نہ پہنچی تھی (یوحنا ۲: ۲۰)۔ اس نے اپنی یہودی رعایا کی دلجوئی کی بہت کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ اس نے یہودی روایتوں کی عزت کی اور دیگر ملکوں میں ان کی بستیوں کی حفاظت کے لئے اپنے رسوخ سے کام لیتا رہا۔ لیکن آخری دم تک یہودی اس سے نفرت کرتے رہے۔ خاصکر فریسی گروہ کے لوگ یہ لوگ شریعت کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی عمل کرتے اور انبیاء کا مطالعہ کرتے اور مسیح کی سلطنت کی امید پر دل دادہ تھے۔

یہ ہیرودیس ۴ ق م میں مرگیا۔ اُس کی وفات کے بعد رومیوں کی صلاح سے اُس کی سلطنت اُس کے تین بیٹوں میں منقسم ہوگئی۔ ارخلاؤس تو یہودیہ اور سامریہ کا حاکم ہوگیا۔ ہیرودیس انتپاس گلیل اور پریا کا حاکم ہوا اور فلپ کو یردن کے پار کا علاقہ ملا۔ سنہ ۶ء میں ارخلاؤس بدچلنی کی وجہ سے معزول ہوگیا۔ اور اس کی ریاست ایک رومی (Procurator) کلکٹر کے سپرد ہوئی۔

(۲) پروکیوریٹر (Procurators) مفصلہ ذیل اشخاص یہودیہ اور سامریہ کے پروکیوریٹر یا کلکٹر تھے (سنہ ۶ سے ۴۱ء)۔ کوپونی اس۔ ایم۔ امبی وی اس۔ انیوس۔ رونس ویلیریس۔ گریٹس (سنہ ۱۵ سے ۲۶ء)۔ پنطس پلاطس (سنہ ۲۶ سے ۳۶ء)۔ مارسلس (سنہ ۳۶ و ۳۷ء)۔ مروس (سنہ ۳۷ سے ۴۱ء)۔ دانستہ یا نادانستہ یہ حکام یہودیوں کو ناراض ہی کرتے رہے۔ جور و تعدی کے علاوہ جو ان کا شعار ہوگیا تھا۔ لگان اور ٹیکس کا وصول کرنا جو ان کا فرض تھا یہودیوں پر شاق گزرا اور اس سے وہ ہمیشہ نالاں رہے پنطس پلاطوس جس نے مسیح کو مصلوب کرانے کے ذریعہ ایسی بدنامی حاصل کی یہودیوں کو ہمیشہ ستاتا رہا۔ اور اسی وجہ سے وہ آخر کار روم بلا لیا گیا۔ ان حکام کا صدر مقام قیصریہ تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بڑی عید کی تقریب پر پلاطوس یروسلم میں تھا جب مسیح کے خلاف ہنگامہ ہوا۔ اس انتظام کے ذریعہ جابجا ناراضگی پھیلی ہوئی تھی۔ اور زیلوتی فرقے نے اس ناراضگی کی آگ کو اور بھی مشتعل کردیا۔ یہ زیلوتی فرقہ انقلاب چاہتا تھا اور مسیح کی سلطنت کو بزور شمشیر قایم کیا چاہتا تھا۔

(۳) **ہیرودیس اگرپہ** تھوڑے عرصہ کے لئے وہی پرانا طرز حکومت جاری رہا۔ جو ہیرودیس اعظم کے وقت میں مروج تھا۔ سنہ ۳۴ء میں فلپ شمالی حصہ کا حاکم جو تھا مرگیا۔ اور سنہ ۳۷ء میں اس کا علاقہ اگرپہ کو مل گیا۔ جو ہیرودیس اعظم کا پوتا تھا اور جسے بادشاہ کا خطاب عطا ہوا۔ سنہ ۴۰ء میں ہیرودیس انتپاس کا ملک بھی اُسے مل گیا جس نے

یوحنا بپتسمہ دینے والے کو قتل کیا تھا اور جسے اس کی بدچلنی اور حرص کی سزا یہ ملی کہ وہ
علاقہ گال میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس سے ایک سال بعد یہودیہ اور سامریہ کے پروکیوریٹر
کا عہدہ بھی موقوف ہو گیا۔ اس لئے اگرپہ کے ملک کو اور بھی وسعت حاصل ہوئی اور
یہ علاقے بھی اس کی ریاست میں شامل ہو گئے اس لئے اس کی سلطنت وسعت میں
تقریباً اسی قدر ہو گئی جس قدر کہ اس کے دادا کی حکومت تھی۔ اس کی حکمت عملی یہ تھی کہ
فریسیوں کو خوش کرے اور رومیوں کو بھی ناراض نہ کرے۔ اس لئے اس نے فریسی ریت
و رسوم پر عمل کیا اور یہودی تعصبات اور روایات کی توقیر کی اور ابتدائی مسیحی کلیسیا کو ستایا
(اعمال ۱۲: ۱ سے ۱۵) تین سال حکومت کرنے کے بعد قیصریہ میں وہ ناگہان موت کا
شکار ہو گیا (اعمال ۱۲: ۲۰ سے ۲۳)۔ چونکہ اس کا بیٹا اگرپہ دوم حکومت کے لئے نابالغ تھا
اس لئے وہ برطرف کر دیا گیا۔ اور اس کی ساری ریاست پروکیوریٹرز کے ماتحت کر دی
گئی اور یہ حاکم سوریا کے گورنر کے زیر حکومت تھے۔

(۴) فلسطینی پروکیوریٹرز۔ ان کا یہ سلسلہ تھا۔ کسپیوس فیڈس (۴۴ء
سے ۴۶ء)۔ ونٹی ڈیئوس کومانس (۴۸ء سے ۵۲ء)۔ فیلکس (۵۲ء سے ۶۰ء)۔
پورکیوس فیسطس (۶۰ء سے ۶۲ء)۔ البینس (۶۲ء سے ۶۴ء)۔ کسپیوس
فلورس (۶۴ء سے ۶۶ء)۔ ان کے عہد سلطنت میں وہ حالات اور بھی خراب ہو گئے
جو پہلے حکام کے زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ غلط فہمی جور و ستم کے ذریعہ یہودیوں کی دشمنی و
کشیدگی زیادہ گہری ہوتی گئی۔ اسکندر گو یہودی نسل سے تھا لیکن بہت ہی سنگدل
اور ظالم تھا۔ فیلکس ایسا ظالم اور متعصب شخص تھا کہ اس کی بدسلوکی کی وجہ سے جابجا
فساد ہونے لگے اور زیلوتی لوگ تعداد اور گستاخی میں ترقی کر گئے اور اب وہ سکارائی
(Scarrii) (سیکہ (sica) ایک اوزار کا نام تھا جس کی وجہ سے یہ
لوگ سکارائی کہلائے۔ اور سارے ملک میں بغاوت ہی بغاوت پائی جاتی تھی

فلورس نے یہاں تک سختی کی کہ لوگوں کو زیادہ برداشت کی تاب نہ رہی۔
قیصریہ میں پہلا ہنگامہ برپا ہوا۔ اس غیر قوم شہر میں یہودیوں کی بڑی بستی تھی
یہ لوگ اسی وقت ساری مہذب دنیا میں منتشر تھے اور ان کی بستیاں۔ تبوتیہ، آسیہ کوچک
بالائی اور زیریں مصر۔ یونان اور اٹلی میں پائی جاتی تھیں۔ قیصریہ کے یہودی اپنے تمدنی
حقوق کھو بیٹھے تھے۔ بازاروں میں برملا ان کی بے عزتی اور ان سے بدسلوکی ہوتی تھی
آخرکار ان کو وہ شہر مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ فلورس نے اسے اچھا موقعہ پا کر ہیکل کے
خزانے اور یروشلم کے بالائی شہر کو لوٹا اور وہاں کے بہت باشندوں کو تہ تیغ کر دیا۔
اس وجہ سے یہ لوگ انتقام پر آمادہ ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر سارے
ملک میں یہودی اور غیر قوم دست بگریبان ہو گئے۔ حاکم نے سوریہ کے گورنر
سیتیس گالیوس سے مدد کی درخواست کی۔ یہ گورنر تئیس ہزار جرار فوج لیکر
اس کی کمک کو روانہ ہو گیا۔ اور آناً فاناً گلیل کو تسخیر کر کے یروشلم کے سامنے آموجود
ہوا۔ لیکن یہ بھاگنے پر مجبور ہوا اور یہودیوں نے اس کا تعاقب کیا اور بمقام بیتہ مکن
اسے شکست فاحش دی اور اسے بہت نقصان پہنچایا۔ اس پر روم نے اپنا سب سے
بڑا تجربہ کار سپہ سالار ویسپے شی ان نامی کو لشکر دیکر جنگ کے لئے روانہ کیا۔ ۶۷ء
کی موسم گرما میں اس نے دیہاتی علاقوں کو مغلوب کر لیا۔ اور بہت چھوٹے شہروں
کو بھی لے لیا۔ جو اسیر اس وقت گرفتار ہوئے ان میں یوسیفس مورخ بھی تھا۔ اس وقت
اس نے یروشلم کو نہ چھیڑا کیونکہ وہاں پریشانی اور مذہبی جنون ہی لوگوں کو فنا کر رہے
تھے اور محصورین کے شمار کو گھٹا رہے تھے۔ چھبیس ہزار آدمیوں کی مدد سے زیلوتیوں کو
پورا غلبہ حاصل ہو گیا۔ لیکن متواتر جھگڑوں اور خونریزیوں نے وبا اور کال کے ساتھ
مل کر شہر کو سخت آفت میں مبتلا کر دیا۔ ۶۹ء کی موسم گرما میں۔ روم میں ویسپے شی ان
شہنشاہ مشتہر کیا گیا اور جنگ کا اہتمام اس کے بیٹے طیطس کے سپرد ہوا۔ یروشلم کا

محاصرہ چار مہینے تک رہا۔ اس عرصہ میں لوگوں کو سخت مصیبتوں کا سامنا پڑا اور خون کی ندیاں بہ گئیں۔ آخر کار ۷۰ء کو اگست کے مہینے میں یروشلم کو اس نے تسخیر کر لیا۔ طیطس ہیکل اور شہر کو بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے سپاہیوں نے اُسے آگ لگا دی اور جلا کر خاک سیاہ کرا دیا۔ اکثر باشندے تہ تیغ ہوئے اور جو بچ رہے وہ غلامی میں بیچے گئے یا روم میں بادشاہ کی فتحیابی کی خوشی منانے کے لئے رکھے گئے۔

مسیح نے جو آگاہی چالیس سال پہلے دی تھی وہ اب پوری ہوئی (لوقا ۱۹: ۴۲ سے ۴۴)۔ تین قلعے کچھ عرصے تک اڑے رہے۔ مخاریس کا قلعہ بحیرہ مردار کے مشرق کی طرف۔ ہیرودیان اور مسعدہ مغرب کی طرف۔ ان میں سے آخری قلعہ جو پہاڑ کی دشوار گزار چوٹی پر بنا تھا ایک طویل محاصرہ کے بعد تسخیر ہوا (۷۳ء)۔ جب محاصرین قلعہ میں گئے تو ہولناک نظارہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سب محصورین نے خودکشی کر لی تھی۔

(۵) **انجام** یہودیہ ایک بستی بن گیا جس پر ایک رومی گورنر مسلط تھا۔ اور وہاں کے باشندوں کی حالت پراگندہ شدہ یہودیوں کی حالت سے مشابہ تھی۔ ان کو نہ کوئی ملکی حقوق حاصل تھے۔ نہ اُن کی کوئی صدر مجلس تھی۔ نہ اُن کی ہیکل تھی اور نہ کاہن تھے۔ وہ اجنبی سرزمین میں اجنبی تھے۔ ہدریان قیصر کے دنوں میں اُنہوں نے پھر ایک دفعہ بغاوت کی۔ اُس وقت ان کا سرگروہ شمعون برکوکب تھا۔ اُس نے تین برسوں تک رومی طاقت کا مقابلہ کیا (۱۳۲ء سے ۱۳۵)۔ لیکن سخت خونریزی کے بعد بغاوت فرو ہوئی اور یروشلم غیر قوموں کا شہر ہو گیا۔ اس کا نام ایلیاہ کپٹولینا رکھا۔ اس میں داخل ہونا یہودیوں کو سخت ممانعت تھی۔ باپ دادوں کی زمین کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے یہاں ان کی تاریخ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ پرانے اور نئے عہد نامے کے مابین زمانہ کی تصنیفات

یہودی کلیسیا کی رائے ہے کہ بلاواسطہ مکاشفہ انبیا پر ختم ہو گیا۔ اس لئے جو کتابیں عزرا اور عبادت خانہ اعظم کے بعد تحریر ہوئیں وہ عہد عتیق کے قانون میں داخل نہ کی گئیں۔ چنانچہ نئے عہد نامہ کے قانون کے قائم ہونے سے پیشتر جو زمانہ گزرا اُس میں بہت سی کتابیں قلمبند ہوئیں۔ ان میں سے بعض تو مصر میں تصنیف ہوئیں بعض فلسطین میں اور بعض بابل میں۔ اور یہ کتابیں نہ صرف بذات خود دلچسپی رکھتی ہیں بلکہ اُس زمانہ کے بارہ میں آگاہی کا یہی چشمہ ہیں۔ یہ کتابیں مختلف قسم کی ہیں بعض تو تاریخی ہیں۔ بعض افسانے ہیں۔ بعض تعلیمی اور نبیانہ ہیں لیکن بحیثیت مجموعی وہ ان باتوں کا خاکہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں کہ یہودیوں کی تمدنی اور دینی زندگی میں کیا نشو و نما ہوا۔ کونسے قومی انقلابات ان کو دیکھنے نصیب ہوئے۔ اور کونسی فاتح قوموں نے ان کی تاریخ اور روش زندگی پر اثر کیا۔ اس لئے عہد عتیق اور عہد جدید کے مابین جو عرصہ اور گزرا ہے اُس پر وہ پل باندھنے کا کام دیتی ہیں اور دنیا میں جو تیاری مسیحی عقیدہ کی آمد کیلئے ہو رہی تھی اور جن حالات میں اُس عقیدہ کا آغاز ہوا اُن پر ان سے بڑی روشنی پڑتی ہے۔

ان میں سے بعض کتابیں تو ایسی ہیں جن کے خیالات اور طرز تحریر قانونی کتابوں سے کہیں ادنےٰ ہے اور ان میں کوئی تازگی اور نئی بات پائی نہیں جاتی اُن میں فصاحت اور بلاغت پر ہی زور دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں پرانی کتابوں کی بڑی قدر و منزلت مانی گئی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ پرانے عہد نامہ کے

بیانات کو زیادہ توسیع اور توضیح دی گئی اور امثال اور ایوب کی کتابوں کی بہت نقل کی گئی۔ بعض کتابوں میں یہودی بہادروں کے مبالغہ آمیز قصے اور ان کی زندگی کے مفصل بیانات قلمبند ہوئے۔ البتہ بعض اوقات اعلےٰ تصنیفات بھی ظاہر ہوئیں۔ اور نہ صرف مکابیوں کی پہلی کتاب میں بلکہ بعض دوسری کتابوں میں بھی نہایت ضروری اور قابل اعتبار تاریخی مضمون پایا جاتا ہے۔ مثلاً حکمت اور یسوع بن سیرخ کی کتاب میں۔ ان میں اعلےٰ درجہ کی تحریر اور دینی حقیقت پائی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ قانون کی بعض کتابوں کے پایہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کی تعلیم کی اعلیٰ باتیں اور جو امیدیں ان سے پیدا ہوئیں یا جن امیدوں کی ان سے تقویت ہوئی اور نئے عہدنامہ کے جن خیالات اور محاورات کا پہلے ہی سے انہوں نے اظہار کیا ان کا ذکر ہم اس مضمون میں کرینگے جو یہودی دین کے نشوونما کے بارہ میں ہے اور اس کے بعد (صفحہ ۱۸۱) مندرج ہے +

اوّل۔ اپوکرفا

- ۱۔ عزراہ
- ۲۔ عزراہ
- توبیت
- یودیت
- آستر کی کتاب کا باقی حصہ
- حکمت کی کتاب
- یسوع بن سیرخ کی حکمت
- باروخ
- تین نوجوانوں کا گیت
- سوسنہ کی تاریخ
- بیل اور اژدہا کا قصہ
- منسی کی دعا
- مکابیوں کی پہلی کتاب
- مکابیوں کی دوسری کتاب

یہ اُن ضروری کتابوں کا مجموعہ ہے جن کی نسبت یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ اُن کو بھی

قانونی کتابوں کی طرح مستند ماننا چاہئے۔ لیکن وہ ایسی مستند تو نہ سمجھی گئیں۔ البتہ یہودی یا مسیحی کلیسیا نے کم وبیش ان کو پسند کیا۔ اسکندری یہودیوں نے ان کی یہاں تک قدر کی کہ انہوں نے عزراہ کی دوسری کتاب کے سوا باقی سب کتابوں کو ستروں کے یونانی ترجمے میں عہدعتیق کی کتابوں کے ساتھ مجلد کر دیا۔ بعض قدیم مسیحی بزرگوں نے مثلاً آگسٹین جیسوں نے ان کو مقدس کتاب کا ہی جزو مان لیا۔ اسی وجہ سے رومی کلیسیا نے ٹرینٹ کے مجمع میں اُن کو قانونی کتابوں میں شمار کیا۔ اس رائے کے لحاظ سے کبھی قانون ثانی کا لقب اُنہیں دیا گیا جس سے یہ مراد ہے کہ یہ کتابیں کتاب مقدس کے قانون ثانی سے متعلق ہیں۔ جس کا درجہ قانون اول سے شاید کسی قدر کم ہے۔ برعکس اس کے فلسطین کے یہودیوں نے اُن کو ٹھیک طور سے کتاب مقدس سے ہمیشہ علیحدہ رکھا۔ انہیں کی تقلید پر مقدس جیروم مشہور مسیحی عالم نے اُن کو کتاب مقدس میں شامل نہیں کیا۔ ان کی نسبت اس بزرگ کی عموماً وہی رائے تھی جو آجکل اصلاح شدہ کلیسیا کی ہے کہ چال چلن کے نیک نمونہ اور اخلاق کی درستی کے لئے کلیسیا ان کو پڑھتی ہے مگر عقاید کے ثبوت کے لئے اُن سے سند نہیں لیتی +

لفظ اپوکرفا یونانی لفظ ہے جس کے معنی راز یا پوشیدہ کے ہیں۔ یہ نام دینی اور فلسفی فرقوں کی عقاید کی کتابوں کے لئے مستعمل ہوتا تھا کیونکہ یہ کتابیں دُنیا سے پوشیدہ رکھی جاتی تھیں۔ بلکہ خود ان فرقوں کے بعض شرکا کو بھی ان کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اول اول تو اس نام میں کچھ قابل اعتراض بات نہ تھی۔ صرف اس نام سے یہ مراد تھی کہ ایسی کتابوں کا استعمال خاص لوگوں ہی میں محدود تھا۔ لیکن چونکہ ان میں سے بعض کتابوں کی تصنیف ایسے لوگوں سے منسوب کی گئی جن کی وہ تصنیف ہرگز نہ تھیں اور چونکہ اس نام کی ساری کتابیں قانون میں داخل ہونے نہ پائیں اس لئے یہ نام کچھ مشتبہ سا پڑ گیا اور اس کے معنے جعلی یا جھوٹے کے ہو گئے۔ اسی وجہ

سے پیچھے ان کی ایسی بے قدری ہوگئی۔ اگرچہ ان کے مصنف نامعلوم ہونے اور قانون میں جگہ نہ پانے سے ان کی تاریخی وقعت اور فایدہ مند ہونے میں کسی قسم کی کمی نہ ہونی چاہئے تھے۔ کیونکہ جو کتابیں قانون میں داخل ہیں۔ ان میں سے بھی بعض کتابوں کے مصنف نامعلوم یا مشتبہ ہیں۔ ان کی طرح ان اپوکرفل کتابوں کی قدر بھی ان کی ذاتی خوبی کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ اگر وہ دینی یا تاریخی پہلو سے مفید اور قابل اعتبار ثابت ہوں تو ان کی قدرومنزلت بھی اسی کے مطابق ہونی چاہئے۔ جو زمانہ اسیری کے بعد گزرا اُس کے لحاظ سے یہ کتابیں سب سے پرانی اور نہایت اہم گواہ ہیں۔ اِن کے ذریعہ اُس زمانہ کے خیالات اور واقعات ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اُن کے ذریعہ اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ اُس زمانہ میں یہودیوں کے درمیان قانونی نوشتوں کی کیا قدرومنزلت تھی۔ ان کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہودی کلام اور خیال کے ساتھ یونانی زبان اور خیال کے مخلوط ہونے سے کیا اثر ہوا۔ اسی اثر کا ذکر نئے عہدنامہ میں بھی آتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے مسیحی دین کی توسیع و ترقی کے لئے راہ تیار ہوگئی ۔

(۱) عزراہ کی پہلی کتاب

عزراہ وہ بڑا یہودی فقیہ تھا جس کے ساتھ قانون کی دو کتابوں کا علاقہ ہے ان کا تتمہ اسی نام کی دو اپوکرفل کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس وقت ان کا نام عزراہ کی تیسری اور چوتھی کتاب ہوا۔ کیونکہ عزراہ کی کتاب جو اب بائیبل میں ہے وہ عزراہ کی پہلی کتاب کہلاتی تھی۔ اور نحمیاہ کی کتاب عزراہ کی دوسری کتاب کہلاتی تھی۔ بعض اوقات ان کو عزراہ کی پہلی اور چوتھی یا پہلی اور تیسری کتاب بھی کہتے تھے۔ انگریزی بائیبل کی ترتیب جنیوا (Geneva) بائیبل کے مطابق ہے

اس لئے ان دو قانونی کتابوں کا نام عزراہ اور نحمیاہ کی کتاب آتا ہے۔ اور ان اپوکرفل کتابوں کا نام عزراہ کی پہلی اور دوسری کتاب ہوا۔ یہ ترتیب معقول معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کی مقبولیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ اپوکرفل کتابیں صرف یونانی لاطینی ترجمے ہی میں داخل ہیں لیکن عبرانی یا کسدی بائیبل میں داخل نہیں ۔

عزراہ کی پہلی کتاب کا بڑا حصہ یونانی نوشتوں سے تالیف ہوا ہے اور شاید یہ کام کئی ایک شخصوں کا ہے۔ جو عبارات کچھ تبدیلی کے ساتھ اس میں درج ہیں وہ تواریخ کی دوسری کتاب کے آخری دو باب ہیں اور عزراہ کی کتاب کے بعض حصے ہیں اور نحمیاہ کی کتاب کے ۷:۷۳ سے ۸:۱۳ تک۔ ان سب کا علاقہ ہیکل کی بربادی اور اُس کی دوبارہ تعمیر اور عزراہ کے ذریعہ شریعت کی اشاعت کے ساتھ ہے۔ لیکن ایک خاص فصل بھی ہے جو کسی کتاب سے نہیں لی گئی۔ (۳ باب سے ۵:۶ تک)۔ اس میں ایک عجیب قصہ کا ذکر ہے فارس کے دربار میں زربابل نے ایسی حکمت ظاہر کی جس کی وجہ سے دارا بادشاہ اُس کا گرویدہ خاطر ہوگیا اور اسیر یہودیوں کو واپس جانے کی اجازت دی۔ ایک عقلی مناظرہ میں اس نے سچائی کی تعریف ایسی فصاحت سے کی جس سے وہ سب پر سبقت لے گیا۔ اس صفت کے بیان کرتے وقت اُس نے ظاہر کیا کہ سچائی کی طاقت - بادشاہ - اور عورت سے بھی بڑھکر ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ زمین بڑی ہے۔ آسمان بلند ہے۔ آفتاب اپنی رفتار میں تیز ہے۔ اس لئے جس نے یہ ساری چیزیں بنائیں کیا وہ ان سب سے بڑا نہ ہوگا پس سچائی بڑی ہے اور ان ساری چیزوں سے زور آور ہے ..... وہ کسی کی طرفدار نہیں اور نہ تحفے تحائف پر پھسل جاتی ہے ..... نہ اُس کے فیصلوں

میں کوئی ناراستی ہے۔ اور وہ سارے زمانوں کی قوت۔ بادشاہت۔ قدرت اور عظمت ہے۔ سچائی کا خدا مبارک ہو"۔ اس پر سب نے جواب دیا "سچائی بڑی ہے۔ اور سب چیزوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ یہ جملہ کچھ تبدیلی کے ساتھ ضرب المثل ہو گیا ہے (۴: ۳۴ سے ۴۱)۔

اس کی تصنیف کی تحقیق تاریخ معلوم نہیں۔ کیونکہ اس کی موجودگی کی کوئی شہادت یوسیفس (۹۰ء) سے پہلے کی نہیں۔ البتہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اسکندریہ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ قبل از مسیح دوسری صدی کے آخر یا پہلی صدی کے شروع میں۔ اسکی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ فارسی بادشاہوں نے یہودیوں پر کیسی کیسی مہربانیاں کی تھیں تاکہ مصر کے بادشاہ بھی ویسی ہی مہربانیاں ان پر کریں۔ اس امر کی کوئی شہادت نہیں کہ ۱۶۰ ق م میں اسکندری یہودیوں کے لئے جو ہیکل آونیاس نے بنوائی تھی اس کی تقریب پر یہ کتاب لکھی گئی۔

(۲) عزراہ کی دوسری کتاب

یہ کتاب تاریخی ڈھانچے میں نہیں ڈھالی گئی۔ بلکہ اسے نبیانہ لباس پہنایا گیا۔ اسی لئے یہ مذکورہ بالا پہلی کتاب سے متفرق ہے اور اسی لئے یہ "عزراہ کا مکاشفہ" بھی کہلائی۔ یہ کتاب یا تو تین خاص الگ الگ کتابوں سے تالیف کی گئی یا اگر اصلی تصنیف ہو تو اس میں دو خاص مصنفوں نے تتمہ کے طور پر کچھ حصہ ایزاد کیا۔ اس کتاب میں کل سولہ باب ہیں لیکن پہلے دو باب اور پچھلے دو باب بذات خود الگ الگ فصلیں ہیں جو کتاب کے خاص بڑے حصے سے کچھ عرصہ بعد لکھی گئی ہونگی۔ چونکہ ان فصلوں کے خیالات اور الفاظ نئے عہدنامہ سے ملتے جلتے ہیں اس لئے بعضوں کا خیال ہے کہ کسی مسیحی شخص نے یہ فصلیں لکھی ہونگی چنانچہ مقابلہ کرو ۱: ۳۰ سے ۳۳ کا متی ۲۳: ۳۷ سے + ۲: ۱۳ کا متی ۲۵: ۳۴ سے + ۱۵: ۸ کا مکاشفہ ۶: ۱۰ سے اور ۱۶: ۵۴ کا۔ لوقا ۱۶: ۱۵ سے + ان بابوں کا خاص مضمون یہ ہے

کہ بنی اسرائیل کو ان کی بغاوتوں کی وجہ سے تنبیہ دی گئی اور غیر قوموں کو دعوت دی گئی ہے کہ جو برکتیں بنی اسرائیل سے چھن گئیں ان کو حاصل کرو۔ اور جو قومیں خدا کو غصہ دلاتی اور اس کا مقابلہ کرتی ہیں ان کو خدا کی عدالت کی دھمکی تقریباً ویسے ہی الفاظ میں دی گئی ہے جن میں عہد عتیق کے نبیوں نے دی تھی اور یہ حصہ شاید تیسری صدی مسیحی کی تصنیف ہے۔

۳ باب سے ۱۴ باب تک جو اس کتاب کا بڑا حصہ ہے وہ کسی خاص یہودی کی قلم سے نکلا ہوا ہے۔ گو یہ فصل ابتدا ہی سے مسیحی کلیسیا کو معلوم تھی۔ ان میں کئی ایک مکاشفوں اور رویتوں کا ذکر ہے۔ جن کی نسبت یہ دعوے ہے کہ بابل کی اسیری کے تیرھویں سال عزراہ کو ملے تھے۔ چونکہ وہ اپنی قوم کے غموں سے غمزدہ تھا اور خدا کی راست حکومت پر شک و شکوک اسے پیدا ہو گئے تھے اس لئے اوری ایل فرشتے نے اس کے پاس آ کر اس کے غم پر اسے ملامت کی۔ اور دنیا کے اخلاقی بھیدوں کو اس پر منکشف کیا تین مکاشفوں اور پانچ رویتوں میں اوری ایل نے اس پر یہ ظاہر کیا کہ گو خدا کے مقاصد کی تہ تک پہنچنا ناممکن ہے تو بھی اس کی پروردگاری کا یہ کام ہے کہ بدی کو شکست ہو اور نیکی کو فتح ہو۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک شرارت غالب رہے۔ لیکن اس کا وقت بہت محدود ہے۔ اور جن نشانوں کا ذکر ان رویتوں میں ہے جب وہ پوری ہو جائینگے تو ابن خدا۔ وہ ممسوح ظاہر ہوگا۔ اور سلطنت کریگا۔ غیر قوموں کی طاقتیں ٹوٹ جائینگی۔ اور اسرائیل کے گمشدہ فرقے پھر صیحون میں جمع ہونگے۔ اس اثنا میں عزراہ کو چاہئے کہ وہ شریعت کو امت کی خاطر تحریر کرے اور رازوں کی ستر کتابیں ان کے لئے تیار کی جائیں جو خدا کی پوشیدہ باتوں میں شریک ہونے کے لائق ہیں۔ کئی مقاموں میں مسیح کی طرف خاص اشارے ہیں (۷: ۲۸ + ۱۲: ۳۱ + ۱۳: ۳۲ و ۳۷ و ۵۲) اور ایک مقام (۷: ۲۹) میں اس کی موت کے بارہ میں ایک عجیب بیان پایا جاتا ہے "ان سالوں کے بعد میرا بیٹا مسیح مر جائیگا۔ اور سارے آدمی جو زندگی رکھتے ہیں"۔

عقاب کی رویت کے ذریعہ اس کتاب کے سن تصنیف کا کچھ پتہ لگ جاتا ہے۔

(۱۱: ۱ سے ۱۲: ۵۱) اس عقاب کے بازوؤں اور سروں سے روم کے قیصروں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو یکے بعد دیگرے برپا ہوئے۔ جس آخری قیصر کی طرف اشارہ ہے وہ دومتیان ہے۔ اس لئے یہ قیاس رہا ہے کہ اس کے عہد سلطنت میں یہ کتاب تصنیف ہوئی (۸۱ء اور ۹۶ء کے درمیان) طیطس کے ذریعہ یروشلم کی بربادی اور یہودیوں کی مابعد مصیبتوں کے باعث غالباً مصنف غمزدہ تھا۔ اور اسی لئے اس نے یہ مضمون چنا ہوگا۔ یونانی ترجمہ کے بعض حصے اب تک موجود ہیں۔ لیکن ۱۸۷۵ء میں پروفیسر بنسلے (Bensly) صاحب کو گم شدہ حصہ بھی مل گیا۔ لیکن ساری کتاب لاطینی ترجمے میں موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو کبھی کبھی لاطینی عزراہ کی کتاب بھی کہتے ہیں تاکہ یونانی عزراہ کی کتاب سے اُس کا اشتباہ نہ ہو +

(۳) توبیت کی کتاب

یہ دینی قصہ بہت خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ گو اس کی کوئی تاریخی بنیاد ہوگی لیکن جو مقصد اس قصہ میں مدنظر ہے اس کے سامنے اس تاریخی بنیاد کی چنداں وقعت نہیں۔ اسوری اسیری کے وقت اور نینوہ کے علاقہ کا یہ قصہ ہے۔ توبیت ایک دیندار خداترس آدمی تھا۔ اور نفتالی کے فرقہ میں سے تھا۔ اس کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی۔ اور بعض دیگر مصیبتوں میں مبتلا ہوا۔ ان کی وجہ سے اُس نے خدا سے دعا مانگی کہ مجھے موت دے۔ اس وقت اُسے یاد آیا کہ میں نے چاندی کے دس مثقال اپنے ایک رشتہ دار کے پاس بمقام میدیا امانت رکھے تھے۔ اس لئے اس نے اپنے بیٹے توبیاس کو وہ روپے لینے کے لئے بھیجا۔ اور ایک اجنبی شخص کو اُجرت کے وعدہ پر اُس کے ہمراہ کر دیا۔ ایک بتنا شہر میں وہ ایک شخص رعوئیل نامی کے ہاں ٹھہرے۔ اس شخص کی بیٹی سارہ نامی بھی بہت مصیبت میں تھی اور خدا سے اپنی موت کی خواستگار تھی کیونکہ

جن سات خاوندوں سے اُس نے یکے بعد دیگرے شادی کی تھی اُنہیں عین شادی کی رات عسموديوس بدروح نے قتل کر دیا تھا۔ توبیاس نے اُس سے شادی کر لی اور اُس عورت کو اس بدروح سے مخلصی حاصل ہوئی۔ وہ دس مثقال چاندی کے مل گئے اور توبیت کی بینائی بھی دوبارہ حاصل ہوئی۔ اور ان دونو خاندانوں کو از سر نو خوشحالی نصیب ہوئی۔ یہ ساری برکتیں اُس رفیق کی بدولت ملیں جو سفر میں توبیاس کے ہمراہ گیا تھا۔ آخر کار معلوم ہوا کہ وہ اجنبی رفیق رفائیل فرشتہ تھا۔ جسے خدا نے توبیت اور سارہ کی دعاؤں کو سُن کر ان کی مدد کے لئے بھیجا تھا +

الغرض اس قصہ کا مقصد یہ تھا کہ جو یہودی غیر ممالک میں رہتے تھے ان کی حوصلہ افزائی کرے اور ان کو تسلی بخشے۔ تاکہ وہ شریعت پر عمل کریں۔ اور اثنائے بیان میں خیرات دینے پر زور دیا گیا (مثلاً ۴: ۷ سے ۱۱ + ۱۲: ۸ و ۹)۔ اور توبیاس کی شادی کے بیان کرنے کی یہ غرض ہوگی کہ ان یہودیوں کو معلوم ہو جائے کہ اپنی ہی قوم میں شادی کرنے سے کیسے فوائد حاصل ہوتے ہیں +

اس کتاب کا سن تصنیف دریافت کرنا مشکل ہے۔ البتہ بعض اشارات سے پتہ لگتا ہے کہ یہ کتاب قبل از مسیح دوسری صدی یا پہلی صدی کے شروع میں لکھی گئی ہوگی۔ اور غالباً عبرانی زبان میں لکھی گئی۔ گو سبعین کے ترجمہ سے پیشتر کا کوئی نسخہ عبرانی میں موجود نہیں +

(۴) یودیت کی کتاب

یہ توبیت کے قصہ سے مختلف قسم کا قصہ ہے اور تاریخی فسانہ معلوم ہوتا ہے۔ جس یودیت کا اس فسانہ میں ذکر ہے وہ ایک دیندار اور خوبصورت یہودی تھی۔ اس نے اپنی قوم کے لئے ایک بڑا بہادری کا کام کیا۔ جیسے یائیل نے کیا تھا جس کا ذکر قاضیوں کی

کتاب میں آیا ہے یہ عورت جو بیت شہر میں رہتی تھی۔ ۴: ۶ اور ۷: ۳ میں ذکر آیا ہے کہ یہ شہر اسدرالیون کے بالمقابل تھا گو بعض حال کے علما کا خیال ہے کہ یہ یروشلم شہر تھا۔ کیونکہ اس نام کے معنی ہیں "خدا کا گھر"، بنوکد نضر کے جرنیل ہولوفرنس نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس بیوہ عورت نے یہ ٹھانا کہ کسی طرح سے اپنے شہر کو محاصرین کے ہاتھ سے چھڑا لے۔ اس ارادہ سے یہ عورت صرف ایک لونڈی کو ہمراہ لیکر ہولوفرنس کے خیمہ کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ جرنیل اس عورت کی خوبصورتی پر فریفتہ ہو گیا اور اس کی منظور نظر ٹھیری۔ لیکن جب یہ جرنیل شراب کے نشہ میں چور ہوا تو اس عورت نے اس کا سر کاٹ ڈالا اور اس کو لیکر اپنے شہر کو آگئی۔ یہ نظارہ دیکھکر محصورین کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ وہ دشمن پر جا پڑے اور ان کو شکست فاش دی ؁

مصوروں نے کئی دفعہ اس قصہ کی تصویر کھینچی ہے اور شاید اس قصہ کی بنیاد بھی کسی تاریخی واقعہ پر ہوگا۔ لیکن اس کے عام طرز بیان سے یہ گمان نہیں گزرتا اور اس میں کئی ایک تاریخی اور جغرافیہ کی غلطیاں بھی ہیں۔ اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل یہود میں حب الوطنی کا جوش مشتعل کرے اور ان کو تحریک دے کہ نہ صرف یہودی شریعت اور رسوم پر قایم رہیں بلکہ غیر ملکی مظالم کا مقابلہ بھی استقلال سے کرتے رہیں۔ اس قصہ کا زمانہ مکابی زمانہ کی حالت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور اس سے بعضوں کا یہی خیال ہے کہ یہ فسانہ اسی زمانہ کی تصنیف ہے یعنی قبل از مسیح دوسری صدی کے وسط کا۔ اور بعضوں کا خیال ہے کہ اس زمانہ سے ایک صدی بعد یہ قصہ لکھا گیا۔ یعنی ہرکانیوس دوم کے زمانہ میں۔ اور جو صفات اس بیوہ خاتون سے منسوب کی گئیں ان سے ملکہ اسکندرہ کا خیال گزرتا ہے جو فریسیوں کی بڑی مددگار تھی (دور سلطنت ۷۸ تا ۶۹ ق م)۔ المختصر ان دونوں زمانوں میں سے ایک نہ ایک کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا ؁

(۵) آستر کی کتاب کا باقی حصہ

سترّوں کے ترجمہ میں جو آستر کی کتاب ہے اس میں بعض ایسے مقامات بھی ہیں جو عبرانی بائبل میں پائے نہیں جاتے اس قسم کی افراط و تفریط اسکندریہ کے یہودی مدرسوں میں غالباً عمل میں آئی۔ کیونکہ وہاں اکثر ایسے روایتی قصوں کو زیادہ طویل بنانے اور ان پر حاشیہ چڑھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ان مزید مقامات کو جیروم نے جمع کیا اور آستر کی کتاب کے ترجمے کے آخر میں ان کو رکھا۔ یہی مقامات اب آستر کی اپوکرفل کتاب کہلاتے ہیں۔ کتاب مقدس کے قصہ کو مفصل بنانے کے علاوہ اس حصہ کو دینی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ ظاہر کیا گیا کہ خدا نے مردکی اور آستر کی دعائیں سنیں اور یہودیوں کو ان کے غیر قوم دشمنوں سے چھڑایا۔ اس ضمیمہ میں صرف ساڑھے چھ مختصر باب ہیں اور ان بابوں میں ان دعاؤں کا ذکر ہوا ہے اور مردکی کے خواب کا۔ اور ارتخششتا بادشاہ کے دو خطوط قلمبند ہیں۔ ان میں سے ایک خط میں تو یہودیوں کے قتل عام کا حکم ہے۔ اور دوسرے خط میں پہلے حکم کی تنسیخ کا ذکر ہے اور اس میں انکو یہ تاکید کی گئی کہ بارھویں مہینے اذار کی تیرھویں تاریخ پر یادگاری کی عید منائی جایا کرے ؁

کہتے ہیں کہ اس قسم کی افراط پہلی یا دوسری صدی قبل از مسیح میں ہوئی۔ اس سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اسکندری یہودیوں نے کیوں ان مقامات کو کتاب مقدس کے قانون میں داخل کر لیا۔ ان میں اس امر کی توضیح کی گئی کہ جو یہودی غیر ممالک میں رہتے تھے خدا ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ آستر کی کتاب میں تو خدا کا نام مذکور نہیں لیکن اس ضمیمہ میں اس کے نام کا بار بار ذکر آتا ہے ؁

(۶) سلیمان کی حکمت

یہ کتاب بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ جیسا اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ یہ اس زمانہ کی فلسفانہ کتابوں میں سے ایک اعلےٰ اور مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں منکشف صداقت کا دریا بروجہ غیر قوم خیالات سے ٹکر کھاتا ہے۔ اور عہدعتیق میں جو حکمت کا تصور تھا وہ مابعد مسئلہ لوگاس (کلام) سے مبدل ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا مصنف سلیمان بتایا گیا ہے اور یہ اس زمانہ کا عام خاصہ تھا اور ناظرین کتاب مجبور نہیں کہ اس رائے کو مانیں۔ سلیمان کا نام اختیار کرنے سے یہ غرض تھی کہ یہ کس قسم اور کس مقصد کی کتاب تھی۔ قدیم رواج کے یہ عین مطابق تھا کہ کسی کتاب کی تصنیف کسی قابل مشہور شخص سے منسوب کی جائے کہ گویا اسی کی رُوح اور طبیعت میں یہ کتاب لکھی گئی یا اُسی شخص کی تصنیف کا یہ سلسلہ ہے۔ اس کتاب کے بارہ میں نہ مصنف کے ہمعصر ورنہ مابعد علماء نے اس نام سے فریب کھایا۔ یہ کتاب حکمت کی تعریف میں ایک نعت ہے اور اس کے دو حصے ہیں (۱) ۱ سے ۹ باب تک حکمت کا ذکر مجازی طور پر آیا ہے اور اس کے آغاز اور نتائج پر بحث ہوئی ہے اور آدمیوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اسکی تلاش کریں۔ شروع میں حکمت کی تلاش کے لئے نصیحت ہے۔ پھر ان بابوں میں کامیابی کی شرائط کا ذکر آتا ہے مثلاً پاکیزگی خیالات۔ صداقت کلام۔ اور راست روی بعد ازاں مادیہ فرشتے کی کیفیت کا خاکا کھینچا ہے کہ یہ عقیدہ خدا کی نسبت دانستہ جاہل رہنے کا نتیجہ ہے۔ اور شیطان کی عداوت کی وجہ سے دنیا میں موت اور گناہ کو دخل ہوا۔ اسکے ذریعہ صادقوں اور شریروں کا مفصل مقابلہ کیا ہے۔ مثلاً ان کے خاندانوں۔ ان کی عمر درازی۔ اور آئندہ جہان میں ان کے انجام کے بارہ میں۔ پھر حکمت کی تعریف

کی گئی کہ وہ زندگی کی حقیقی رہنما ہے اور اُس کے خواص کا ذکر دُعا کے پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ اور لوگوں کو خاصکر حکام کو تاکید ہوئی ہے کہ سلیمان کی طرح اُس کی تلاش کریں اور اُس کے لئے خدا سے دُعا مانگیں۔

(۲) ۱۰ سے ۱۹ باب تک۔ جیساکہ اسرائیل کی تاریخ سے آشکار ہے حکمت کا ذکر تاریخی پہلو سے کیا گیا۔ اوّل تو آدم سے لیکر موسیٰ تک بزرگوں کی زندگیوں کا خاکا دیا گیا اس امر کی تشریح کے لئے کہ حکمت کی رہنمائی کا کیا نتیجہ ہوا۔ بعد ازاں اُن لوگوں کو تنبیہ دی گئی جو اس سے غافل رہتے ہیں۔ مثلاً مصریوں اور کنعانیوں کی سزا کا مثال کے طور پر ذکر ہوا۔ بعد ازاں بت پرستی کی باغیانہ صفت اور نتائج کا بیان ہوا۔ اور مصریوں اور اسرائیلیوں کا باہمی مقابلہ کیا ہے اور اسرائیلیوں کی آخر تک تعریف کی ہے۔

چونکہ یہ کتاب یک لخت ختم ہو جاتی ہے اس لئے بعضوں نے یہ گمان کیا کہ اس کا کچھ حصہ معدوم ہو گیا ہوگا اور ان دو حصوں کے قیاسی فرق پر اتنا زور دیا گیا کہ گویا یہ دو شخصوں کی تصنیف ہے جن کا طرز کلام الگ الگ ہے۔ لیکن ایسے قیاس کے لئے کافی وجوہات پائی نہیں جاتیں۔ اس لئے عموماً یہی رائے رہی ہے کہ یہ کل کتاب ہے اور ایک ہی شخص کی تصنیف ہے اور یہ شخص بھی اسکندریہ کا یہودی ہوگا۔ جو ۱۵۰ ق م اور ۱۲۵ ق م کے مابین گذرا گو بعض اوقات اس کتاب کی تصنیف اس زمانہ سے پیشتر یا اس زمانہ کے بعد بتائی جاتی ہے۔ اس کتاب کی طرز عبارت اس کے اعلےٰ مضمون کے مناسب ہے اور جو علمی زمانہ مصر میں مسیح کی سن سے پیشتر طلوع ہوا اُس کے خیالات اور طرز عبارت کا اس میں جا بجا پتا لگتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ کتاب یہودی نکتہ خیال سے لکھی گئی معلوم ہوتی ہے اور قدیم عقیدہ کے قیمتی اجزا کی تصدیق اور تاکید ہوتی ہے۔ گاہے گاہے عبرانی محاورات پائے جاتے ہیں۔ اور

عہد عتیق سے کئی خیالات مستعار ہیں مثلاً سلیمان کا نام اور قانونی کتابوں کا طریقہ جو پہلے
اُس سے منسوب ہو چکا ہے۔ لیکن برعکس اس کے یہ کتاب یونانی میں لکھی گئی اور
عبارت بہت فصیح و بلیغ ہے اور بعض اوقات یونانی رسوم و تصورات کی طرف
اشارے ہیں اور یہ ایسے ہی شخص سے ہو سکتے تھے جو مغرب کے علوم سے بخوبی واقف
ہو۔ مثلاً ۲: ۸ میں شرابی لوگ پھولوں کے ہاروں کا تاج پہنتے ہیں۔ ۴: ۲ میں لڑائی میں
فتح حاصل کرنے والوں کو پھولوں کا ہار عطا ہوتا ہے۔ اور ۱۳: ۱۵ میں ذکر ہے کہ ہر خاندان
کا ایک دیوتا ہوا کرتا ہے۔ اور ۱۴: ۱ میں ذکر ہے کہ ہر جہاز کا ایک موکل معبود ہے۔
اور ۱۹: ۲۱ میں من حیات بخش خوراک کہلاتا ہے۔ علاوہ ازیں کئی مقامات میں افلاطونی
اور ستوئکی فلسفے کی طرف بھی اشارے ہیں۔ جیسے سنسان (۱۷: ۱۱) مادہ سے یہ جہان
پیدا ہوا اور ۷: ۲۲ میں جو روح کا لقب گیا ہے کہ وہ فہم کی روح ہے۔ ۸: ۷ میں
جن چار بڑی نیکیوں کا ذکر ہے وغیرہ۔ اس کتاب میں کئی مرکب الفاظ آتے ہیں جو صرف
اسی کتاب سے مخصوص ہیں۔ مثلاً بچہ کشی (۱۱: ۷) طفل کشی (۱۴: ۲۳) بدی کیلئے محنت (۱۵: ۹)
اور ادرگرد آواز دینا (۱۷: ۱۴) اور لفظ پروٹوپلاسٹ (πρωτόπλαστος)
جو آجکل خاص علمی اصطلاح ہے وہ پہلے پہل ۷: ۱ اور ۱۰: ۱ میں مذکور ہے۔ اور چند
ایسے فرحت افزا جملے بھی ہیں جو مابعد زمانہ میں دینی تقریروں میں عام طور پر مستعمل ہو گئے
مثلاً بقا سے معمور امید (۳: ۴) "راستبازوں کی روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں" (۳: ۱)۔
کتاب کا یہ مقصد تھا کہ یہودی عقیدہ کے ضروری مسائل کی صداقت ظاہر کرے
بمقابلہ مادیت۔ بت پرستی خیالی فلسفہ وغیرہ کے اور اسکندری یہودیوں کو ترغیب اور
حوصلہ دے تا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قایم رہیں۔ اور بت پرستی کی تحریصات
سے بچے رہیں اور جن مصیبتوں میں وہ مبتلا تھے ان کی برداشت کریں۔ اس معاملہ میں اس
کتاب نے نہ صرف اپنے زمانہ پر بلکہ مابعد زمانوں پر اثر کیا جیسا کہ نئے عہد نامہ سے

ظاہر ہے۔ نئے عہد نامہ کی بعض کتابیں مثلاً یوحنا کی انجیل اور عبرانیوں کے خط میں اس قسم
کے خیالات اور محاورات پائے جاتے ہیں۔ فضل اور رحمت کا اکٹھا ذکر (۳: ۹ + ۴: ۱۵)
۱ تمتھیس ۱: ۲ وغیرہ میں پھر ملتا ہے۔ یہ عبارت "کیونکہ فی الحقیقت وہ شاید غلطی کرتے ہیں
جبکہ وہ خدا کی تلاش بھی کرتے ہیں اور اس کو پانے کا منشا بھی رکھتے ہیں" (۱۳: ۶) تقریباً
اسی قسم کی ہے جو اعمال ۱۷: ۲۷ میں پائی جاتی ہے۔ "تاکہ خدا کو ڈھونڈیں شاید کہ ٹٹول کر
اُسے پائیں" اور ۵: ۱۷ سے ۲۰ اور پولس کے الفاظ (افسیوں ۶: ۱۳ سے ۱۷) میں جو
سپاہی اوزاروں کا ذکر ہے ان میں ایسی مشابہت ہے کہ یہ اتفاقی نہیں ہو سکتی۔ نیز مقابلہ
کرو ۳: ۵ کا۔ مکاشفہ ۳: ۴ + ۱۴: ۶ سے اور ۷: ۲۶ کا عبرانی ۱: ۳ سے اور ۱۳: ۲
کا۔ ۱ کرنتھی ۲: ۵ وغیرہ سے۔

(۷) یسوع بن سیرخ کی حکمت
یا کلیسیائی کتاب

ان دو ناموں میں سے پہلا نام زیادہ قدیم ہے چنانچہ ستروں کے ترجمہ میں یہی نام
دیا گیا ہے۔ اور اسی نام سے اس کتاب کی کیفیت اور تصنیف کا پتا لگ جاتا ہے۔ دوسرے
نام کے یہ معنی ہیں "کلیسیا سے متعلق" "یا کلیسیائی" یہ دوسرا نام چوتھی صدی سے مروج
ہوا کیونکہ یہ کتاب مغربی کلیسیا میں عبادت کے وقت اور تعلیم کے لئے استعمال ہوتی تھی۔
لاطینی اور انگریزی ترجموں میں بھی یہ کتاب پائی جاتی ہے۔ بعض مختصر نام بھی اس کے آتے
ہیں مثلاً امثال اور بن سیرخ۔

جس کتاب کا پہلے ذکر ہوا یہ اسی قسم کی کتاب ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ حکمت
کی تعریف اور تعلیم سکھائے۔ لیکن یہ زیادہ عملی صورت اور عبرانی نکتہ خیال سے تحریر

ہوئی۔ طرزِ عبارت اور خیال کے لحاظ سے یہ عہدِ عتیق کی حکمت کی کتابوں اور اپوکرفا کی حکمت کی کتاب کے بین بین ہے۔ امثال کی کتاب سے یہ بہت مشابہ ہے۔ اس میں حکمت کا وہی عام تصور ہے۔ اور وہ ویسے ہی مختصر اور پُر معنی اقوال کے ذریعہ۔ اخلاق اور روشِ زندگی کی تعلیم دی ہے جس نکتہ خیال سے امثال کی کتاب لکھی گئی تھی اُس کو اس نے زیادہ وسعت اور تکمیل دی ہے۔ لیکن جس حد تک یہ کام سلیمان کی حکمت کی کتاب نے کیا اس حد تک یہ کتاب نہیں پہنچی اور نہ اس میں اسی قسم کا میلانِ خیال اور یونانی فلسفانہ خیالات کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ یہ مابعد فلسفانہ حکمت کا فلسطینی اصلی نمونہ ہے لیکن دوسری کتاب میں اسکندری خیالات کا اظہار ہے۔

یسوع بن سیراخ کی کتاب میں کوئی خاص تجویز پائی نہیں جاتی۔ اس میں زندگی کے متعلق خیالات کا سلسلہ ہے جن میں بعض تو مصنف کے طبع زاد ہیں اور بعض اِدھر اُدھر سے اخذ کئے گئے ہیں۔ پھر بھی اس کتاب کے مضامین کو دو غیر مساوی حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں (۱) ابواب ۱ سے ۴۳ تک۔ اس حصہ کے شروع میں حکمت کی تعریف پائی جاتی ہے اور آخر میں فطرت کے کاموں کا اعلےٰ اور پُر زور بیان ہے۔ ان کے مابین جو ابواب ہیں ان میں حکمت پر بحث کی گئی ہے۔ خاصکر عملی پہلو سے۔ اس لئے بہت سے مختلف مضامین کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً والدین کی اطاعت۔ غریبوں کے لئے فکر۔ دوستی۔ دور اندیشی۔ حسد۔ غرور، فخر۔ عورتیں اور دولت۔ بعض اوقات یہ داناؤں کے اقوال کہلاتے ہیں۔ ان بابوں میں اُسی قسم کی تعلیم قلمبند ہوئی ہے جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق تھی۔ قومی تصور کے زوال نے جو جلاوطنی کے بعد ظہور میں آیا افراد کی ذمہ داری اور روش کے خیال کو برپا کیا۔ کیونکہ جس وقت قدیم قانونی کتابیں لکھی گئی تھیں اُس وقت اس امر پر زور دینے کی چنداں ضرورت نہ تھی بلکہ شفقت کے کلام کی تکمیل کے لئے کسی شے کی ضرورت تھی۔ اور اسی ضرورت کو یسوع بن سیراخ نے اس کتاب کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ ان میں اکثر خیالات

تو بہت اعلےٰ ہیں۔ لیکن بعض زمانہ حال کے لوگوں کے لئے ناگوار ہیں۔ خواہ وہ خیالات کیسے ہی ادنےٰ ہوں لیکن اپنے زمانہ کی روش اور خیال پر روشنی ڈالنے کے لحاظ سے وہ بہت مفید اور دلچسپ ہیں۔

(۲) ابواب ۴۴ سے ۵۱۔ اس حصہ میں عبرانی تاریخ کے نامی اشخاص کا ذکر آتا ہے اور خدا اور شریعت کے معاملہ میں وفادار رہنے کے باعث ان کی تعریف کی گئی ہے عزراہ۔ دانیال اور مردکی کے نام اس فہرست میں پائے نہیں جاتے۔ سامریوں کے بارہ میں یہودیوں کا جو خیال اُس زمانہ میں تھا وہ صرف ایک جملہ میں ظاہر کر دیا گیا ہے: "ایسی قوم جس سے میرا دل نفرت کرتا ہے" (۵۰: ۲۵ و ۲۶)۔ اس کا تتمہ ایک دعا یا شکرگزاری کی صورت میں ہے جس کی صحت کے بارہ میں شک رہتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ خود مصنف نے پیچھے لکھ کر کتاب پر ایزاد کر دیا ہو۔

اگر اس کتاب میں یونانی تاثیر کا کچھ پتہ لگتا ہو تو وہ عام تصورات ہی میں محدود ہے مثلاً نیکی اور علم کو ہم معنی ٹھیرانا اور کاموں میں اعتدال پر زور دینا خود فلسطین میں بھی اس قسم کے یونانی خیالات مروج تھے۔ لیکن عام خیال یہودیوں کا ہے۔ اور اس زمانہ سے متعلق ہے جو کم از کم مکابیوں کے زمانہ سے پیشتر گزرا۔ حکمت کا یہ ذکر ہے کہ وہ خدا کا عرفان ہے اور زندگی کا رہنما اور الہام ہے۔ خدا عالمگیر خداوند ہے۔ جو انسان اور باقی ساری اشیا کا خالق اور حاکم ہے اور جو درمیانی مخلوقات ہے اُس کا کچھ ذکر نہیں آتا سوائے ان اقتباسات کے جو عہدِ عتیق سے لئے گئے ہیں۔ شریعت کو فوقیت دی گئی ہے۔ لیکن قیامت کے عقیدہ کا کچھ ذکر نہیں اور نہ کسی خاص مسیحی پیشین گوئی کا ذکر ہے۔ نیک زندگی کا صلہ دنیاوی خوشحالی اور مرنے کے بعد نیک نامی میں پایا جاتا ہے۔

جس مصنف سے یہ کتاب منسوب کی گئی ہے اور جو سنِ تصنیف اس کا بتایا جاتا

ہے اس کے بعینہٖ مطابق ہے۔ اپوکرفا کی کتابوں کے برعکس اس میں مصنف کا صحیح نام دیا گیا ہے۔ ۵۰: ۲۷ میں اس نے اپنا نام "یروسلم کا یسوع بن سیرخ" بتایا ہے۔ اور کتاب کے دیباچہ میں کچھ اور تفصیل بھی دی گئی ہے۔ اس دیباچہ کے مطابق یہ کتاب یسوع نے عبرانی میں تصنیف کی۔ اور اس کے پوتے نے (جس نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا) اس کتاب کا ترجمہ یونانی میں کیا مصر کے بادشاہ یوآرگیٹیس کے اڑتیسویں سال میں اسی ملک میں یہ ترجمہ بھی کیا گیا۔ عام خیال یہ ہے کہ اس کا اشارہ بطلیمی ہفتم فِسکون (۱۷۰ سے ۱۱۶ ق م) کی طرف ہے۔ اور اس کی سلطنت کا اڑتیسواں سال ۱۳۲ ق م ہوگا۔ جس میں یہ ترجمہ کیا گیا۔ دو پشتیں پہلے کی طرف جاکر اس صدی کے پہلے چوتھے حصہ تک پہنچ جاتے ہیں جس میں کہ یہ کتاب تصنیف ہوئی ہوگی۔ اس تاریخ کی تصدیق اس امر سے ہوسکتی ہے کہ جن نامی شخصوں کی فہرست اس کتاب میں دی گئی ہے وہ شمعون سردار کاہن پر ختم ہوجاتی ہے۔ یہ شمعون دوم ہوگا (۲۱۸ سے ۱۹۸ ق م تک) اور اس شخص کا ذکر بھی اتفاقی آیا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ مصنف کو اس شخص کا علم تھا۔ دیباچہ کی اس تشریح پر کبھی کبھی تکرار ہوئی۔ بایں خیال کہ یونانی میں کچھ شبہ ہے اور یوآرگیٹیس اور شمعون شاید کوئی اور شخص ہو۔ لیکن گمان غالب زیادہ اسی تشریح کا ممد ہے۔ چند گذشتہ سالوں میں تقریباً نصف سے زیادہ یہ کتاب عبرانی میں مل گئی ہے ۔

مترجم کے اس دیباچہ کے ذریعہ نہ صرف اس کتاب کے مصنف اور سن تصنیف کا پتہ لگ جاتا ہے بلکہ اس امر کا بھی کہ مصنف کے زمانہ میں عہد عتیق کی قانونی کتابوں کی سند اور مضامین پائے جاتے تھے۔ وہ ۱۰ سے شریعت انبیا اور باقی کتابیں نئے عہد نامہ میں اس کتاب سے کوئی اقتباس نہیں آیا۔ لیکن بعض مقامات سے پتا لگتا ہے کہ عہد جدید کے مصنف اس کتاب سے واقف تھے مقابلہ کرو

۲۹: ۲ کا لوقا ۱۲: ۱۹ سے ۱۲: ۲ سے ۵ کا یعقوب ۱: ۲ سے ۴ تک اور ۵: ۱۱ کا۔ یعقوب ۱: ۱۹ سے۔ مگر مابعد مصنفوں نے بار بار اس سے حوالے دیئے ہیں اور جان خسین نے اپنی کتاب "وہ کثرت فضل" میں بیان کیا ہے کہ "اس کتاب کے اس مقام سے کیسی مدد ملی۔ قدیم پشتوں پر نظر کرو اور دیکھو کیا کبھی کسی نے خداوند پر بھروسہ کیا اور شرمندہ ہوا۔ کوئی اس کے خوف میں قائم رہا اور وہ ترک کیا گیا یا جس نے اس کو پکارا ہو اور اس نے اسے حقیر جانا ہو؟ کیونکہ خداوند ترس اور رحمت سے معمور ہے۔ وہ بڑا برداشت کرنے والا اور بڑا ترس کھانے والا ہے۔ وہ گناہوں کو بخشتا اور مصیبت کے وقت مخلصی عطا کرتا ہے" (۲: ۱۰-۱۱)۔ یہاں بھی ۱۸: ۱۰ سے ۱۳ کی طرح خدا کے تحمل کا تصور زبور ۱۰۳ کے تصور تک پہنچ جاتا ہے ۔

(۸)۔ بارُوخ کی کتاب

اس کتاب کو بارُوخ کے مکاشفہ سے خلط ملط نہ کریں۔ اس کتاب میں چند نسخے بارُوخ کے نام سے جو یرمیاہ نبی کا وفادار دوست اور منشی تھا جمع کئے گئے ہیں ان نسخوں میں سے اکثروں کی نسبت یہ رائے ہے کہ بارُوخ نے بابل میں لکھے جب یروشلم کو کسدیوں کے ہاتھ سے جلے پانچ سال گزر گئے تھے۔ لیکن زباندانی اور تاریخی امور پر لحاظ کرنے سے یہ رائے قائم نہیں رہتی۔ اس میں کم از کم دو فصلیں اور ایک تتمہ ہے اور یہ تینوں حصے غالباً مختلف شخصوں کی تصنیف ہیں۔ (۱) ۱ سے ۳: ۸ تک۔ ایک مختصر تاریخی دیباچہ کے بعد یہودی اسیروں کے منہ سے گناہ کا اقرار نکلتا ہے۔ اور یہ دعا کہ خدا ان کی خطاؤں کو معاف کردے خاص کر یہ گناہ کہ انہوں نے نبیوں کی پرواہ نہ کی (۲) ۳: ۹ سے ۵: ۹ تک۔ جو اسرائیلی قوموں میں منتشر تھے ان کو یہ نصیحت کی گئی کہ ان کی ساری مصیبتوں کی وجہ اس خدا سے نافرمانی ہے

جو حکمت کا چشمہ ہے اور انہیں بحالی کی امید دیکر تسلی دی۔ ان دونو فصلوں میں کوئی قدرتی تعلق نہیں اور شاید یہ دونو فصلیں مختلف زبانوں میں لکھی گئیں۔ ایک عبرانی ہیں اور دوسری یونانی ہیں۔ لیکن دونو کا طرز تحریر نبیانہ ہے۔ پہلی فصل تو بہت کچھ یرمیاہ اور دانیال کے نمونہ پر ہے اور دوسری فصل یسعیاہ اور ایوب کے نمونہ پر۔ ان کا سن تصنیف ٹھہرانا مشکل ہے۔ اگر یروشلم کی تسخیر کا ذکر ہے تو گمان غالب ہے کہ رومیوں کے ذریعہ اس کی بربادی کی طرف اشارہ ہے اور نہ جیسا کہ بعضوں نے سمجھا انتی اوخس اپی فینس کے ذریعہ یروشلم کے فتح ہونے کی طرف۔ اس لحاظ سے پہلی فصل کی تصنیف کا سن ۷۰ء کے بعد ہوگا۔ برعکس اس کے دوسری فصل اس سے کچھ عرصہ پہلے تحریر ہوئی ہوگی۔ اس کی آخری آیات سلیمان کے زبور کے ایک مقام سے مشابہت رکھتی ہیں جن کا سن تصنیف عموماً پہلی صدی قبل از مسیح کا وسط بتایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ فصل عموماً اس کے بعد لکھی گئی ہوگی یا مسیحی سن کے شروع کے قریب۔ یہ دونو فصلیں جیسا کہ ہم باروخ کی کتاب میں ذکر کر چکے ہیں پہلی صدی مسیحی کے آخر سے پیشتر اکٹھی جمع کی گئی ہونگی۔ یہودیوں میں اس کی بہت قدر و منزلت نہ تھی ✦

تتمہ یعنی چھٹا باب یرمیاہ کا خط ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ خط اس نبی نے یہودیوں کو لکھا جب وہ بابل کو اسیر ہوکے جانے کو تھے۔ یہ خط بھی مستند نہیں۔ شاید کسی اسکندری یہودی نے پہلی صدی قبل از مسیح میں یہ خط لکھا۔ یہ عجیب طرح کی تحریر ہے اور اس میں عموماً بت پرستی کی بے وقوفی اور بتوں کی کمزوری کا ذکر ہے۔ اس خط کے مصنف نے شاید یرمیاہ ۲۹: ۱ میں یرمیاہ کے خط کا ذکر پڑھا اور اس خط کو یرمیاہ کا وہ خط ظاہر کرنا چاہا تاکہ اس طریقہ سے اپنے ہم وطنوں کو ان خطروں اور آزمایشوں سے آگاہ کرے جن سے وہ مصر میں گھرے تھے ✦

(۹) تین پاک جوانوں کا گیت

یہ اور باقی دو اجزا جو ایک ایک باب کے ہیں یونانی بائیبل میں دانیال کی کتاب کے ساتھ مجلد ہیں۔ ان میں یہودی اسکولوں کے اس میلان کی تشریح ہے خاص کر اسکندریہ کے سکولوں کی کہ تاریخ میں مذکور شدہ مقدس لوگوں کے ساتھ عجیب عجیب قصے ملحق کریں۔ ان کے آغاز کا کچھ حال معلوم نہیں اور شاید دانیال کی کتاب سے ان کا کچھ علاقہ بھی نہ ہو۔ بہرحال مسیحی سن کے شروع ہونے سے پیشتر یہ اس کتاب میں شامل کیا گیا ✦

یہ تین پاک جوان۔ سدرک۔ میسک اور عبدنجو ہیں۔ جن کے عبرانی نام یہ ہیں حننیاہ۔ میسائیل اور عزریاہ (دانیال ۱: ۶ و ۷)۔ ان کا گیت دانیال کے یونانی ترجمہ میں تیسرے باب کی ۲۳ و ۲۴ آیات کے مابین مندرج ہے۔ جس وقت کہ وہ بندھے ہوئے آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالے گئے۔ اس میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ (ا) آیات ۱ سے ۲۲ تک عزریاہ کی دعا جو عام الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اور دانیال ۹ اور عزرا ۹ کے نمونہ پر کل اسرائیل کے گناہوں کا اقرار اور ان کے لئے التجا ہے۔ (ب) آیات ۲۳ سے ۲۷ میں تین عبرانی جوانوں کو خدا نے آگ کے شعلوں میں محفوظ رکھا جن شعلوں نے کسدیوں کو جلا دیا اور یہ دعا کا جواب تھا۔ (ج) ۲۸ آیات ۲۸ سے ۶۸ تک شکرگزاری یا خلقت کے سارے طبقات سے مخاطب ہونا کہ وہ خداوند کی حمد کریں اور اس کو مبارک کہیں ✦

آخری فصل میں جو کہ خاص گیت ہے اس رہائی کا صرف ایک دفعہ ذکر آیا ہے جس تقریب پر کہ یہ بنایا گیا تھا۔ یہ گیت شکرگزاری کے مزامیر پر بہت کچھ مبنی ہے مثلاً ۱۰۳-۲۰ + ۱۳۶ و ۱۴۸ + یشوع بن سیراخ کی حکمت ۴۸ باب۔ حمد کا گیت

یا تین نوجوانوں کے گیت کے نام سے یہ گیت مسیحی کلیسیا میں چوتھی صدی سے گایا جاتا ہے اور انگلستان کی کلیسیا میں حمد الہیٰ کی بجائے صبح کی نماز کے وقت خاص موسموں میں مستعمل ہوتا ہے۔

(۱۰) سوسنہ کی تاریخ

دانیال کے یونانی ترجمہ میں یہ قصہ اُس کتاب کے بارہ بابوں کے تتمہ کے طور پر ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ کیسے دانیال نے اپنی جوانی میں اپنی بڑی دانائی کے ذریعہ پاکدامن اور عفت شعار سوسنہ کو شرمناک موت سے بچالیا۔ اس قصہ میں اخیاب اور صدقیاہ اور بابل کے دو جھوٹے نبیوں کا ذکر ہے جنہوں نے یرمیاہ کے غصہ کو بھڑکایا تھا (یرمیاہ ۲۹: ۲۰ سے ۲۳)۔ جن کا ذکر مابعد یہودی مصنفوں کی کتاب میں بار بار آیا ہے۔ اس کتاب کا مقصد یا تو یہ ہوگا۔ کہ ذی رتبہ لوگوں کے درمیان بدی کو ظاہر کرے یا دانیال کی حکمت کی تعریف کرے جب شکسپیئر نے شائی لاک یہودی کی زبان سے یہ کلمہ نکلوایا "دانیال عدالت کے لئے آیا ہے" تو اس کے دل میں اس قصہ کا خیال ہوگا۔

(۱۱) بیل اور اژدہا کی بربادی کا قصہ

یہاں دو اور قصے دانیال کی دانائی اور دینداری کے ہیں۔ یہ ستروں کے ترجمہ میں دانیال کی کتاب کے تتمہ یا چودھویں باب کے طور پر آیا ہے۔ پہلے قصہ میں (۱ سے ۲۲ آیات) دانیال نے اُس مکر کو ظاہر کردیا جو بیل کے کاہن کیا کرتے تھے۔ وہ یہ دکھانا چاہتے تھے کہ جو طرح طرح کے کھانے اور شرابیں بُت کے آگے رکھے جاتے تھے اُن کو وہ بُت کھا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ اور انکے خاندان ایک پوشیدہ راستے کے ذریعہ رات کو اندر

گھس کر سب کچھ کھا جایا کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کاہن مع ان کے خاندانوں کے مروا دیئے گئے اور دانیال کو اجازت ملی کہ بیل اور اس کے مندر کو برباد کرے۔ دوسرا قصہ (آیات ۲۳ سے ۴۲ تک) اژدہا کے مارے جانے کا ہے جس کے آگے اہل بابل نذر نیاز چڑھایا کرتے تھے۔ اس یہودی بہادر نے اُس کو غیر ہضم اشیا پلادیں۔ جن کی وجہ سے اُس کا پیٹ پھٹ گیا اور دانیال کو اس اژدہا کے پجاریوں نے شیروں کی ماند میں ڈلوادیا اُس ماند میں دانیال چھ دن تک پڑا رہا۔ اور اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا اور معجزانہ طور پر حبقوق نبی نے یہودیہ سے اُس کو خوراک پہنچائی۔ اُس کے رہا ہونے پر اُس کے دشمن شیروں کے آگے ڈالے گئے۔ اور شیروں نے اُنہیں فوراً نگل لیا۔ مابعد یہودیوں نے یہ واقعہ قانونی کتاب کے قصہ سے متفرق سمجھا۔ اس دُہرے قصہ کا یونانی نام یہ ہے "دحبقوق ابن یسوع لیوی کی نبوت میں سے" اس قصہ کا مقصد یہ ہے کہ بتوں کی ناتوانی کا مقابلہ خدا کی قدرت مطلقہ سے کرے اور ان کی عبادت کی بطالت اور بیہودگی کو ظاہر کرے۔ ان قصوں کی بنا غالباً یرمیاہ ۱۰: ۱۴ + ۵۱: ۴۴ ہوگی جہاں بتوں کی بطالت اور نبوکدنضر شاہ بابل کے اژدہا جیسی شکم پروری کا ذکر ہے۔

(۱۲) منسّی کی دُعا

یہ شخصی گناہ کا مختصر اقرار اور خدا سے معافی کے لئے پرجوش زاری و فریاد ہے اور بہت عمدگی سے بیان ہوئی ہے۔ یہ "تائب منسی کی دعا ظاہر کی جاتی ہے جو یہوداہ کا بادشاہ تھا جس نے بابلی اسیری کے ایام میں دعا مانگی (۲ تواریخ ۳۳: ۱۱ سے ۱۳)۔ لیکن ایک جملہ کے سوائے کہ "لوہے کی زنجیروں سے میں پست ہوگیا ہوں" اور کوئی جملہ نہیں جو خاص طور سے اُس پر عاید ہوسکے۔ وہ اُس کے خاص گناہوں کا ذکر ہے جن کا وہ خاص اقرار کرنا چاہتا تھا۔ شاید ۲ تواریخ ۳۳: ۱۸، ۱۹ کی وجہ سے یہ دعا منسی سے

منسوب ہوئی۔ کیونکہ اُس مقام میں مذکور ہے کہ وہ دعا معہ اُس کے دیگر اعمال کے بنی اسرائیل کے بادشاہوں کی کتاب" اور غیب بینوں کے اقوال" میں لکھی گئی تھی۔ چونکہ یہ دعا پیشتر سے موجود تھی اس لئے اس مقام کے لحاظ سے منسی کا نام اس پر چسپاں کیا گیا۔ یا شاید یہ خاص اسی مطلب کے لئے تیار کی گئی تاکہ قانونی کتابوں میں داخل ہو۔ اس میں بائیبل کے الفاظ محاورات اور خیالات بہت پائے جاتے ہیں اور یہ ایک نظم ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دعا پہلے پہل عبرانی یا آرامی زبان میں لکھی گئی تھی ‡

(۱۳) مکابیوں کی پہلی کتاب

مکابیوں کی ساری چار کتابیں ہیں، جو اُس مشہور خاندان سے منسوب ہیں جو دوسری صدی قبل از مسیح میں ملک یہوداہ میں عروج پکڑ گیا۔ لیکن اس اپوکرفا کے مجموعہ میں صرف دو کتابیں ہیں۔ اس لئے اس فصل میں ان کا ذکر ہوگا ‡

مکابیوں کی پہلی کتاب چالیس سالوں کی تاریخ ہے (۱۷۵ سے ۱۳۵ ق م)۔ اس عرصہ میں اس مشہور خاندان کے ماتحت یہودی دینی اور ملکی آزادی کے لئے جنگ کرتے رہے۔ چونکہ یہ کتاب عموماً قابل اعتبار ہے۔ اور مفصل تفصیل اس میں دی گئی ہے۔ جن تاریخوں کا ذکر ہے وہ صحیح ہیں اس لئے یہ کتاب اُس زمانہ کی واقفیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ اسکندر اعظم کی فتوحات کا مختصر ذکر کرنے اور سریانی سلطنت کے آغاز کے بیان کے بعد اس میں واقعات کا سلسلہ ٹھیک تاریخی طور سے بیان ہوا ہے۔ آنتی اوخس اپی فینس کی ایذا رسانی سے لیکر تیسرے مکابی بھائی شمعون کی وفات تک اس میں ذکر ہے (ا) ۱: ۱۰ سے ۲ باب کے آخر تک سوریانی ایذا رسانی کے دکھوں کا بیان ہے۔ اور اُس بغاوت کا ذکر ہوا ہے جو متتھیاس نے بمقام موذین شروع کی۔ (ب) ۳ سے ۹: ۲۲ تک یہوداہ مکابی کی مہموں اور کامیابیوں کا مفصل ذکر ہے۔

(۱۶۷ سے ۱۶۱ ق م) جس میں ہیکل کی بحالی اور خدا کے لئے نئے مذبح کی تقدیس بھی داخل ہے۔ (ج) ۹: ۲۳ سے ۱۲ باب تک۔ اس قوم کے مزید انقلابات کا بیان ہوا۔ یوناتھن کے عہد سلطنت میں (۱۶۰ سے ۱۴۳ ق م)۔ جو شمعون کے زمانہ (۱۴۳ سے ۱۳۵ ق م) میں کمال عروج تک پہنچی۔ کتاب کے آخر میں شمعون کے جانشین یوحنا ہرکانیوس کا ذکر ہے ‡

یہ کتاب سلیس عبارت اور مختصر طرز بیان اور اپنے معتبر مقامات اور واقعات کا علم رکھنے کی وجہ سے کبھی دلچسپی سے خالی نہیں رہی۔ اس کے عام اعتبار سے جو مقامات مستثنے کئے گئے ہیں وہ ۱: ۶ میں ہے۔ جہاں لکھا ہے کہ اسکندر نے اپنے جیتے جی اپنے جرنیلوں کے درمیان اپنی سلطنت کو تقسیم کر دیا۔ اور رومی سینٹ کی طرف اشارہ ۸: ۱۵ و ۱۶ میں اور ان سوریانیوں کے شمار میں مبالغہ جو یہودیوں کے مقابلے میں آئے۔ کثیر التعداد سوریانیوں پر یہودیوں کی عجیب فتح کے سوا اور کسی معجزے کا ذکر اس کتاب میں پایا نہیں جاتا۔ اور شاذونادر ہی مصنف کے ذاتی خیالوں سے قصہ کی روانگی میں خلل ڈالا گیا۔ حالانکہ اس قسم کی دوسری کتابوں میں ایسی مداخلت بہت پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں خاص امر یہ ہے کہ واقعات کی تاریخیں "یونانیوں کی سلطنت" کے شروع سے لی گئی ہیں۔ یعنی سوریا میں سلیوکی خاندان کی بنیاد سے لے کر (۳۱۲ ق م)۔ اس سے پیشتر کی یہودی تصنیفات میں کوئی صحیح طریقہ تاریخوں کے شمار کا استعمال نہیں ہوا ‡

مکابیوں کی پہلی کتاب کی تصنیف کا زمانہ عموماً پہلی صدی قبل از مسیح کا شروع بتایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس کتاب میں رومیوں کی تعریف اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلق کا ذکر آتا ہے اس لئے یہ کتاب پمپی کے ذریعہ یروشلم کی تسخیر سے چند سال پہلے لکھی گئی ہوگی۔ (۶۳ ق م)۔ اور برعکس اس کے اس کتاب کی آخری آیات (۱۶: ۲۳ و ۲۴) میں یہ ذکر ہے کہ یوحنا ہرقانیوس کے اعمال کا

باقی احوال تواریخ میں لکھا گیا اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کی سلطنت (۱۳۵ سے ۱۰۵ ق م) اس کتاب کی تصنیف سے پیشتر ختم ہو چکی تھی۔ اس موخر الذکر نتیجہ پر بعضوں نے اعتراض کیا ہے اس خیال سے کہ جن آیات کا حوالہ دیا گیا ان میں عام محاورہ کا ذکر ہے کہ گو مصنف نے کتاب ہرقانوس کے زمانہ میں لکھی۔ لیکن یہ جملہ عام طور سے کتاب کو زینت دینے کے لئے استعمال کیا۔ کتاب کے لہجہ سے اور اس کی اعلےٰ صحت اور چند خاص حوالجات سے ماقبل تاریخ تصنیف کی ہی تائید ہوتی ہے۔ اس سے ہرقانوس کی سلطنت کے شروع میں اس کی تصنیف قرار دی گئی۔ یا ۱۳۵ اور ۱۰۵ ق م کے مابین۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ کسی فلسطینی یہودی نے عبرانی زبان میں یہ کتاب لکھی اور جیروم کی بھی یہی رائے تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یونانی کتاب میں بہت عبرانی محاورے آئے ہیں۔ بعض مقامات میں ترجمہ اور اسمائے معرفہ کے غلط ہجوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مصنف کتاب کا فلسطین میں ایسی دلچسپی رکھنا اور وہاں کے مقامات سے اس قدر واقف ہونا بھی اسی رائے کا ممد ہے۔ اس مصنف کے بارہ میں کئی دیگر اشارے بھی اس کتاب سے مل سکتے ہیں۔ اس میں تو کچھ شک نہیں رہتا کہ مصنف محب وطن یہودی تھا اور اپنے ملک کے دستورات اور مذہب کا دلدادہ تھا۔ وہ وہاں کے ملکی امور سے بھی کلی واقفیت رکھتا تھا۔ غالباً یہ کوئی عہدہ دار شخص ہوگا جو رؤسا و شرفا سے بخوبی آشنا تھا۔ علاوہ ازیں یہ مصنف عشمانی خاندان کا بھی بڑا حامی تھا اور اُس نے اسرائیل کی بختاوری اور جلال اسی خاندان سے منسوب کی اس نے اس کتاب میں خدا کا نام لکھنے سے اجتناب کیا اور اُس کی جگہ آسمان کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ اُس زمانہ کے یہودیوں کے عین خیال کے مطابق تھا کیونکہ وہ خدا کو ایسا اعلےٰ مانتے تھے کہ اُس کا نام زبان پر لانا بھی معیوب سمجھتے تھے۔ چونکہ اس نے

قیامت کے بارہ میں خاموشی ظاہر کی اور یہودی کہانت کی عظمت پیش کی اس لئے یہ مصنف غالباً صدوقی فرقے سے ہوگا۔ اس نے مسیحی امید کا بھی ذکر نہیں کیا۔ سوائے ان مقامات کے جہاں پُرانے مذبح کے پتھروں کے جمع کرنے کا ذکر ہے (۱م ۴ : ۴۶) اور کہ شمعون ہمیشہ کے لئے حاکم اور سردار کاہن مقرر ہو گیا (۱۴ : ۴۱) "جب تک کہ ایک وفادار نبی برپا نہ ہو"۔

(۱۴) مکابیوں کی دوسری کتاب

اس کتاب میں بھی مکابی تاریخ کا ذکر ہے۔ لیکن پہلی کتاب سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ برعکس اس کے گو اس کتاب میں پہلی کتاب کے زمانہ کا کچھ ذکر ہے۔ لیکن اس کتاب کے مصنف کو پہلی کتاب سے مطلق واقفیت معلوم نہیں ہوتی۔ اور طرز اور لہجہ میں پہلی کتاب سے یہ بالکل متفرق ہے۔ انتی آوخس ایپی فینس کے سریانی تخت پر بیٹھنے سے (۱۷۵ ق م) پیشتر کے زمانہ کا ذکر اس کتاب کے شروع میں ہے۔ اور کتاب کے آخر میں نکانور کی شکست اور وفات اور یہوداہ مکابی (۱۶۱ ق م) کی فتح کا بیان قلمبند ہے۔ باقی درمیانی حصہ میں یہ ذکر آتا ہے کہ ہیلیوڈورس نے ہیکل کا خزانہ لوٹنے کی بہت کوششیں کیں۔ اور صدر کہانت کے لئے یروشلم کے رؤسا نے بہت سازشیں کیں۔ انتی آوخس نے ہیکل کو ناپاک کیا۔ اور جو مصیبتیں اس بڑی ایذا رسانی کے ذریعہ یہودیوں کو پیش آئیں اور جن لڑائیوں میں اپنے ملک کی آزادگی کے لئے یہوداہ نے فتوحات حاصل کیں۔

مصنف کا یہ دعوےٰ نہیں کہ یہ خالص میری اپنی تصنیف ہے بلکہ اُس کا بیان یہ ہے کہ جو کتاب یاسون قرینی نے (۲ : ۲۳) پانچ جلدوں میں لکھی تھی اس کا یہ اختصار ہے۔ یاسون اور اس کی تاریخ کے بارہ میں کچھ تحقیق معلوم نہیں

گو گمان غالب یہ ہے کہ اُس نے یونانی میں یہ کتاب لکھی۔ دوسری صدی قبل از مسیح کے آخر کے قریب اور زبانی روایات سے مصالح جمع کیا۔ اس نے اختصار کرنے میں اصلی کتاب کی کئی عجیب غریب فضلیں چھوڑ دی ہیں۔ اس کی یونانی کی طرز سے اور اس تالیف کی طرف قدیم اشاروں سے مصنف کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسکندریہ کا یہودی تھا۔ اور مکابیوں کی پہلی کتاب سے جن باتوں میں یہ متفرق ہے اس سے اس امر کا پتہ لگتا ہے کہ یہ مصنف فریسی فرقہ سے تھا۔ اس نے خداوند کے نام کا بلا تامل ذکر کیا ہے۔ اور قیامت کے عقیدہ کی طرف صاف اشارے ہیں (۷: ۹، ۱۴ ؛ ۱۲ : ۴۳، ۴۴)۔ اور مُردوں کے لئے دعاؤں کے رواج کا ذکر ہے۔ یہ خداوند کے جلال بڑھانے کی زیادہ فکر کرتا ہے۔ جو سارے آدمیوں کو اپنے اوزاروں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ مکابی بہادروں کی بہادری کا ذکر کرے۔ کتاب کی تصنیف کا سن بھی تحقیق معلوم نہیں۔ لیکن چونکہ یہ کتاب فائلو کو معلوم تھی۔ اور عبرانیوں کے خط کے مصنف کو (مقابلہ کرو ۲ مکابی ۶ : ۱۸ سے ۷ : ۴۲ کا عبرانی ۱۱ : ۳۵ سے) اس لئے اس کتاب کا سن تصنیف مسیحی سن کے شروع کے بعد نہیں ہو سکتا ✦

خاص تاریخ ۲ : ۱۹ سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پیشتر دیباچہ کے طور پر دو خطوط ہیں جن کی نسبت دعوے ہے کہ فلسطین کے یہودیوں نے اُن یہودی بھائیوں کو لکھے جو مصر میں تھے ✦

دوم مکاشفہ کی کتابیں

باروخ۔ حنوق۔ یسعیاہ کا صعود۔ جوبلی۔ موسیٰ کا اٹھایا جانا۔ بارہ بزرگوں کا عہدنامہ۔ سلیمان کے مزامیر۔ الہامی کلام ✦

یہ نام مکاشفہ چند یہودی اور قدیم مسیحی تصنیفات پر چسپاں کیا گیا ہے تاکہ انکی خصوصیت کو ظاہر کرے۔ ان کتابوں کا مقصد ان مشکلات کو حل کرتا ہے جو خدا کی حکومت عادلہ کے واقعات میں پائی جاتی ہیں۔ یہودی خلاسفر خدا کی راستبازی اور شریعت کے ماننے کے لئے جن اجروں کا وعدہ کیا گیا ان کو مانتا تھا۔ اس لئے جو صورت حالات نظر آتی تھی اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ خدا کے بندوں پر ایسی مصیبتیں کیوں آتی ہیں اور غیر قومیں ایسی زبردست اور باقدرت کیوں ہیں؟ اس لئے دینی تمیز کے ساتھ راستبازوں کی مصیبتوں کو مطابقت دینے کے لئے کوئی طریقہ چاہئے۔ ان مکاشفہ نویسوں نے معلوم کیا کہ جہان کی تاریخ کی بحیثیت مجموعی روحانی تفسیر کریں۔ مشرق اور مغرب کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ساتھ تعلق رکھنے کے ذریعہ ان کے خیالات زیادہ وسیع ہو گئے تھے۔ اور انسانی تاریخ کی بڑی بڑی تحریکوں سے وہ واقف ہو گئے تھے۔ افراد اور قوموں دونوں کے برپا ہونے اور گرنے میں الٰہی مقصد کا بتدریج مکاشفہ ہوتا جاتا تھا۔ اور آئندہ کو اس کی پوری تکمیل ہو گی خدا کی راستبازی کی پوری تصدیق ہوتی تھی۔ اور خدا کے ایماندار لوگ غیر قوموں کی نظر میں صادق ٹھہرتے تھے۔ یہ روایتیں اور مکاشفے کسی نہ کسی نبی سے منسوب ہیں اور ان کے سلسلہ میں جہان کی تاریخ کا خاکا کھینچا گیا ہے اور سنہری زمانے کا بیان ہے جس کے وہ امیدوار تھے ✦

ان کتابوں کا طرز اور مضامین بہت مختلف ہیں۔ بعضوں میں تو غیر قوم مخاطب ہیں تاکہ یہودی عقیدہ کی عظمت اور اُس کو نظرانداز کرنے کے خطرات کو ظاہر کریں بعضوں میں مصنف نے اپنے ہم مذہبوں کو تسلی دی ہے۔ بعض صوفیانہ اور مکاشفانہ ہیں۔ اور بعضوں میں شریعت کی تفسیر اور تعمیل کا ذکر ہے۔ بعضوں میں اسرائیل کے جلال اور حکومت کے ازسرِنو فروغ پانے کا ذکر ہے۔ بعض میں یہ پیش خبری ہے کہ عالمگیر مسیحی سلطنت اور قیامتی زندگی ہوگی اور بعض مصنفوں نے ان کی حقیقت اور مدت کا مختلف بیان کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہودی زندگی اور خیال کے نشوونما میں اُنہوں نے بہت اثر کیا اور اس لئے مورخ کے لئے یہ بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک طرف تو اُنہوں نے اس امر میں مدد کی کہ اعلےٰ خیال کے یہودیوں کو انجیل کے قبول کرنے کے لئے تیار کریں جس میں عالمگیر اصول خود انکاری کے پائے جاتے تھے۔ اور آئندہ کے لئے ایک ذوالجلال امید کا بیان تھا۔ اور دوسری طرف ان کے ذریعہ ان لوگوں کو حب الوطنی کی تحریک حاصل ہوئی جنہوں نے بار بار کوشش کی تھی کہ رومی جوئے کو اتار پھینکیں اور آخر کار یہودی قوم کی بربادی کا باعث ہوئے۔

ان مکاشفہ کی کتابوں میں سے دو تو قانون میں داخل ہو گئیں۔ مثلاً دانیال کی کتاب عہد عتیق میں اور یوحنا کے مکاشفے کی کتاب نئے عہدنامہ میں۔ اپوکرفا میں عزراہ کی دوسری کتاب اسی قسم کی ہے۔ لیکن اس قسم کی بہت دوسری کتابیں تھیں جن میں سے زیادہ مشہور مذکورہ بالا ہیں۔

(۱) باروخ کا مکاشفہ

تعلیم اور دیگر خاص امور کے لحاظ سے جو اس کتاب میں مندرج ہیں یہ کتاب عزراہ کی دوسری کتاب سے مشابہت رکھتی ہے اس میں باروخ کی پیشین گوئی قلمبند ہوئی ہے

جو نیریاہ کا بیٹا تھا جس کی نسبت یہ روایت ہے کہ ۵۸۶ ق م میں کسدیوں کے حملہ سے تھوڑی دیر پہلے اُس نے یہ کلام کیا۔ اور یروشلم کی بربادی اور مابعد بحالی کی پیشین گوئی کی۔ اس میں سات الگ الگ فصلیں ہیں جن میں عموماً دعائیں اور رویتیں پائی جاتی ہیں اور بعض بیان تعلق دینے کے لئے آئے ہیں۔ سوائے ایک واقعہ کے ہر ایک میں فاصلہ روزہ رکھنے کے ذریعہ ظاہر کیا گیا۔ باقی بابوں میں اسیر شدہ فرقوں کی طرف باروخ کا خط ہے۔ یہ خط مدتوں سے معلوم تھا۔ لیکن جس صورت میں یہ کتاب موجود ہے اس صورت میں یہ کتاب لاطینی ترجمہ میں ۱۸۶۶ء میں ملی۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی اصلی کتاب سے سوریانی اور یونانی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور پھر وہاں سے لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا ایک حصہ رومیوں کے ذریعہ یروشلم کی تسخیر (۷۰ء) سے پیشتر لکھا گیا اور کچھ حصہ اس کے بعد۔ اس امر واقعی اور دیگر وجوہات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے مختلف حصے مختلف شخصوں کی تصنیف ہیں اور مختلف وقتوں کی ۵۰ء سے ۹۰ء کے درمیان۔ اس میں فریسی خیال کا اظہار ہے۔ اور اس کی زبان نئے عہدنامہ کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔

(۲) حنوق کی کتاب

حنوق کے نام کے ساتھ مکاشفہ کا ذکر کرنا شاید پیدائش ۵: ۲۴ کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اس کی نسبت یہ رائے تھی کہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اس لئے اس سے زمانہ حال اور استقبال اور ارضی و سماوی اشیاء کے مکاشفات منسوب کرنا قدرتی امر تھا۔ قدیم زمانہ میں مکاشفات کی کئی ایک کتابیں اس سے منسوب کی گئی تھیں اور کئی حصے اس کتاب کے جو اب اس کے نام سے مشہور ہے۔ عموماً یہ مانا جاتا ہے کہ قبل از مسیح آخری دو صدیوں میں فلسطین میں یہ مکاشفات لکھے گئے۔ لیکن عبرانی یا آرامی

اصل کتاب کھو گئی ہے اور مکمل کتاب صرف کوشی ترجمہ میں موجود ہے۔

حنوق کی کتاب کے مضامین پانچ فصلوں پر منقسم ہیں جو مختلف شخصوں کی تصنیف ہیں اور ان کی تاریخ ۲۰۰ ق م سے لیکر مسیحی سال کے شروع ہونے تک ہے۔ بیچ میں بعض مقامات ایسے ہیں جو نوح سے منسوب کئے ہیں۔ اور مولف کتاب نے دوسرے مکاشفہ سے اخذ کئے اور اس بزرگ کے نام سے مشہور کیا۔ عام مضمون کتاب کا یہ ہے خدا کے دشمنوں اور اس کی امت کا زوال اور عدالت۔ اور آخر کار خدا کی سلطنت کا راستبازی اور قدرت کے ساتھ قایم ہو جانا۔ ایک روئیت میں ستر فرشتوں یا چوپانوں کو یہ حکم ملا کہ باری باری اسرائیل کی حفاظت کریں لیکن وہ اس امانت میں بے وفا نکلے۔ اس لئے یہودی روایت کے مطابق وہ معہ اپنے دواحقوں کے آگ کے سمندر میں ڈالے گئے۔ حنوق نے آسمان کی سیر کی اور اس نے آدمیوں اور فرشتوں کا انجام بہت کچھ معلوم کر لیا۔ اس نے فطرت کے رازوں کو بھی دریافت کیا۔ کتاب کے وسط میں تین طویل تمثیلیں ہیں۔ (۳۷ سے ۷۰ بابوں تک)۔ ان بابوں کی نسبت یہ خیال ہے کہ وہ ۹۴ اور ۶۰ ق م۔ کے درمیان لکھے گئے اور کسی صورت میں شاہ ہیرودیس کی سلطنت کے بعد نہیں۔ معمولی مکاشفہ کے مضمون کے ساتھ اس کتاب میں اس حاکم عادل کا دلچسپ بیان ہے جس کے ذریعہ دنیا کے ظلم اور بے انصافیوں کا علاج ہوگا۔ وہ محض داؤد کی نسل ہی نہیں۔ بلکہ وہ برگزیدہ یا راستباز شخص یعنی مسیح ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ وہ ابن آدم ہے جو راستبازی رکھتا ہے جس کے ساتھ راستبازی سکونت رکھتی ہے وہ سارے پوشیدہ رازوں کو منکشف کرتا ہے۔ کیونکہ روحوں کے خداوند نے اسے چنا ہے۔ (۴۶: ۱ سے ۳)۔ ان چاروں لقبوں کو پیچھے یسوع نے خود اپنے لئے استعمال کیا یا اس کے شاگردوں نے اس کے لئے۔ مگر اس کے علاوہ کئی دیگر باتوں سے بھی پتہ لگتا ہے کہ قدیم مسیحیوں میں اس کی کیسی قدر تھی۔ اس کے کئی مقامات میں عبارت نئے

عہد نامہ سے مشابہ ہے۔ اور ایک مقام میں تو اس کا صریح اقتباس ہے (یہوداہ ۱۴۔ آیت)۔ اس کی تعلیم پر بھی اس کتاب کا بڑا اثر پایا جاتا ہے۔ خاصکر قیامت آیندہ جزا و سزا، فرشتوں کی خدمت۔ اور جنات کی ذات و کام کے مسائل کے بارہ میں۔ کلیسیا کے قدیم بزرگوں کے درمیان حنوق کی کتاب سے اقتباس کرنا بہت پسند تھا اور برنباس کے خط نے تو اس کتاب کو قانونی درجہ تک پہنچا دیا۔

چند سال گزرے ایک کتاب ملی جس کا یہ نام تھا "حنوق کے راز" اس میں بھی حنوقی مکاشفات کے اجزا پائے جاتے ہیں۔ جس زبان میں یہ کتاب لکھی گئی اس کی وجہ سے یہ کتاب سلیوونک حنوق (Slavonic Enoch) کہلاتی ہے تاکہ دوسری قدیم کوشی کتاب سے اس کا امتیاز ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ عبرانی اصل سے لیا گیا لیکن بڑا حصہ غالباً یونانی زبان میں لکھا گیا ہوگا۔ مسیحی سن کے آغاز کے قریب۔ اس میں ان رازوں کا ذکر ہے جو حنوق پر اس وقت منکشف ہوئے جب اس نے ساتوں آسمانوں کی سیر کی۔ اس کے ذریعہ جو روشنی نئے عہد نامہ پر پڑتی ہے اس کی وجہ سے یہ قابل قدر ہے۔ ہزار سالہ سلطنت اور سات آسمانوں کی تقسیم پہلی دفعہ اس کتاب میں ملتی ہے۔

(۳) یسعیاہ کا صعود

یہ کتاب مکمل صورت میں صرف کوشی ترجمہ ہی میں پائی جاتی ہے اور اس میں مفصلہ ذیل مضامین پائے جاتے ہیں:-

(ا) یسعیاہ کے شہید ہونے کا بیان۔ (ب) ایک مختصر مکاشفہ جس میں قدیم کلیسیا کی تاریخ کا خاکہ دیا گیا ہے (۵۰ سنہ سے ۱۰۰ سنہ تک)۔ (ج) یسعیاہ کی روئیت جس میں اس کے ساتوں آسمانوں کی سیر کا بیان ہے۔ اور اس میں مسیح کی آمد کے متعلق

دیگر باتوں کے ذکر کے سوا نجات دہندہ کی صلیب اور قیامت کا بیان ہے۔ اس کا پہلا حصہ غالباً کسی یہودی نے پہلی صدی مسیحی کے شروع کے قریب لکھا۔ باقی دو حصے کسی مسیحی شخص کی تصنیف ہیں اور اس صدی کی آخری نصف سے علاقہ رکھتے ہیں۔ عبرانی ۱۱:۳۷ میں غالباً اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے ؎

(۴) جوبلیوں کی کتاب

یہ مکاشفہ پیدائش کی کتاب کی تفسیر کے طور پر ایک طرح کا وعظ ہے اور یہودی ہگدا (Haggada) کی تعلیم کے نمونہ پر ہے۔ دنیا کی پیدائش سے لے کر عید فسح کے تعین تک کا سرسری ذکر کیا ہے۔ اور بزرگوں (Patriarchs) کی تاریخ کا مطلب مسیحی سن کے شروع ہونے سے پیشتر کی صدی کے یہودی علماء کے مطابق دیا گیا ہے۔ مصنف کی خاص غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ شریعت اور یہودی رسوم کی قدامت پر زور دے اور اس کے ثبوت میں یہ پیش کرے کہ نہایت قدیم زمانوں سے ان کی پوری تعمیل ہوتی چلی آئی ہے۔ ساتھ ہی ایسے بیانات کے لئے جو یونانی یہودیوں کے دل خراش تھے عذر معذرت کرتا ہے۔ مثلاً باغ عدن سے خارج کیا جانا۔ قائن پر لعنت۔ ابراہیم اور یعقوب کا فریب۔ اور موعود زمین میں داخل ہوتے وقت اسرائیلیوں کا ظلم کنعانیوں پر۔ اس کتاب میں مردوں کی قیامت کا کچھ ذکر پایا نہیں جاتا۔ گو روح کی بقا کی طرف کئی ایک اشارات ہیں۔ وقت کے شمار کے طریقے کے لحاظ سے کتاب کو یہ نام دیا گیا۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ہر جوبلی دورہ انچاس سال کا لیا گیا ہے۔ اور کتاب کے مضمون کے لحاظ سے اس کا نام پیدائش صغیر آیا ہے۔ نہ اس لئے کہ یہ کتاب پیدائش کی کتاب سے چھوٹی ہے۔ کیونکہ چھوٹی تو نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ یہ پیدائش کی کتاب کے برابر مستند نہیں ؎

گو ساری کتاب صرف کوشی ترجمہ میں موجود ہے۔ لیکن یہ شروع میں عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اور کوئی فریسی اس کا مصنف تھا۔ اس کا سن تصنیف مسیح کی پیدائش سے پچاس برس پہلے یا پیچھے کے مابین قرار دے سکتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ نظر آتا ہے کہ ہیکل موجود ہے اس لئے یہ یروشلیم کے تسخیر ہونے سے پیشتر ۷۰ء کے قریب لکھی گئی ہوگی۔ اور ایک طرف اس میں حنوک کی کتاب کی اس فصل سے کئی ایک اقتباسات آئے ہیں جس کا سن تصنیف ۶۰ ق م کے بعد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لئے یہ کتاب اس سے کچھ بعد تحریر ہوئی ہوگی۔ نہ صرف فریسی تعلیم اور نئے عہد نامے کے مطالعہ کے لئے یہ بہت مفید ہے بلکہ پیدائش کی کتاب کی اصل عبرانی متن کے قرار دینے میں یہ بہت ممد و معاون ہے ؎

(۵) موسیٰ کا اٹھایا جانا

جب موسیٰ نے جان لیا کہ اس کی موت کا وقت قریب ہے تو اس نے پیشین گوئیوں کی ایک جلد یشوع کے سپرد کی۔ ان پیشین گوئیوں میں اسرائیل کی تاریخ کا ذکر ہے۔ اور مابعد ابواب میں رویا کے طور پر اس تاریخ کا بیان اس زمانہ تک کیا گیا جب یہودیہ رومی علاقہ ہو گیا۔ مصنف نے جو بیان چھٹے باب میں کیا اس کے ذریعہ اس کتاب کے سن تصنیف کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اس باب میں یہ ذکر ہے کہ ہیرودیس کے بیٹے اس کی نسبت کم عرصہ تک سلطنت کریں گے اور چونکہ ان میں سے تین نے باپ سے زیادہ عرصہ تک سلطنت کی۔ اس لئے یہ کتاب ان کے حین حیات میں لکھی گئی ہوگی اور ۳۰ء کے بعد تحریر نہ ہوئی ہوگی۔ مصنف غالباً فریسی تھا اور اس نے عبرانی میں یہ کتاب لکھی۔ لیکن ہمیں یہ کتاب صرف لاطینی ترجمے ہی میں ملی ہے ؎

(۶) بارہ پتری آرکوں کا عہدنامہ

اس کتاب میں یہ ذکر ہے کہ یعقوب کے بارہ بیٹوں نے اپنے مرنے کے وقت اپنی اولاد کو نصیحت کی۔ ان میں سے ہر ایک نے پہلے اپنی زندگی کا احوال بیان کیا اور اُس میں سے سبق نکالے اور اپنی اولاد کو نصیحت کی کہ اُن میں جو خوبیاں تھیں ان کی خوب تقلید کرو اور اُن میں جو نقص تھے اُن سے بالکل اجتناب کرو۔ پھر انہوں نے اس امر کی پیشین گوئی کی کہ گناہ کی وجہ سے کیا کیا مصائب اور ظلم ان پر نازل ہونے کو تھے مضامین کے مخلوط ہونے کی وجہ سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کتاب کسی اصلی یہودی تصنیف پر مبنی ہے۔ اور پیچھے کسی یہودی اور مسیحی اشخاص نے اس پر حاشیے چڑھائے۔ اس کے سب سے پرانے حصے غالباً دوسری صدی قبل از مسیح سے علاقہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ مزید حاشیے اُس وقت سے لے کر مسیحی سن کے شروع تک پہنچتے ہیں۔ جو نسخہ لاطینی ترجمہ کا ہم تک پہنچا وہ تیرھویں صدی کا ہے۔ اس میں وقت کے شمار کا وہی طریقہ ہے جو جوبلیوں کی کتاب میں پایا جاتا ہے۔ اور کئی سوانح عمریوں کے بیان میں اُس کے ساتھ مطابق ہے +

(۷) سلیمان کے مزامیر

یہ اٹھارہ مزامیر جو فسانہ کے طور پر سلیمان سے منسوب کئے گئے ایک یا دو فریسیوں کی تصنیف ہیں۔ یہ تو تحقیق ہے کہ یہ مزامیر اولاً عبرانی میں لکھے گئے تھے گو اب وہ ہمارے پاس صرف ترجموں ہی میں موجود ہیں۔ تمثیلی طور پر جس کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے اس کتاب میں اس وقت سے لے کر جب پمپی نے ۶۳ق م میں یروشلم کو تسخیر کیا اس کی وفات تک جو پندرہ سال بعد واقع ہوئی واقعات کا بیان

ہے۔ جن عثمانی رئیسوں نے اس کو شہر میں داخل ہونے کے لئے خیر مقدم کہا وہ داؤد کے تخت کے غاصب ٹھہرائے گئے۔ پھر آرستوبولس ودم کے فریق کی شکست اور قتل کا ذکر ہے اور مابعد مصیبتوں کا خاکا کھینچا گیا۔ اور پمپی کو اژدہا سے تشبیہ دی گئی جس نے الٰہی قدرت کا دعوے کیا۔ اور دُنیا پر حکومت کرنے کی خواہش رکھی۔ لیکن مصر کے ساحلوں پر ایسی بُری موت سے مرگیا کہ اُسے دفن کرنے کو بھی کوئی نہ ملا۔ واقعات کی جو حقیقت اس کتاب میں بیان ہوئی اور جو دینی خیال اس میں ظاہر ہوئے اُن سے گمان گزرتا ہے کہ کسی صدوقی کی تصنیف نہیں بلکہ کسی فریسی کی تحریر ہے۔ فریسیوں کے لئے لفظ "مقدس" اور راستباز آئے ہیں۔ صدوقیوں کے لئے "مغرور گناہگار" اور "خطاکار" نام آتے ہیں۔ اور اس پر بھی زور دیا گیا کہ یہودیوں پر خدا بادشاہت کرتا تھا اور راستبازی کا خاص بیان یہ ہے کہ وہ رسمی شریعت کی تکمیل ہے۔ ساری کتاب میں عدالت کی عام آگاہی دی گئی ہے۔ لیکن جزا و سزا کے لئے مُردوں کی قیامت کی بھی صاف خبر دی گئی۔ آخری دو مزامیر میں مسیحی امید کا ذکر بھی ذکر آتا ہے جس سے یہ گمان ہے کہ یہ دو مزامیر کسی متفرق شخص کی تصنیف ہیں لیکن اس سارے مجموعہ کی تصنیف کو ۷۰ سے ۴۰ق م کے درمیان قرار دے سکتے ہیں +

(۸) سیبی لائین الہامی کلام

قدیم زمانہ میں سبلس ملہم نبیہ کو کہا کرتے تھے۔ ان کا سرکاری عہدے یا مذہب سے کچھ تعلق نہ تھا۔ ان کی بنسبت یہ گمان تھا کہ ان کے وسیلے سے دیوتا اپنے خیالات اور اپنی مرضی ظاہر کیا کرتے تھے۔ ان کے کلام کی بڑی عزت کی جاتی تھی خاصکر روم میں بڑے بڑے اہم موقعوں پہ سرکاری عہدہ داران کے ذریعہ الٰہی مرضی دریافت کیا کرتے تھے۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ اسکندریہ کے یہودیوں

اور قدیم مسیحیوں نے اپنے خاص اصولوں اور عقیدوں کی طرف لوگوں کی توجہ اس طرح منعطف کرنی چاہی کہ انہوں نے سبی لائن طرز اور پیرایہ اختیار کیا۔ اگر وہ اپنے کسی نبی یا پتری آرک کا نام اِن کتابوں پر رکھتے تو غیر قوم دنیا ان کا اتنا لحاظ نہ کرتی جتنا اس نام کے ذریعہ کرتی ✦

جن تحریروں پر یہ نام سبی لاین چسپاں کیا گیا وہ مختلف قسم کی تحریروں کا مجموعہ ہیں جو کئی صدیوں میں مختلف شخصوں نے تحریر کیں۔ شروع میں یہ مجموعہ صرف چودہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ لیکن ان میں سے اب صرف بارہ موجود ہیں۔ تیسری جلد غالباً ان سب کا مرکز تھی جس کے اردگرد باقی تحریریں جمع ہوتی گئیں اور یہ جلد دوسری صدی قبل از مسیح کے وسط کے قریب تحریر ہوئی ہوگی۔ اس میں بابل کے برج کی تعمیر سے کر انتی آوخس اپی فینیس کے زمانہ تک کی اسرائیل کی تاریخ دی گئی ہے۔ اور آخر میں مسیح کی سلطنت کی آیندہ شان وشوکت اور جلال کی پیشین گوئی ہے۔ دوسری کتابوں کا رنگ ڈھنگ بھی یہی ہے۔ ان میں مسیحی خیالات کی آمیزش اور رومی طاقت کی طرف اشارے اکثر پائے جاتے ہیں۔ یہ مختلف اوقات پر تصنیف ہوئیں۔ بعضوں کی نسبت تو یہ گمان ہے کہ وہ دوسری یا تیسری صدی مسیحی میں تحریر ہوئیں ✦

مذکورہ بالا تحریروں کے علاوہ چند دیگر مکاشفات کی طرز کی تحریریں ہیں اُن میں سے بعض آدم وابرہام سے اور بعض موسیٰ۔ ایلیاہ۔ صفنیاہ وغیرہ سے منسوب وموسوم ہیں لیکن چونکہ یہ بہت اہم کتابیں نہیں اس لئے ان کے الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ✦

سوم سنروں کا ترجمہ

عہد عتیق کے قدیم یونانی ترجمہ کا کئی بار ذکر ہو چکا ہے جو اسکندریہ کے یہودیوں نے کیا تھا۔ اس کے نام (سنروں) کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مصر میں ایک روایت بہت مشہور ہو گئی تھی۔ یہ روایت بطلمئی زمانہ کی ایک جعلی یہودی چٹھی میں مندرج ہے جس کی نسبت یہ ظاہر کیا گیا کہ بطلمئی خلاڈلفس کے ایک درباری ارستیاس نامی نے (۲۸۵ سے ۲۴۷ ق م) یہ لکھی تھی۔ اس میں ذکر ہے کہ اُس مصری بادشاہ نے یروشلم سے بہتر یہودی عالم منگوائے۔ ان میں سے چھ چھ ہر فرقہ میں سے تھے۔ بادشاہ نے انہیں حکم دیا کہ اسکندریہ کے کتب خانہ کے لئے عبرانی کتب مقدسہ کا ترجمہ کریں۔ اگرچہ ان لوگوں نے الگ الگ ترجمہ کیا تھا۔ لیکن جب ان کا مقابلہ کیا تو ان کا ترجمہ یکساں نکلا۔ بہتر دنوں میں انہوں نے یہ ترجمہ ختم کیا۔ اور یہی ترجمہ سارے یونانی بولنے والے یہودیوں کی کتاب مقدس ہو گیا۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اس خط کا کچھ حصہ تو اپوکرفل ہے اور مابعد سالوں میں اس پر اور بھی حاشئے چڑھائے گئے۔ لیکن اس کی بڑی بڑی باتیں شاید بالکل سچ ہوں۔ یہ ظن غالب ہے کہ کم از کم توریت کا ترجمہ فلاڈلفس کی تحریک سے ہوا۔ یہ بادشاہ علوم وفنون کا بڑا حامی تھا۔ اس نے ساری قوموں کے قوانین اور شرائع کو اپنے کتب خانہ کے لئے جمع کیا تھا۔ اس صورت میں اس کی یہودی رعیت نے اس نئے ترجمہ کو خوشی سے قبول کر لیا ہوگا۔ کیونکہ یونانی زبان اختیار کرنے کی وجہ سے جو ضرورت ان کو پیدا ہوئی تھی وہ اس سے رفع ہو جاتی تھی۔ باقی کتابیں جن میں اپوکرفا شامل تھا مختلف اوقات میں مختلف اشخاص نے ترجمہ کیں۔ فلاڈلفس کے عہد سلطنت سے لے کر مسیحی سال کے شروع تک کے عرصہ میں یشوع بن سیرخ

کی حکمت کی کتاب کے مترجم نے (۱۳۲ ق م) "شریعت اور انبیا اور باقی کتابوں"
کے یونانی ترجمہ کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ان میں سے کسی خاص کتاب کا نام
اُس نے نہیں دیا۔ فائلو اسکندریہ کا یہودی فیلسوف جو مسیح کے زمانہ کے قریب گزرا
عہد عتیق کی سابق کتابوں سے واقفیت ظاہر کرتا ہے سوائے تین یا چار کتابوں
کے تیسری صدی مسیحی کے آخر کے قریب اس سترون کے ترجمہ کی تین ترمیمیں ظاہر
ہوئیں جن کو ہیسی خیوس۔ لوشیان اور یوسیبیس نے تیار کیا تھا۔ یہ ان نسخوں کی
بنیاد ہے جن سے کہ ہمارا نسخہ تیار ہوا ۔

سترون کے ترجمہ کے مضامین ہی سے پتہ لگ جاتا ہے کہ مختلف شخصوں نے
اسے تیار کیا۔ کیونکہ طرز عبارت میں اختلاف ہے بحیثیت مجموعی توریت کا ترجمہ
سب سے اعلےٰ اور بہت احتیاط کے ساتھ ہوا ہے۔ دوسری کتابوں کے درمیان
تاریخی کتابیں نظمی کتابوں سے عموماً زیادہ اعلےٰ ہیں بعض مقامات کے ترجمے تو عمدہ یونانی میں
ہوئے ہیں بعض مقامات کا ترجمہ ناقص ہے اور بہت سے عبرانی محاورات اُن میں
پائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات کا ترجمہ تو اچھا ہے لیکن ان میں کہیں کچھ چھوڑ دیا گیا
ہے۔ کہیں کچھ بدل دیا گیا ہے اور یہ بھی محض اپنی خوشی سے "تاکہ کسی قسم کی بے ادبی
ہو یا یہودی یا مصری دیوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ بعض مقامات کا ترجمہ بہت دیانتداری
سے کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر الفاظ کے پڑھنے میں غلطی کی یا ترجمہ ٹھیک نہیں ہوا یا صرف اصلی
لفظ کو یونانی میں لکھ دیا۔ بعض مقامات میں عبرانی اصل کا ٹھیک ترجمہ ہوا ہے بعض
مقامات کا ترجمہ بالتفصیل بالتشریح دیا گیا اور کتابوں کی ترتیب بلکہ بابوں کی ترتیب بھی
عبرانی اصل سے متفرق ہے۔ اور جو اپوکرفل زیادتیاں جابجا پائی جاتی ہیں اُن سے
یہ فرق اور بھی بڑھ جاتا ہے ۔

باوجود ان اختلافوں اور ان سوالات کے جو ان سے پیدا ہوتے ہیں عہد عتیق

کا یہ قدیم ترجمہ نہایت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ جو ترجمے کسی عبری کتاب کے کسی
دوسری زبان میں ہوئے ہیں اُن میں سے یہ سب سے پرانا سمجھا گیا ہے۔ اس امر
کے علاوہ وہ عہد عتیق اور عہد جدید کے متن سمجھنے میں اگر اس کو لازمی نہ ٹھہرائیں تو نہایت
ہی مفید کہے بغیر تو رہ نہیں سکتے۔ عہد عتیق کے قدیم نسخہ کا (جو کب معدوم ہے) ترجمہ
ہونے کی حیثیت سے یہ مسلمہ متن کی تصحیح میں بہت عمدہ مددگار ہے۔ علاوہ اس کے
جو بائیبل ہمارے خداوند اور نئے عہد نامہ کے مصنفوں کے دنوں میں فلسطین میں
مروج تھی اس کی زبان ٹھہرانے میں اس نے مدد دی اور اس کی تشریح کی کلید ثابت
ہوا۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ عبرانی نوشتوں کے غیر قوموں پر ظاہر کرنے کے ذریعہ اس نے
انجیل کے لئے راہ تیار کرنے میں مدد دی ۔

چہارم۔ دیگر کتابیں

مکابیوں کی تیسری کتاب۔
مکابیوں کی چوتھی کتاب
یوسیفس
لوگیا
ٹیڈاخی

(۱) مکابیوں کی تیسری کتاب

اگرچہ یہ کتاب اس نام کی مستحق ہے تو محض اس لئے ہے کہ اس میں بھی مکابی

کتابوں کی طرح غیر ملکی ایذا رسانی کے وقت یہودیوں کی تکلیفات کا ذکر آتا ہے۔ اس
قصہ میں جو نظارہ پیش کیا گیا وہ مکابیوں کے زمانہ کا بھی نہیں بلکہ بطلیموس چہارم
فلوپیٹر (۲۲۲ سے ۲۰۴ ق م) کے زمانہ کا ہے۔ یہ مصری بادشاہ اعجازی طور پر
یروشلم کی ہیکل میں داخل ہونے سے روکا گیا۔ بعد ازاں اس کی چند پے درپے
کوششوں کو خدا نے اپنی مداخلت کے ذریعہ رائیگاں کر دیا تاکہ وہ اپنی یہودی رعایا
سے انتقام نہ لے سکے۔ اسی قسم کا ایک قصہ یوسیفس نے بطلیموس ہفتم فیسکون
(Physcon) کے بارہ میں بیان کیا ہے۔ اور شاید یہ قصہ کسی واقعی امر
پر مبنی ہو۔ اس کتاب کی سن تصنیف کے بارہ میں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ۱۰۰ ق م
اور ۷۰ء کے مابین لکھی گئی ہوگی۔

(۴) مکابیوں کی چوتھی کتاب

اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کتاب کے بڑے حصہ میں ان شہیدوں کا
تذکرہ آتا ہے۔ جن کا بیان ۲ مکابی ۶: ۱۸ سے ۷: ۴۱ میں ہے۔ ۱: ۱ میں مصنف نے
اس تصنیف کی غرض کا یہ بیان کیا ہے کہ "دیندار شخص اپنے جذبات کو اپنے قابو میں
رکھتا ہے"۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں (ا) عام فلاسفرانہ مسئلہ پر تقریر (ب) اور
مکابی شہیدوں کا دوبارہ بیان معہ ان اسباق کے جو اس بیان سے نکل سکتے ہیں۔
مصنف ایک دیندار یہودی معلوم ہوتا ہے جو اپنے یہودی بھائیوں کا ایمان
بت پرست فلسفہ کی گمراہی کے خلاف مضبوط کیا چاہتا تھا۔ اتفاقی طور پر اس نے
یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ روح کی بقا کا قائل تھا اور آئندہ جزا و سزا کو مانتا تھا یہ بھی قیاس
کیا گیا ہے کہ مصنف اسکندریہ یا کسی ہیلی نسٹک (Hellenistic) شہر کا
باشندہ تھا اور مسیحی سن کے آغاز میں اس نے یہ کتاب لکھی۔

(۳) یوسیفس کی تصنیفات

فلے ویئی اس یوسیفس بمقام یروشلم ۳۷ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اعلےٰ درجہ
کی تعلیم حاصل کی اور فریسی جماعت وطن میں اس نے ایسی عزت حاصل کی کہ روم کے
ساتھ لڑائی شروع ہونے پر وہ گلیل کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ مابعد لڑائیوں میں اسکی
دانائی اور شجاعت کی بہت شہرت ہوئی لیکن آخرکار ویسپے شین نے اسے
گرفتار کر لیا اور روم کو بھیج دیا۔ وہاں اس نے تحریر و تصنیف کا کام کیا۔ اس کی
تصنیفات یہ ہیں:۔ (۱) یہودی جنگوں کی تاریخ۔ اس کتاب میں وہ واقعات
سلسلہ وار بیان کئے گئے جو انتی آوخس اپی فینس کے وقت سے لیکر وقوع میں آئے
تھے اور جس لڑائی میں وہ خود شریک تھا اس کا مفصل بیان کیا ہے۔ (۲) یہودی قدامتیں
اس کتاب میں اس نے اپنے وطن کا قصہ لکھا ہے۔ قدیم زمانوں سے لیکر نیرو کے
عہد سلطنت کے خاتمہ تک۔ (۳) اپیون (Apion) کے خلاف رسالہ۔ یہ
رسالہ اس لئے قابل قدر ہے کہ اس میں بہت بت پرست مورخوں کی تصنیفات سے
اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ (۴) اس کی اپنی سوانح عمری۔ اس کتاب میں اس نے
ظاہر کیا کہ لڑائی کے وقت گلیل کی حفاظت کے لئے تیار اٹھانا جائز تھا۔

صدیوں تک یہودی تاریخ کے بارہ میں مسیحیوں کو صرف یوسیفس کی تصنیفات ہی
سے حالات معلوم ہوتے رہے اور اس امر کے لحاظ سے یہ تصنیفات اب بھی بہت
قابل قدر ہیں۔ یہ عمدہ یونانی میں قلمبند ہوئی ہیں۔ اور تعصب سے خالی ہیں اور شاید
اس لحاظ سے کہ یہ تصنیفات بہت رومیوں کی نظروں سے گذریں گی بعض بیانات اور
واقعات کو معتدل بنا دیا ہے۔

(۴) پے پی رس لوگیا

حال ہی میں کئی پے پی رس تابہرج پتر پر لکھے ہوئے چند قطعے ملے ہیں جن میں یسوع کے اقوال (لوگیا) کے چند مختصر مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ ۱۸۸۵ء میں بِکل (BicKell) صاحب نے شائع کیا۔ جو آرچ ڈیوک رینے ر (Rainer) کے مجموعہ میں سے تھا۔ اور یہ محض مرقس ۱۴: ۲۶ سے ۳۰ کے مطابق ہے۔ دوسرا مجموعہ ۱۸۹۷ء میں گرین فیل (Grenfell) اور ہنٹ (Hunt) نے شائع کیا جسے انہوں نے بمقام (oxyrhynchus) آکسرہنکس پایا تھا۔ اس میں چھ اقوال اور ساتویں قول کا پہلا لفظ آیا ہے۔ ان میں سے تین قول تو وہی ہیں جو لوقا ۶: ۴۲ اور ۴: ۲۴۔ اور متی ۵: ۱۴ میں آتے ہیں۔ اور تین بالکل نئے ہیں جو اناجیل میں نہیں ملتے۔ ہارنک (Harnack) صاحب کا خیال ہے کہ دوسرا مجموعہ اقوال مصریوں کی انجیل (۱) سے لیا گیا۔ لیکن ان دونوں مجموعوں کے بارہ میں علما کا اتفاق نہیں۔ اور یہی حال اُن مجموعوں کا ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔

(۵) ڈِڈاخی۔ بارہ رسولوں کی تعلیم

بارہ رسولوں کی تعلیم پہلے پہل ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۱۰۵۶ء کے یونانی نسخے کے مطابق تھی جو قسطنطنیہ میں ملا تھا۔ اس کے دو الگ الگ حصے ہیں۔

(۱) پہلے حصہ میں چند اخلاقی احکام ہیں جس کا نام دو راستوں کی تعلیم آتا ہے۔ اس حصہ میں اناجیل کی طرف کوئی اشارہ نہیں اور شاید کسی یہودی چشمہ سے ہو۔

(ب) دوسرے حصے میں کلیسیائی قوانین جماعت اور عبادت آئے ہیں۔ اور

اس حصہ میں مقدس متی کی انجیل کا بہت استعمال ہوا ہے۔ اس کا سن تصنیف ۸۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان ہوگا۔ لیکن موجودہ صورت میں یہ کتاب دوسری صدی کے وسط کی ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ بعض اپوکرفل کتابوں کے نام اور اجزا بھی مسیحی کلیسیا کی ابتدا سے ملتے ہیں۔ مثلاً اپوکرفل اناجیل۔ اعمال اور خطوط۔ ان کی طرف صرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے۔ مثلاً پطرس کی انجیل۔ عبرانیوں کی انجیل اور مصریوں کی انجیل۔ یعقوب کی کتاب جو عموماً پہلی بشارت کہلاتی ہے۔ پلاطوس کے اعمال۔ اور پولس اور تھکلا کے اعمال۔ اب گرس (abgarus) خطوط۔ پولس کا خط لاودکیا کے نام۔ اسکندریوں کے نام اور کرنتھیوں کے نام وغیرہ خطوط

۳۔ پرانے اور نئے عہدناموں کے درمیانی عرصہ میں یہودی دین کی ترقی

گو یہودی دین کی بنیاد الٰہی مکاشفہ پر تھی تو بھی جن انسانی تاثیرات سے اُس کو واسطہ پڑا اُس سے وہ بچ نہ سکا اور اس کے ذریعہ اس کی حالت میں کچھ تغیر و تبدل عمل میں آگیا۔ نئے عہدنامہ میں جس یہودی دین کا ذکر آتا ہے وہ عہدعتیق کے زمانہ کے مذہب سے بہت متفرق تھا۔ ان دونو عہدناموں کے درمیانی عرصوں میں نہ صرف ملکی اور تمدنی انقلابات ہوئے۔ بلکہ علمی و عقلی انقلابات بھی ہوئے جن کا اثر قومی مذہب پر ہوا۔ عقاید اور رسوم پر یہ اثر ہوا کہ ان میں سے بعض پر زیادہ زور دیا گیا گو اُن میں پوری تبدیلی عمل میں نہ آئی

کئی نئے خیالات داخل ہو گئے اور اُنہوں نے عجیب نشو و نما پایا۔ اُس زمانہ کی تصنیفات میں اس عمل کا سراغ ملتا ہے (جس کا کچھ احوال بیان ہو چکا ہے) اور اس امر کے سمجھنے کے لئے کہ یسوع اور رسولوں نے اپنے زمانہ کے یہودی دین سے کیوں ایسا سلوک کیا اس کا کچھ علم ہونا ضروری ہے +

۱۔ خدا کی تعلیم۔ یا خدا کا تصور۔ بابل کی اسیری کے وقت یہ خاص مرکزی عقیدہ بت پرستوں کی آلودگیوں اور بیہودگیوں سے (قدیم ایام میں جن کی آمیزش ہو گئی تھی) بالکل پاک اور صاف ہو گیا۔ بہت تنبیہوں اور سزاؤں کے بعد قومی یعنی اور شخصی مصیبت کے درمیان یہودیوں نے یہ سیکھ لیا کہ اپنے آبا و اجداد کے خدا کو دنیا کا اعلےٰ خدا تسلیم کریں اور بت پرستی کی ناپاک رسوم سے علیحدہ کر کے اس کی پرستش کریں۔ بت پرستی کا بھوت اُتر گیا اور اُس نے پھر کبھی اُن کے عقیدہ کو گندہ نہیں کیا۔ اور نہ اُن کی عبادت کی ندی کو ناپاک کیا۔ ایذا رسانیوں کی سختیوں نے بھی (جیسا کہ انتی اوخس ایپی فینیس کے زمانہ میں ہوا) خدا کی روحانیت اور وحدانیت کا تصور زیادہ گرویدہ اور زیادہ پختہ بنا دیا +

جوں جوں یہ خیال بڑھتا گیا کہ خدا نے ہماری قوم کو چھوڑ دیا اور ہم برباد ہو رہے ہیں اور یہودی دینی علما میں یونانی طریقوں اور خیالوں نے زیادہ گھر کر لیا تو اس خیال کو اور بھی مانجھنے لگے اور خدا کو مادی مخلوقات سے علیحدہ کر کے عرش معلّی پر بٹھا دیا۔ اِسے خدا کا روحانی تصوّر کہتے ہیں۔ اس میں یہاں تک مبالغہ کیا گیا کہ خدا کو دنیا سے ایسا اعلےٰ اور افضل مان لیا کہ انسانوں کی اُس تک رسائی ناممکن ٹھہری۔ حالانکہ یہ وہی خدا تھا جو پہلے اپنی امت کے ساتھ مقدس خیمہ میں سکونت کیا کرتا تھا اور اُن کی اپنی بولی میں اُن سے متکلم ہوتا تھا۔ اس تصور نے اُس زمانہ کی تصنیفات میں اپنا رنگ ڈھنگ دکھایا۔ اس تصوّر میں اس امر سے

اجتناب کیا گیا کہ خدا میں انسانی جذبات یا اجزا قرار دیئے جائیں بلکہ اس کے نام کے ذکر سے بھی پرہیز کیا۔ اسی وجہ سے یسوع کے ہمعصر یہودی بہت ناراض تھے کہ اس نے خدا کو اپنا باپ کہا۔ اور اُس کو ایسا خدا ٹھہرایا جو انسانی چھوٹے امور میں دلچسپی رکھتا ہو +

۲۔ شریعت۔ خدا کا تصور جس قدر اعلےٰ ہو گیا۔ اسی قدر زیادہ الٰہی شریعت کی تعظیم بڑھ گئی۔ جب خدا بادلوں کے پرے جا چھپا اور اپنی امت کے ساتھ راہ و ربط منقطع کر لیا تو اُس کے ارادہ کا علم صرف بوساطت اُس کے افعال اور اقوال کے مل سکتا تھا۔ جب کوئی زندہ آواز اُن کی رہنمائی کے لئے باقی نہ رہی تو ان کا تکیہ اور آسرا و بھروسہ صرف تحریری کلام ہی پر رہ گیا۔ اور ان کے معاملات میں جس قدر پیچیدگیاں بڑھتی گئیں اتنی ہی زیادہ ان کو ضرورت پڑی کہ اس شریعت کی تلاش کریں اور اس کا مطالعہ کریں۔ جلاوطنی کے ذریعہ شریعت کی قدر زیادہ بڑھ گئی اور مابعد مصیبتوں نے ان کی اس قدر کو اور بھی تقویت دے دی اور اس کے لئے اُن کا جوش ایسا بڑھا کہ فریسی فرقہ پیدا ہو گیا۔ اور غیر ملکی ظلم کا شکار ہی بنے اور آیندہ بربادی کا عکس قومی زندگی پر پڑا۔ یہ شریعت نہ صرف ملکی سیاست کی بنیاد ٹھہری بلکہ ان کی روزمرہ زندگی اور رفتار کا دستور العمل ہو گئی۔ اور فقیہی فرقہ جن کا خاص کام یہ تھا کہ شریعت کی تفسیر کریں اور اس کے اجرا پر زور دیں بہت مشہور اور باقدرت ہو گئے +

پہلی ایک فصل میں یہ ظاہر کر دیا گیا تھا کہ کس طرح توریت کے مختلف حصے جمع کئے گئے تاکہ عمل اور عقیدہ کے لئے دستور العمل کا کام دیں۔ تیسری صدی قبل از مسیح کے قریب نبیانہ کتابیں جمع کی گئیں اور تقریباً مساوی مستند ٹھہریں۔ بعد ازاں دیگر کتابیں ایزاد کی گئیں جن کی نسبت یہ یقین تھا کہ وہ نبیانہ

زمانہ سے لیکر تحریر ہوئیں اور یوں پہلی صدی مسیحی کے آخر کے قریب عہد عتیق کا قانون آخر کار مکمل ہو گیا۔ اس تحریری معیار ایمان وعمل کے ساتھ ساتھ زبانی روایات کا طومار بھی بڑھتا چلا گیا جس کی نسبت یہودیوں کا یہ گمان تھا کہ وہ موسیٰ کو کوہ سینا پر ملا تھا اور یشوع اور بزرگوں اور نبیوں کے وسیلے صدر عبادت خانہ کے لوگوں تک اور فقیہوں تک سینہ بہ سینہ چلا آیا (عزراہ ۲۹ [illegible]) اس کے دو حصے تھے۔ ایک کا نام حلاقہ (چلنا) اور دوسرے کا نام اگادہ (تعلیم)۔ اول الذکر تحریری شریعت کا گویا تتمہ تھا۔ اور موخر الذکر اس کی تشریح تھی معہ مثالوں کے۔ یہ سب کام فقیہوں کے ذمہ تھا۔ یہ لوگ معہ فریسیوں کے ان فروعات پر بڑا زور دیا کرتے تھے۔ اناجیل میں جن بزرگوں کی روایتوں کا ذکر ہے وہ یہی ہیں (متی ۱۵: ۲ + مرقس ۷: ۳ وغیرہ)۔ اور جب ہمارے خداوند نے یہ کہا کہ "اگلوں سے کہا گیا تھا" تو اس نے غالباً انہیں کی طرف اشارہ کیا (متی ۵: ۲۱) اور فریسیوں کا وہ بوجھ جس کا اٹھانا مشکل تھا انہیں کی طرف اشارہ ہوگا (متی ۲۳: ۴ + لوقا ۱۱: ۴۶)۔ پہلی مسیحی صدیوں میں یہ زبانی شریعت معہ تشریحات اور مناظرات کے بتدریج دو مختلف جلدوں میں قلمبند ہو گئی۔ ایک کو تو بابلی طالمود کہتے ہیں اور دوسری کو فلسطینی طالمود۔

۳۔ فردیت۔ شریعت کے اس نئے نشوونما اور اثر کے ساتھ قومیت پر زور دینے کی بجائے فردیت پر زور دیا جانے لگا۔ اب تک یہ امت بحیثیت مجموعی دینی طور پر مدنظر رہی تھی۔ قوم کے فرائض اور حقوق۔ اس کی غلطیاں اور برگشتگیاں ظاہر کرنا ہی دین کا کام تھا۔ لیکن اب خیالات نے بالکل پلٹا کھا لیا۔ اور افراد کی ذمہ داریوں اور دعاوی پر زور دیا جانے لگا۔ جلاوطنی کے وقت قومیت تو ایک طرح سے ٹوٹ گئی لیکن گناہ کا شخصی اور فردی احساس بڑھ گیا اور خدا کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے شخصی کوشش کو زیادہ تحریک ہوئی۔ امید تو اس وقت بھی تھی کہ یہ قوم بحال ہوگی۔ چونکہ

بابلی تجربہ کے ذریعہ نوع انسان اور دنیا کی نسبت ان کے خیالات کو توسیع ہو گئی اور دینداروں کی آنکھوں کے سامنے یہ سماں گزرنے لگا کہ غیر قوم سلطنتیں برباد ہوں گی اور دنیا کے سارے باشندے اسرائیل کے خدا کو تسلیم کریں گے۔ لیکن اس کی تکمیل افراد کی راستبازی کے ذریعہ عمل میں آئے گی اور جو لوگ خدا کی شریعت پر ایمانداری سے عمل کریں گے ان کا یہ اجر ہوگا۔ یروشلیم میں واپس آنے کے وقت یہ پولیٹیکل دعاوی انہوں نے تقریباً بالکل چھوڑ دیئے۔ اور اس جماعت کا انتظام قومی اصول پر نہیں بلکہ دینی اصول پر کیا گیا۔ اس کا سر سردار کاہن تھا۔ اس کا مرکز ہیکل کی عبادت تھا۔ اس کے ممبر فرداً فرداً ہیکل کا ٹیکس ادا کیا کرتے تھے اپنے اپنے گناہ کا اقرار کرتے اور الٰہی شریعت کی اطاعت کا وعدہ کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فردی کانشنس کو ترقی اور پختگی حاصل ہوئی اور دینداری ایک شخصی بات ہو گئی (دانی ایل اور سوسنہ کے احوال پر غور کرو)۔ اسی طرح جوں جوں وقت گزرتا گیا مرید بنانے کی خواہش بھی بڑھتی گئی۔ اور دوسری قوموں کو ترغیب دی اور کبھی کبھی مجبور بھی کیا تاکہ وہ یہودی مذہب کو قبول کریں۔ اس امر کے سمجھنے کے لئے کہ منتشر یہودی فرقوں میں یہودی مذہب کیسے قائم رہا یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جلاوطنی سے لے کر مکابی عہد حکومت کے سوا یہودی امت ایک دینی جماعت تھی اور پولیٹیکل گروہ چنداں نہ رہی۔ افراد کی ایک ایسی جماعت جن کا باہمی رشتہ صرف ایک رسم (یعنی ختنہ) ایک مشترک ایمان۔ تعلیم اور عبادت پر مبنی تھا۔

۴۔ فرشتے اور جن۔ اس تعلیم کے ذریعہ کہ خدا جہان سے ایسا اعلیٰ اور پرے اور حاکم مطلق ہے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا اور انسان کے درمیان دیگر مخلوقات ہوں گی۔ چنانچہ مابعد یہودی تصنیفات میں فرشتوں اور جنوں کا بہت ذکر آتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلی کتابوں میں ان کا بہت کم ذکر ہے۔ عہد عتیق کی ابتدائی کتابوں میں عزرا کے سوا چند فوق الخلقت وجودوں کا ذکر کئی بار آیا ہے اور ان کو فرشتہ کہا گیا۔ لیکن مابعد زمانوں میں

لفظ فرشتے سے جو مراد لی گئی وہ اُس وقت تک مفہوم نہ تھی۔ کیونکہ مابعد زمانوں میں فرشتوں کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ مددگار اور موذی روحیں ہیں جو انسان سے گہرا تعلق پیدا کر لیتی ہیں اور اُن کی زندگی پر اثر کرتی ہیں۔ یسوع مسیح کے ہمعصروں کے نزدیک یہ حقیقی آسمانی ایلچی تھے یا شیطان کے ایلچی تھے۔ جو تعداد میں بے شمار تھے لیکن انکے درجے مختلف تھے اور ان کے نام بھی مختلف تھے۔ جب یہودیوں کو دیگر قوموں سے واسطہ پڑا خاصکر اہل فارس سے جن کے دین میں نیک و بد روحوں کا بہت ذکر آتا ہے۔ تو اس تعلیم میں بہت ترقی ہوئی۔ لیکن اس تعلیم میں یہ خصوصیت قایم رہی کہ شیطان اور اُس کے لشکر کو فارسیوں کی طرح خدا اور فرشتوں کے برابر درجہ نہیں دیا گیا بلکہ وہ ہمیشہ ادنےٰ درجہ ہی میں رہے۔ صدوقیوں نے اس تعلیم کو بالکل رد کر دیا (اعمال ۲۳: ۸) لیکن فریسی گروہ ایسی تعلیم کو مانتے تھے اور اسینی گروہ کے لوگوں نے اس تعلیم میں اور بھی مبالغہ کیا۔ کسی قدر مسیح نے بھی اس کی تائید کی۔ ارواح کی موجودگی کا عقیدہ اُس نے مان لیا لیکن اس کے ساتھ جو بعض خیالات ملحق ہو گئے تھے ان کو رد کیا اور اُس نے خاصکر یہ دعوےٰ کیا کہ الٰہی مکاشفہ اور برکت دینے کا سارا اختیار اُسے اور روح القدس کو حاصل تھا۔

۵۔ حکمت۔ فرشتوں اور جنوں پر اعتقاد کے ساتھ ساتھ ہی الٰہی "حکمت" کا تصور بڑھتا گیا کیونکہ اسی تعلیم کے ساتھ اس کا خاص علاقہ تھا۔ ہم عصر تصنیفات کے ایک حصہ کی کیفیت و خاصہ اسی پر منحصر ہے۔ مثلاً ایوب کی کتاب۔ بعض زبوریں امثال کی کتاب۔ یسوع بن سیراخ کی حکمت۔ واعظ کی کتاب اور سلیمان کی حکمت اور اسی لئے یہ حکمت کی کتابیں کہلاتی ہیں۔ جلاوطنی سے پیشتر کے ایام میں یہ بیج بوئے گئے تھے۔ لیکن مابعد زمانوں میں غیر قوموں کی تاثیر سے اس میں زیادہ ترقی ہوئی۔ اس تصور کی بنیاد غالباً انسانی فراست کا عام خیال تھا اور خدا کے خیال اور مرضی کے اعلےٰ ظہور کے ساتھ ہمدردی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے حکمت کا تعلق کلمہ خدا کے ساتھ ہوا۔ کلمہ خدا سے خدا کا کل پیغام

اور مکاشفہ مراد تھا جو انسان کی طرف بھیجا گیا۔ شاعرانہ طور پر اس کو شخصیت کا جامہ پہنایا گیا۔ اور نہ صرف الٰہی صفات اُس سے منسوب ہوئیں بلکہ اُس کی نسبت یہ خیال بھی کیا گیا کہ نبیوں نے اُسے دیکھا تھا (یسعیاہ ۶: ۱)۔ حکمت کی کتابیں اس مقام سے گویا شروع ہوتی ہیں اور اُس حکمت کے تشخص کو زیادہ مفصل طور سے بیان کرتی جاتی ہیں۔ حکمت خدا کا کمانشتہ یا ایلچی ہے جس کے وسیلے سے وہ اپنی مرضی انسانوں پر ظاہر کرتا ہے اور اپنی مہربانی اور قدرت کو جو دنیا میں پائی جاتی ہے منکشف کرتی ہے (امثال ۸ باب)۔ وہ خدا کی پہلی مخلوق ہے اور جو اُسے پیار کرتے ہیں ان کی دوست ہے (یسوع بن سیراخ کی حکمت ۱: ۱۴)۔ اس کے خیالات سمندر سے بڑھکر ہیں۔ اور اس کی مصلحتیں بڑے گہراؤ سے زیادہ عمیق (یسوع بن سیراخ کی حکمت ۲۴: ۲۹)۔ اعلےٰ عبارت میں سلیمان کی حکمت نے حکمت کا آغاز اور اس کی سیرت بیان کی۔ اُس کی صفات کا ذکر اور اس کے فواید کی تعریف بیان کی ہے (۶ تا ۹ باب)۔

تارگم یا عہد عتیق کی آرامی تفسیروں سے ظاہر ہے (یہ کتابیں ابتدائی مسیحی زمانہ میں مروج تھیں) کہ اس قسم کے خیالات نے یہودی دماغوں پر بڑا اثر کیا تھا۔ اُن میں خدا کا کلام (میمرہ) تقریباً ایک حقیقی شخص معلوم ہوتا ہے جو خود خدا کا قایمقام ہے۔ اس کی ذات کا اظہار اور اس کے مقاصد بجا لانے کا اوزار گو خدا دنیا سے سرفراز ہے تو بھی وہ اپنے کلام کے وسیلے اس پر اپنے تئیں ظاہر کرتا اور اس پر اثر کرتا ہے۔ تقریباً اسی قسم کی تعلیم جس میں یونانی خیالات کی تاثیر پائی جاتی ہے اسکندریہ میں یہودی فلاسفر فائلو نے مفصل طور پر بیان کی۔ خدا کے اعلےٰ ہونے کے یہودی تصور کو قبول کر کے اس نے عہد عتیق کے نوشتوں میں کلام (لوگاس) میں وہ قدرت اور وسیلہ دریافت کیا جس کے ذریعہ خدا کی عقل اور قوت اب تک دنیا پر اثر کرتی ہے۔ لوگاس اس کا پہلوٹھا بیٹا۔ اُس کا اعلےٰ فرشتہ بلکہ خدائے ثانی ہے۔ اُسی کے وسیلے انسان اور باقی مخلوقات پیدا ہوئے اور قایم

رہتے ہیں۔ ان خیالات کا رواج پانے اور کتاب مقدس کی تمثیلی تفسیر کا پتہ نئے عہدنامہ میں پایا جاتا ہے۔ خاصکر عبرانیوں کے خط اور چوتھی انجیل میں۔ چوتھی انجیل کے دیباچہ میں مصنف نے اس خیال کو لیا جو اس کے ہمعصروں میں مشہور تھا اور جس میں اس حقیقت کی گویا پیشین گوئی تھی اور اپنے طریقے سے اُس پر عاید کیا جو آدمیوں کا نُور اور زندگی تھا +

(۶) **Hellinism یونانی یہودیت** یہودیوں کے مابعد عقیدہ میں یونانی خیال کے تاثیر کے کئی پتے کئی دیگر باتوں میں بھی ملتے ہیں۔ باوجود ان کے علیحدہ رہنے کے بھی یونانی تاثیر سے بچ نہ سکے۔ جہاں جہاں اسکندر اعظم کی فتوحات پہنچیں یہ تاثیر بھی شائستہ دنیا میں پھیل گئی۔ اور اس کے بعد صدیوں تک۔ خاصکر منتشر یہودیوں میں مغرب کی اس فلاسفر قوم کے ساتھ راہ و ربط رکھنے سے یہ تاثیر رہی۔ چونکہ ان منتشر یہودیوں کو یونانی زبان کا علم حاصل تھا اور اُن کے دستورات و خیالات کے ساتھ اُن کو گہری واقفیت تھی اس لئے ان کے خیالات میں بھی بہت توسیع آگئی۔ نہ صرف مابعد یہودی تصنیفات میں بلکہ نئے عہدنامہ میں بھی۔ مثلاً سلیمان کی حکمت کی کتاب میں یونانی طرز خیال بھی پایا جاتا ہے اور جو محاورات اس میں استعمال ہوتے وہ یونانی فلاسفروں کی کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ اس میں چار یونانی اخلاقی صفات کو پسندیدگی کے ساتھ بیان کیا (۸: ۷)۔ اس نے دنیا کی خلقت کا ذکر افلاطونی الفاظ میں کیا ہے کہ وہ بے شکل مادہ سے بن گئی نہ کہ نیستی سے ہست ہوئی (۱۱: ۱۷)۔ اس نے من کو امرت خوراک یا آبحیات سے نامزد کیا (۱۹: ۲۱) اور نیکی کا حلیہ ایسا کھینچا ہے کہ وہ تاج پہنے ہوئے ہے جیسے کہ کشتیوں میں کامیاب پہلوان پہنا کرتا تھا (۴: ۲)۔ اسی طرح مکاشفہ کی کتاب میں مقدسوں کا بیان کیا ہے (۷: ۹)۔ اور وہ تصویر بھی یونانی کشتیوں سے لی گئی ہے۔ مقدس پولس نے مسیحی نیکیوں اور خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے

تماشا گاہوں اور دوڑوں سے استعارے اور تشبیہیں لیں۔ حالانکہ پہلے ایام میں یہودی ان کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ یہ سب اس امر کے آثار ہیں کہ خیالات میں کیسا تبادلہ ہوا تھا۔ نہ صرف اخلاقی اور ملکی خیالات میں بلکہ فلسفانہ اور دینی تصورات میں بھی یہ تبادلہ ہوا۔ یہودیوں میں جو امتیاز آسمانی بادشاہت اور دنیا کی بادشاہت میں پیدا ہوا وہ یونانی تاثیر ہی کا نتیجہ تھا۔ اُنہوں نے یونانی فلاسفروں کی کتابوں میں ایسے اعلےٰ حقایق کو بڑی صفائی سے قلمبند دیکھا۔ مثلاً روح کی بقا۔ اور آیندہ زندگی کی جزا و سزا جن کا ذکر ان کی اپنی کتابوں میں بہت دھندلا سا ہوا تھا۔ مغربی زبان اور خیال کے ساتھ رابطہ ہونے سے سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی اور غیر قوم کے درمیان جو جدائی کی دیوار تھی وہ گر گئی اور عالمگیر انجیل کی منادی کے لئے دنیا میں تیاری ہوئی۔ اسی وجہ سے اس بات کی سمجھ آسکتی ہے کہ پولس اور صلیب کے دیگر مبشروں کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی +

۷۔ **مسیحی امید۔** یہودیوں کے حالات اور خدا اور انسان کے بارہ میں نئے تصورات کے دیکھنے سے مسیح کی آمد کے خیالات میں ترقی ہوئی خاصکر آخری زمانہ کے بارہ میں۔ جہاں تک جہان کے ساتھ تعلق تھا یہ تصورات مسیحی امید کے گرد جمع ہوتے گئے یعنی خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نجات دہندہ جو اسرائیل کی گم شدہ عظمت کو بحال کرے گا اور خدا کی امت کی حکومت راستبازی اور قدرت کے ساتھ قایم کرے گا۔ اس امید کی بنیاد عہدعتیق کی نبوت میں تھی۔ ماقبل اور مابعد نبیوں نے بھی اندرونی اور بیرونی مصیبتوں سے اسرائیل کی نجات کی اور خدا کے ساتھ اس قوم کے کامل ملاپ کی رویتیں دیکھیں جس کی وجہ سے یہودیوں پر وفاداری اور جان نثاری کی وجہ سے برکتیں نازل ہوں گی۔ ان نبیوں نے جو نقشے کھینچے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیونکہ جس زمانہ اور حالات میں وہ انبیا زندہ تھے وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ لیکن اس امر میں

اُن سب کا اتفاق ہے کہ خدا بادشاہ مطلق ہے اور قوم کی پاکیزگی اور اطاعت کی وجہ سے خدا کی مہربانی اُن پر ہوگی۔ ایک خاص شخص کا ذکر بھی آتا ہے جس کے وسیلہ سے خدا کا یہ مقصد پورا ہوگا۔ وہ مُوسیٰ کی مانند نبی ہوگا۔ وہ داؤد کی نسل کا بادشاہ ہوگا یا خداوند کا خادم۔ لیکن عام تصور یہ ہے کہ خدا کسی درمیانی کو استعمال نہ کرے گا بلکہ خود دخل دے گا عہدِ عتیق میں مسیح کی شخصیت کے بارہ میں کوئی خاص یکساں تعلیم پائی نہیں جاتی۔ بلکہ لفظ مسیح دیا تیبل ملا گیا) بھی خاص معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ گو مابعد زمانہ میں یہودیوں اور مسیحیوں دونوں نے اس لقب سے اپنے طور پر مسیح کے معنے لئے (دیکھو فصل مسیحی امید)۔ جلاوطنی کے بعد قومی عظمت اور عروج کا خیال ایسا دھندلا تھا کہ اُسے دینی یا ملکی تحریک کے لئے عملی طور پر استعمال نہ کر سکتے تھے۔ دوسری قوموں کے ساتھ راہ و ربط ہونے سے دنیا کے بارہ میں بھی ان کے خیالات میں توسیع ہوگئی اور اُس منظر میں اصلاح ہوئی جو تاریخ کے انقلابات میں اُن کو نظر آتا تھا۔ اور جب فقیہی لوگ انبیا کے قائم مقام ٹھہرے اور قومی تصور کی بجائے شخصی اور فردی تصور نے جگہ لی تو قوم کے بڑے حصے نے ظاہری دین کے پردہ میں پناہ لی حالانکہ پہلے دنوں میں یہ ایسا معتمد اور الہامی نہ سمجھا گیا تھا۔ باوجود اس کے یہ زمانہ اصحاب فکر سے خالی نہ تھا۔ یہ لوگ اب تک قدیم امید پر تکیہ کئے ہوئے تھے اور تبدیل شدہ حالات سے ان کی یہ امید معدوم نہ ہوئی تھی کہ خدا ان کی خاطر مداخلت کرے گا۔ گو خدا بہت اعلےٰ تھا۔ کیا وہ آسمان کے فضا کو جھکا نہ سکتا تھا اور اپنی تائب امید کی بحالی کے لئے آ نہ سکتا تھا؟ کیا وہ آسمان اور زمین کو جنبش دینے کے لئے اور سلطنتوں کے تختوں کو اُلٹ پلٹ کرنے کے لئے اُٹھ نہ سکتا تھا؟ (حجی ۲: ۲۱)۔ شریعت کی تلاوت کے ساتھ ساتھ نبیوں کے وعدوں اور پیشین گوئیوں کی گہری تلاش و دریافت ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہتوں کے دلوں میں وہ قدیم امید زیادہ شان کے ساتھ پیدا ہوگئی۔ اس صورت میں فوق العادت

قدرت سے یہ پوری ہوگی جس کا اثر عالمگیر ہوگا۔ غیر قوم سلطنتیں برباد ہوں گی۔ منتشر اسرائیل اپنے ملک میں پھر جمع ہوگا اور یروشلیم میں یہوواہ کی عبادت ازسرِنو قائم ہوگی اور زمین کے سارے باشندے اس کی تعظیم کریں گے۔ دانیال کی یہی امید تھی۔ اور اس زمانہ کی دوسری کتابوں میں اس کی طرف بہت اشارے پائے جاتے ہیں جس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ مکابیوں کے زمانہ سے پیشتر اور پیچھے بھی یہی امید قائم رہی مگر اس وقت تک کوئی آثار شخصی مسیح کے تصور کے نہیں ملتے جو کہ مابعد یہودی خیال کا خاص جز تھا۔ عشمانی خاندان کے برپا ہونے اور عروج کے وقت اس آیندہ کامل سلطنت کی امید بالکل موہوم سی رہ گئی۔ پہلے پہل تو یہودی آزادگی کے لئے جنگوں میں سرو پا معروف اور مشغول رہے اور دیگر امیدوں کی ڈھارس توڑتے رہے۔ پھر کامیابی اور ظفریابی کے وقت اُن کو ایسی آزادگی اور عروج حاصل ہوا کہ آیندہ کی طرف سے ان کی نظریں ہٹ گئیں اور ان باتوں کا چرچا انہوں نے ملتوی کر دیا جب تک کہ کوئی نیا نبی برپا نہ ہو (۱ مکابی ۴: ۴۱) +

جس صدی میں مسیح پیدا ہوا اُس کے عین شروع میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہوئی۔ عشمانی خاندان کی حکومت تباہ ہونے پر تھی۔ اُس خاندان کے سرداروں میں خانہ جنگیاں برپا تھیں جن کی وجہ سے وہ خاندان بُری طرح سے برباد ہو رہا تھا اور ملک میں ہر طرح کی ابتری اور بدامنی پھیل رہی تھی۔ فریسی اور اُسی قسم کے دیگر گروہوں نے ملک کی اصلی حکومت کا انکار کر دیا اور کامل بادشاہ کے بارہ میں قدیم امید کو سرسبز کرکے تسلی حاصل کی۔ عشمانی عہد سلطنت میں قومیت کا خیال پھر تازہ ہوا بلکہ اس میں زیادہ مبالغہ کیا گیا۔ لیکن چونکہ اب ان کا اعتماد جاتا رہا اور ان کی امیدیں مایوسی سے بدل گئیں۔ اس لئے انہوں نے زیادہ سرگرمی کے ساتھ منجانب اللہ قائم شدہ سلطنت کے بنیادی خیال کو اپنا ماوا و ملجا بنا لیا۔ جنوں کے

انیسویں باب میں اس وقت کے جذبات کا اظہار ہوا ہے۔ اور خاصکر سلیمان کے مزامیر میں۔ ان مزامیر میں پہلی دفعہ خاص معنی میں مسیح کے نام اور شخصیت کا ذکر ہوا ہے غالباً مسیح بادشاہ کا تصور کچھ عرصہ سے یہودیوں کے دلوں میں صورت پکڑ رہا تھا۔ اس کے بعد اس تصور نے زیادہ زور حاصل کیا اور دینی امید کا مرکز اور علم الٰہی کی تلاوت اور دینی غور و خوض کا خاص مضمون بن گیا۔ ہیرودیس اور رومی حکام کے جور و ظلم کے ایام میں اس خیال میں از حد جوش و ترقی ہوئی اور یہودی اسرائیل کی تسلی کے لئے دعائیں کرنے اور آرزو ظاہر کرنے لگے اور مسیح کی اور خدا کی سلطنت کی آمد کے آثاروں کی دیکھ بھال شروع کر دی (لوقا ۲: ۲ وغیرہ)۔ نئے عہد نامے کے اوراق سے ظاہر ہے کہ عوام الناس میں یہ خیالات کیسی شدت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ اور اس سے اس امر کی تشریح بھی ہو جاتی ہے کہ کیسے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی منادی نے لوگوں پر تاثیر کی۔ اور کہ ہمارے خداوند کے ہمعصروں نے اس کے ابتدائی کام کو کیسا پسند کیا۔ اور اس سے اس امر کی توضیح بھی ہو جاتی ہے کہ آخرکار کیسی تندی کے ساتھ انہوں نے مسیح کو رد کیا جب کہ وہ مسیح کی آمد کے مترقبہ آثار دکھلانے میں قاصر رہا اور ایک روحانی سلطنت کا اشتہار دینے لگا۔ یہ اشتہار ان کی مانوس امیدوں کے خلاف تھا۔ بعد ازاں انہیں وجوہات سے انہوں نے رومی سلطنت کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی قوم قوم نہ رہی*

شخصی بقا۔ دنیا کے آخر اور مسیح کی آمد کے خیالات میں جن کا تعلق آئندہ زندگی اور شخصی روح کی حالت کے ساتھ تھا پختگی اور نشو و نما میں ترقی ہوئی۔ اور اس ترقی کا محرک نہ صرف یہ امر تھا کہ فردیت پر زیادہ زور دیا گیا اور فارسی اور یونانی تاثیریں ہوئیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ بلکہ زیادہ تر شاید اس ملک کی اندرونی

حالت تھی جس کی وجہ سے ملکی اور دینی فریق حیران و سرگردان تھے۔ اس زمانہ کے جنگ و جدل قسمت کے ناگہاں انقلاب اور قومی طاقت اور عظمت کی امیدوں پر پانی پھر جانے سے یہ قدرتی بات تھی کہ یہودیوں کی توجہ موت کے بعد زندگی کی طرف منعطف ہو جس میں ہر طرح کی غیر مساوات مساوی ہو جائیگی اور ہر طرح کے ناحق کا بدلہ مل جائیگا خاصکر ایذا رسانیوں کے دنوں میں جبکہ انہیں اپنے ملک اور مذہب کی خاطر جانیں قربان کرنی پڑیں اس خیال کو ترقی ہوئی۔ آئندہ عدالت کا عقیدہ شہادت کی روح پیدا ہونے کی شرط لازمی تھی۔ اور یہودی مذہب کے ابتدائی شہیدوں کی حوصلہ افزائی اور استقلال کے لئے نہایت ضروری تھا*

عہد عتیق شخصی بقا کے مضمون کے بارہ میں تقریباً بالکل خاموش ہے۔ مابعد کتابوں میں مثلاً مزامیر (۱۶ و ۴۹ و ۷۳) اور ایوب (۱۴: ۱۳ سے ۱۵ + ۱۹: ۲۵ سے ۲۹) کی کتاب میں قبر کے پرے متواتر ہستی کی طرف اشارے تو پائے جاتے ہیں اور حنوک اور ایلیاہ کے اٹھائے جانے میں موت کے بعد حالت پر کچھ روشنی پڑتی ہے لیکن عبرانی قوم عموماً آئندہ زندگی کے خیالات سے چنداں دلچسپی نہ رکھتی تھی۔ ان کو صرف دنیاوی چیزوں ہی کا خیال تھا اور انہیں کا ہمیشہ حظ اٹھانے کو خدا کی طرف سے برکت سمجھتے تھے جس نجات کی انہیں آرزو تھی وہ اکثر قومی اور دنیاوی قسم کی تھی۔ زندگی کی معمولی مصیبتوں سے بچنا اور اپنے دشمنوں کے خوف اور طاقت سے نجات پانا ہی ان کی بڑی آرزو تھی۔ جب کبھی ان کو آئندہ زندگی کا خیال آیا تو انہوں نے یہی سمجھا کہ وہ ایک محرومی اور ناداری کی حالت تھی جس کے مقابلہ میں دنیاوی موجودہ زندگی ایک بڑی برکت خیال کرتے تھے۔ آئندہ زندگی ہر انہیں شیول (Sheol) ہی کی خوفناک اور تاریک شکل نظر آتی تھی۔ جسے وہ بے بدن ہستی کی ایک غیر یقینی حالت سمجھتے تھے جس میں نیک و بد سب یکساں جمع ہو جاتے ہیں اور جس سے بڑے بڑے دیندار اور خدا پر ایمان رکھنے والے بھی مخلصی حاصل نہیں

کر سکتے۔ آیندہ اور آخری باتوں کے بارہ میں اس نازک بنیاد سے شروع کر کے آیندہ
باتوں کا تصور زیادہ زیادہ ترقی کرتا گیا۔ اس تصور سے شروع میں شخصی بقا کا خیال زیادہ
پختہ اور روشن ہوتا گیا عہدِ عتیق کے موہوم اشارات کے ساتھ جب اپوکرفل اور تالمود
کے مصنفوں کے صریح مضامین کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب یہ
الفاظ غیر فانی اور غیر فنا (بقا) زیادہ مشہور ہو گئے اور تقریباً ہر معمولی یہودی اس خیال کا
گرویدہ پایا جاتا ہے فیلو کے تصور میں حیات بعد ممات کا دھندلا سا خیال تھا لیکن
اب وہ اس سے مختلف ذی ہوش حیات بعد از ممات کے منتظر اور امیدوار تھے۔ تھوڑے
ہی عرصہ کے بعد اس کو ایسے معنی اور ایسا درجہ حاصل ہوا کہ یہ زندگی کے انتظام میں اعلیٰ
رتبہ پر سرافراز ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ دو دیگر خیالات بھی وابستہ ہو گئے جس کے ذریعہ
سے یہ تصور زیادہ موثر اور قابلِ احساس ہو گیا یعنی بدن کی قیامت کا خیال اور آیندہ
جزا و سزا کا خیال۔ یہ دونوں تصور کچھ تبدیلی کے ساتھ مسیحی دین کے عقیدہ میں شامل ہو گئے
اور زمانہ حال کے خیالات پر انہوں نے بہت تاثیر کی ہے ٭

مکابیوں کی لڑائیوں کے زمانہ میں روح کی بقا کا یقین زیادہ زور پکڑ گیا اور
بدن کی قیامت اس کا لازمی جزو تھا۔ ان لڑائیوں سے بیس سال پہلے علامہ عصر یعنی
یشوع بن سیرخ نے اس بدن سے رحلت کرنے کا سخت نا امیدی کے ساتھ ذکر کیا۔
(یشوع بن سیرخ کی حکمت ۱۴: ۱۲ سے ۱۶ + ۱۷: ۲۷ سے ۳۲) لیکن ان لڑائیوں کے عرصہ
میں یہ خیال بالکل بدل گیا اور ان کے بعد قیامت کا بہت صاف ذکر آیا ہے۔ (دانیال
۱۲: ۲ + زبور سلیمان ۳: ۱۶) مکابیوں کی دوسری کتاب میں (۷ باب) یہ قصہ آیا ہے کہ
سات بیٹوں اور ان کی ماں نے موذی بادشاہ کے آگے ابدی زندگی کے لئے قیامت
کا ذکر کیا۔ اور ۱۴: ۴۶ میں بیان کیا ہے کہ رزس (Razis) نے اپنے مرنے کے وقت اپنی
انتڑیاں نکال کر لوگوں پر پھینک دیں اور زندگی اور روح کے خداوند سے دعا مانگی

کہ میری بے انتہا عمر مجھے عطا کر۔ کئی دیگر اشارات بھی ملتے ہیں (زبور سلیمان ۳: ۱۶ + ۹: ۹ + ۱۴: ۲
+ ۱۳: ۱۵ + حنوک ۹۰: ۳۳ + ۹۱: ۱۰ وغیرہ) لیکن شاید اس عقیدہ کی سب سے بڑی شہادت
یہ ہے کہ مکابیوں کے زمانہ کے بعد مسیح کے دنوں میں یہ عقیدہ عام طور پر مشہور و مروج
تھا۔ صدوقی تو بیشک اس کی تردید کرتے تھے لیکن فریسی اس تعلیم کے بڑے حامی اور ممد
تھے اور عوام میں سے اکثر اس تعلیم کے معتقد تھے ٭

اس زمانہ میں قیامت کا تصور کئی صورتوں میں ظاہر ہوا گو اس نے خاص نشو و نما
نہ پایا ہو۔ ابتدا میں تو قیامت دینداروں کی ہی مانی جاتی تھی اور مسیح کی سلطنت کے
قیام کا لازمی جز قرار پایا چونکہ اس سلطنت کے قایم ہونے میں توقف ہو گیا تھا لیکن جو اسی
امید پر زندگی بسر کر کے سلطنت کے قایم ہونے سے پیشتر اس جہان فانی سے کوچ کر گئے وہ مسیح کی آمد
کے وقت پھر جلائے جائینگے اور خداوند کی نجات میں حصہ لیں گے۔ سلیمان کے زبور میں اسی خیال کا اظہار ہے٭
اس کے بعد یہودی مسلمہ تعلیم کے جز کے طور پر یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ تخت الہی کے سامنے
عدالت کے لئے اور ابدی جزا و سزا کے لئے سبھوں کی قیامت ہو گی۔ (۲ عزرا ۷: ۳۲-
سے جو پہلی مسیحی صدی کے آخر کے قریب لکھی گئی) یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسیح کے زمانہ میں یہ عقیدہ
غالباً مشہور تھا۔ اور بعض مقامات میں اس تعلیم کے ساتھ وہ خاص رائے بھی متعلق تھی
اس سے ظاہر ہے کہ خاص لوگوں کی قیامت اور قیامت عام دونوں رائیں پائی جاتی تھیں۔
صادقوں کی قیامت مسیح کی آمد کے وقت اس کی زمینی سلطنت کی برکتوں میں شریک
ہونے کے لئے اور اس کے بعد دنیا کے آخر میں نوع انسان کے باقی حصہ کی قیامت جزا
و سزا کے لئے۔ مسیح کی آمد کے قرینہ میں یہ دونوں تعلیمیں نئے عہد نامہ میں ایک دوسرے
کے ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں اور خاص کر مکاشفہ کی کتاب میں جہاں دنیا کے آخر کا ذکر ہے۔
اثنائے زمانہ میں شخصی امید قومی مسیح کی توقع سے علیحدہ ہو گئی اور بذات خود ایک الگ
تعلیم ٹھیری۔ اس برکت کے قریب پہنچتے ہوئے مسیح کے زمانہ کی خوشحالی جس کا پیش خیمہ

تھی لوگوں کے خیالات عموماً مسیح کے زمانہ کی امید سے ہٹتے چلے گئے اور بذات خود علیحدہ ہو گئے۔ یہ تو آشکارا ہے کہ ہمارے اپنے زمانہ میں قیامتی زندگی کے بارہ میں اتفاق رائے حاصل نہیں ہوا۔ مسیح کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی اس کے متعلق بحث کا بازار گرم رہا۔ (اعمال ۲۳: ۶ تا ۹، ۲ تیمتھیس ۲: ۱۷ سے ۱۸)۔

مکابیوں کی لڑائیوں کے زمانے قریب آیندہ جزا و سزا کا مسئلہ جو روح کی بقا کے مسئلہ سے علاقہ رکھتا تھا زیادہ زور پکڑ گیا۔ بدن کی قیامت کے عقیدہ کی طرح یشوع بن سیراخ کی حکمت کی کتاب میں اس کا کوئی سراغ پایا نہیں جاتا۔ پہلے پہل اس مسئلہ کا پتہ صرف اتنا ملتا ہے کہ آیندہ جہان دو مختلف حصوں پر منقسم ہے۔ ایک میں خوشحالی اور دوسرے حصہ میں عذاب پایا جاتا ہے۔ نیک لوگ خوشحالی کے حصہ میں رہتے ہیں اور بدکار لوگ عذاب کے حصے میں۔ حکمت کی کتاب میں لکھا ہے یہ راستبازوں کی روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں اور کوئی عذاب ان تک نہ پہنچے گا۔ تھوڑی سزا کے بعد ان کو بہت اجر ملے گا۔ لیکن بے دینوں کو ان کے اپنے تصورات کے مطابق سزا ملیگی (۳: ۱ و ۵ و ۱۰، ۵: ۱۴ سے ۱۶ وغیرہ)۔ یہی خیال مکابیوں کی کتاب میں بھی پایا جاتا ہے {دیکھو مثلاً ان شہیدوں کی تقریریں جو انہوں نے بادشاہ کے سامنے کی تھی (۲ مکابی ۷: ۳۵ سے ۳۷)}۔ آیندہ جزا و سزا کے عقیدہ کا یہ دھندلا سا ذکر پہلے پہل پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی اس مسئلہ نے مکمل صورت اختیار کر لی۔ کیونکہ مسیح کے زمانہ میں اس مضمون پر مفصل رائے قایم ہو چکی تھی۔ آیندہ جہان کے دو حصوں میں سے ایک کا نام فردوس تھا (یا استعارہ کے طور پر ابرہام کی گود)۔ اور دوسرے کا نام جہنم جس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ یروشلم کے قریب ہنوم نام ایک وادی تھی جس میں شہر کی گندگی اور کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا اور جن مجرموں کو پھانسی ملتی تھی ان کی لاشیں پھینکی جاتی تھیں۔ راستباز مرتے ہی بلا توقف فردوس میں داخل ہو جاتے۔ لیکن دوسروں کو ان کی شرارت کے مطابق بہت یا

تھوڑا عرصہ جہنم میں رہنا پڑتا تھا۔ صادق لوگوں سے مراد ہے اسرائیلی تھا یعنی جو ساری شریعت کو مانتے تھے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کیا کرتے تھے لیکن بعض اوقات دوسرے مذاہب کے لوگ بھی صادقوں کے زمرہ میں شامل سمجھے گئے جنہوں نے پاکیزگی اور راستبازی سے زندگی بسر کی تھی۔ باقی لوگوں میں سارے غیر قوم شامل تھے اور وہ سارے اسرائیلی جن کی راستبازی ناقص تھی۔ یعنی ایسے اسرائیلی جو شریعت سے غافل رہے یا جنہوں نے اس کو حقیر جانا اور اپنے بدنوں میں گناہ کیا۔ ایسوں کے لئے جہنم کی تاریکی اور عذاب میں دکھ اور عذاب تھا۔ مگر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جہنم کی سزا کبھی ابدی نہیں مانی گئی تھی وہ سزا صرف ایک عرصہ کے لئے تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسے لوگوں کی اصلاح ہو جائے۔ آیندہ جہان کی دو مخالف حالتوں کے مابین ایک قلیل فاصلہ تھا جس پر گنہگار کی توبہ اور اصلاح زندگی کے ذریعہ پل پڑ سکتا تھا اور اس پر سے وہ لوگ عبور کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ مانا گیا کہ کم گنہگار یہودی جو جہنم میں ڈالے گئے تھے (یعنی جن کی اصلاح ناممکن نہ تھی)، وہ کچھ عرصہ عذاب میں رہ کر اور اپنے گناہ سے پاک ہو کر اور بھی توبہ کر کے فردوس میں چلے جاتے تھے۔ یہ بھی ظن غالب ہے کہ جہنم اور فردوس کی درمیانی حالت یعنی شیول کے دو حصے خیال کئے گئے جس جگہ سے صادق لوگ اور جنہوں نے اپنی ناراستیوں سے توبہ کی تھی آخرکار آسمان میں داخل ہو جاتے تھے۔ اور جو شریر لاعلاج تھے ان کی نسبت عام رائے یہ تھی کہ وہ نیست کئے جائینگے۔ لیکن اس کی نسبت کچھ تکرار رہتی تھی۔ ربیوں کے بعض اقوال سے کچھ پتہ لگتا ہے کہ جو شریر آخر تک توبہ نہ کریں گے ان کو ابدی سزا ملے گی۔ لیکن اس کے خلاف یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا عقیدہ تھا تو مابعد زمانہ میں وہ بالکل معدوم ہو گیا۔ کیونکہ طالمود کی تعلیم تو صریح ابدی عذاب کے خیال کے خلاف ہے۔ اور شریر سے شریر گنہگاروں کیلئے بھی عارضی سزا مانی گئی۔

مسیح نے اپنے زمانہ کی ان تعلیموں پر کچھ بحث نہیں کی بلکہ اپنی تعلیم میں کبھی کبھی ان کا ذکر کیا۔ مثلاً دولتمند اور لعزر کی تمثیل میں اور صلیب پر چور سے وعدہ کرتے ہوئے (لوقا ۱۶: ۱۹ سے ۳۱؛ ۲۳: ۴۳)۔ جہاں ہمارے خداوند نے بہت اور تھوڑے کوڑوں کا ذکر کیا (لوقا ۱۲: ۴۷، ۴۸)۔ اور جب تک تو کوڑی کوڑی ادا نہ کر دیگا (متی ۵: ۲۶)۔ نادانوں کے گناہوں کی سزا زیادہ برداشت کے لایق ہوگی۔ (متی ۱۱: ۲۲)۔ وہاں بھی یہی تعلیم پائی جاتی ہے۔ آئندہ زندگی کے بارہ میں جو تعلیم مسیح نے دی اس کا ذکر فصل بنام "یسوع مسیح کی تعلیم" میں پایا جاتا ہے +

(۵) عبادت اور عمل۔ جلاوطنی کے ایام میں یہودی عبادت زیادہ روحانی ہوگئی۔ ہیکل کی رسومات اور قربانیوں سے محروم ہوکر قوم کے دیندار لوگوں نے ختنہ اور سبت کی رسوم کو تو مانا لیکن شریعتِ خدا پر زیادہ غور کرنے اور زیادہ دعا مانگنے لگے۔ ان جلاوطنوں کی سرگرمی اس سے بھی زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کی روحانی ترقی اور حوصلہ افزائی کے لئے جمع کیا کرتے تھے اور غالباً عبادتخانہ کا آغاز اسی سے ہوا۔ اور نئے عہد نامہ کے دنوں میں یہ قدیم انتظام مانا گیا (اعمال ۱۵: ۲۱)۔ جلاوطنی کے ایام میں عبادت الگ الگ اشخاص ہی کر سکتے ہونگے۔ سب کا مل کر عبادت کرنا مشکل ہوگا اس لئے قومی مجموعی عبادت کا خیال کمزور ہوگیا اور شخصی عبادت کا خیال زیادہ ترقی کر گیا +

جلاوطنی سے واپس آنے کے بعد ہیکل کی عبادت کو از سر نو ترتیب دی گئی اور اس میں کئی باتیں بڑھائی گئیں۔ صبح و شام کے لئے یکسالہ برہ کی قربانیاں پھر شروع ہوئیں اور بلاناغہ یروشلم کے تسخیر ہونے تک جاری رہیں۔ سوائے انتی اوخس اپی فینس کی ایذارسانی کے زمانہ کے۔ سبتوں نئے چاندوں اور بڑی بڑی

سالانہ عیدوں کے لئے سوختنی قربانیاں اور خطا کی قربانیاں مقرر ہوئیں۔ اور جلاوطنی سے پیشتر جو تہوار مروج تھے ان کے سوا اور کئی تہوار بھی مقرر کئے گئے۔ مثلاً پوریم کی عید جو اس بات کی یادگاری میں منائی جاتی تھی کہ ہامان نے جو سازش فارسی یہودیوں کے خلاف کی تھی وہ ناکامیاب ٹھہری (آستر ۹: ۲۳ سے ۳۲)۔ اور عید تجدید۔ اس امر کی یادگاری میں تھی کہ یہوداہ مکابی نے ۱۶۵ ق م ہیکل کی عبادت کو بحال کیا تھا۔ ان سارے موقعوں پر قربانیوں کا خرچ اخراجاتِ شاہی خزانے سے ادا نہ ہوتا تھا بلکہ ان یہودیوں کی خیرات سے جو ساری دنیا میں منتشر تھے۔ یوں انہوں نے نمایندہ صورت اختیار کی اور عالمگیر دینی شراکت کا نشان بن گئے۔ چونکہ صرف انبیا کی تلاوت کی طرف یہودیوں نے زیادہ توجہ کی اس لئے زیادہ گہری دینداری ان کے دلوں میں پیدا ہوگئی۔ وہ خدا کی نظر میں پسندیدہ سمجھے گئے نہ اس لئے کہ ان میں کوئی باطنی خوبی یا ثواب تھا بلکہ اس لئے کہ وہ دینداری اور توبہ کاری کا اظہار تھے۔ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ خدا کو بچھڑوں اور بکروں کے خون کی چنداں پروا نہیں جس قدر کہ اس امر کی ہے کہ لوگ اس کی مرضی بجا لائیں (زبور ۴۰: ۶ + ۵۰: ۷ + امثال ۲۱: ۳ + یسوع بن سیراخ کی حکمت ۳۴: ۱۸ سے ۳۵)۔ یسوع نے گو اپنے زمانہ کے یہودی معلموں کی نسبت قربانیوں کی کم وقعت کی تو بھی اس نے ان میں مداخلت نہ کی بلکہ شریعت کے دیگر معمولی رسومات کی طرح ان کو بھی اس نے مانا (لوقا ۲: ۴۱ + مرقس ۱۴: ۱۲ + یوحنا ۲: ۱۳ + ۵: ۱ + ۷: ۲) +

کئی اور باتیں بھی عبادت میں داخل کی گئیں اور ان پر زور دیا گیا۔ ان کی وجہ سے قربانیوں کی وقعت کچھ گھٹ گئی۔ اور کاہنوں سے علیحدہ یہودی جماعت کو عبادات میں زیادہ دلچسپی حاصل ہوئی۔ اسی وجہ سے ہیکل کی عبادت کے علاوہ عبادتخانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ چنانچہ جہاں کہیں یہودی جماعت

تھی وہاں ایک یا اُس سے زیادہ عبادت خانے پائے جاتے ہیں۔ عبادت خانہ میں بھی اور ہیکل میں بھی فایدہ عام کے لئے توریت پڑھی جاتی اور اس کی تفسیر ہوتی تھی۔ کچھ عرصے بعد نبیوں کے صحیفوں اور عہد عتیق کی دوسری کتابوں کی بھی تفسیر ہونے لگی۔ اور مقدس گیت (جن میں سے کئی ایک مزامیر کی کتاب میں محفوظ ہیں) مشاق مغنی باجے کے ساتھ یا بلا باجے کے گاتے تھے اور یہ جماعت کی طرف سے حمد کے طور پر تھے۔ برملا عبادت اور شخصی عبادت میں دعا جزو اعظم تھا۔ ہر خوشبو جلانے یا قربانی کے وقت تعریف اور شکرگزاری کے ساتھ دعا مانگی جاتی۔ عبادت عام کے لئے دعا کی کئی مقررہ ترتیبیں تھیں جن میں سے "اٹھارہ مبارکبادیاں" مشہور ہیں۔ اس کا نسخہ خورد "آل حنیموا وراں قادیش" کہلاتا ہے۔

اُس زمانہ میں دُنیا کے آخر کی نسبت جو خیالات مروج تھے ان کے عین مطابق مُردوں کے لئے دعا مانگنے اور قربانی چڑھانے کا دستور بھی پیدا ہو گیا۔ شاید اس رسم کے آغاز کی وجہ بت پرستوں کا دستور ہو جو مُردوں کی قبروں پر جا کر چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے۔ لیکن بت پرستوں کے دستور اور یہودیوں کی اس رسم کے درمیان فرق یہ تھا کہ یہ قربانیاں مُردوں کے آگے نہ چڑھائی جاتی تھیں بلکہ ان کے واسطے خدا کے آگے چڑھائی جاتی تھیں۔ قربانی کے بغیر مُردوں کے لئے دعا مانگنے کا دستور ابتدائی مسیحی کلیسیا میں بھی پیچھے مروج ہو گیا۔ اس کے آغاز کا صحیح صحیح پتا لگانا مشکل ہے لیکن جو دیندار یہودی روح کی بقا اور بدن کی قیامت کو مانتے تھے اور جن کا یقین تھا کہ جہنم کی سزاؤں کے ذریعہ روحیں پاک ہو جاتی ہیں ان کے لئے ایسی دعائیں مانگنا قدرتی بات تھی۔ ان کے لئے یہ مان لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ جن روحوں کو اس جہان میں ان کی دعاؤں کے ذریعے فایدہ ہوا تھا ان کو مرنے کے بعد بھی ان کی دعاؤں کے

ذریعہ فایدہ پہنچ سکتا ہے۔ خیال ہے کہ اس قسم کی دعاؤں کی مثال زبور ۱۳۲: ۱ میں پائی جاتی ہے بشرطیکہ یہ زبور داؤد کے زمانہ کے بعد کی تصنیف مانی جائے۔ "اے خداوند داؤد کے لئے اس کی ساری مشقتوں کو یاد کر"۔ لیکن ہم اس پر بہت زور نہیں دے سکتے۔ اس رواج کا صاف ذکر پہلی دفعہ مکابیوں کی تواریخ میں آتا ہے (۲ مکابی ۱۲: ۴۳ سے ۴۵)۔ یہودی معلموں کی تعلیم بالکل اس کے مطابق تھی۔ اور اس بات کے ماننے کی معقول وجہ بھی ہے کہ مسیح کی زندگی اور خدمت کے ایام میں گو اس کی نسبت اس نے ہمیشہ خاموشی اختیار کی عبادتخانوں میں مُردوں کے لئے دعائیں مانگی جاتی تھیں اور متوفی کے رشتہ دار ایسی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ پہلی اور دوسری صدی مسیحی میں یہودی قبرستانوں میں جو کتبے ملے ہیں وہ اس رواج پر شاہد ہیں اور اس کا سراغ اس دعا میں ملتا ہے جو مقدس پولس نے انیسفرس کے لئے مانگی (۲ تیمتھیس ۱: ۱۸)۔

سوائے خاص دیندار حلقوں کے مثلاً جن میں مسیح کی انجیل نے جڑ پکڑی جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے آخر کے قریب یہودی دین محض ایک رسم اور دکھاوا رہ گیا۔ اس خیال نے کہ خدا انسان کی رسائی سے پرے ہے کئی سخت تصورات اس کی ذات اور عدالتوں کے بارہ میں پیدا کر دیئے تھے۔ اس قدر محبت اس سے منسوب نہ کی جاتی جس قدر کہ متلون مزاجی اور مطلق العنانی منسوب کی جاتی تھی اور یہ مانا گیا تھا کہ خدا جو کچھ طلب کرتا ہے وہ توریت اور بزرگوں کی روایات میں مندرج تھا۔ ان روایات کا اس قدر بڑا طومار ہو گیا تھا کہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے امور کے لئے ہدایات ان میں دی گئی تھیں۔ ان کے خیال میں صرف فریسی قوانین کی پابندی ہی سے آدمی خدا کے سامنے راستباز ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ پابندی صرف ظاہری ہی تھی۔ پس دینی زندگی ریت رسوم کی بجا آوری ہی پر مشتمل

تھی۔ اور ان میں طہارت اور غسل اور ظاہری رسوم کی پابندی جزو لاینفک تھی۔ کل فریسی انتظام کا مقصد یہ تھا کہ پیالے اور رکابیوں کا بیرونی حصہ صاف ہو جائے۔ یہ پودینہ اور سداب کی اور ساری ترکاریوں کی دہ یکیوں پر زور دیتے تھے لیکن خدا کی عدالت اور محبت کو نظر انداز کرتے تھے (لوقا ۱۱: ۳۹ سے ۴۲) جو لوگ ساری شریعت کے ماننے میں قاصر رہتے ان کے کفارہ کے لئے بھی کئی تجویزیں پیش کی گئیں مثلاً غیر معمولی دُکھ اُٹھانا اور اعلےٰ درجہ کے ثواب کے کام کرنا۔ خاصکر خیرات دینا۔ بلکہ یہ بھی کہتے تھے کہ ماں باپ اور دوستوں کے اعمال حسنہ سے بھی یہ قصور معاف ہو جاتے تھے۔ ایسے انتظام میں حقیقی روحانی زندگی کا پیدا ہونا مشکل تھا۔ اس کا نتیجہ (جیسا کہ نئے عہد نامہ سے ظاہر ہے) ایک طرف تو غرور اور ریاکاری اور دوسری طرف مایوسی تھا۔ ہمارے خداوند نے ایسی حالت پر برابر ملامت کی جب تک کہ صلیب پر اس کے ہونٹ بند نہ ہو گئے اور اس کے خلاف اُس نے پاک اخلاقی تعلیم اور گہرے روحانی ایمان پر زور دیا جس نے اب ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔

یسوع مسیح کی زندگی

مسیح کے پیروؤں کی نظروں میں مسیح کی زندگی دنیا کی تاریخ کا مرکز ہے چنانچہ بیرونی طور پر اس کا ثبوت ان کا وقت کے شمار کرنے کا طریقہ ہے اور دیگر واقعات کی تاریخ اُسی واقعہ سے شمار کی جاتی ہے۔ خاصکر وہ اپنی شخصی زندگیوں کے لئے اس واقعہ کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور اپنے غور و فکر اور دنیا میں اپنی روش کی بنیاد اُسی کو ٹھہراتے ہیں۔ مسیحیت ایسے گہرے طور سے مسیح کی شخصیت اور کام پر محیط ہے کہ اُس کی زندگی کا علم و ادراک مسیحی عقیدہ کے سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ نہ صرف اس خیال سے کہ اُس نے کیسی پاکیزگی اور راستی کی زندگی بسر کی۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ وہ اخلاقی زندگی کا کامل معیار ہے۔ بلکہ اس لئے کہ دینی تمنا اور رجحان کا کمال اُس میں نظر آتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ بڑے ادب اور غور و خوض سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ ایسے مطالعہ کے لئے مفصلہ ذیل مختصر خاکا ممد و مددگار ہوگا۔ اس خاکے میں اناجیل کی تطبیق ظاہر کی جائے گی اور جہاں تک ممکن ہوگا تاریخی سلسلہ میں اس کا بیان کیا جائے گا

مسیح کی پیدایش کی مسلمہ تاریخ میں چند سالوں کی غلطی وقوع میں آئی ہے۔ فی الحقیقت وہ سنہ ۴ یا ۶ ق م میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا جو یروشلم سے ۵ میل جنوب کی طرف تھا۔ اس کا نام بیت لحم تھا۔ یہاں وہ بطن مادر سے ایک اصطبل میں پیدا ہوا کیونکہ سرائے میں اُس کو جگہ نہ ملی تھی۔ اُس کی والدہ مریم اور یوسف جو اُس کا باپ مشہور تھا یہوداہ کے فرقے کے دیندار یہودی تھے۔ اُن کا دعوےٰ تھا کہ وہ داؤد کے شاہی خاندان سے تھے۔ لیکن داؤد کی دوسری اولاد کی طرح

بہ حالت افلاس میں تھے۔ انجیل کے بیان کے مطابق جو غالباً یوسف اور مریم کی شہادت
پر مبنی ہے یوسف یسوع کا حقیقی باپ نہ تھا۔ ان کی شادی سے پیشتر معجزہ کے
طور پر مریم حاملہ ہو چکی تھی جیسا کہ فرشتے نے خبر دی تھی۔ یہ معاملہ ایسا انوکھا تھا کہ اگر
کسی معمولی شخص کے بارہ میں یہ کہا جاتا تو کبھی قابلِ اعتبار نہ ٹھیرتا۔ لیکن یسوع کی مابعد غیر معمولی
زندگی کے باعث وہ نہ صرف قابلِ اعتبار بلکہ امرِ طبعی سمجھا گیا۔ اس موقعہ پر اس کی
زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مقدس متی کی انجیل کی تفسیر کے وقت اس پر
مفصل بحث کی گئی ہے۔

۲۔ یسوع کا بچپن اور لڑکپن۔ جب یسوع پیدا ہوا تو ہیرودیس اعظم
یہودیہ اور سارے فلسطین کا بادشاہ تھا۔ اس سے تھوڑے عرصے بعد ہی وہ مر گیا
(۴ ق م)۔ اور اس کی سلطنت اس کے بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ ارخلاؤس کو
یہودیہ۔ سامریہ اور ادومیہ کا علاقہ ملا۔ ہیرودیس انتپاس کو گلیل اور پیریہ کا علاقہ۔
ہیرودیس فلپس کو طراخونیتس اور اتوریا کا علاقہ۔ یہ شہزادے خود مختار نہ تھے بلکہ
روم کے ماتحت تھے۔ ابھی یسوع چھوٹا ہی تھا کہ ارخلاؤس بدنظمی کی وجہ سے گال
میں جلاوطن کر دیا گیا اور یہودیہ پر رومی حاکم مقرر ہو گیا۔ (۶ء)۔ انتپاس اور فلپس
آخر تک حکومت کرتے رہے۔

یوسف کا ارادہ تھا کہ مستقل طور سے بیت لحم میں سکونت اختیار کرے۔ کیونکہ
وہی مسیح کا اصلی وطن تھا (میکہ ۵: ۲)۔ لیکن پہلے تو ہیرودیس اعظم کی عداوت کی وجہ
سے اُسے مصر میں بھاگ جانا پڑا۔ بعد ازاں ارخلاؤس کی وجہ سے اُس کو اپنی تجویز
بدلنی پڑی۔ وہ اپنے شہر ناصرت کو چلا گیا جو انتپاس کے علاقہ میں تھا اور وہاں اُس نے
اپنے ہی پیشہ میں یسوع کی تربیت کی۔ غالباً اُس کا پیشہ نجار یا لوہار تھا۔

یسوع نے ربیوں کے کسی دار العلوم میں تعلیم نہ پائی لیکن غالباً ناصرت کے

عبادت خانے میں دیگر یہودی لڑکوں کی طرح اُس نے بھی معمولی تعلیم حاصل کی ہوگی
اس معمولی تعلیم میں پڑھنا لکھنا اور شاید کچھ ابتدائی ریاضی داخل تھی۔ چھ یا سات سال
کی عمر میں یہ تعلیم شروع ہوتی تھی۔ اس عمر سے پیشتر یہودی والدین اپنے بیٹوں کو شمعہ
(استثنا ۶: ۴) چند مثلیں اور زبور کی چند آیات حفظ کرایا کرتے تھے۔ مدرسیں میں لڑکے
زمین پر بیٹھا کرتے تھے اور اُستاد کے پیچھے پیچھے لفظ دہراتے رہتے تھے جب تک کہ وہ
حفظ نہ ہو جاتے تھے۔ تلفظ کی صحت اور حفظ کرنے پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ توریت کا خاص
مطالعہ کیا جاتا۔ اس میں سے احبار کی کتاب پہلے شروع کرتے۔ کیونکہ سن بلوغت کے
پہنچنے تک جو علم درکار تھا وہ اس میں قلمبند تھا۔ لڑکوں کا بہت شوق تھا کہ اچھی طرح سیکھیں
کیونکہ جو لڑکے اچھی طرح پڑھا کرتے تھے اُن کو عبادت خانے کی عبادت کے وقت ورد
پڑھنے کی اجازت ملا کرتی تھی۔

یہودیوں کی تعلیم کا طریقہ یونانی طریقے سے بالکل متفرق تھا۔ یہودی مدرس فقیہہ
ہوا کرتے جو ربیوں کی روایات میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ اس تعلیم میں سے سارے
دنیاوی مضامین اور غیر قوم تاثیر کو خارج رکھتے تھے۔ یونانیوں کی طرح یہودی لڑکوں
کو کھیل کود کی تعلیم نہ ملتی۔ گو یہ تو پتہ لگتا ہے کہ وہ بازاروں میں ایک دوسرے کے
ساتھ کھیلا کرتے تھے (متی ۱۱: ۱۶)۔ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ یسوع یونانی تعلیم و تربیت
سے بالکل بے بہرہ تھا۔ گو یہ ظن غالب ہے کہ چونکہ گلیل میں بہت یونانی رہتے تھے اسلئے
یسوع کو یونانی زبان سیکھنی پڑی ہوگی۔ بعضوں کا تو یہ خیال ہے کہ وہ صرف آرامی
(جو نئے عہدنامہ میں عبرانی کہلاتی ہے) زبان سے ہی واقف تھا۔ لیکن گمان غالب
ہے کہ اُسے دو زبانیں آتی تھیں۔ حسب موقعہ وہ آرامی یا یونانی میں کلام کرتا تھا۔

اس میں تو کچھ شک ہے کہ یسوع نے اپنی ساری عمر میں بائبل کے سوا کوئی دوسری
کتاب پڑھی ہو۔ اس سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اُس کی جو تقریریں قلمبند ہوئی ہیں اُس نے

عہد عتیق کی تقریباً ہر ایک کتاب سے اقتباس کیا ہے اور اُس کی حقیقت اور معنی
سے اُس کو پوری واقفیت معلوم ہوتی ہے ۔

اُس کے لڑکپن کا صرف ایک ہی واقعہ کا ذکر انجیل میں آیا ہے (لوقا ۲: ۴۱)۔
لیکن یہ ظاہر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ بارہ سال کی عمر میں بھی اُس کو علم تھا کہ میں خدا کا
بیٹا ہوں (لوقا ۲: ۴۹)۔ یسوع کے بچپن کا کوئی معجزہ اناجیل میں مذکور نہیں۔ دوسرے
بچوں کی طرح وہ بھی حکمت اور قد میں بڑھتا گیا (لوقا ۲: ۵۲)۔ اس کی مستثنیٰ قابلیت
ظاہر ہوتی ہے نہ فوق العادت قابلیت (لوقا ۲: ۴۷)۔ انسانی زندگی کی ہر منزل میں سے
گزرتے وقت اُس حالت کے مناسب صفات اور قابلیتیں اُس نے ظاہر کیں۔ بائیبل
سے اس عام رائے کا کچھ ثبوت نہیں ملتا کہ عین تجسم کے وقت سے اُس کی انسانی ذات
کو کل علم اور ہر طرح کا کمال حاصل تھا۔ بلکہ برعکس اس کے کتاب مقدس کی تعلیم یہ
ہے کہ فضل اور علم میں اس کی انسانی عقل کا نشوونما حقیقی تھا اور وہ دوسرے انسانوں
کی طرح حقیقی آزمایشوں میں پڑا تھا ۔

یسوع کی تربیت اور پرورش چند دیگر بچوں کے ہمراہ ہوئی جو اُس کے بھائی
اور بہن کہلاتے تھے ۔ یہ یا تو یوسف کے بچے پہلی بیوی کے شکم سے تھے یا یوسف اور
اور مریم کے بچے یسوع کی پیدایش کے بعد۔ یا بقول بعض اشخاص (مثلاً جیروم) ہمارے
خداوند کے خالہ زاد بھائی تھے (دیکھو متی ۱۲: ۴۷ سے ۵۰) معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھائی
بہن یسوع کی اعلےٰ قابلیتوں کی وجہ سے اُس سے حسد رکھتے تھے اور کچھ عرصہ تک یہ
اس پر ایمان بھی نہ لائے (یوحنا ۷: ۵) مسیح کی قیامت کے بعد وہ ایمان لائے اور
ان میں سے یعقوب اور یہوداہ نے مسیحیوں میں شہرت حاصل کی ۔

۳۔ یسوع کی خدمت۔ ایسے تھوڑے عرصے میں جس قدر یسوع نے کامیابی
حاصل کی اُس قدر کسی دوسرے اُستاد نے حاصل نہ کی۔ اس کی خدمت کے ایام دو سال

اور چھ مہینے (بقول بعض تین سال اور چھ ماہ) سے زیادہ نہ تھے۔ تو بھی اس تھوڑے
عرصہ میں اُس نے ایسی کلیسیا قایم کی جو بڑے بڑے ملکی اور تمدنی انقلابات میں گزر کر
بھی صحیح سلامت نکل آئی اور انسانی علم کی روز افزوں ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی
گئی۔ آج مسیحی دین ایسا ہی نیا ہے جیسے دو ہزار برس پہلے نیا تھا۔ نوع انسان کا
تیسرا حصہ اس دین کا ماننے والا ہے اور اب تک اس کا اثر آدمیوں کے دلوں
اور زندگیوں پر ہوتا چلا آتا ہے ۔

مسیح کی خدمت کی تجویز بالکل صاف و صریح ہے۔ اُس نے اپنا یہ فرض لازمی سمجھا
کہ وہ پہلے پہل اپنے آپ کو یروشلم میں یہودی حکام کے سامنے اور کل قوم کے سامنے
موعود مسیح پیش کرے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا (یوحنا ۲: ۱۳ سے ۳: ۳۶) لیکن
اُسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ اُسے رد کر دیں گے۔ لیکن جس قسم کا مسیح وہ تھا۔ اور مسیح کے
بارہ میں جو تصور یہودیوں کا تھا وہ دونوں ایسے مختلف تھے کہ اُن میں اتفاق ممکن نہ تھا۔
یہودی تو ایسا دنیاوی بادشاہ چاہتے تھے جو رومیوں کے بالمقابل علم بغاوت فراز
کرے اور ایک عالمگیر یہودی سلطنت کی بنیاد ڈالے۔ لیکن مسیح اس جہان کی سلطنت
کا طلب گار نہ تھا۔ جس قوم نے اُسے شروع میں خوشی سے قبول کیا وہ رفتہ رفتہ اس سے
برگشتہ چلے گئے اور مسیح نے اُن کے آیندہ کام کے لئے بارھوں کو تربیت دینے میں زیادہ
مصروف رکھا۔ یسوع کا کبھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ یہودیت کی چار دیواری کے اندر ہی کام
کرے گا بلکہ اس کی نظر دور تک پہنچتی تھی کہ ساری قومیں اُس پر ایمان لائیں۔ چنانچہ اسی کے
مطابق اُس نے تجویز ٹھیرائی (متی ۸: ۱۱؛ یوحنا ۱۰: ۱۶؛ متی ۲۸: ۱۹)۔ اس لئے کیتھولک
کلیسیا کا تصور مقدس پولوس سے ماخوذ نہیں بلکہ خود یسوع سے ہے ۔

۴۔ خدمت کے مقامات۔ سرسری طور سے یسوع نے ایک سال تک
یہودیہ میں تعلیم دی اور ایک سال تک (بعضوں کے خیال کے مطابق دو سال تک)

گلیل میں کام کیا اور چھ ماہ تک پھرا یا اور دوسرے مقاموں میں۔ پہلی تین اناجیل میں
مسیح کے یہودیہ کے کام کا ذکر نہیں بلکہ اشارے بھی بہت تھوڑے ہیں (متی ۲۳: ۳۷۔
لوقا ۴: ۴۴)۔ بے شک یہ فروگذاشت قابل لحاظ ہے۔ لیکن اس کی وجہ آسانی سے
دریافت ہو سکتی ہے۔ مسیح نے یہودیہ میں جو آٹھ ماہ تک کام کیا وہ یوحنا بپتشا کی وفات
سے اور یسوع کے گلیل میں برملا ظاہر ہونے سے پیشتر تھا اور اس لئے یہ چنداں
ضروری حصہ نہیں۔ جو باقی کام مسیح نے یہودیہ میں کیا وہ صرف چند بار یروشلیم میں آنے
پر ہی محدود ہے۔ ان موقعوں پر جب کبھی مسیح یروشلیم کو گیا تو غالباً اپنے رسول یوحنا
کو بھی ساتھ لے گیا ہوگا۔ کیونکہ یوحنا کا گھر یروشلیم میں تھا اُس نے پطرس اور باقی
شاگردوں کو گلیل میں چھوڑا ہوگا تاکہ اس کا کام چلائیں اس لئے پہلی تین اناجیل جن کا
انحصار بہت کچھ پطرس پر تھا۔ یہودیہ کے کام کا ذکر نہیں کرتیں اور چونکہ صرف یوحنا ہی
نے اُس کے یہودیہ کے کام کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس لئے صرف اُسی نے اُس کا ذکر کیا +

۵۔ **بپتسمہ**۔ یوحنا بپتشا نے یسوع کو بپتسمہ دیا۔ اس یوحنا نے یہ دعوے
کیا تھا کہ میں مسیح کا پیشرو ہوں ۲۶ء کے آخری نصف میں بپتسمہ کے بعد یوحنا اور
یسوع دونوں نے کبوتر کی رویا دیکھی جو یسوع پر اترا تھا اور آسمان سے یہ آواز سنی کہ
"یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں"۔ اس نشان نے یوحنا کو قایل کر دیا
کہ یسوع ہی مسیح ہے اور خدا کا بیٹا اور اس کے بعد اُس نے کھلم کھلا اس امر کا اعلان
دینا شروع کیا۔ یوحنا کا یسوع کو مسیح تسلیم کر لینا جو کہ چوتھی انجیل میں ایسے واضح
طور سے بیان ہوا ہے وہ یسوع کی آیندہ خدمت میں نہایت ہی ممد ثابت ہوا۔
سب لوگ یوحنا کو نبی مانتے تھے اور اس کے الفاظ کی بڑی وقعت تھی (متی ۲۱: ۲۶
وغیرہ)۔ یسوع کے پہلے اور نہایت اعلےٰ شاگرد یوحنا کے شاگردوں ہی میں سے تھے
(یوحنا ۱: ۳۵ سے ۴۲) +

۶۔ **آزمایش**۔ اپنے بپتسمہ کے بعد یسوع بیابان کو چلا گیا تاکہ کچھ عرصہ تخلیہ میں
رہ کر اپنی خدمت کے لئے تیار ہو۔ اس عرصہ میں وہ دھیان۔ روزہ اور دعا میں لگا رہا
یہاں وہ آزمائش پر غالب آیا جو اُس شریر کے ذریعہ پیش آئی تھی کہ کامیابی کا آسان اور
باآرام طریقہ یہ ہے کہ عوام الناس کے خیال کے مطابق عمل کرے۔ اور ایک دنیاوی
بادشاہت قایم کرے اور ان غیر شایان مقاصد کے لئے اپنی اعجازی قوتوں کو
استعمال کرے۔ اُس نے مصمم ارادہ کیا کہ میں خود انکاری فروتنی اور دُکھ کی زندگی
اختیار کروں گا اور اپنے اصولوں کی اشاعت کے لئے زور و ظلم سے کام نہ لوں گا
یا لوگوں کی خوشنودی پر نہ چلوں گا۔ بلکہ دیندار اور پاک لوگوں کے دینی تقاضا کے
مطابق عمل کرونگا۔ اُس کی سلطنت حق کی سلطنت ہوگی (متی ۴: ۱) +

۷۔ **پہلے شاگرد**۔ آزمایش کے بعد یسوع اُس علاقہ کو چلا گیا جہاں یوحنا
بپتشما تھا۔ اور اس بپتشما کے کئی ایک شاگرد اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ شاگرد
یہ تھے۔ پطرس۔ یوحنا۔ اندریاس۔ فلپس۔ برتولمائی (نتھانیل)۔ وہ اس یقین یا اس
امید سے اس کے پیچھے ہو لئے کہ یہ فی الحقیقت مسیح تھا لیکن شروع میں یہ اُن کا قطعی فیصلہ
نہ تھا۔ وہ اس کے پیچھے تو ہو لئے لیکن انہوں نے اپنے معمولی پیشوں کو ترک نہ کیا لیکن
جب اُن کو یسوع کے ساتھ رہتے ہوئے ایک سال گزر گیا اور اُنہوں نے اس کو بخوبی
دیکھ بھال لیا۔ تب انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر اُس کی پیروی کی (یوحنا ۱: ۳۵ +
لوقا ۵: ۱۱) +

۸۔ **خدمت کا خاکہ**۔ پہلی تین اناجیل نے ترتیب وقت کو نظر انداز کیا اس لئے
صرف چوتھی انجیل کی مدد کے ذریعہ ہی خداوند کی خدمت کا تاریخی سلسلہ قایم کر سکتے ہیں۔
مقدس یوحنا کی مدد سے ہم مسیح کی خدمت کو آٹھ حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں +

(۱) بپتسمہ سے (دسمبر ۲۶ء سے) مسیح کی خدمت کی پہلی عید فسح تک (اپریل ۲۷ء)

اس چھ ماہ کے عرصے میں بپتسمہ۔ آزمائش۔ پہلے شاگردوں کا جمع ہونا اور قانا میں پہلا معجزہ داخل ہیں۔ اس عرصہ کا پہلا حصہ بیابان میں صرف ہوا اور پچھلا حصہ گلیل میں۔ اس عرصہ میں بہت کچھ مسیح خلوت میں ہی رہا۔ بڑا کام نہیں کیا۔ لیکن اس کے شاگردوں کے اس چھوٹے جھنڈ کا ایمان بڑھتا جاتا تھا اور عوام الناس آسے استاد یا نبی تسلیم کرنے لگ گئے تھے (یوحنا ۱: ۱۰ سے ۲: ۱۲)۔

(۲) اس کی خدمت کی پہلی فسح سے (اپریل ۲۷ء سے) اسی سال کے دسمبر تک یہ عرصہ آٹھ ماہ کا بالکل یہودیہ میں صرف ہوا۔ اس عید فسح کے وقت اس نے پہلی دفعہ ہیکل کو صاف کیا اور اپنی موت اور قیامت کی ایسے الفاظ میں پیشین گوئی کی جن کو پیچھے یہودیوں نے اس کے مقدمہ میں اس کے خلاف استعمال کیا (متی ۲۶: ۶۱)۔ صدر مجلس کا ایک بڑا ممبر ایمان لایا۔ اور اس کے بعد چند مہینے یہودیہ میں تعلیم اور بپتسمہ دینے میں صرف کئے۔ بہت لوگ اس پر ایمان لائے۔ لیکن ان کے ایمان با صدق دلی سے آسے تسلی نہ تھی۔ یسوع کی اس ظاہرا کامیابی پر یوحنا کے شاگردوں کو رشک آیا۔ اس پر یوحنا نے ان کو متنبہ کیا اور یسوع کے مسیح ہونے پر از سر نو گواہی دی (یوحنا ۲: ۱۳ سے ۴: ۴۲)۔

(۳) دسمبر ۲۷ء سے پوریم کی عید (مارچ ۲۸ء) تک۔ یہ تین ماہ کا عرصہ زیادہ تر گلیل میں صرف ہوا۔ یسوع کی کامیابی کے باعث فریسی دشمن ہو گئے۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے یسوع یہودیہ سے چلا آیا۔ اور گلیل کو جاتے ہوئے وہ سامریہ میں سے گزرا اور وہاں کئی ایک اشخاص اس پر ایمان لائے۔ اور پہلی دفعہ اس کا یہ کام یہودیہ کی سرحدوں سے باہر تک پہنچا۔ اس وقت گلیل کو واپس آنا گلیلی خدمت کا شروع تھا جس کا بیان ایسے مفصل طور سے پہلی تین اناجیل میں پڑھتے ہیں (مرقس ۱: ۱۴)۔ اس عرصہ میں یوحنا قید خانہ میں ڈالا گیا۔ اس لئے سارے گلیل کی آنکھیں اب یسوع پر

لگ گئیں۔ یسوع نے کفرناحوم کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اور وہاں سے سارے گلیل میں منادی کرتا پھرا۔ خدا کی سلطنت کا اعلان دیتا۔ بدروحوں کو نکالتا اور بیماروں کو شفا دیتا پھرا۔ اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ سب جگہ اس کو نبی ماننے لگے اور گلیل میں ہر جگہ یہ عام یقین ہو گیا کہ فی الحقیقت یہی مسیح تھا۔ اس عرصے میں جسے عموماً کلاں گلیلی خدمت کہتے ہیں جس میں یسوع کو بہت اعلیٰ کامیابی ہوئی۔ قانا کا دوسرا معجزہ (یوحنا ۴: ۴۶)۔ رسولوں کی آخری بلاہٹ (متی ۴: ۱۹ و لوقا ۵: ۱۱)۔ بارھوں کا چننا۔ پہاڑی وعظ۔ تمثیلوں کے ذریعہ اکثر تعلیم اور کفرناحوم اور سارے گلیل میں بہت معجزے داخل ہیں۔ یسوع کے جس کام کا ذکر متی اور مرقس نے قلمبند کیا اس کا بہت حصہ اسی عرصے سے متعلق ہے۔ اس عرصے میں اس قدر واقعات ہوئے اور یسوع نے ایسے لمبے لمبے سفر کئے کہ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ تین ماہ کے عرصہ میں سما نہیں سکتا اور اس لئے وہ اس خدمت کا عرصہ ایک سال تین ماہ ٹھہراتے ہیں۔ اس عرصے کے آخر میں یسوع نے رسولوں کو منادی کے لئے بھیجا (متی ۱۰: ۵)۔

یہ سارا زمانہ بڑا کاروبار کا زمانہ اور امید و توقع سے بھرا تھا۔ اگرچہ یسوع نے کھلم کھلا اپنے آپ کو مسیح مشتہر نہیں کیا۔ لیکن اس نے ایسے اختیار کے ساتھ کام و کلام کیا جو صرف موعود مسیح کے لئے ہی موزون و مناسب ہو سکتا تھا۔ بظاہر اس نے اس لقب سے اجتناب کیا کیونکہ یہودیوں کے خیال میں اس کا لازمی تعلق دنیاوی بادشاہ اور دنیاوی بادشاہی کے ساتھ تھا۔ لیکن سامریوں کے درمیان مسیح کا تصور (ملکی و پولیٹیکل) نہ تھا۔ اس لئے ان کے درمیان اس نے اپنے متعلق مسیح ظاہر کرنے میں کچھ تامل نہ کیا اور کھلم کھلا اپنے تئیں مسیح کہا (یوحنا ۴: ۲۶)۔ چوتھی انجیل میں جہاں گلیلی خدمت کا ذکر نہیں۔ یسوع نے اپنے تئیں مسیح ظاہر کرنے میں کم تامل ظاہر کیا لیکن پہلی تین اناجیل میں وہ اپنے تئیں برملا مسیح ظاہر کرنے سے کچھ زیادہ پرہیز کرتا ہے۔

(۴) پوریم کی عید (مارچ ۲۸ء) سے لیکر دوسری عید فسح (اپریل ۲۸ء) تک۔ یہ عرصہ تقریبًا ایک ماہ کا ہے۔ اس عرصہ کے شروع میں یسوع پوریم کی عید منانے کو یروشلم کو گیا (یوحنا ۵:۱)۔ لیکن زیادہ تر اُس نے یہ عرصہ گلیل ہی میں کاٹا۔ یروشلم میں یسوع نے بیت حسدا کے حوض پر ایک بیمار کو چنگا کیا اور ایک پر زور تقریر کی جس میں اُس نے ظاہر کیا کہ میں سبت کا بھی خداوند ہوں اور باپ کے برابر ہوں اور مجھے مُردوں کے جلانے کی قدرت حاصل ہے۔ اس کی باتوں سے بہت لوگ ناراض ہوگئے۔ اسلئے اس کے جان لینے کی سازش کرنے لگے۔ جب یسوع یروشلم میں تھا تو اُس کے رسول گلیل میں شفا دینے اور منادی کرنے کی خدمت میں مصروف تھے (متی ۱۰:۵)۔ یروشلم سے واپس آکر یسوع اپنے رسولوں سے آملا اور اُنہوں نے اپنی خدمت کی کامیابی پر بہت خوشی ظاہر کی (لوقا ۹:۱۰)۔ اس کے بعد جھیل کی مشرق کی طرف پانچ ہزار کے کھلانے کا معجزہ وقوع میں آیا (یوحنا ۶:۱)۔ اس واقعہ کا ذکر چاروں اناجیل میں مندرج ہے۔ اس کی خدمت کا فی الحقیقت یہ نازک وقت تھا۔ اس وقت تک خاص کر گلیل میں سب کچھ اس کے مفید مطلب ثابت ہوا۔ لیکن اب سے کچھ تغیر ہونے لگا۔ جس اژدحام کے فائدہ کے لئے اُس نے معجزہ کیا تھا وہ عمومًا جوشیلے گلیلی لوگ تھے جو عید فسح منانے کے لئے یروشلم کو گئے ہوئے تھے۔ وہ اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ اُسے یروشلم لے جاکر بادشاہ مشہور کریں۔ یسوع نے اس سے انکار کیا۔ اور اس کی وجہ سے نہ صرف بھیڑ کے لوگ ناراض ہوگئے بلکہ رسول بھی۔ اگلے روز جب اُس نے کفرناحوم کے عبادتخانہ میں یہ کہا کہ میں زندگی کی روٹی ہوں جو آسمان سے اتری اور جو کوئی ہمیشہ کی زندگی پانا چاہے وہ میرا گوشت کھائے اور میرا خون پیئے تو اُس کے شاگرد بھی اُس سے ناراض ہوگئے۔ اور بہت شاگرد اس کی پیروی سے ہٹ گئے۔ لیکن رسولوں کو گو بہت مایوسی ہوئی لیکن وہ مستقل رہے اور جو عید فسح اُس کے بعد آئی۔ جو اُس کی خدمت میں

دوسری (یا بعضوں کے خیال کے مطابق تیسری تھی) اُس کی تقریب پر وہ یروشلم کو نہ گیا۔ (یوحنا ۷:۱)۔ نیز دیکھو یوحنا ۵:۱ سے ۶:۷۱ تک۔

(۵) دوسری عید فسح (اپریل ۲۸ء) سے عید خیام (اگلے سال اکتوبر میں) تک۔ یہ عرصہ چھ ماہ کا تھا۔ اس عرصہ میں گلیل کا دوسرا اور آخری دورہ داخل ہے۔ یہ وقت کچھ تو گلیل خاص میں صرف ہوا اور کچھ فنیکیہ اور قیصریہ فلپی اور دکاپولس کے علاقوں کا سفر کرنے میں۔ اس زمانہ میں یسوع کی مخالفت ہوئی۔ مایوسی اور غم حاصل ہوا۔ اس عرصہ میں یسوع زیادہ تر برملا خدمت سے کنارہ کرتا رہا اور اپنے شاگردوں کے حلقے ہی میں وقت گزارا۔

ایک مہینہ گزرا کہ عید پوریم کی تقریب پر یسوع نے فریسی فریق کو ناراض کر دیا تھا۔ ان فریسیوں نے اپنے ایلچی گلیل میں بھیجے تاکہ یسوع کا سکہ لوگوں پر بیٹھنے نہ پائے کیونکہ یہ لوگ بھی کئی ایک وجوہات کے باعث اُس سے خوش نہ رہے تھے۔ چنانچہ اُن میں ایک سخت مٹ بھیڑ ہوئی۔ اس جھگڑے میں یسوع نے فریسیوں کی روایتوں پر ملامت کی۔ کیونکہ ان کے ذریعہ خدا کی شریعت باطل ہوتی تھی (مرقس ۷:۱۱)۔ تو بھی گنیسرت کے علاقہ میں اور شاید ساری گلیل میں اُس نے دورہ کیا اور بہت سارے بیماروں کو چنگا کیا (مرقس ۶:۵۳ سے ۵۶)۔ شاید اسی عرصے میں وہ دوسری دفعہ ناصرت کو گیا۔ اور پھر رد کیا گیا (لوقا ۴:۱۶)۔ آخرکار اُس نے یہ ارادہ کیا کہ گلیل کو چھوڑ دے اور غیر قوموں کے علاقہ میں دورہ کرے۔ لیکن پہلے اُس نے اُن گلیلی شہروں پر ملامت کی جن میں اُس نے اتنے معجزے کئے تھے اور جواب بے سود ٹھیرے (متی ۱۱:۲۰)۔ اس وسیع دورہ کی غرض غالبًا یہی نہ تھی کہ غیر قوموں میں نیا کام شروع کر دے۔ گو اُس نے کسی قدر یہ کام کیا۔ بلکہ یہ غرض تھی کہ رسولوں کے ساتھ تنہائی میں رہے اور ان کو اپنی موت کے لئے تیار کرے۔ صور اور صیدا کی سرزمین سے گزر کر اُس نے کنعانی عورت کی بیٹی کو چنگا کیا

(مرقس ۷: ۲۴)۔ اور پھر گلیل کی جھیل (دکاپولس) کی دوسری طرف کا دورہ کیا یہاں کی
آبادی زیادہ تر غیر قوم تھی۔ یہاں اُس نے چند لوگوں کو شفا دی اور چار ہزار کو روٹی
کھلائی۔ غالباً یہ لوگ عموماً غیر قوموں میں سے ہونگے۔ پھر عبور کر کے بیت صیدا کو چلا
گیا اور ایک اندھے کو بصارت عطا کی (مرقس ۷: ۳۱ سے ۸: ۲۶)۔ یہ معلوم کر کے
کہ فریسی اب تک سرگرمی سے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اور اہالیان ملک دشمنی پر
آمادہ تھے (مرقس ۸: ۱۱)۔ اُس نے قیصریہ فلپی میں ایک اور دورہ کیا فلسطین کے عین
شمال کی طرف۔ یہاں مقدس پطرس کا وہ اقرار عظیم وقوع میں آیا جس میں اُس رسول نے
باوجود ظاہرا ناکامیابی کے یسوع کے نہ صرف مسیح ہونے کا اقرار کیا بلکہ اس کی الوہیت کا بھی (متی
۱۶: ۱۶)۔ یسوع پر اس کا بڑا اثر ہوا اور اُس نے کہا کہ جو نام میں نے تمہیں پہلی ملاقات کے
وقت دیا تھا تو بخوبی اس کا مستحق ثابت ہوا (یوحنا ۱: ۴۲)۔ اس کے بعد اپنی موت اور
قیامت کا اعلان کیا۔ اور تبدیل صورت اور کفرناحوم کو چپکے واپس آنے کا واقعہ
ہوا (مرقس ۹: ۳۳)۔ یہاں مچھلی کے منہ میں سے سکہ نکلنے کا معجزہ (متی ۱۷: ۲۴)۔ یسوع
کا ایک بچہ کو گود میں لینے کا واقعہ (مرقس ۹: ۳۳) اور اپنے بھائیوں کے ساتھ گفتگو۔
جس میں اُنہوں نے یسوع کی ناکامیابی پر طعن کیا اور بتایا کہ کیوں تو چھپ کر زندگی
بسر کرتا ہے (یوحنا ۷: ۲)۔

(۶) عید خیام سے لیکر (اکتوبر ۲۸ء) اُسی سال کے دسمبر میں عید تجدید تک
(دیکھو یوحنا ۷: ۱۰ سے ۱۰: ۲۲ تک)۔ عید تجدید منانے کے لئے یسوع چپکے یروشلیم
کو گیا۔ سامریہ کی سرحدوں سے ہوکر (لوقا ۹: ۵۲)۔ اور راہ میں دس کوڑھیوں کو شفا
دی (لوقا ۱۷: ۱۱)۔ یروشلیم میں کسی قدر تائید پانے پر وہ اپنی گوشہ سے نکل آیا۔ الوہیت
کا دعوے برملا کرنے لگا۔ ایک موقعہ پر پتھراؤ سے بال بال بچ گیا (یوحنا ۸: ۵۹)۔ اس
سارے عرصے میں صرف ایک ہی معجزے یعنی جنم کے اندھے کی بصارت حاصل کرنے کے

معجزے کا ذکر آیا ہے۔ عموماً یہ مانا گیا ہے۔ کہ یسوع نے یہ سارا عرصہ جو تقریباً تین ماہ کا
ہوتا ہے یروشلیم میں کاٹا۔

(۷) عید تجدید کے وقت سے لیکر (دسمبر ۲۸ء) لعزر کے جلانے تک (مارچ ۲۹ء) یہ
عرصہ تقریباً تین ماہ کا یسوع نے پیریا میں بسر کیا۔ عید تجدید کے موقعہ پر یسوع کی جان
تقریباً جاتی ہی رہی تھی اور اس لئے یردن کے پار پیریا میں چلے جانے پر مجبور ہوا۔ یہاں
اُس نے انجیل کی منادی کی اور بہت لوگ اُس کے شاگرد بن گئے کیونکہ یوحنا بپتسما کی
منادی کے ذریعہ راہ تیار ہو گیا تھا (یوحنا ۱۰: ۲۲ سے ۴۲)۔ اس عرصے میں بہت واقعات
گزرے اور ابتدائی گلیلی خدمت سے بہت متفرق ہے۔ گلیل کی طرح یہاں بھی فقیہوں اور
فریسیوں نے متواتر اس کی مخالفت کی۔ اس عرصے میں ستروں کی رسالت عمل میں آئی۔
(لوقا ۱۰: ۱)۔ طلاق کا سوال اٹھا (مرقس ۱۰: ۲) چھوٹے بچوں کو برکت دی (مرقس ۱۰: ۱۳)
نوجوان دولتمند سے ملاقات ہوئی (لوقا ۱۳: ۳۱)۔ اور لعزر کے مُردوں میں سے جلانے
کا معجزہ ہوا (یوحنا ۱۱: ۱)۔

(۸) لعزر کے جلانے کے وقت سے (مارچ ۲۹ء) صلیب کے واقعہ تک
(اپریل ۲۹ء)۔ یہ عرصہ تقریباً تین ہفتوں کا افرائیم کے علاقہ میں تنہائی میں گزارا۔
یہاں سے وہ یروشلیم کو واپس گیا۔ تاکہ آخری عید فسح منائے۔ اور موت سہے۔ اور
یریحو اور بیت عنیاہ کی راہ سے گزرا (دیکھو یوحنا ۱۱: ۵۴ سے ۱۲: ۱۱ تک)۔ یریحو میں
اُس نے دو اندھوں کو بینا کیا (متی ۲۰: ۲۹)۔ اور زکائی کے ساتھ ٹھیرا (لوقا ۱۹: ۱)۔
اور فسح سے پیشتر کے سبت کو وہ بیت عنیاہ پہنچا۔ اور وہاں شام کے وقت شمعون
کوڑھی نے اُس کی ضیافت کی (یوحنا ۱۲: ۱۔ مرقس ۱۴: ۳)۔ اتوار کے روز (دکھ
کے اتوار) وہ یروشلیم میں مسیح کے طور پر فتحمندانہ داخل ہوا اور اس ویرانہ کام کے ذریعہ
اس کے گلیلی مددگاروں کو سر نو حوصلہ ہو گیا۔ اور لعزر کے مُردوں میں سے جلانے کے

معجزے نے بھی یروشلم میں ہل چل مچا دی۔ اگر وہ چاہتا تو کامیابی کے ساتھ ایک انقلاب پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس کے حامی اس کو بتدریج چھوڑتے چلے گئے (متی ۲۱: ۱)۔ تو بھی یسوعؔ ہر روز ہیکل میں تعلیم دیتا رہا اور صبح سے شام تک لوگ خوشی سے اُس کی سنتے رہے (لوقا ۲۱: ۳۸)۔ ہیکل میں اُس نے بہت اندھوں۔ لنگڑوں کو شفا دی اور ایسا جوش پھیلا کہ بچے بھی یہ پکار اُٹھے ابن داؤد کو ہوشعنا (متی ۲۱: ۱۴)۔ پیر کے روز یسوع نے جو رات کے وقت بیت عنیاہ میں رہتا تھا۔ انجیر کے درخت کو لعنت دی (متی ۲۱: ۱۸)۔ پھر اُس نے دوسری دفعہ ہیکل کو صاف کیا (متی ۱۱: ۱۵)۔ منگل کے روز صدر مجلس نے اُس سے پوچھا کہ تو کس اختیار سے یہ تعلیم دیتا ہے (متی ۲۱: ۲۳)۔ اور یسوع نے دو بیٹوں کی تمثیل سنائی (متی ۲۱: ۲۸)۔ اور شریر باغبانوں کی (متی ۲۱: ۳۳)۔ اور شادی کے لباس کی (متی ۲۲: ۱)۔ اُس نے جزیہ کے سوال کو بھی حل کیا (متی ۲۲: ۱۵)۔ اور صدوقیوں کو حیران کیا (متی ۲۲: ۲۳)۔ اور فقیہوں اور فریسیوں کی تعلیم پر سخت ملامت کی (متی ۲۳: ۱)۔ اُس روز کا خاص کام جب پر اس کی خدمت ختم ہوگئی یروشلم کی بربادی کی اور دنیا کے آخر کی مشہور پیشین گوئی تھی (متی ۲۴: ۱۔ نیز دیکھو یوحنا ۱۲: ۲۰ سے ۵۰ تک۔ بدھ کا روز اُس نے شاگردوں کے ساتھ خلوت میں کاٹا۔ اگرچہ نہیں تو اس روز یہوداہ نے یسوع کو تیس روپیوں کے عوض پکڑوایا (متی ۲۶: ۱۴)۔ جمعرات کی شام کو عید فسح کے خاص دن سے ایک روز پیشتر یسوع نے آخری عشائے منائی اور پاک عشائے ربانی مقرر کی (یوحنا ۱۳: ۱۔ متی ۲۶: ۱۷)۔ یہ دن عموماً مونڈے (Maundy Thursday) جمعرات کہلاتا ہے۔ (مونڈے بمعنی حکم) کیونکہ یسوع نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا تھا کہ ایک دوسرے کے پاؤں دھوئیں اسی بات وہ پکڑا گیا اور جمعہ کے روز

علی الصباح صدر مجلس۔ پیلاطوس اور انتپاس کے سامنے اُس کی پیشی ہوئی اور اُس کی صلیبی موت اور دفن کے بعد یہودی عید فسح ہوئی جو اُس سال سبت کے دن واقع ہوئی۔ سنیچر (ایسٹر کا عرفہ) یسوع نے مُردوں کے مسکن میں کاٹا۔ عام رائے کے مطابق (گو اس میں کئی ایک مشکلات ہیں) اُس نے راحت کی جگہ (لوقا ۲۳: ۴۳) اور رنج کی جگہ کو دیکھا (۱ پطرس ۳: ۱۸)۔ اس دوسری جگہ میں اُس نے منادی کی (۱ پطرس ۳: ۱۹ + ۴: ۶) اور شاید پہلی جگہ میں بھی۔

(۹)۔ قیامت اور صعود۔ روز قیامت کی صبح کو یسوع مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ اپنے حقیقی بدن میں جو جلالی اور روحانی بدن میں مبدل ہوگیا تھا اور چالیس دن تک وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو دکھائی دیتا رہا اور اپنی قیامت کی حقیقت کو اُن پر ثابت کیا اور خدا کی بادشاہت کے بارہ میں بہت باتیں انہیں سکھائیں۔ پھر شاگردوں کو یہ حکم دے کر کہ سارے جہان میں جا کر تعلیم دیں اور شاگرد بنائیں وہ کوہ زیتون پر سے اُن کے روبرو آسمان پر چلا گیا اور خدا کے دہنے ہاتھ جا بیٹھا تاکہ اس وقت سے کل عالموں پر حکومت کرے (اعمال ۱: ۱۱)۔ آسمان پر سے اُس نے پنتکوست کے دن روح القدس کو نازل کیا اور مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ایک دن وہ بذات خود پھر آئے گا تاکہ نوع انسان کی ان کے کاموں کے مطابق عدالت کرے۔

یسوع مسیح کی تعلیم

یسوع مسیح کی تعلیم کسی خاص سلسلہ کی صورت میں پائی نہیں جاتی بلکہ جیسی ضرورت پڑی اور جس قسم کے سامعین سے واسطہ پڑا اس کے مطابق جزوی صورت میں دی گئی۔ لیکن ان اجزا کو ملا کر پوری اور مکمل صورت میں یہ تعلیم مل سکتی ہے ۔

ظاہری صورت میں یہ بالکل یہودیانہ اور ربیانہ ہے ۔ چنانچہ مقدس متی کی تفسیر میں جو مقابلہ کیا گیا ہے اس سے یہ بخوبی ظاہر ہے ۔ خاص کر یسوع نے تمثیلوں کو بہت استعمال کیا ۔ یہ طریقہ تعلیم ربیوں میں بہت عام تھا ۔ لیکن جس باقاعدہ اور موثر طریقے سے یسوع نے ان کو استعمال کیا ۔ ربیوں نے ایسا نہیں کیا ۔ لیکن حقیقت میں وہ یہودیانہ نہیں بلکہ نہایت وسیع معنوں میں وہ انسانی اور عالمگیر تعلیم ہے جو ہر زمانے اور ہر حالت کے لوگوں کے مناسب حال ہے ۔ اس عالمگیری کو مدنظر رکھکر یسوع نے مفصل شریعت دینے سے پرہیز کیا اور نہ عبادت کی مفصل ہدایات دیں ۔ اس نے چال چلن کے لئے اور عبادت کے لئے چند اصول سکھائے تاکہ اس کے شاگرد اپنے لئے ان کو عمل میں لا سکیں ۔ یوں یسوع کی تعلیم محرک قسم کی تھی یہ آدمیوں کو سوچنے کے لئے مجبور کرتی تھی ۔ اس میں اخلاقی مسایل کے لئے کانٹے چھانٹے جواب نہیں لیکن اس نے بنیاد اور خیال کو پیش کر دیا جن کے ذریعہ وہ مسایل حل ہو سکتے تھے ۔ اکثر اوقات وہ تعلیم معمہ نظر آتی اور نقیض دکھائی دیتی ہے جس کا یہ منشا ہے کہ ان اخلاقی اصولوں پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا جب تک کہ دیگر اصولوں پر جو حریف نظر آتے ہیں بخوبی غور و فکر نہ کی جائے (متی ۵: ۳۹ سے ۴۲ لوقا ۱۴: ۲۶ وغیرہ)۔ بعض اوقات یہ متضاد صورت اس بات کا نتیجہ تھا

کہ یہ تعلیم کیسی کامل اور مطلق صورت کی ہے (متی ۵: ۳۳ سے ۴۸)۔ خاصکر پہاڑی وعظ اس قسم کا ہے ۔ کامل سوسائٹی میں کامل چلن کا یہ خاکا ہے اور اس کے احکام کو زمانہ کی موجودہ حالت پر بلا شرائط عاید نہیں کر سکتے ۔ لیکن ایسا وقت آئے گا کہ پہاڑی وعظ کے اصول بلا شرائط عمل میں آ سکیں گے ۔

یسوع کی تعلیم مستند اور با اختیار تعلیم تھی ۔ حالانکہ یونان کے حکیم اپنی رایوں کو سچائی کے لئے محض قیاس ہی سمجھتے تھے اور اسرائیل کے نبیوں کا کلام خدا کی آواز تھا جو وقتاً فوقتاً ان کو پہنچتا رہا ۔ لیکن یسوع نے اختیار والے کی طرح تعلیم دی اور یہ اس کا ذاتی خاصہ تھا ۔ اس نے نہ صرف رسم شریعت کی تفاصیل کی اپنے اختیار سے ترمیم کی بلکہ دس احکام کی بھی (متی ۵: ۲۱)۔ اور عہد عتیق کے مکاشفہ کے بارہ میں بالعموم اس نے ایسا عمل کیا کہ کسی نبی نے کبھی نہ کیا تھا ۔ اس کی خدمت کے ابتدا ہی سے اس کے سامعین اس کی تعلیم سے دنگ ہو گئے کیونکہ وہ انہیں فقیہوں کے طور پر نہیں بلکہ اختیار والے کی طرح تعلیم دیتا تھا (متی ۷: ۲۸) ۔

(۱)۔ **خدا کی ابویت اور انسان کی فرزندیت** ۔ بلاشک یسوع کی خاص دینی تعلیم یہ تھی کہ خدا باپ ہے ۔ یہ خیال پرانے عہد نامہ میں بہت کم پایا جاتا ہے ۔ اور بہت ہی محدود معنی میں اور دوسرے مذاہب میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے ۔ لیکن یہ خیال یسوع کی تعلیم کی بنیاد تھا ۔ انجیل کا لب لباب یہ ہے کہ خدا محبت ہے ۔ اور ہر شخص کے لئے جسے اس نے پیدا کیا وہ بلحاظ خدا کی بشریت پدرانہ محبت رکھتا ہے (متی ۱۰: ۳۰)۔ لیکن یسوع کی تعلیم کے مطابق خدا باپ ہے نہ محض اس لئے کہ وہ فرشتوں اور آدمیوں کا باپ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا باپ ہے (یوحنا ۱۷: ۵)۔ ازل سے خدا نے بیٹے کو پیار

کیا اور بیٹے نے خدا کو پیار کیا۔ اس لئے اگر وہ خلقت کو بھی نہ پیدا کرتا تو بھی خدا ازل سے محبت کا خدا ہوتا (یوحنا ۱۷: ۲۴)۔ انسان اعلٰے روحانی معنی میں خدا کے بیٹے بن جاتے ہیں۔ لیکن براہ راست نہیں۔ بلکہ خود یسوع کے ساتھ رشتہ رکھنے کے ذریعہ سے (یوحنا ۱۴: ۲۱)۔ یسوع پر ایمان رکھنے اور پانی اور روح کے ذریعہ پیدا ہونے کے وسیلہ سے وہ خدا کے بیٹے اور ابدی زندگی کے وارث بن جاتے ہیں۔ البتہ عام طور پر فطرت ہی کے ذریعہ انسان خدا سے علاقہ رکھتے ہیں اور اس لئے اس کے فرزند کہلائے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ ان کی حیات اور ہستی کا بانی ہے اور ان کے سارے قواے اور قابلیتوں کا وہ چشمہ ہے لیکن اس طبعی رشتے کے ذریعہ وہ صحیح اور خاص معنی میں خدا کے بیٹے نہیں بن سکتے۔ یہ تو صرف اس امکان کی بنیاد ہے کہ وہ ایسے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ گنجایش رہتی ہے کہ وہ شاید ایسے کبھی بھی نہ بنیں بلکہ بالکل اُس کے خلاف بن جائیں کیونکہ خدا کے ساتھ حقیقی فرزندانہ رشتے کے لئے اس سے کچھ بڑھکر درکار ہے کہ ان کی ہستی کا وہ چشمہ ہے۔ باہمی سمجھوتہ اور تسلیم ارادہ۔ شوق اور کام کی شراکت۔ مسیح میں یہ ممکن ہو گیا چونکہ وہ خود خدا کا ابدی بیٹا تھا اس نے خدا کے طبعی بچوں کے دلوں کو ان کے باپ کی طرف پھیر دیا اور اس کی محبت کے دریچے ان کے لئے کھول دیئے۔ اس نے انہیں تعلیم دی کہ وہ اس حق کے مدعی بنیں اور خدا میں اپنے تولد کے حق کو استعمال کریں۔ بلکہ اُس کی الٰہی فرزندیت کا حکمنامہ اُن کے ہاتھ میں پکڑوا دیا۔ اس نے اپنے خون سے اُس پر دستخط اور مہر کر دی جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا یعنی اُنہیں جو اُس کے نام پر ایمان لاتے ہیں (یوحنا ۱: ۱۲)۔ اس سے اس کی توقع ہو سکتی ہے کہ یسوع اپنی فرزندیت اور دوسرے لوگوں کی فرزندیت میں خاص امتیاز کرے۔ اس نے کہا "میں اپنے باپ اور تمہارے باپ" "میرا خدا اور تمہارا خدا" لیکن اس نے کبھی نہیں کہا

"ہمارا باپ" اور "ہمارا خدا"۔ یہ کہنا کہ یسوع کی ابنیت صرف انسانی ابنیت کے تصور کی تکمیل تھی نہ صرف ایک یا دو آیتوں کے خلاف ہوگا بلکہ مسیح کی ساری تعلیم کے خلاف*

یہ فرزندیت کی زندگی بپتسمہ یافتہ مسیحی کو توبہ کے وقت سے حاصل ہوتی ہے جب سے کہ وہ اپنی مرضی کو یسوع الٰہی نجات دہندہ کے سپرد کرتا ہے۔ مسیحی شخص اپنی زندگی یسوع کے سپرد کر دیتا ہے جس کے ذریعہ اس کی زندگی یسوع کی پاک زندگی کے بالکل مطابق ہو جاتی ہے۔ اس سپردگی کے بغیر مسیحیت کی برکت اور قدرت اُس کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ پورے طور سے صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے کے ذریعہ وہ باپ کے پاس آ سکتا ہے "میں راہ حق اور زندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آ سکتا۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنا ہاتھ ہل پر رکھکر پیچھے دیکھتا ہے وہ خدا کی بادشاہت کے لایق نہیں" سب سے بڑی قربانی جو مسیحی دین طلب کرتا ہے وہ مرضی یا ارادہ کی قربانی ہے جس شخص نے یہ سیکھ لیا کہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے مطابق بنائے اور انہیں باتوں میں خوش ہو جن سے کہ خدا خوش ہے اُسی کو یسوع کا یہ عظیم راز معلوم ہو گیا ہے اور اسی کو فرزندیت کی باطنی خوشی سے معموری حاصل ہوتی ہے*

(۲) محبت کی تحریک۔ چونکہ خدا آدمیوں کا محبت کرنے والا باپ ہے اس لئے اس کا یہ ضروری نتیجہ تھا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں۔ اسی وجہ سے مسیحی اخلاق میں محبت پر بہت زور دیا گیا ہے (متی ۲۲: ۳۷)۔ یہ محبت کئی طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے (۱) جیسے خدا مسیح کی خاطر ہر تائب گنہگار کو معاف کرنے کو تیار ہے ویسے ہی ہم بھی ایک دوسرے کو معاف کرنے کے لئے تیار رہیں۔ ویسے ہی ہم بھی ہوں اس لئے اس نے یہ تاکید کی کہ جس گنہگار کے گناہ معاف ہو گئے وہ اپنے بھائی کو بھی معاف کرے نہ صرف سات دفعہ بلکہ سات کے ستر دفعہ (متی

۱۶: ۱۵ + ۱۸: ۲۲)۔ (۲) بے محبتی کی نکتہ چینی سے پرہیز کرنے کے ذریعہ مسیحیوں کو یہ تاکید کی گئی کہ وہ عیب نہ لگائیں تاکہ اُن پر بھی عیب نہ لگایا جائے (متی ۷: ۱)۔ (۳) صلح جوئی کے ذریعہ۔ "مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائینگے" (متی ۵: ۹)۔ (۴) عملی مہربانی کے ذریعہ۔ اس پر بشدت زور دیا گیا "جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اُس سے منہ نہ موڑ" (متی ۵: ۴۲) "اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دو" (لوقا ۱۲: ۳۳) اور اس کا کامل اظہار سنہری حکم میں ہے "پس جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو۔ کیونکہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے" (متی ۷: ۱۲)۔ (۵) دشمنوں اور ستانے والوں سے محبت رکھنے کے ذریعہ مسیح نے اس کی نسبت فرمایا کہ مسیحی کمال کا یہ خاص اور بڑا نشان تھا (متی ۵: ۴۴، ۴۸)۔ (۶) نقصان پہنچانے والے کا نہ مقابلہ کرنا نہ اُس سے ناراض ہونا۔ "میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے" (متی ۵: ۳۹)۔ مسیح کی ساری تعلیم میں چال چلن پر ہمیشہ بہت زور دیا گیا اور خاص کر عملی مہربانی کے فرائض پر۔ آخری عدالت بھی اعمال کے مطابق ہوگی۔ کیونکہ اعمال ہی زندہ ایمان کا معتبر نشان ہیں اور جن اعمال کو مسیح پسند کرتا ہے ان کا اس نے یوں بیان کیا "میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اتارا۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا تم نے میری خبر لی۔ قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔" جو لوگ ایسے عمل کرتے ہیں آسمان کی بادشاہت ایسوں ہی کی ہے (متی ۲۵: ۳۴-۳۶)۔

(۳) **مسیحی سیرت کا عام نمونہ۔** مسیحی دین نے ایسی سیرت کو نشوونما دیا جو بہت باتوں میں ایسی سیرت کے مخالف ہے جسے دنیا پسند کرتی ہے۔ غرور کی بجائے فروتنی اپنے حقوق پر زور دینے کی بجائے ظلم کو سہہ لینا۔ بلند پروازی کی بجائے قناعت

نرم مزاجی، حلم، صبر، ہمدردی، دکھوں میں خوش ہونے کی طاقت اور درد میں سے راحت کو اخذ کرنا۔ یہ انعام مسیحی دین کے ذریعہ دنیا کو عطا ہوئے ہیں۔ مسیحی دین کے تصور پر بعض اوقات یہ اعتراض کیا گیا کہ اس میں مردانگی اور ہمت کی کمی ہے۔ لیکن درحقیقت مغرور ہونے کی نسبت فروتنی ہونے کے لئے۔ دوسرے کی گال پر طمانچہ مارنے کی نسبت اپنی گال دوسرے کے آگے پھیرنے کے لئے زیادہ مردانگی کی ضرورت ہے۔ مسیحی سیرت کا دوسرا نشان سچائی و خلوص دلی ہے۔ مسیح کی تعلیم کے مطابق مسیحی آدمی کا قول ایسا ہی پختہ ہونا چاہئے جیسے اُس کی قسم۔ یہی اس قول کے معنے ہیں کہ "بالکل قسم نہ کھانا" (متی ۵: ۳۴)۔ لیکن شاید مسیحی آدمی کی سیرت کا سب سے اچھا حلیہ یہ ہے کہ وہ یک دل آدمی ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ایک قدم تو دنیا میں رکھے اور دوسرا کلیسیا میں۔ وہ خدا اور ممون دونو کی خدمت کر نہیں سکتا۔ اُس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہونا چاہئے۔ اور باقی سب کچھ اس کے ماتحت ہو۔ "تم پہلے اس کی بادشاہت اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو۔ تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائینگی" (متی ۶: ۳۳)۔

(۴) **مسیح اور دولت۔** مسیح نے دولت کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ سب سے بڑا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ دنیا لوگوں کو اپنی غلامی میں جکڑ بند رکھتی ہے۔ اس لئے دولت سے آزاد ہونا مسیحی ہونے کے لئے ایک ضروری ابتدائی قدم تھا۔ بعض صورتوں میں جہاں دولت کی محبت بہت زبردست تھی اُس نے اس کے پورے طور سے ترک کرنے کا حکم دیا (متی ۱۹: ۲۱)۔ دولت سے ایسی علیحدگی کے ذریعہ اندرونی اطمینان اور عدم تشویش پیدا ہوتی ہیں۔ "اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے" (متی ۶: ۲۵)۔ اگرچہ مسیح نے اپنے شاگردوں کو دولت کے خطرے سے آگاہ کیا اور انہیں نصیحت کی کہ فیاضی سے خیرات دیں تو بھی اس رائے کی کوئی بنیاد نہیں کہ مال و اسباب کی شراکت مسیحی سوسائٹی کا لازمی نشان تھا۔ اس لئے

مسیحیوں نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ دولت کو ترک کرنا کمال کی ایک ہدایت تھی نہ کہ حکم۔ (متی ۱۹: ۲۱)۔

(۵)۔ آئندہ زندگی۔ مسیح کی اخلاقی تعلیم اس خیال پر مبنی ہے کہ یہ زندگی مابعد زندگی کے لئے تیاری کا زمانہ ہے۔ اس نے اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت دی کہ اس زندگی میں اجر کے متلاشی نہ ہوں۔ بلکہ اگلی زندگی میں جہاں اس دنیا کی ساری بے اعتدالیوں کا علاج ہو جائے گا اور سارے غم والم پوری خوشی سے مبدل ہو جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مسیحی شخص کو اس دنیا میں مطلق کچھ اجر نہ ملے گا۔ مسیح کے وسیلے خدا کے ساتھ شراکت رکھنا بذات خود ایک بے بیان خوشی ہے اور اسے ابدی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا پورا پھل اُس وقت تک ظاہر نہ ہوگا جب تک کہ ساری چیزوں کا آخری کمال نہ ہو۔ مبارک بقا کے اس یقین کے ذریعہ مسیحی کے لئے دنیا کی صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ درد۔ غم۔ بے انصافی مسیحی شخص کو پاک صاف کرنے کا وسیلہ ہو جاتے ہیں جس کے ذریعہ خدا اس کی روح کو ابدیت کے لئے تیار کرتا ہے۔ درد کی شکل بدل جاتی ہے اور حلم کے ذریعہ بے انصافی کی برداشت کی جاتی ہے۔

(۶) موت۔ موت اور آئندہ جہان کا ذکر کرنے میں ایک حد تک مسیح نے اپنے کلام کو اپنے سامعین کی سمجھ کے مطابق پیش کیا۔ اس لئے یہ خطرے سے خالی نہ ہوگا کہ اس مضمون کی طرف جو اشارہ اس نے کیا ہو خواہ وہ کیسا ہی اتفاقی ہو اُس کے لفظی معنی پر کسی رائے کا انحصار رکھیں۔ لیکن اس کی عام تقریروں سے بہت کچھ نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ موت کے وقت آدمیوں کی روحیں یک لخت آخری اجر تک نہیں پہنچ جاتیں بلکہ وہ ایسی حالت میں جاتی ہیں (جو ہادیس یا عالم ارواح کہلاتی ہے)۔ اس حالت میں وہ عدالت اور قیامت کی انتظار کرتے ہیں۔ اس حالت میں بھی گویا پیش خیمہ کے طور پر کچھ امتیاز کیا جاتا ہے۔ صادقوں کی روحوں کو اس درجہ کی خوشی حاصل ہوتی ہے

کہ ان کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فردوس میں یا ابرہام کی گود میں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ایسی حالت میں وہ پاکیزگی اور جلال میں ترقی کرتی جاتی ہیں جس کا کمال قیامت میں ہوتا ہے۔ اسی قسم کے نتیجہ سے مُردوں کے لئے دعا مانگنے کا دستور شروع ہوا۔ اور یہ دستور یہودی کلیسیا میں ہمارے خداوند کے زمانہ سے پیشتر رواج پکڑ گیا تھا (دیکھو ۲ مکابی ۱۲: ۴۳ سے ۴۵)۔ اور ابتدائی مسیحیوں میں بھی مسیحی کلیسیا کی عبادت میں یہ داخل ہوا (مقابلہ ۲ تمتھیس ۱: ۱۶ سے ۱۸ + ۴: ۱۹)۔ برعکس اس کے شریروں کی روحیں غم کی حالت میں رہتی ہیں جو ان کے آئندہ عذاب کا بیعانہ ہے (لوقا ۱۶: ۲۳)۔ یہ تو پورے طور سے منکشف نہیں ہوا کہ ان دُکھوں کے ذریعہ ان لوگوں کی اصلاح ہو جاتی ہے جو گناہ میں مطلقاً سخت نہیں ہوئے لیکن ایک طرح سے یہ ایک دیندارانہ امید کے طور پر مانا گیا۔ ابتدائی کلیسیا اسے مانتی تھی اور اب بھی بہت مسیحی مانتے ہیں کہ غیر قوموں میں سے جو لوگ مسیح کے علم بغیر مر جاتے ہیں اُن کو دوسرے جہان میں موقعہ دیا جاتا ہے کہ مسیحی تعلیم حاصل کریں یا کم از کم ان کی عدالت زیادہ سختی سے نہیں ہوتی۔ مقدس پطرس کے پہلے خط میں ایک جملہ آتا ہے جس کی تفسیر اسی امید کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ اس نے یہ لکھا ہے کہ مسیح نے خود عالم ارواح میں جا کر مُردوں کو انجیل سنائی (۳: ۱۹ + ۴: ۶)۔

(۷) قیامت۔ آخری دن مسیح اپنی قدرت سے راستوں اور ناراستوں دونو کو مُردوں میں سے زندہ کرے گا (یوحنا ۵: ۲۹)۔ جو بدن قیامت میں ملے گا گو جسمانی طور پر وہ موجودہ بدن کی مانند نہ ہوگا تو بھی کسی نہ کسی صورت سے اسی کا تواتر ہوگا۔ یہ ذوالجلال اور روحانی بدن ہوگا جو زمینی زندگی کے لئے موزوں نہ ہوگا بلکہ نئی اور اعلےٰ زندگی کے لئے (متی ۲۲: ۳۰)۔ عدالت میں مسیح حاکم عادل کے طور پر بیٹھے گا کیونکہ وہ ابن آدم ہے (یوحنا ۵: ۲۷)۔ اور ابدی جلال یا ابدی عذاب کا فتویٰ دیوے گا (متی ۲۵: ۴۶)۔

(۸)۔ ابدی سزا۔ گزشتہ سالوں میں آئندہ سزا کے مروجہ خیالوں میں بہت تغیر ہو

تبدل پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ خدا کی سیرت کی نسبت زیادہ علم حاصل ہو گیا ہے اور لفظ ہادیس اور جہنم کے بارہ میں زیادہ امتیاز ظاہر ہو گیا ہے خاصکر نئے عہد نامہ کے نئے ترجمہ کے ذریعہ۔ اس لئے ایسے شخصوں کے آخری انجام کی نسبت کچھ امید پیدا ہو گئی ہے جو اپنی موت کے وقت فضل کی حالت میں نہ تھے۔ تو بھی ابدی سزا کا مسئلہ (گو اس میں بعض باتوں کو ہم چھوڑ سکتے ہیں) اب بھی بہت لوگ مانتے ہیں اور کم سے کم اس کا امکان تو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خداوند نے خود یہ تعلیم سکھائی (متی ۲۵: ۴۶ مرقس ۹: ۴۴، ۴۸ وغیرہ)۔ اور جنہوں نے اس مسئلہ کو انجیل سے خارج کرنے اور تشریحوں کے ذریعہ اس کو معدوم کرنے کی کوشش کی وہ ناکامیاب رہے ہے۔ جو روح کی بقا اور آزاد مرضی کی عام مسلمہ صداقتوں کا یہ تقریباً لازمی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر نیک و بد کے چھٹنے میں روح آزاد ہے اور وہ مر بھی نہیں سکتی تو یہ لازمی نتیجہ ہے کہ جو روح بدی کو اپنی ذات کا مستقل جزو بنالے وہ مستقل طور سے ہمیشہ کے لئے خدا کی حضوری سے خارج کی جائے۔ ابدی سزا کی یہی حقیقت ہے۔ یہ تو درست نہیں کہ محض انتقام کے طور پر خدا خواہ مخواہ کسی کو ابدی سزا دیتا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں کا انسان کی معلومہ ذات اور خدا کی معلومہ ذات کا یہ ایک طبعی نتیجہ ہے۔ خدا اگر چاہے بھی تو وہ کسی کو زبردستی نیک نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ نیکی کی عین اصلیت یہی ہے کہ وہ آزاد مرضی سے پیدا ہو۔ اگر کوئی شخص دانستہ بدی کو قبول کرتا اور مستقل طور پر اس سے شراکت رکھتا ہے تو خدا بھی اسے بچا نہیں سکتا۔ اس کی نسبت تو کچھ منکشف نہیں ہوا کہ یہ ابدی سزا کیسی ہوگی۔ سوائے اس امر کے کہ جس درجہ تک کوئی بدی کا مرتکب ہوا اسی کے مطابق اس کی سزا ہوگی (لوقا ۱۲: ۴۷، ۴۸)۔ یہ ممکن ہے کہ اس سزا کا یہ لازمی جزو ہو کہ فرشتوں اور انسانوں دونوں میں آزاد مرضی معدوم ہو جائے۔ اگر یہ رائے درست ہو تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ اخلاقی بدی بھی آخرکار معدوم ہو جائے گی۔

(۹)۔ **ابدی خوشی**۔ صادقوں کے آخری اجر کی حقیقت کے بارہ میں جو کچھ

نسبت صاف طور سے بیان ہوا ہے کہ وہ ابدی ہوگا (متی ۲۵: ۴۶)۔ ہم صرف عام طور پر بیان کر سکتے ہیں جن الفاظ میں مسیح نے اس کا بیان کیا وہ ہمیشہ استعارہ کے طور پر ہے (متی ۸: ۱۱، ۲۵: ۱۰ وغیرہ)۔ تو بھی یہ پتہ لگتا ہے کہ اس خوشی کے بھی درجے ہونگے (یوحنا ۱۴: ۲)۔ بلکہ آسمان میں اختیار کے بھی درجے ہونگے (لوقا ۱۹: ۱۷)۔ بعضوں نے یہ بھی خیال کیا کہ آسمان منفعل دھیان کی یا مجذوبانہ عبادت کی حالت ہوگی۔ لیکن یہ زیادہ اغلب ہے کہ دھیان کے ساتھ ہر ایک کی قابلیت کے مطابق کام بھی ہوگا۔ (لوقا ۱۹: ۱۷ و ۱۹)۔ مسیح نے یہ تعلیم دی کہ سعادتمندوں کی آیندہ زندگی ایک تبدیل شدہ اور ذوالجلال جہان میں بسر ہوگی (متی ۱۹: ۲۸)۔ یہ خیال بدن کی قیامت کے عقیدہ کے عین مطابق ہے۔ نئے عہد نامہ میں آسمان ایک سوسائٹی یا ایک شہر سمجھا گیا ہے۔ یہاں کے باشندوں کی خوشی نہ صرف خدا کے دھیان عبادت اور محبت میں ہے (گو یہ ان کی اعلیٰ خوشی ہے) بلکہ اس پُر محبت شراکت میں جو اُن کو ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہے۔ آسمان ایک کامل سوسائٹی ہے جس کی بنیاد کامل محبت ہے۔ خدا کی محبت اور خدا کی ساری مخلوقات سے محبت۔

(۱۰) **مسیح کی دیگر تعلیم**۔ اس فصل میں مسیح کی تعلیم کے ایک بڑے حصے کو بالکل چھوڑ دیا ہے کیونکہ جو کچھ دوسری جگہ بیان ہوا وہ اس کے تتمہ کے طور پر ہے۔ ابن خدا کے لقب کی تشریح جو اس نے اپنی پیشی کے وقت استعمال کیا مضمون بعنوان یسوع مسیح کی شخصیت میں ہوئی ہے۔ اور ابن آدم کے لقب کی تشریح جو اس نے عموماً اپنے لئے استعمال کیا متی ۸: ۲۰ کی شرح میں آئی ہے۔ خدا کی بادشاہت یا آسمان کی بادشاہت کا محاورہ مسیح نے بہت استعمال کیا۔ اس کی تشریح مقدس متی کے دیباچہ میں کی گئی ہے اور نیز پہاڑی وعظ کی شرح میں (متی ۵ باب)۔ مسیح نے جو تعلیم اپنی موت کے بارہ میں دی جسے اس نے جہان کے گناہوں کے لئے کفارہ سمجھا۔ اور جس کے ذریعہ اس نے خدا اور نوع انسان

کے درمیان نیا عہد قایم کیا۔ دیکھو متی ۲۰: ۲۸ + ۲۶: ۲۸ + اور مضمون بعنوان "کفارہ" توریت اور عہدِ عتیق کے بارہ میں جو اُس نے تعلیم دی اُس کے لئے دیکھو متی ۵: ۱۷ سے ۱۹ + ۲۲: ۳۷ سے ۴۰ + لوقا ۱۶: ۱۶ و ۱۷ + ۲۴: ۴۴ + ۲۶ + ۵۳ + یوحنا ۵: ۳۹ و ۴۰ و ۴۵ سے ۴۷ + دعائے عام اور خلوتی دعا کے لئے دیکھو متی ۶: ۵ سے ۱۵ و ۷: ۷ سے ۱۱ + لوقا ۱۱: ۵ سے ۸ + ۱۸: ۱ سے ۸ و ۹ سے ۱۴ + یوحنا ۱۴: ۱۳ و ۱۴ + ۱۶: ۲۳ و ۲۴ متی ۲۱: ۱۳ و ۲۳: ۲۲ + ۲۴: ۲۰ + یوحنا ۴: ۲۱ و ۲۴ + سبت کے لئے دیکھو متی ۱۲: ۱ سے ۱۳ + مرقس ۳ و ۴ + یوحنا ۷: ۲۱ سے ۲۴ + لوقا ۱۳: ۱۵ و ۱۶ + روزہ کے لئے دیکھو متی ۶: ۱۶ سے ۱۸ + ۹: ۱۵ + خیرات کے لئے دیکھو متی ۶: ۲ سے ۴ + ۱۹: ۲۱ سے ۲۳ + ۲۵: ۳۱ سے ۴۶ + لوقا ۱۲: ۳۳ و ۳۴ + ۱۴: ۱۲ سے ۱۴ + ۱۹: ۸ + ۲۱: ۱ سے ۴ + ۱۰: ۳۰ سے ۳۷ + ۱۲: ۳۳ و ۳۴ + ۱۶: ۹ + توبہ کے لئے دیکھو متی ۴: ۱۷ + ۲۱: ۲۸ سے ۳۲ + لوقا ۵: ۳۱ و ۳۲ + ۱۳: ۱ سے ۵ + ۱۵: ۱۰ و ۱۷ سے ۲۰ + ۱۶: ۳۰ و ۳۱ + ۲۴: ۴۶ و ۴۷ + شکرگزاری کے لئے دیکھو لوقا ۷: ۴۰ سے ۴۷ + ۸: ۳۹ + ۱۷: ۱۶ و ۱۸ + ریاکاری کے لئے دیکھو متی ۲۳ + شادی کے لئے متی ۵: ۲۷ سے ۳۲ + ۱۹: ۳ سے ۱۲ + کلیسیا اور سلطنت کے لئے متی ۲۲: ۲۱ + کم اعتقادی کے لئے متی ۱۴: ۳۱ + ۱۷: ۱۷ سے ۲۰ + یوحنا ۳: ۱۸ و ۱۹ + ۴: ۴۸ + ۸: ۲۴ + ۱۵: ۲۲ سے ۲۴ + روح القدس کے کام کے لئے یوحنا ۳: ۳ + ۱۴: ۱۶ سے ۱۸ و ۲۶ + ۱۵: ۲۶ + ۱۶: ۷ سے ۱۴ + شیطان اور بدروحوں کے لئے دیکھو متی ۴: ۲۵ کی شرح + شرعی کام کے لئے متی ۲۸: ۱۸ سے ۲۰ + لوقا ۲۴: ۴۶ سے ۴۹ + کلیسیا کے لئے متی ۱۶: ۱۸ + ۱۸: ۱۷ + ساکرامنٹوں کے لئے متی ۲۶: ۲۶ سے ۲۹ + ۲۸: ۱۹ + یوحنا ۳: ۵ + ۶: ۳۱ +

سناپٹک مسئلہ

سناپٹک (پہلی تین اناجیل) اناجیل کے متعلق سب سے بڑا اور مشکل سوال یہ ہے کہ اُن کا باہمی رشتہ کیا ہے اور کن چشموں سے وہ لی گئیں۔ اگرچہ ایک صدی سے زیادہ اس کی تحقیقات میں صرف ہو چکا ہے لیکن اب تک کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکلا لیکن مفصلہ ذیل امور کے بارہ میں بہت کچھ اتفاق رائے ہے:-

(۱) مقدس مرقس کی انجیل سناپٹک اناجیل میں سب سے پرانی ہے اور مقدس متی اور لوقا نے اُسے استعمال کیا اور اس انجیل کے ایک بڑے حصہ کو اپنی اناجیل میں بہت کم تبدیلیوں کے ساتھ مندرج کیا۔

اس کی شہادت بہت ہی مضبوط ہے۔ اول تو مقدس مرقس کی ساری انجیل تیس یا چالیس غیر ضروری آیات کے سوا مقدس متی یا لوقا کی انجیل میں پائی جاتی اور اس کا ایک بڑا حصہ دونوں میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ مقدس متی اور مقدس لوقا کی اناجیل کے بڑے حصے اور وہ بھی بڑے ضروری حصے خود اُنہیں انجیل نویسوں سے مخصوص ہیں۔ اس لئے اگر کہیں سے عاریت لی گئی تو وہ مقدس مرقس کی انجیل سے ہوگی۔ دیگر رائے تحقیقات کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں۔ مقدس مرقس نے مقدس متی سے نقل نہیں کی ورنہ وہ مسیح کی پیدایش کا حال۔ پہاڑی وعظ اور ایسی تمثیلوں کو نظر انداز نہ کرتا۔ مثلاً بے رحم قرضدار کی۔ تاکستان میں مزدوروں کی۔ دس کنواریوں کی۔ توڑوں کی اور بھیڑوں اور بکریوں کی تمثیلیں۔ مقدس متی نے مقدس لوقا سے نقل نہیں کی ورنہ وہ نیک سامری۔ نادان دولتمند۔ دولتمند اور لعزر اور مسرف بیٹے کی تمثیلوں کو نہ چھوڑ دیتا۔ اور مقدس لوقا نے مقدس متی سے نقل نہ کی ہوگی ورنہ وہ اُن مشہور تمثیلوں کو نظر انداز نہ کرتا

جن کا ذکر ہو چکا ہے +

ہم اب یہ ثابت کریں گے کہ فی الحقیقت نقل ہو کی گئی۔ ایسا کرنے کے لئے ہم چند مقامات کو ہر ایک سے نقل کر کے ان کی تشریح کریں گے +

مرقس ۱۳: ۱۴	متی ۲۴: ۱۵ و ۱۶
پس جب تم اس اجاڑنے والی مکروہ چیز کو اس جگہ کھڑا ہوا دیکھو جہاں اس کا کھڑا ہونا روا نہیں (پڑھنے والا سمجھ لے) اس وقت جو یہودیہ میں ہوں وہ پہاڑوں پر بھاگ جائیں +	پس جب تم اس اجاڑنے والی مکروہ چیز کو جس کا ذکر دانیال نبی کی معرفت ہوا ہے مقدس مقام میں کھڑا ہوا دیکھو (پڑھنے والا سمجھ لے) تو جو یہودیہ میں ہوں وہ پہاڑوں پر بھاگ جائیں +

یہاں مؤلف کتاب کی شرح ہے (یعنی پڑھنے والا سمجھ لے) اور دونو اناجیل میں لفظ بہ لفظ مطابق ہے اور ہمارے خداوند کی تقریر کے عین اسی حصہ میں یہ جملہ آتا ہے۔ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ دونو انجیل نویسوں نے اتفاق سے ایک ہی الفاظ استعمال کئے اور ایک ہی مقام میں ان کو ڈالا۔ اس لئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ ضرور ایک نے دوسرے سے نقل کیا +

مرقس ۶: ۱۶ و ۱۷	متی ۱۴: ۱ سے ۳
مگر ہیرودیس نے سن کر کہا کہ یوحنا جس کا سر میں نے کٹوا دیا وہی جی اٹھا ہے۔ کیونکہ ہیرودیس نے آپ آدمی بھیجکر یوحنا کو پکڑوایا اور اپنے بھائی فلپس کی بیوی ۔ ۔ ۔ قید خانے میں باندھ رکھا +	اس وقت چوتھائی ملک کے حاکم ہیرودیس نے یسوع کی شہرت سنی اور اپنے خادموں سے کہا کہ یہ یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے وہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے۔ اس لئے اس سے یہ معجزے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ہیرودیس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سبب یوحنا کو پکڑ کر باندھا۔

یہاں تاریخ کے ایک ہی موقعہ پر یوحنا بپتسمہ دینے والے کی موت کا ذکر دونو انجیل نویسوں نے کیا ہے لیکن تاریخی سلسلہ سے علیحدہ کر کے۔ اس کی وجہ نقل کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے +

مرقس ۱: ۱۶	متی ۴: ۱۸
اور گلیل کی جھیل کے کنارے کنارے جاتے ہوئے اس نے شمعون اور شمعون کے بھائی اندریاس کو جھیل میں جال ڈالتے دیکھا کیونکہ وہ مچھلیوں کے پکڑنے والے تھے +	اس نے گلیل کی جھیل کے کنارے پھرتے ہوئے دو بھائیوں یعنی شمعون کو جو پطرس کہلاتا ہے اور اس کے بھائی اندریاس کو جھیل میں جال ڈالتے دیکھا کیونکہ وہ مچھلیوں کے پکڑنے والے تھے +

اس شرح پر بھی غور کرو (کہ وہ مچھلیوں کے پکڑنے والے تھے) جو دونوں انجیل نویسوں نے لکھی ہے یہ قیاس میں نہیں آسکتا کہ دونو انجیل نویسوں کو اتفاق سے یہ خیال آگیا کہ ایک ہی الفاظ ایک ہی موقعہ پر درج کر دیں +

مرقس ۳: ۱۹	متی ۱۰: ۴	لوقا ۶: ۱۶
اور یہوداہ اسکریوتی جس نے اسے پکڑوا بھی دیا	یہوداہ اسکریوتی جس نے اسے پکڑوا بھی دیا۔	یہوداہ اسکریوتی جو اس کا پکڑوانے والا ہوا

یہ اتفاقی امر نہیں کہ تینوں انجیل نویس ایک ہی موقعہ پر یہوداہ کو پکڑوانے والا کہیں بلکہ یسوع کے پکڑے جانے کے وقت تینوں انجیل نویس بڑی خبرداری سے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ یہوداہ اسکریوطی بارہوں میں سے تھا (مرقس ۱۴: ۱۰ + متی ۲۶: ۱۴ + لوقا ۲۲: ۳) +

مرقس ۵: ۲۴	متی ۹: ۱۹	لوقا ۸: ۴۲
پس وہ اس کے ساتھ چلا	یسوع اٹھ کر اپنے شاگردوں	جب وہ جا رہا تھا تو لوگ

اور بہت لوگ اس کے پیچھے ہو لئے اور اس پر گرے پڑتے تھے۔ پھر ایک عورت جس کے بارہ برس سے خون جاری تھا اور اس نے بہت حکیموں سے بڑی تکلیف اٹھائی تھی۔	سمیت اس کے پیچھے ہو لیا اور دیکھو ایک عورت نے جس کے بارہ برس سے خون جاری تھا۔	اُس پر گرے پڑتے تھے اور ایک عورت نے جس کے بارہ برس سے خون جاری تھا۔

اس پر لحاظ کرو کہ کس طرح سے تینوں انجیل نویس جائرس کی بیٹی کے قصہ کو ایک ہی موقعہ پر آن کر چھوڑ دیتے ہیں اور اس عورت کا قصہ درج کرتے ہیں جسے خون جاری تھا اور یہ بھی تینوں کا اتفاق ہے کہ وہ بارہ برس سے بیمار تھی ٭

مرقس ۱: ۳۲	متی ۸: ۱۶	لوقا ۴: ۴۰
شام کو جب سورج ڈوب گیا تو لوگ سارے بیماروں کو اور اُن کو جن میں بدروحیں تھیں اس کے پاس لائے۔	جب شام ہوئی تو اس کے پاس بہت سے لوگوں کو لائے جن میں بدروحیں تھیں۔	سورج کے ڈوبتے وقت وہ سب جن کے ہاں طرح طرح کی بیماریوں کے مریض تھے انہیں اُس کے پاس لائے

یہاں صاف اشارہ ہے کہ مرقس کی ہی انجیل سے باقی دو نے نقل کیا کیونکہ دن کے خاتمہ کے بارہ میں جو دو محاورے مقدس مرقس نے استعمال کئے (شام اور سورج کا ڈوبنا) اُن میں سے ایک تو متی نے نقل کیا اور دوسرا مقدس لوقا نے۔ انجیل کی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔ عام واقعات کے بیان میں مقدس مرقس کا بیان عموماً زیادہ طویل اور زیادہ مفصل ہے اور اُس تفصیل میں سے کچھ تو مقدس متی نے لیا اور کچھ مقدس لوقا نے۔ لیکن پوری تفصیل ان دونوں میں سے کسی میں نہیں ٭

دیگر وجوہات سے بھی مقدس مرقس کی انجیل کا تقدم ثابت ہوتا ہے (۱) مرقس

نے جو سلسلہ واقعات کا دیا ہے اس کی تائید یا تو متی کی انجیل سے ہو جاتی ہے یا لوقا کی انجیل سے۔ حالانکہ جن امور میں مقدس متی نے مقدس مرقس سے تجاوز کیا ہے اُس کی تائید لوقا نہیں کرتا۔ نہ مقدس لوقا کی مقدس متی کرتا ہے ٭

(۲) مقدس متی اور مقدس لوقا نے جن واقعات کا بیان کیا جو مقدس مرقس میں بھی پائے جاتے ہیں ان میں بہت مشابہت ہے۔ مسیح کی پیدائش کے بیان میں کوئی مشابہت نہیں اور پہاڑی وعظ کے بیان میں دونوں میں بڑا فرق ہے ٭

(۲) مقدس مرقس کی انجیل کا ترجمہ جیسے مقدس متی اور مقدس لوقا نے استعمال کیا وہ غالباً موجودہ یونانی انجیل تھی۔ مدت تک تو یہی رائے رہی کہ تینوں اناجیل کی مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصلی مرقس کی انجیل سے لی گئیں لیکن حال کی تحقیقات نے یہ بخوبی ثابت کر دیا کہ وہ اصلی مرقس کی انجیل موجودہ مرقس کی انجیل سے ایسی مشابہ تھی کہ ہم آسانی سے یہ فرض کر سکتے ہیں کہ وہ دونو ایک ہی تھیں اور یہی رائے آجکل مسلمہ ہے ٭

(۳)۔ غالباً زبانی روایت نے بھی ان سناپٹک انجیلوں کی تصنیف میں بہت اثر کیا خاص کر پہلی اور تیسری انجیل کی تصنیف میں۔ لیکن مشابہتیں ایسی گہری ہیں کہ ہم یہ مان نہیں سکتے کہ ان کا چشمہ محض ایک زبانی روایت تھی یہ اصلی مرقس کی انجیل یقیناً تحریری تھی۔ کیونکہ مصنف ایک مقام میں اپنے ناظرین سے مخاطب ہوتا ہے (مرقس ۱۳: ۱۴، متی ۲۴: ۱۵ ٭ دیکھو مذکورہ بالا) اور مقدس لوقا نے کئی ایک تحریری چشموں کا ذکر کیا ہے

(۴) مقدس متی اور لوقا کے جو بیان مقدس مرقس میں پائے نہیں جاتے ان کے چشمے کے بارہ میں علما میں بہت اختلاف ہے۔ ان چشموں میں مفصلہ ذیل داخل ہو سکتے ہیں۔ (۱) زبانی روایت (۲) مقدس لوقا کی انجیل کے لحاظ سے یہ مقدس لوقا کی شخصی تحقیقات ہوگی۔ اور فلسطین میں جو معلومات اُسے حاصل ہوئے (۳) دیگر تحریریں جو پہلے لکھی جا چکی تھیں لیکن وہ مکمل صورت میں نہ تھیں گو تعداد میں بہت تھیں (لوقا ۱: ۱)۔ (۴) ایک بہت

قدیم مصنف پے پیان نامی ۱۳۰ء میں گزرا ہے اُس نے بیان کیا کہ مقدس متی نے الٰہی کلمات عبرانی (یا آرامی) زبان میں لکھے "الٰہی کلمات" کے لئے جو لفظ اُس نے استعمال کیا اُس کے معنی کچھ مشتبہ ہیں لیکن آجکل کے علماء کی یہ رائے ہے کہ مقدس متی کے عبرانی "کلمات" (گویا) ہمارے خداوند کی تقریروں کا مجموعہ ہوگا نہ کوئی تاریخی بیان۔ مقدس متی کے "کلمات" یونانی ترجمہ میں غالباً پہلی انجیل کے مصنف نے استعمال کی اور شاید ساری کی ساری وہ کتاب اس انجیل میں مندرج ہوئی اور شاید اسی وجہ سے اس انجیل کا یہ نام پڑ گیا "مقدس متی کے مطابق انجیل"۔ البتہ یہ تو مشکل سوال ہے کہ آیا اس "کلمات" کو مقدس لوقا نے استعمال کیا اور اگر استعمال کیا تو کہاں تک؟ مقدس متی اور مقدس لوقا کی انجیلوں میں تقریباً دو سو آیات ہیں جو صرف ان ہی میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان آیتوں میں مقدس لوقا مقدس متی سے اس قدر متفرق ہے کہ یہ ماننا مشکل ہے کہ اُس نے ایک مشترکہ تحریر کو استعمال کیا۔ مفصلہ ذیل مقامات کا مقابلہ کرنے سے ناظرین خود اپنے لئے فیصلہ کر سکیں گے:-

متی	لوقا	
۷:۳ سے ۱۰و۱۲	۷:۳ سے ۹و۱۷	یوحنا کی منادی
۳:۴ سے ۱۱	۳:۴ سے ۱۳	آزمائش
۱:۵ سے ۶و۱۰ سے ۱۲	۲۰:۶ سے ۲۳	پہاڑی وعظ
۱۳:۵	۳۴:۱۴و۳۵	″
۱۸:۵	۱۷:۱۶	″
۲۵:۵و۲۶	۵۷:۱۲ سے ۵۹	″
۳۸:۵ سے ۴۸	۲۷:۶ سے ۳۰و۳۲ سے ۳۶	″
۳:۶و۴	۱۳:۱۴و۱۴	″

متی	لوقا	
۹:۶ سے ۱۳	۱:۱۱ سے ۴	پہاڑی وعظ
۱۹:۶ سے ۲۱	۳۳:۱۲ سے ۳۴	″
۲۲:۶ سے ۲۳	۳۴:۱۱ سے ۳۶	″
۲۴:۶	۱۳:۱۶	″
۲۵:۶ سے ۳۴	۲۲:۱۲ سے ۳۲	″
۱:۷و۲	۳۷:۶ سے ۳۸	″
۳:۷ سے ۵	۴۱:۶و۴۲	″
۷:۷ سے ۱۱	۹:۱۱ سے ۱۳	″
۱۲:۷	۳۱:۶	″
۱۳:۷و۱۴	۲۳:۱۳و۲۴	″
۱۵:۷ سے ۲۰ ۳۳:۱۲ سے ۳۷	۴۳:۶ سے ۴۵	″
۲۱:۷	۴۶:۶	″
۲۲:۷و۲۳	۲۵:۱۳ سے ۲۷	″
۲۴:۷ سے ۲۷	۴۷:۶ سے ۴۹	″
۵:۸ سے ۱۳	۱:۷ سے ۳و۶ سے ۱۰ ۲۸:۱۳و۲۹	″
۱۹:۸و۲۰	۵۷:۹و۵۸	لومڑیوں کے لئے ماندیں
۲۱:۸و۲۲	۵۹:۹و۶۰	مُردوں کو اپنے مُردے گاڑنے دو
۳۲:۹ سے ۳۴ ۲۲:۱۲ سے ۲۴	۱۴:۱۱و۱۵	گونگی بہری بدروح

متی	لوقا	
۹:۳۶ سے ۳۸	۱۰:۲	فصل درحقیقت بہت ہے
۱۰:۵ سے ۱۵	۱۰:۱ سے ۱۲	بارہوں اور ستروں کی رسالت
۱۰:۲۴ سے ۳۳	۶:۴۰ } ۱۲:۲ سے ۹ }	"
۱۰:۳۴ سے ۳۶	۱۲:۵۱ سے ۵۳	"
۱۰:۳۷ و ۳۸	۱۴:۲۶ و ۲۷	"
۱۰:۳۹	۱۷:۳۳	"
۱۰:۴۰ و ۴۱	۱۰:۱۶	"
۱۱:۱ سے ۶	۷:۱۸ سے ۲۳	یوحنا نے اپنے شاگردوں کو بھیجا
۱۱:۷ سے ۱۱	۷:۲۴ سے ۲۸	مسیح کی رائے یوحنا کے بارہ میں
۱۱:۱۲ سے ۱۴	۷:۳۱ سے ۳۵	"
۱۱:۲۰ سے ۲۴	۱۰:۱۲ سے ۱۵	اے کرازین تجھ پر افسوس
۱۱:۲۵ سے ۲۷	۱۰:۲۱ و ۲۲	اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں
۱۲:۹ سے ۱۴	۱۴:۱ سے ۶	"
۱۲:۲۷ و ۲۸ و ۳۰	۱۱:۱۹ و ۲۰ و ۲۳	بعلزبوب
۱۲:۳۸ سے ۴۲	۱۱:۲۹ سے ۳۲	یونہ کا نشان
۱۲:۴۳ سے ۴۵	۱۱:۲۴ سے ۲۶	گھر جو جھاڑا اور صاف ہوا
۱۳:۱۶ و ۱۷	۱۰:۲۳ و ۲۴	تمہاری آنکھیں مبارک ہیں
۱۳:۳۳	۱۳:۲۰ و ۲۱	خمیر کی تمثیل
۱۵:۱۴	۶:۳۹	اندھوں کے اندھے رہنما

متی	لوقا	
۱۶:۲ و ۳	۱۲:۵۴ سے ۵۶	تم آسمان کو پہچان سکتے ہو
۱۷:۱۹ و ۲۰	۱۷:۵ و ۶	ایمان رائی کے دانہ کے برابر
۱۸:۷	۱۷:۱	ٹھوکروں کے سبب دنیا پر افسوس
۱۸:۱۲ سے ۱۴	۱۵:۳ سے ۷	کھوئی ہوئی بھیڑ
۱۸:۱۵ و ۲۱ و ۲۲	۱۷:۳ و ۴	اگر تیرا بھائی گناہ کرے
۱۹:۲۸	۲۲:۲۸ سے ۳۰	اسرائیل کے بارہ گھرانوں کی عدالت
۲۱:۳۱ و ۳۲	۷:۲۹ و ۳۰	؟
۲۱:۴۴	۲۰:۱۸	جو کوئی اس پتھر پر گرے
۲۲:۱ سے ۱۰	۱۴:۱۵ سے ۲۴	؟
۲۳:۴ سے ۸ و ۱۲ و ۱۳	۱۱:۴۳ و ۴۵ و ۴۶ و ۵۲ } ۱۴:۱۱ }	فقیہوں اور فریسیوں پر افسوس
۲۳:۲۳ سے ۳۳	۱۱:۳۷ سے ۴۴ و ۴۷ و ۴۸	"
۲۳:۳۴ سے ۳۶	۱۱:۴۹ سے ۵۱	"
۲۳:۳۷ سے ۳۹	۱۳:۳۴ و ۳۵	یروشلیم یروشلیم تو جو نبیوں کو مار ڈالتی ہے
۲۴:۲۶ سے ۲۸	۱۷:۲۳ و ۲۴ و ۳۷	دوسری آمد کے بارہ میں اقوال
۲۴:۳۷ سے ۳۹	۱۷:۲۶ و ۲۷	"
۲۴:۴۰ و ۴۱	۱۷:۳۴ و ۳۶	"
۲۴:۴۳ سے ۵۱	۱۲:۳۹ سے ۴۶	"
۲۵:۱۴ سے ۳۰	۱۹:۱۱ سے ۲۸	توڑوں اور منا کی تمثیل

یہ بھی یاد رہے کہ عام مضمون زیادہ تر (گو کلیۃً طور پر نہیں) اقوال اور تقریروں

کی صورت میں ہے اور ان دونوں اناجیل میں ان کی ترتیب اور سلسلہ بہت مختلف ہے۔ ترتیب اور سلسلہ کا یہ اختلاف جو بکثرت پایا جاتا ہے اس رائے پر حقیقی اعتراض ہے کہ پہلی اور تیسری اناجیل کے مصنفوں نے "لوگیا" کو کم از کم عام مشترک چشمہ کے طور پر استعمال کیا۔ جب کہ وہ مقدس مرقس کی انجیل سے نقل کرتے ہیں تو عموماً نہ صرف اس کے الفاظ استعمال کرتے ہیں بلکہ اس کے سلسلے اور ترتیب کو بھی لیکن جب وہ "لوگیا" سے (بقول بعض) نقل کرتے ہیں وہ الفاظ کو بھی اپنی مرضی کے مطابق آدلتے بدلتے ہیں اور ترتیب و قرینہ کا تو کچھ خیال ہی نہیں کرتے یا اس سے بہت اختلاف کرتے ہیں اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ مقدس متی کی عادت یہ تھی کہ ہمارے خداوند کے اقوال کو جمع کر کے ایک جگہ اکٹھا کر دے اور مقدس لوقا کی یہ عادت ہے کہ وہ اُن اقوال کو جدا جدا رکھے۔ پھر بھی ترتیب و قرینہ میں بہت اختلاف باقی رہتا ہے اور اس لئے اس رائے کے ماننے میں مشکل بنی رہتی ہے کہ ان سب کا ایک ہی مشترک چشمہ تھا +
یہ ماننا ایک امر طبعی ہے کہ اگر مقدس لوقا نے لوگیا کو استعمال کیا تو اس نے بہت ہی کم استعمال کیا اور دیگر صحیفوں سے اُس نے خداوند کے اقوال اخذ کئے +

ہیرودیس کا خاندان

۱۔ ہیرودیس اول (اعظم)۔ ہیرودیس کا خاندان قوم کے لحاظ سے اسرائیلی نہ تھا بلکہ آدومی تھا۔ ہیرودیس اول کے دادا انتی پے تر (انتی پاس) نے اس وقت یہودی دین قبول کیا جب یوحنا ہرقانیوس نے آدوم کو فتح کیا اس لئے ہیرودیس اول کی تربیت یہودیوں کے طور پر ہوئی۔ ۴۷ ق م میں جولیس قیصر نے اُس کے باپ کو یہودیہ کا حاکم بنایا اور اُس نے اپنے چار بیٹوں میں اپنی سلطنت تقسیم کر دی ہیرودیس کو گلیل کا علاقہ ملا جس کا انتظام اُس نے بہت سرگرمی سے کیا اور ڈاکوؤں کو بڑے زور سے قابو میں لایا۔ ۴۰ ق م میں رومی سینیٹ نے انتونی کی تحریک سے ہیرودیس کو یہودیہ کا بادشاہ بنا دیا۔ لیکن یروشلیم میں اُس کے تخت کو قیام ۳۷ ق م تک نہ ہوا۔ کیونکہ لوگ ابتک عثمانی خاندان کا دم بھرتے تھے جس خاندان نے ۱۲۶ سال تک فلسطین میں حکومت کی تھی۔ آخرکار ہیرودیس نے یروشلیم کو فتح کر لیا اور اپنی فتح کے وقت صدر مجلس کے سارے ممبروں کو سوائے دو شخصوں کے تہ تیغ کیا اور اپنے حریف بادشاہ انتی گونس کے حامیوں کو مروا ڈالا۔ انتونی نے انتی گونس کا بھی سر قلم کرا دیا۔ ہیرودیس دانا۔ دور اندیش مستقل مزاج اور روشن ضمیر بادشاہ تھا۔ یہودی تنگ دلی اور تعصب سے وہ مبرا تھا اور رومیوں اور یونانیوں کی شائستگی اور علم کو سیکھنے کی طرف مائل تھا۔ برعکس اس کے۔ وہ متلون مزاج۔ ظالم۔ خود غرض اور بے رحم تھا۔ اپنی زندگی کے آخر میں جب وہ ایک دردناک بیماری میں مبتلا ہوا تو اس میں خون ریزی کا شوق دیوانگی تک پہنچ گیا۔ جو اُس کے ظلم کا شکار ہوئے وہ اس کی محبوب بیوی مریمنی۔ اس کا بھائی ارستوبولس اور اس کا دادا ہرقانیوس اور

کی صورت میں ہے اور ان دونوں اناجیل میں ان کی ترتیب اور سلسلہ بہت مختلف ہے۔ ترتیب اور سلسلہ کا یہ اختلاف جو بکثرت پایا جاتا ہے اس رائے پر تحقیقی اعتراض ہے کہ پہلی اور تیسری اناجیل کے مصنفوں نے "لوگیا" کو کم از کم عام مشترک چشمہ کے طور پر استعمال کیا۔ جب کہ وہ مقدس مرقس کی انجیل سے نقل کرتے ہیں تو عموماً نہ صرف اس کے الفاظ استعمال کرتے ہیں بلکہ اس کے سلسلے اور قرینے کو بھی۔ لیکن جب وہ "لوگیا" (بقول بعض) نقل کرتے ہیں وہ الفاظ کو بھی اپنی مرضی کے مطابق آدتے بدلتے ہیں اور ترتیب و قرینہ کا تو کچھ خیال ہی نہیں کرتے یا اس سے بہت اختلاف کرتے ہیں۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ مقدس متی کی عادت یہ تھی کہ ہمارے خداوند کے اقوال کو جمع کر کے ایک جگہ اکٹھا کر دے اور مقدس لوقا کی یہ عادت ہے کہ وہ اُن اقوال کو جدا جدا رکھے۔ پھر بھی ترتیب و قرینہ میں بہت اختلاف باقی رہتا ہے اور اس لئے اس رائے کے ماننے میں مشکل بنی رہتی ہے کہ ان سب کا ایک ہی مشترکہ چشمہ تھا۔

یہ ماننا ایک امر طبعی ہے کہ اگر مقدس لوقا نے لوگیا کو استعمال کیا تو اس نے بہت ہی کم استعمال کیا اور دیگر چشموں سے اس نے خداوند کے اقوال اخذ کئے۔

ہیرودیس کا خاندان

۱۔ ہیرودیس اول (اعظم)۔ ہیرودیس کا خاندان قوم کے لحاظ سے اسرائیلی نہ تھا بلکہ آدومی تھا۔ ہیرودیس اول کے دادا انتی پیتر (انتی پاس) نے اس وقت یہودی دین قبول کیا جب یوحنا ہرقانیوس نے ادوم کو فتح کیا اس لئے ہیرودیس اول کی تربیت یہودیوں کے طور پر ہوئی۔ سنہ ۴۷ ق م میں جولیس قیصر نے اس کے باپ کو یہودیہ کا حاکم بنایا اور اس نے اپنے چار بیٹوں میں اپنی سلطنت تقسیم کر دی۔ ہیرودیس کو گلیل کا علاقہ ملا جس کا انتظام اس نے بہت سرگرمی سے کیا اور ڈاکوؤں کو بڑے زور سے قابو میں لایا۔ سنہ ۴۰ ق م میں رومی سینٹ نے انتونی کی تحریک سے ہیرودیس کو یہودیہ کا بادشاہ بنا دیا۔ لیکن یروشلم میں اس کے تخت کو قیام سنہ ۳۷ ق م تک نہ ہوا۔ کیونکہ لوگ ابتک عشمانی خاندان کا دم بھرتے تھے جس خاندان نے ۱۲۶ سال تک فلسطین میں حکومت کی تھی۔ آخر کار ہیرودیس نے یروشلم کو فتح کر لیا اور اپنی فتح کے وقت صدر مجلس کے سارے ممبروں کو سوائے دو شخصوں کے تہ تیغ کیا اور اپنے حریف بادشاہ انتی گونس کے حامیوں کو مروا ڈالا۔ انتونی نے انتی گونس کا بھی سر قلم کرا دیا۔ ہیرودیس سوانا۔ دور اندیش مستقل مزاج اور روشن ضمیر بادشاہ تھا۔ یہودی تنگ دلی اور تعصب سے وہ مبرا تھا اور رومیوں اور یونانیوں کی شائستگی اور علم کو سیکھنے کی طرف مائل تھا۔ برعکس اس کے وہ متلون مزاج۔ ظالم۔ خود غرض اور بے رحم تھا۔ اپنی زندگی کے آخر میں جب وہ ایک دردناک بیماری میں مبتلا ہوا تو اس میں خونریزی کا شوق دیوانگی تک پہنچ گیا۔ جو اس کے ظلم کا شکار ہوئے وہ اس کی محبوب بیوی مریمنی۔ اس کا بھائی ارستوبولس اور اس کا دادا ہرقانیوس اور

اس کے بیٹے اسکندر، ارسطوبولس اور انتی پیتر تھے۔ اس کی زندگی کا بڑا کام ہیکل کی تعمیر تھی جسے اُس نے ۲۰ ق م میں شروع کیا اور ۶۵ء تک بھی پورے طور سے ختم نہ ہوا۔ تقریباً اُس وقت تک کہ رومیوں کے ساتھ لڑائی شروع نہ ہوئی۔ اپنے بستر مرگ (۴ ق م) پر اُس نے حکم دیا کہ یہودی رؤسا کو یریحو کے تماشاگاہ میں قید رکھیں اور اُس کے مرتے ہی وہ قتل کر دیئے جائیں تاکہ اُس کے جنازہ کے وقت کچھ حقیقی ماتم کرنے والے بھی ہوں۔ اُس کی دس بیویاں تھیں اور بہت سارے بچے ۔

۲۔ ہیرودیس انتپاس ہیرودیس اوّل کا بیٹا اُس کی سامری بیوی ملتھکے کے بطن سے تھا۔ اپنے باپ کی وصیت کے وسیلے وہ گلیل کی چوتھائی اور پیریا کے علاقہ کا حاکم ہوا۔ اس علاقہ کی سالانہ آمدنی دو سو توڑے تھے۔ اُس نے پطریہ عرب کے بادشاہ ارِتاس کی بیٹی سے شادی کی۔ لیکن اُس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس سے سازش کی اور پیچھے اسے باوجود یوحنا بپتسما کی تنبیہ اور ملامت کے اپنے گھر ڈال لیا اور ایک حکمت عملی کے ذریعہ ہیرودیاس نے اُسے قتل کروایا جس کا ذکر اناجیل میں آیا ہے۔ انتی پاس طبریاس کا بڑا دوست تھا۔ اُسی کی یادگار میں اُس نے طبریاس کا شہر بنوایا۔ ۳۹ء میں وہ فرانس میں جلاوطن کر دیا گیا اور آخرکار ہسپانیہ میں مرگیا۔ ہیرودیاس اپنی خوشی سے اُس کے ساتھ جلاوطنی میں چلی گئی ۔

۳۔ ہیرودیس ارخلاؤس بھی ہیرودیس اوّل کا بیٹا ملتھکے کے بطن سے تھا اور انتپاس سے چھوٹا تھا۔ باوجود اس خورد سنی کے باپ نے اُسے اعلیٰ میراث دی۔ یعنی یہودیہ کی سلطنت اور بادشاہ کا لقب۔ یہودیہ میں لوگ اُسے مطلق پسند نہ کرتے تھے۔ اور جب وہ سوار ہو کر روم کو روانہ ہوا تاکہ بادشاہت اُس کے لئے منظور ہو جائے تو اُس کی رعیت نے اُس کے پیچھے یہ پیغام بھیجا کہ یہ شخص بادشاہت

سے معزول کر دیا جائے اور یہودیہ براہ راست روم کے ماتحت ہو۔ اس ماجرے کی طرف ہمارے خداوند نے لوقا ۱۹: ۱۲ سے ۲۷ میں اشارہ کیا۔ اگستس نے ارخلاؤس کو یہودیہ۔ سامریہ اور ادوم کا علاقہ دے دیا اور اِتھنارک کا نہ بادشاہ کا لقب دیا ۶ء میں اگستس نے اس کے ظلم کے باعث اسے معزول کر دیا اور وی اَن علاقہ فرانس میں اُس کو جلاوطن کر دیا۔ اس کی ریاست رومی حاکم کے سپرد ہوئی اور یہ انتظام ۴۱ء تک رہا۔ متی ۲: ۲۲ سے پتا لگتا ہے کہ یوسف نے ظالم ارخلاؤس کی ریاست میں داخل ہونے سے پرہیز کیا اور ناصرت کو چلا گیا تاکہ انتپاس کے علاقہ میں رہے جو قدرے نرم مزاج تھا ۔

۴۔ **ہیرودیس فلپس اوّل**۔ یوسیفس مورخ اسے ہیرودیس اور اناجیل اسے فلپس کہتی ہیں (متی ۱۴: ۳ + مرقس ۶: ۱۷ + لوقا ۳: ۱۹)۔ اس فلپس کا امتیاز دوسرے فلپس سے کریں جو اطوریا اور طراخونی تِس کا چوتھائی کا حاکم تھا (لوقا ۳: ۱)۔ یہ ہیرودیس اوّل کا بیٹا شمعون سردار کاہن کی بیٹی دوسری مریمنی کے بطن سے تھا۔ اس کی ماں کی غداری کی وجہ سے باپ نے وصیت میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے تقریباً ساری عمر روم میں ایک عام شریف آدمی کی طرح گزاری۔ وہ ہیرودیاس کا پہلا خاوند تھا۔ اُس نے طلاق دے دیا تاکہ وہ اپنے چچا کے ساتھ شادی کرے ۔

۵۔ **ہیرودیس فلپس دوم**۔ جو عموماً فلپس چوتھائی کے حاکم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ہیرودیس اوّل کا بیٹا یروشلم کی کلیوپترا کے شکم سے تھا۔ اس کی تربیت روم میں ارخلاؤس اور انتپاس کے ساتھ ہوئی تھی۔ اُس کے باپ نے اپنی وصیت میں اس کو گلیل کے سمندر کے شمال و مشرق کا علاقہ دیا (بتانیہ۔ طراخونی تِس۔ اورانیتس)۔ اور چوتھائی کے حاکم کا لقب دیا۔ مقدس لوقا نے اُسے اطوریا اور طراخونی تِس کا چوتھائی کا حاکم لکھا ہے (لوقا ۳: ۱)۔ اُس نے ۴ ق م سے ۳۴ء تک بادشاہی کی۔ وہ اپنے اعتدال

انصاف اور حسن انتظام کے باعث مشہور تھا۔ اُس نے قیصریہ فلپی اور بیت صیدا جولیس
کو تعمیر کرایا جہاں ایک دفعہ انتپاس سے بچنے کے لئے ہمارا خداوند چلا گیا (لوقا ۹: ۱۰)
اس کی بیوی سلومی ہیرودیس فلپس اول اور ہیرودیاس کی بیٹی تھی۔ چونکہ وہ بے اولاد
تھا اس کی وفات کے وقت اُس کی بادشاہت سوریا کے رومی حاکم کے سپرد
ہوئی +

۶۔ ہیرودیاس۔ (دیکھو متی ۱۴: ۱۱ + مرقس ۶: ۱۷ + لوقا ۳: ۱۹)۔ ہیرودیس
اول کے بیٹے ارستوبولس کی بیٹی اور اس کی خالہ زاد برنیقی کے بطن سے تھی۔ اس نے
پہلے اپنے چچا ہیرودیس فلپس اول سے شادی کی جس سے اس کی بیٹی سلومی پیدا
ہوئی جس نے ہیرودیس کے سامنے ناچ کر اُسے خوش کیا تھا۔ بعد ازاں اس نے
اُس سے طلاق لے لیا اور اُس کے بھائی انتپاس سے شادی کر لی۔ اس انتپاس
نے اس کی خاطر اپنی بیوی کو طلاق دے دیا اس پر اُس کے خسر نے اُس کے ساتھ
جنگ کی۔ ہیرودیاس نے حیلہ سے یوحنا بپتسٹا کو قتل کرایا۔ اور اپنے خاوند کے ساتھ
جلاوطنی میں گئی۔ یہ ہیرودیس اگرپہ اول کی بہن تھی +

۷۔ ہیرودیس اگرپہ اول۔ جسے یوسیفس نے اگرپہ اعظم کہا ہے۔ یہ ارستوبولس
اور برنیقی کا بیٹا تھا اور ہیرودیس اول کا پوتا۔ اُس نے روم کے شاہی خاندان کے ساتھ
روم میں پرورش پائی اور کے لی گولا اور قلودیوس قیصروں کا خاص دوست تھا جب
کے لی گولا ۳۷ء میں قیصر ہوا تو اُس نے فوراً فلپس کی چوتھائی کا علاقہ اگرپہ کو عطا
کیا اور ۳۹ء میں جب انتپاس جلاوطن ہوا تو اُس کا علاقہ بھی اُس کو مل گیا (یعنی گلیل
اور پیریا کا علاقہ)۔ ۴۱ء میں جو اعلیٰ خدمات اس نے قلودیس کی کی تھیں ان کے
صلہ میں اس کو بادشاہ کا خطاب عطا ہوا۔ اب اس کے پاس ہیرودیس اعظم
کا سارا علاقہ تھا۔ یہ اکثر یروشلم میں رہتا تھا اور موسوی شریعت کا بڑا پابند تھا

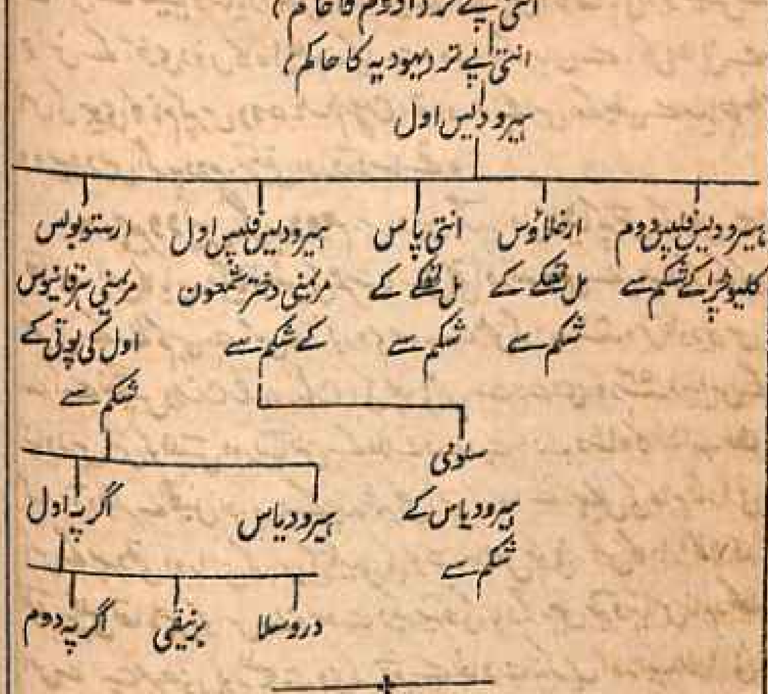
اور کوئی ایسا دن نہ تھا کہ وہ قربانی نہ گزرانتا۔ شریعت کے لئے اس سرگرمی کی وجہ
سے اس نے کلیسیا کو ستایا (اعمال ۱۲)۔ اس نے ۴۴ء میں وفات پائی۔ یوسیفس نے
جو اُس کے آخری دنوں کا حال قلمبند کیا ہے وہ لوقا کے بیان سے بالکل مطابق ہے۔
اُس کی بیوی کا نام کپرس (Cypros) تھا اور جو بچے اس کے بطن سے پیدا ہوئے
وہ ہیرودیس اگرپہ دوم۔ برنیقی اور دروسلا تھے +

۸۔ ہیرودیس اگرپہ دوم۔ ہیرودیس اگرپہ اول کا بیٹا کپرس کے بطن سے
تھا جب اس کا باپ مر گیا تو اُس کی عمر سترہ سال تھی اور قلودیس نے یہ خیال کر کے کہ یہ
حکمرانی کے لئے کم سن ہے اُس علاقہ کو رومی صوبہ سے ملحق کر دیا۔ ۴۸ء میں قلودیوس
نے اُسے خلقیس (Chalcis) کی چھوٹی ریاست دے دی اور ۵۳ء میں اس کے
تبادلہ میں اُس کو فلپس اور لسانیاس کے علاقے دے دیئے۔ اور بادشاہ کا خطاب عطا
کیا۔ نیرو قیصر نے گلیل اور پیریا کے چند شہر بھی اُس کو عطا کئے۔ ہیکل کی عام نگرانی
اُس کے سپرد تھی اور اسی کو اس کی تکمیل کی عزت حاصل ہوئی۔ اس کا دارالخلافہ
قیصریہ فلپی تھا۔ جس کو اس نے وسعت دیکر نیرو کی یادگار میں نیرونیاس نام رکھا۔
اس نے اپنے ہموطنوں کو یہ نصیحت دی کہ روم سے بغاوت نہ کریں اور جب لڑائی
شروع ہوئی تو یہ روم کی طرف ہو گیا۔ یروشلم کی تسخیر (۷۰ء) کے بعد اس کو بہت
سا اور علاقہ بھی مل گیا۔ اس کی زندگی کے آخری ایام روم میں صرف ہوئے اور وہاں
ہی مر گیا۔ ۱۰۰ء کے قریب ہیرودیس کے خاندان سے یہ آخری بادشاہ تھا۔ اگرچہ
یہودیوں کے دستوروں اور مسئلوں سے بخوبی واقف تھا اور پولس کی رایوں کی صحت
پر پوری رائے دے سکتا تھا (اعمال ۲۵ و ۲۶)۔ مگر بدکار شخص تھا +

۹۔ برنیقی۔ دیکھو اعمال ۲۵: ۱۳ کی تشریح۔

۱۰۔ دروسلا۔ دیکھو اعمال ۲۴: ۲۴ کی تشریح +

ہیرودیس کے خاندان کا مختصر شجرہ ۔ نئے عہدنامہ کی تشریح کے لئے



مقدس پولُس کی زندگی اور کام

رسولی زمانے کے سارے اشخاص میں سے مقدس پولُس سب سے زیادہ درخشاں ہے ۔ مسیحی دین کے حال کے مخالفوں نے اُس کو بالکل اور طرح کا شخص خیال کیا ہے ۔ جو مشکل اس کے بارہ میں پیش آتی ہے اُس کو انہوں نے بالکل حل نہیں کیا۔ اُن میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس نے مسیحی دین کو بہت کچھ بگاڑ دیا۔ بعضوں کی یہ رائے ہے کہ دراصل مسیحی دین کا بانی یہی شخص تھا۔ گو اُس نے یہ اقرار کیا کہ میں مسیحی دین کا شاگرد ہوں۔ بعضوں نے تو یہ کہنے کی بھی جرأت کی کہ جو خطوط اس کے نام سے مشہور ہیں وہ ہرگز اس کی قلم سے نہیں نکلے ۔ لیکن جو لوگ یہ ناقابل اعتبار رائے بھی رکھتے ہیں وہ بھی یہ انکار نہیں کر سکتے کہ مقدس پولُس نے پہلے مسیحیوں پر بکثرت اثر کیا۔ کوئی شخص اس کے نام کے جعلی خطوط بنانے کی کوشش نہ کرتا ۔ اگر یہ شخص مسیح کا برگزیدہ اور رسول نہ سمجھا جاتا اور اس کی یہ عزت و تعظیم مسیحی نہ کرتے ۔ خواہ مسیحی ہوں یا غیر مسیحی سب یہ مانتے ہیں کہ جس قدر کامیابی کے ساتھ پولُس نے محنت کی رسولی زمانہ کے کسی اور شخص نے نہیں کی +

اس کی زندگی کا حال اعمال کی کتاب سے مل سکتا ہے جو اُس کے ہمعصر لوقا نے تحریر کی اور نیز اس کے اپنے خطوط سے ۔ اس کی زندگی کے بارہ میں چند معتبر روایات بھی ہیں ۔ پولُس اور تکلا کے اپوکرفل اعمال کی کتاب میں چند امور اس کے بارہ میں معلوم ہو سکتے ہیں ۔ یہ فسانہ دوسری صدی کا ہے اور مقدس کلیمنٹ کے اس بیان پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ مغرب کی حد تک پہنچا۔ اور یہ قدیم روایت ہے کہ وہ روم میں شہید ہوا۔ زمانہ حال میں مسیحی دین کے جو بیانہ رو مخالف ہیں وہ یہ

ماننے ہیں کہ دوسری صدی کی شہادت ایسی مضبوط ہے کہ اُسے ہرگز نظرانداز نہیں کرسکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سارے خطوط جعلی ہیں اور ان میں سے آٹھ تو تقریباً یقینی طور سے اصلی ہیں (یعنی گلتیوں۔ رومیوں۔ پہلا اور دوسرا کرنتھیوں کا فلپیوں کلسی۔ فلیمون۔ پہلا تھسلنیکیوں)۔ ہم کو پورا اطمینان ہے کہ تیرہ خطوط اصلی ہیں۔ اور اس لئے اس رسول کی زندگی کے بارہ میں معتبر شہادت اُن سے مل سکتی ہے +

۱۔ اس کی ابتدائی زندگی اور اُس کا مسیحی ہونا۔ ساؤل جو پولس بھی کہلاتا ہے۔ خالص یہودی نسل سے تھا بنیامین کے فرقے سے۔ طرطوس واقع قلقیا میں پیدا ہوا اس کے ان دو ناموں کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس نے رومی نام رومی شہری حقوق کے ساتھ میراث میں حاصل کیا۔ آج تک یہودیوں میں یہ عام رواج ہے کہ یہودی نام بھی رکھتے ہیں اور غیر قوم نام بھی۔ اور سولس کے معنے یونانی میں لڑکھڑانے کے ہیں اس لئے غیر قوموں کے درمیان یہ نام اس قابل نہ تھا کہ استعمال کیا جائے۔ عام یہودی لڑکوں کی طرح پولس نے ایک حرفہ بھی سیکھ لیا تھا یعنی خیمہ دوزی کا کام جس کے بنانے کے لئے قلقیا کی بکریوں کی اون درکار تھی۔ غالباً اُس کا والد متمول شخص تھا اور اس نے اپنے بیٹے کو اچھی تعلیم دلوائی۔ یروشلم میں گملیل ربی سے اُس نے یہودیوں کے دین کی تعلیم پائی اور اس کی طرز تحریر سے اس ربیانہ و رزمیانہ تاثیر کے پتے لگتے ہیں۔ تو بھی اس وسیع یہودیت سے بے بہرہ نہ تھا جو زیادہ یونانی نمونہ کی تھی اور اسکندریہ میں بکثرت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑا سرگرم۔ دلیر اور پرجوش شخص تھا۔ البتہ اُس کا جسم اُس کے دماغ کا ہم پلہ نہ تھا۔ اُس کی ظاہری شکل بہت دل پسند نہ تھی اور اس کی صحت بھی بہت اچھی نہ تھی جس جسم کے کانٹے کا وہ ذکر کرتا ہے وہ شاید کوئی بدنی تکلیف تھی۔ شاید سودا کی یا مرگی کا خلل ہو۔ اس کی ابتدائی زندگی بے عیب گزری لیکن اس کی تعلیم کے ذریعہ خدا کی شریعت کی عظمت کا اعلےٰ خیال اُسے پیدا ہوا اور شریعت کے

معنی سمجھنے کے وسیلے گناہ کی حقیقت بھی زیادہ سمجھ لی۔ جو حکم زندگی کے لئے تھا وہ اُسے موت کا حکم معلوم ہوا۔ اس عرفان کے ذریعہ کہ گناہ ممنوع ہے اور کہ وہ ممکن ہے اُسے شدت کی باطنی جنگ کرنی پڑی (رومی ۷ باب) +

اس باطنی ناکامیابی کو محسوس کرکے شریعت کے لئے اُس نے بڑی سرگرمی ظاہر کی۔ اُس نے مسیحی دین کو ایک سخت دغا خیال کیا اور اس نے مسیحیوں کو ستانا اُس نے اعلےٰ فرض سمجھا۔ استفنس کی شہادت سے پیشتر وہ بڑا جوشیلا تھا۔ اس کے بعد یہودی کلیسیائی حکام نے خیال کیا کہ اس نئے مذہب کو ستانے کا سبب سے مفید آلہ تھا۔ نہ تو یہودیوں نے اور نہ پولس نے اس پر قناعت کی کہ فلسطین کے مسیحیوں کو ہی ستائیں اس نے اس کو اختیار دیا کہ دمشق کو جائے۔ وہاں جاتے ہوئے یسوع کا مکاشفہ دیکھ کر مسیحی ہو گیا (۳۵ء و ۳۶ء)۔ اس کے اپنے بیان سے اور جو تین احوال اعمال کی کتاب میں مندرج ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مکاشفہ اعجازی تھا (اعمال ۹: ۱ سے ۱۶ + ۲۲: ۴ سے ۱۶ + ۲۶: ۹ سے ۱۸)+ ۱ کرنتھی ۱۵: ۸ میں اُس نے اپنے پر مسیح کے ظہور کو گنا اور دوسرے رسولوں پر ظہور کے برابر ٹھیرایا۔ اس ظاہری رویت اور صاف پیغام کے ساتھ اندرونی مکاشفہ بھی حاصل ہوا (گلتیوں ۱: ۱۶)۔ اس وجہ سے اُس نے کبھی یہ یقین نہیں چھوڑا کہ دوسرے رسولوں کی طرح میں بھی جی اُٹھے مسیح کا عینی گواہ ہوں۔ اسی رویت سے اُس نے غیر قوموں کے لئے اپنے رسول ہونے کی بلاہٹ کو منسوب کیا اور کرنتھس کی کلیسیا کو لکھتے وقت اُس نے یہ دعوے کیا کہ ہو نہیں سکتا کہ میرے دشمن میری ظاہری رویت کو مانیں اور میری رسولی بلاہٹ کا انکار کریں +

۲۔ مشنری زمانہ کا شروع۔ دمشق میں تین روز ٹھیر کر اس آئندہ غیر قوموں کے رسول کو حنانیاہ نے بپتسمہ دیا۔ اور مسیحی کلیسیا کا ممبر ہو کر اس نے عبادت خانوں میں

یہ بشارت دینی شروع کی کہ "یسوع خدا کا بیٹا ہے"۔ لیکن جو اندرونی کشمکش اسے ملی تھی اس کی وجہ سے آرام کرنا لازمی ٹھہرا۔ اس لئے وہ تین سالوں تک عرب میں جا رہا۔ اور نئی طاقت حاصل کر کے دمشق کو واپس گیا۔ چونکہ یہودیوں نے اس کی جان مارنے کی بندش باندھی تھی اس لئے وہ مقدس پطرس سے ملنے کے لئے ۳۸ء میں یروشلیم کو گیا۔ وہاں وہ صرف پندرہ روز ٹھیرا اور اپنے دستور العمل کے مطابق اُس نے گوشت اور خون سے صلاح نہ لی۔ پطرس اور خداوند کے بھائی یعقوب کے سوا اُس نے کسی کو نہ دیکھا۔ اعمال ۹: ۲۶ سے ۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ برنباس نے اس کی ملاقات رسولوں سے کرائی۔ شاگرد اُسے قیصریہ سٹراٹونس کے بندرگاہ تک پہنچا آئے اور وہاں سے وہ جہاز پر سوار ہو کے طرطوس کو گیا (گلتیوں ۱: ۱۸ تا ۲۱ و ۲۳ + اعمال ۹: ۳۰ + ۱۱: ۲۵ و ۲۶)۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوریہ اور کلکیہ میں اُس نے تقریباً سات سال کاٹے اور بہت مسیحی ہو گئے۔ مقابلہ کرو اعمال ۱۵: ۲۳ سے ۰

برنباس نے اُسے انطاکیہ میں بلا بھیجا۔ اس کلیسیا میں پولس کو اچھا رتبہ ملا۔ اگلے سال ۴۶ء میں برنباس کے ہمراہ یہودیہ کے غریب مسیحیوں کے لئے انطاکیہ سے خیرات دیکر بھیجا گیا (اعمال ۱۱: ۳۰)۔ اس کے بعد روح القدس نے اسے اور برنباس کو چن لیا کہ وہ رومی سلطنت میں بشارت دینے کے لئے علیحدہ کئے جائیں (۴۷ء)۔ یوحنا مرقس کو ساتھ لیکر وہ کپرس کو روانہ ہوئے۔ وہاں سرجیس پولس رومی صوبہ دار مسیحی ہوا۔ پھر وہ جہاز پر سوار ہو کر پرگا کو گئے اور اگرچہ یوحنا مرقس اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ دلیری سے جنوبی گلاتیہ میں انجیل سنانے لگا۔ پہلے پہل مقدس پولس یہودیوں ہی کو انجیل سناتا رہا۔ اس کا اجر یہودیوں نے یہ دیا کہ شہر بشہر اس کا تعاقب کیا۔ مشنریوں نے ہر جگہ یہ معلوم کیا کہ غیر قوموں سے جو یہودی مرید

تھے وہ خوشی سے انجیل سنتے تھے اور غیر قومیں بھی انجیل سننے کے لئے رضامند تھیں۔ مشنریوں کے یہ خطرناک سفر اور جدوجہد بے سود نہ ٹھیرے۔ پسدیہ کے انطاکیہ۔ اکونیم۔ لسترا۔ دربے اور غالباً دوسری جگہوں میں بھی کلیسیائیں قائم ہو گئیں اور یہ ظاہر ہو گیا کہ "خدا نے غیر قوموں کے لئے ایمان کا دروازہ کھول دیا"۔ اور پولس کو خاص بلاہٹ ملی کہ غیر قوموں کو مسیح کی طرف پھیرے ۰

۳۔ یروشلیم کا مجمع۔ ۴۹ء۔ مقدس پولس کے اس کام پر نئے سرے سے مُہر صداقت کی ضرورت تھی۔ ایک مکاشفہ نے (گلتیوں ۲: ۲) اُس کو ہدایت کی کہ انطاکیہ سے یروشلیم کو جائے۔ وہاں اُس نے رسولوں کے سامنے اس انجیل کا ذکر کیا جس کی منادی اُس نے غیر قوموں کے درمیان کی تھی۔ یہ سخت نازک وقت تھا۔ یہودیت مائل چند شاگرد جو رسولوں کے ذریعہ ایمان لائے تھے یہ مانتے تھے کہ انجیل کے وعدے صرف انہیں سے علاقہ رکھتے ہیں جو موسوی شریعت پر عمل کرتے ہیں۔ مقدس پولس کا یہ دعوے تھا کہ جو غیر قوم یسوع مسیح پر ایمان لاتے ہیں وہ بلا ختنہ راستباز ٹھیرتے ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ اگر غیر قوموں کا ختنہ ہوا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ مسیحی ہونے کے لئے انہیں پہلے یہودی بننا چاہئے۔ اس لئے انجیل مقدم نہ ٹھیری بلکہ موخر ٹھیری۔ جو رسولوں میں رکن تھے انہوں نے مقدس پولس کی تائید کی انہوں نے اُسے شراکت کا داہنا ہاتھ دیا اور وہ انطاکیہ کو واپس آیا تاکہ نامختونوں کے رسول کی حیثیت سے آزادانہ کام کرے۔ یہ خطرہ جاتا رہا کہ مسیحی دین یہودی دین کا محض ایک فرقہ ہو ۰

۴۔ دوسرا مشنری سفر (۴۹ء سے ۵۲ء)۔ اعمال ۱۵: ۳۶ سے ۱۸: ۲۲ تک میں اس سفر کا بیان ہے اور اس سفر میں اس رسول کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ جو خط موجود ہیں اُن میں سے سب سے پہلے خط تحریر ہوئے (پہلا اور دوسرا خط

تھسلونیکیوں کو) اور انجیل یورپ تک پھیل گئی اس کے شروع میں پولس اور برناباس کے درمیان جھگڑا ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ مقدس پولس نے مرقس کو ساتھ لے جانے سے انکار کیا تھا۔ بعد ازاں اس کے ساتھ ملاپ ہو گیا۔ سیلاس ایک یہودی مسیحی کو جسے رومی شہری حقوق حاصل تھے ساتھ لیکر اس نے ان کلیسیاؤں کو دیکھا جو اس کے پہلے سفر میں قایم ہوئی تھیں۔ ہر مقام میں یروشلیم کے مجمع کے فتوے ایمانداروں کو سنائے گئے (اعمال ۱۶: ۴ و ۵)۔ لسترا میں مقدس پولس نے تیمتھیس کو مددگار کے طور پر لیا۔ اس کا اس نے ختنہ بھی کر دیا کیونکہ اس کی ماں یہودن تھی۔ روح القدس نے ایشیا کے صوبہ میں انجیل سنانے سے مشنریوں کو منع کیا اور ایک رویا کے ذریعہ پولس کو ہدایت ہوئی کہ وہ یورپ کو جائے۔ تروآس کے بندرگاہ پر مقدس لوقا اس کے ساتھ آ ملا۔ جس نے یہ سارا قصہ بیان کیا (مقدس لوقا نے ضمیر "ہم" اعمال کی ۹۷ آیتوں میں استعمال کی ہے (۱۶: ۱۰ سے ۱۷ + ۲۰: ۵ سے ۱۵ + ۲۱: ۱ سے ۱۸ + ۲۷: ۱ سے ۲۸: ۱۶)۔ وہ عبور کر کے مقدونیہ کو چلے گئے اور فلپی میں انجیل سنانے لگے۔ اب تک انطاکیہ کے سوا پولس نے اپنی رسالت سے لیکر کسی بڑے شہر میں منادی نہ کی تھی۔ اب سے لیکر اُسے بڑی بڑی صدر جگہوں میں بھی منادی کرنا پڑا۔ فلپی میں اس پر ظلم ہوا۔ یہ وہ پہلا شہر ہے جہاں یہ معلوم ہوا کہ مشنریوں اور حکام شہر میں کچھ بگاڑ ہو گیا۔ جیسا پیچھے افسس میں واقع ہوا ویسے یہاں بھی یہ مخالفت دینی یا ملکی نہ تھی بلکہ ایسے آدمیوں کی عداوت کی وجہ سے تھی جن کے خیال میں مسیحی دین کے ذریعہ اُن کو مالی نقصان پہنچتا تھا۔ تھسلنیکے اور بیریا میں بھی تھسلونیکی یہودیوں کی طرف سے سخت مخالفت کے باوجود بہت سے مسیحی پیدا ہو گئے۔

بیریا سے وہ آتینی کو گیا جو یونان کا علمی مرکز تھا۔ اریوپگس کی پہاڑی

پر اس نے تقریر کی۔ اریوپگس کی مجلس کے ایک ممبر نے مسیحی دین قبول کر لیا لیکن آتینی کے عقلا اس امر کے قائل نہ تھے کہ وہ اندرونی جدو جہد میں ناکامیاب رہے ہیں اس لئے انہوں نے انجیل کی چنداں پرواہ نہ کی۔ کرنتھس کا بڑا بھاری شہر جو یونان کی تجارت کا صدر مقام تھا۔ مختلف قسم کی زمین ثابت ہوا۔ یہ شہر امیروں کی عیاشی اور غریبوں کی مصیبت کے باعث بدنام تھا۔ پولس یہاں غریبوں کے ساتھ غریبوں کے طور پر رہا۔ اور اس نے یہ عزم بالجزم کیا کہ سوائے یسوع مسیح اور اس کے مصلوب ہونے کے اور کسی شے کی منادی نہ کرے۔ رومی قانون کے زیر سایہ بہت شاگرد ہو گئے جن میں سے بعض شریفوں میں سے بھی تھے۔ کرنتھس سے اس نے دو خط تھسلونیکیوں کو لکھے۔ اس دوسرے سفر کے آخر میں وہ یروشلم کو گیا۔ غالباً اس دفعہ یروشلم کو جانے کے جلد بعد ہی ایک واقعہ وقوع میں آیا جس سے ثابت ہوا کہ کلیسیا میں یہودی مائل فریق کا کیسا زور تھا۔ وہ اس کا تو انکار نہ کرتے تھے کہ غیر مختون ایماندار مسیحی تھے۔ لیکن وہ مختون کا درجہ اُن سے اعلےٰ ٹھیراتے تھے جب مقدس پولس یروشلم سے انطاکیہ کو گیا (۵۲ء) مقدس پطرس نے یہودی مائل مسیحیوں کو ناراض نہ کرنا چاہا اور یہ دکھانا چاہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ متفق تھا۔ اُس نے غیر مختون مسیحیوں کے ساتھ کھانے سے انکار کیا۔ اس ریا کے باعث پولس نے اس کو برملا ملامت کی (گلتیوں ۲: ۱۱) یعنی اپنی حقیقی رائے کے خلاف عمل کرنے کے باعث (بعض مفسروں نے اس واقعہ کو یروشلم کے مجمع (۴۹ء) سے کچھ پیشتر ٹھیرایا۔ دیکھو اعمال ۱۵ کی شرح) علما میں اب تک اس امر میں تکرار ہے کہ مقدس پولس شمالی گلاتیہ کو بھی گیا یا فروگیا اور گلاتیہ کے علاقہ سے ایک خاص علاقہ مراد ہے جس کے دو مختلف نام تھے اور اکونیم سے پسدیہ کے انطاکیہ تک پھیلا ہوا تھا قوم کے لحاظ سے وہ فروگی اور ملکی لحاظ سے وہ گلاتی علاقہ کہلاتا تھا۔

۵۔ **تیسرا مشنری سفر۔** ۵۲ء سے ۵۶ء۔ یہودی مائل مسیحیوں نے اپنا انتقام پولس سے
یوں لیا کہ جن کلیسیاؤں کی بنیاد مقدس پولس نے ڈالی تھی وہاں وہ سفارشی خطوط لے کر پہنچے
اور یہ ظاہر کیا کہ ہم اصلی رسولوں کی طرف سے نمائندہ ہیں اور مقدس پولس کی تعلیم میں جو نقص
ہیں اُن کو رفع کرنے آئے ہیں۔ اس اثنا میں مقدس پولس گلتیا اور فروگیہ کو گیا اور افسس
میں دیر تک قیام کیا اور پھر مقدونیہ اور یونان کو گیا۔ ان چند سالوں کے عرصے میں پولس
عین عروج کی حالت میں تھا۔ اپنی مرضی کے خلاف مباحثہ پر مجبور ہو کر اس نے چار خط لکھے
پہلا اور دوسرا خط کرنتھیوں کو جو سارے علم ادب میں ایک اعلےٰ رتبہ رکھتے ہیں یہ سارا
زمانہ مشکلات سے پُر تھا لیکن اس مجادلہ کا انجام کامیاب ہوا۔ اعمال کے ۱۹ باب میں افسس
کے ہنگامہ کا دلچسپ بیان ہے۔ وہاں سناروں نے جو ارتمس کی مورتیں بنایا کرتے تھے عوام الناس
کو بھڑکایا کہ اسے وہاں سے نکال دیں۔ افسس سے روانہ ہو کر اس نے طروآس میں انجیل سنائی اور
وہاں سے مقدونیہ۔ الریا اور یونان کا دورہ کیا اور کرنتھس کو اپنا منزل مقصود ٹھیرایا۔ وہ غم کی حالت
میں پہلے بھی وہاں گیا تھا (۲ کرنتھی ۲: ۱+۱۳: ۲و۱)۔ لیکن مباحثہ کے ازسرنو پھوٹ نکلنے کی وجہ سے
اُسے مجبوراً پھر وہاں جانا پڑا۔ ان مباحثوں کی وجہ سے اس رسول کو بہت فکر و افکار پیدا ہو گئے
گو کرنتھیوں کے دوسرے خط سے پتا لگتا ہے کہ اُس کے یہ تفکرات کسی قدر گھٹ گئے تھے لیکن اس نے
اپنا سفر جاری رکھا اور ۵۵ء کے آخر میں کرنتھس پہنچا اور وہاں وہ تین مہینے ٹھیرا (اعمال ۲۰: ۳)۔ اس
عرصہ میں اس نے رومیوں کو خط لکھا۔ وہ سوریا کو واپس جانا چاہتا تھا لیکن یہودیوں کی سازش
کی وجہ سے کرنتھس سے سوریا کے لئے جہاز پر سوار نہ ہو سکا۔ اس لئے وہ خلیج کے گرد گھوم کر گیا اور
۵۶ء کی ایسٹر (عید قیامت) وہاں ہی منائی۔ اور پھر طروآس کو گیا۔ مقدس لوقا نے اعمال
۲۰ و ۲۱ بابوں میں اس سفر کا بیان کیا ہے۔ اور یروشلم میں مقدس یعقوب اور دیگر بزرگ پولس سے
دوستانہ پیش آئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلیسیا کے ان پیشواؤں کے درمیان کوئی نا اتفاقی نہ
تھی گو اُن کے توابعین و متعلقین میں باہمی اختلاف تھا۔ ایشیا کے بعض یہودیوں نے ہیکل میں اس

رسول کو پہچان لیا اور مخالف انبوہ نے اس پر حملہ کیا۔ اُس نے عوام الناس کے سامنے ایک تقریر کی اور
ایک صدر مجلس کے سامنے۔ ان دنوں اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ وہاں سے وہ فیلکس رومی گورنر کے پاس قیصریہ بھیجا گیا۔
۶۔ **قیدخانہ** ۵۶ء تا ۶۱ء جو کارروائی پولس کے خلاف کی گئی اُس کا مفصل بیان لوقا نے
کیا ہے۔ مقدس پولس رومی شہری حقوق رکھتا تھا اور رومی حاکم اس قدر بے انصاف نہ تھے
کہ اسے یہودیوں کے سپرد کر دیتے۔ گو فیلکس کو رشوت حاصل کرنے کی امید تھی۔ آخر کار مقدس
پولس نے قیصر کی دہائی دی اور یوں اُس کارروائی کو مختصر کرا دیا۔ اس درخواست کو فیسطس گورنر
نظرانداز نہ کر سکتا تھا۔ جو بحری سفر روم تک پولس نے کیا اس کا بیان نہایت صحت کے ساتھ
مقدس لوقا نے کیا ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقدس پولس کیسی آسانی سے اپنے رفیقوں
پر فوق حاصل کر لیتا تھا۔ روم میں یہودی سرگروہان نے اس کی مخالفت نہ کی لیکن اکثر یہودیوں
نے اُسے ترک کیا۔ وہ روم میں ۶۱ء تک رہا۔ اس نے وہاں کرایہ پر گھر لیا ہوا تھا اور ایک سپاہی
اس کی نگرانی کرتا تھا۔ اس عرصہ میں اُس نے کلسیوں۔ فلیمون۔ افسیوں اور فلپیوں کو خط
لکھے۔ پہلے چار خطوط کی طرح ان میں بحث و تکرار کی بو نہیں آتی۔ بلکہ ان کی
نرم مزاجی۔ جاں نثاری۔ اختیار اور فروتنی ان کا مسیح اور کلیسیا کے حقیقی معنی سمجھنا وغیرہ
سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پولس طاقت پر طاقت حاصل کرتا چلا جاتا ہے +
۷۔ **خاتمہ۔** مقدس پولس روم کی پہلی اسیری سے رہا ہو گیا جیسا کہ اسے امید
تھی جب اس نے فلپیوں کو خط لکھا (فلپیوں ۱: ۲۶ + ۲: ۲۴)۔ اسے مدت سے آرزو تھی کہ ہسپانیہ
کو جائے (رومیوں ۱۵: ۲۸) اور اگرچہ اس کے خطوں میں ہسپانیہ جانے کا کچھ ذکر پایا
نہیں جاتا۔ لیکن مقدس کلیمنٹ نے ۹۵ء کے قریب لکھتے وقت اس امر کا ذکر کیا کہ وہ
مغرب کی حد تک گیا اور رومی مصنف کے لحاظ سے غالباً اس سے ہسپانیہ مراد ہے۔
تیمتھیس اور طیطس کے خطوں سے ظاہر ہے کہ وہ مشرق کو واپس گیا۔ اس کا آخری خط
تیمتھیس کا دوسرا خط ہے جو جاڑے کی موسم سے پیشتر لکھا گیا جب کہ اس کے مقدمہ کی پہلی

پیشی ہو چکی تھی۔ وہ تروآس اور کریتے میں ہو آیا تھا اور غالباً فلپّی اور کرنتھس میں بھی۔ تیمتھیس کو پہلا خط غالباً مقدونیہ سے کرنتھس کو جاتے وقت لکھا گیا۔ اور طِطُس کو خط کرنتھس سے لکھا گیا۔ جب کہ اُسے توقع تھی کہ آیندہ موسم سرما نکوپولس میں کاٹے جو اکتیم کے بالمقابل تھا (طِطُس ۳: ۱۲)۔ طِطُس کو خط روانہ کرنے سے تھوڑی ہی دیر بعد وہ پھر گرفتار ہوا ہوگا۔ قدیم کلیسیا کی روایات کے مطابق روم سے تین میل کے فاصلہ پر اوسٹیان راہ میں (Ostian way) اس کا سر قلم ہوا۔ یہ جگہ اُس کے نزدیک تھی جہاں اب مقدس پولس کا بڑا گرجا پایا جاتا ہے۔ اس گرجا میں اس کی قبر ہے اور اس پر ایک کتبہ چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی موت کا سن غالباً ۶۴ء تھا اگرچہ پہلے ۶۷ء بتایا جاتا تھا۔ اس کے رجوع لانے کا سال ۳۴ء تھا۔ ۳۰ سال کے عرصہ میں کسی نے بھی ساری تاریخ میں اس قدر کام سر انجام نہیں دیا جس قدر مقدس پولس نے دیا۔

مقدس پولس کے خطوں پر سرسری نظر

۱۔ مقدس پولس کی تصنیفات کی صورت۔ ہمارے پاس تیرہ خطوط ہیں جو مقدس پولس کی قلم سے نکلے۔ ان میں سے چار تو اُس نے اپنے خاص مددگاروں کے نام لکھے اور باقی اُن مسیحی کلیسیاؤں کے نام جن کی اُس نے بنیاد ڈالی تھی یا جو اُس کے مشنری سفر میں آئیں (مثلاً رومیوں او کلسیوں کو)۔ وہ دینی مسایل پر رسالے نہیں اور نہ خاص وعظ ہیں کہ خاص خاص فرائض کی تاکید کریں بلکہ دوستانہ خطوط ہیں جیسے ایک دوست دوسرے دوست کو لکھتا ہے یا جیسے مشنری یا پاسٹر اپنی غیر حاضری کے ایام میں اپنے گلہ کو لکھتا ہے۔ ایک وسیع خط وکتابت سے یہ چند چنے گئے اور بعضوں سے (مثلاً کرنتھیوں کے پہلے اور دوسرے خط) یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اُن شخصوں و کلیسیاؤں کی طرف سے بھی اُسے خط ملا کرتے تھے۔ ان معنوں میں چونکہ باہمی اتحاد تھا اور جس میں دونوں فریق یکساں دلچسپی رکھتے تھے اس لئے اس خط وکتابت کی یہی بنیاد تھی۔ یعنی الحقیقت شخصی خطوط کاتب اور مکتوب الیہ میں باہمی رشتہ کا نتیجہ ہیں۔ اور جن سوالات، مسائل اخلاق یا انتظام کا اُن میں ذکر ہے وہ اُسی زمانہ سے علاقہ رکھتے تھے۔ اور اسی وجہ سے ہم ان تحریروں کو حقیقی تحریریں قرار دیتے ہیں کیونکہ اس زمانہ کی صحیح حالت کا خاکہ اُن میں پایا جاتا ہے کہ یہ غیر قوموں کا رسول کیسی مشنری خدمات میں مصروف تھا۔ اور اس مخلوط گلے کی اُس نے کس طرح سے چوپانی کی۔

مقدس پولس کی تحریرات کا چشمہ یہ شخصی واقفیت تھی۔ رسول نے اپنی عدم موجودگی کی کمی کو پورا کرنے کے لئے قلم اٹھائی (۲ تھسلنیکیوں ۳: ۱۷)۔ کیونکہ جب اس کی خدمات کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گیا اور اُن جگہوں میں خود نہ جا سکا تو اپنی تحریروں کے ذریعہ اُس ضرورت کو رفع کیا۔ اور جیسا موقعہ پیش آیا ویسا ہی اُس نے لکھا (مثلاً رومیوں کے

خط کے)، شاید کسی تازہ خبر ملنے۔ یا کسی پیغام کے پہنچنے یا کسی
سوال کا جواب دینے کے لئے یا کسی امر کی تشریح یا کسی شکرگزاری ظاہر کرنے کے لئے یا اپنے
ناظرین سے کچھ درخواست کرنے کے لئے (مثلاً دیکھو ۱-تھسلنیکیوں ۳: ۸ + ۱-کرنتھیوں ۱: ۱۱ + ۷: ۱
۲-کرنتھیوں ۱: ۸ + ۷: ۶ + ۱۳: ۱۰ + فلپیوں ۱: ۱۲ + ۴: ۱۰ + کلسیوں ۱: ۴ و ۸ + ۲: ۱۔ فلیمون
۱۰ آیت وغیرہ)، تو بھی ان الگ الگ تحریروں میں جو اتفاق لکھی گئیں، کسی سفر کے وقت یا
قید میں سے یا رسول کے جا چکنے کے گھر سے، اُن میں ایک اعلےٰ مقصد پایا جاتا ہے جو
ساری انسانی زندگی اور خدا کی چیزوں پر حاوی ہے ۔

۳۔ خطوں کا طرز تحریر۔ یہ قول کہ "طرز عبارت ہی وہ انسان ہے" خاص کر
خطوط پر صادق آتا ہے جن شخصوں کو خداداد نعمت ملی ہے ان کے خطوط اکثر ان کی
تصنیفوں کی نسبت بھی زیادہ دلکش ہوتے ہیں کیونکہ وہ آزاد دلی۔ اور خلوص قلبی سے
لکھے جاتے ہیں اور ان میں تکلف پایا نہیں جاتا۔ مقدس پولس کے خطوط میں جو صفت
پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے وہ دلکش بھی ہیں اور پُر از مشکلات بھی ہیں۔ اس کا
گفتگویانہ طرز بہت ہی شخصی ہے گویا اس کی بات چیت کو کسی نے بلا ترمیم قلمبند کر لیا
(Renan) علم ادب میں مصنف کی شخصیت جس قدر ان میں سے بعض خطوط
میں نمایاں ہے ایسی کسی اور تصنیف میں نمایاں نہیں ۔

مقدس پولس کا طرز عبارت آسان طرز نہیں۔ کیونکہ وہ ایسی ساخت کا شخص
نہ تھا کہ وہ اشیا پر سرسری نظر ڈالے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک متواتر جنگ تھی ظاہری
اور باطنی۔ اس کی جبلّی شدید محنت اور قید کے درمیان اطمینان خاطر کی تہ میں وہ انتھک
کوشش پائی جاتی ہے کہ "جس کی خاطر مسیح نے اُسے پکڑا وہ بھی اُسے پکڑے" اسے گویا
روزہ جیسی تکلیف ہے۔ نہ صرف ایمان کے فرزندوں کے جننے میں بلکہ خدا کے اعلےٰ
راز کے دریافت کرنے میں۔ جس کے لئے وہ مخصوص رہا۔ جس محبت کا مکاشفہ مسیح میں

علاوہ اس کی بیرون از قیاس دولت کو ڈھونڈے اور اس کے عمق کا پتہ لگائے۔ اس کے
مرکب اور پیچیدہ جملوں سے ظاہر ہے کہ اُسے کیسی دلی محنت کرنی پڑی (مثلاً دیکھو
رومیوں ۵: ۱۲ سے ۲۱ + گلتیوں ۲: ۳ سے ۱۰ + یا افسیوں ۱: ۳ سے ۱۴)۔ اس کے
جلدی اور جوش کی وجہ سے کبھی وہ اپنا کلام ختم کرنے نہیں پاتا اور ہم کو سانس لینے
نہیں دیتا جب تک کہ ہمیں دوسرے سرے تک نہ پہنچا دے اور جو اعلےٰ خیال
اس کے دل میں تھا وہاں تک نہ لے جائے۔ اس وقت وہ دشوار گزار راہ ہمارے
سامنے صاف نظر آنے لگتی ہے۔ دینی خیال میں مقدس پولس نے بڑا دل کا کام
دیا۔ اس نے غیر قوموں کے عقل و ضمیر کے سامنے انجیل کی صداقت کا راہ کھول دیا
اس مشکل کام کا نشان اس کی تحریرات پر نقش ہو گیا جیسے لنگڑی ران کشتی میں یعقوب
کی فتح کا نشان تھا۔ یہ شخص نہ صرف ایک صاحب فکر تھا بلکہ جدت طبع سے بھی ملبس تھا
بعض اوقات مقدس پولس کی طرز تحریر میں پیچیدگیوں کی یہ وجہ تھی کہ وہ خیالات
کے مختلف سیلابوں کو اپنی پھرتیلی طبیعت کے ذریعہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ (مثلاً دیکھو
۱-کرنتھی ۴: ۱۴ سے ۲۱ + ۲-کرنتھی ۵: ۱۱ سے ۱۵ + ۷: ۵ سے ۹ + گلتیوں ۴: ۱۲ سے ۲۰)
منطق اور روح، جذبہ اور شدت خیال اس کے کلام میں ایسے امتزاج یافتہ ہیں کہ
عجیب طرح کی نرمی ملائمت اور مضبوطی اس میں پائی جاتی ہے۔ اس کے خیالات
کی کثرت اور دباؤ کی وجہ سے کبھی کبھی حرف و نحو کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ البتہ جن خیالات
کو وہ ظاہر کیا چاہتا ہے وہ صاف و روشن ہیں۔ مقدس پولس کی تعلیم کے جو خاص
خیالات تھے جن کو ہم نام شب (Watch words) سے موسوم کر سکتے
ہیں ان کو ایسا لباس پہنایا گیا تاکہ وہ ہمیشہ تک قایم رہیں ۔

چونکہ مقدس پولس ترسس کا باشندہ تھا۔ اس لئے وہ بچپن ہی سے یونانی
کا علم رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے نفیس یونانی محاورے بلا تکلف استعمال کئے

ہیں۔ البتہ جب یونانی زبان میں اُس نے خط لکھے وہ اس وقت کی کتابی یونانی
نہ تھی بلکہ روزمرہ کی بول چال کی یونانی۔ اس یونانی لباس کے اندر عبرانی روح
اور مزاج بھی تھی۔ ساؤل نے لڑکپن میں گملی ایل کے قدموں پر تعلیم پائی تھی
(اعمال ۲۲: ۳)۔ اور اس کی طبیعت نے ربیوں کے سکول میں تربیت حاصل کی
تھی (گلتیوں ۱: ۱۴)۔ اُس نے عہد عتیق کی زبان اور خیالات کو آزادانہ استعمال کیا
اور ستروں کا جو یونانی ترجمہ اس وقت مروج تھا اُسے استعمال کیا گو وہ اس میں لکیر
فقیر بنا نہیں رہا۔ ہمارے خداوند یسوع نے تو استعارے اور تشبیہات عموماً فطرت
کے باغ سے لئے لیکن مقدس پولُس نے شہری زندگی اور انبوہ مردماں سے۔ اس
رسول کی طبیعت بہت زرخیز اور مصورانہ تھی جن جن گروہوں میں یہ خط پالے جاتے
ہیں اُن کے خواص الگ الگ ہیں۔ اس نے اپنی ہی طرز و طریقے اور محاورے استعمال
کئے اور کسی کا نٹے چھانٹے محاورات کا پابند نہیں رہا۔ اس کی تقریر میں اُس زمانہ
کی کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور جن کو اس نے مخاطب کیا ان کی حالت کے وہ
عین موزون ہیں۔ اس معاملہ میں رومیوں کے خط کی شاندار اور قاطع براہین کے
ساتھ گلتیوں کے خط اور کرنتھیوں کے پہلے اور دوسرے خطوں کی نشتر، سختی اور
دلسوزی کا اور پہلے تھسلنیکیوں اور فلپیوں کے خط کی پُر محبت صاف دلی اور
بے تکلفی کا اور فلیمون کے چھوٹے خط کی آشنائی کے ساتھ مقابلہ کرو۔

۳۔ **خطوں کا مضمون۔** مقدس پولُس کے خط اس زمانہ کے خطوں کے
طریق پر لکھے گئے۔ "فضل اور اطمینان"، سلام کا معمولی طریقہ تھا اور جہاں کہیں اس
سلام کو توسیع دی گئی تو اس سے اُس خط کا خاص مضمون ظاہر کیا گیا مثلاً رومیوں
اور گلتیوں کے خطوں میں۔ بعد ازاں مکتوب الیہم کے ایمان کے لئے خدا کا شکر ادا
کیا گیا سوائے گلتیوں کے خط کے۔ اور اس کے بعد ایک مناسب دعا پائی جاتی

ہے۔ افسیوں کے خط میں ابتدائی تعریف اور دعا کو ایسی توسیع دی گئی کہ خط کا
ایک بڑا حصہ اسی سے بھرا ہے۔ اور دیباچے کے بعد کاتب کا مقصد نظر آنے لگ جاتا
ہے۔ جہاں اس کا مقصد علم الٰہیات ہے تو وہاں کسی اصول کی تشریح ہوگی (دیکھو
رومی ۱: ۱۶ و ۱۷؛ کلسیوں ۱: ۱۵ وغیرہ) اس صداقت کی حسب موقعہ تشریح کی جاتی
ہے۔ اور اُس تشریح کے بعد عملی نصیحتیں پیش کی جاتی ہیں۔ پھر خط کے آخر میں شخصی خبریں
اور پیغام اور سلام اور کلمہ برکت آتے ہیں۔ تعلیمی خطوں کا یہی سلسلہ ہے (رومیوں۔
گلتیوں۔ افسیوں، کلسیوں اور تھسلنیکیوں)۔ اور جہاں کہیں مصنف کا مقصد شخصی اور
عملی ہے وہاں یہ ترتیب پائی نہیں جاتی۔ حسب موقعہ جن تشریحات، تکرارات
وغیرہ کی ضرورت پڑی اُن کو اُس نے تحریر کیا۔ اور عام بیانات کو اس کے بعد۔
الٰہیات کے متعلق جہاں کہیں انجیل کے اصول کے ظاہر کرنے کی ضرورت پڑی چند
عبارتیں کہیں کہیں آئی ہیں۔ مثلاً فلپیوں کے خط اور کرنتھیوں کے دونوں خطوں کا
یہی حال ہے۔

خطوں کے مضامین کو مفصلہ ذیل عنوانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں شخصی۔ الٰہیات۔
اخلاق۔ انتظامی اور عبارتی۔ یہ اجزا کامل آزادگی سے باہم ملائے گئے ہیں اور
اُن میں کوئی حد فاصل کھینچ نہیں سکتے۔ جس نسبت سے یہ مضامین کسی خط میں آتے
ہیں اور جس قدر ایک کو دوسروں پر فوق دیا گیا ہے اُس سے ہر خط کی خصوصیت
معلوم ہو سکتی ہے۔ رومیوں کا خط بحیثیت مجموعی علم الٰہیات (دیکھو جکل) کا خط ہے
کرنتھیوں کا دوسرا خط، فلپیوں اور فلیمون کے خط خاص کر شخصی ہیں۔ کرنتھیوں کے
پہلے خط اور چوپانی خطوط میں عملی اور انتظامی امور کا خاص کر ذکر ہے اور جس کے ساتھ
کہیں کہیں اخلاق اور تعلیمی امور کا بھی ذکر آیا ہے۔ تھسلنیکیوں کے پہلے خط میں شخصی
اور اخلاقی عنصر کا زیادہ غلبہ ہے۔ تھسلنیکیوں کے دوسرے خط کلسیوں اور افسیوں

ے خطوں میں تعلیمی اور اخلاقی مضامین نے میدان سنبھالا ہے اور فلپیوں کے خط میں عبادتی خیالات میں بھی ترقی کا اظہار ہے۔ کلسیوں کے خط میں شخصی تعلیمی و جدلی اور اخلاقی تینوں مضامین مخلوط ہیں۔ البتہ تعلیمی و جدلی مضمون باقی دو پر ترجیح لے گیا ہے۔

بابوں اور آیتوں کی تقسیم۔ یہ زمانہ حال نے سہولیت کی خاطر کی ہے اور جو ناظرین مقدس پولس کی تحریرات کو سمجھنا چاہیں وہ اسے نظر انداز کریں۔ نئے ترجمہ میں جو پیرے گراف کا انتظام ہے وہ قابل ترجیح ہے۔ مطالعہ کے لئے مناسب ہے کہ خط کا ایک خاکہ کھینچا جائے اور جو مشکل جملے آتے ہیں اُن پر نشان کر دیا جائے تاکہ پیچھے ان پر غور کی جائے اور سارے خط کو اول سے آخر تک پڑھیں تاکہ اس کے مضمون کا نقشہ دل پر جم جائے اور اسے اسی طرح پڑھیں جیسے کسی دوست کے خط کو پڑھا کرتے ہیں۔ اور خط کے خاص خاص مقاموں پر توجہ کریں تاکہ اصل مقصد ذہن نشین ہو۔

۴۔ خطوں کا سلسلہ اور تعلق۔ مقدس پولس کے خطوں کا مسلمہ سلسلہ قدیم زمانہ سے چلا آیا ہے۔ شروع میں یہ خط ایک جلد میں مجلد ہوا کرتے تھے اور عبرانیوں کا خط بھی اُن میں شامل تھا اور اس جلد کا یہ نام تھا ”رسولی“ اور ہر خط کا الگ الگ نام دیا گیا تھا مثلاً رومیوں کے نام کا خط، کرنتھیوں کے نام کا پہلا خط وغیرہ۔ پہلے وہ نو خط تھے جو سات کلیسیاؤں کے نام لکھے گئے۔ پھر وہ چار خط جو تین دوستوں کے نام لکھے گئے۔ ان دونوں فصلوں کی ترتیب ان کی ضخامت اور اہمیت کی وجہ سے تھی نہ کہ زمانہ کے لحاظ سے۔

(ا) مسلمہ سلسلہ کے پہلے چار خط ہیں: کرنتھیوں کا پہلا اور دوسرا خط اور رومیوں کا خط جو چند ماہ کے بعد ہی لکھا گیا۔ گلتیوں کے خط کی تحریر کے سن کے بارہ میں تکرار ہے۔ لیکن سیرت اور مضمون کے لحاظ سے [illegible] اور رومیوں

سے مشابہ ہے (۵۵ء یا ۵۶ء)۔

(ب) اس کے بعد تین خط ہیں اور ایک رقعہ فلیمون کے نام کا ہے۔ یہ دوسرا گروہ ہے۔ اس میں یہ خط داخل ہیں۔ کلسیوں اور افسیوں کے نام کے خط ایک ہی وقت میں لکھے گئے اور توام خطوط ہیں اور فلیمون کا خط بطور رقعہ کے شخصی خط ہے۔ فلپیوں کا خط سیرت میں بھی اور مقام کے لحاظ سے بھی کچھ مختلف ہے۔ اس بارہ میں اختلاف رائے ہے کہ آیا ان سے پہلے لکھا گیا یا پیچھے لکھا گیا۔ یہ چاروں خط روم کے قید خانے سے لکھے گئے۔ فلپیوں کا خط تو بالیقین اور باقی تقریباً یقیناً، سنہ ۶۱ء–۶۳ء میں پولس کی پہلی اسیری کے وقت۔

(ج) تھسلنیکیوں کا پہلا اور دوسرا خط جو صرف چند ماہ کے فاصلے سے لکھے گئے وہ مقدس پولس کی موجودہ تحریرات میں سے سب سے پہلی تحریریں ہیں جو رسول کے تھسلنیکے میں جانے سے تھوڑی دیر بعد لکھے گئے (اعمال ۱۷)۔ اس وقت پولس اپنے دوسرے مشنری سفر کے وقت کرنتھس میں محنت کر رہا تھا۔ غالباً سنہ ۵۰ء یا ۵۱ء میں (اعمال ۱۸)۔

(د) تین چوپانی خطوط اس امر کو مان لیتے ہیں کہ جن الزاموں کے خلاف پولس نے فیلکس کی عدالت میں قیصر کی دہائی دی تھی (اعمال ۲۵) اُن سے وہ رہا ہو گیا تھا اور کچھ عرصہ تک وہ مشنری خدمات میں لگا رہا۔ جن کا ذکر اعمال کی کتاب میں پایا نہیں جاتا اور وہ دوبارہ گرفتار ہوا اور روم میں اس کی شہادت کا وقت قریب آ پہنچا تھا (۲ تیمتھیس)۔ ان کی تاریخ سنہ ۶۷ء بتائی جاتی ہے بایں خیال کہ یہ رسول نیرو قیصر کی بڑی ایذا رسانی میں مارا گیا یا سنہ ۶۴ء کے قریب ان لوگوں کے خیال کے مطابق جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طوفان سے بچ نکلا اور دیر تک آزاد رہا۔ اور ان چوپانی خطوط میں اس آزادی کے زمانہ کا پتہ ملتا ہے۔ ان خطوں کی ترتیب یہ ہے: ۱ تیمتھیس۔ ططس۔ ۲ تیمتھیس۔

ج ا ب د۔ ان چار گروہوں کی تاریخی ترتیب ہے۔ اور تقریباً سولہ سال کے عرصہ میں تحریر ہوئے (ج) سنہ ۵۰ء و ۵۱ء (ا) سنہ ۵۵ء سے ۵۷ء (ب) سنہ ۶۱ء–۶۳ء

اور د) ۶۳ء یا ۶۴ء کے قریب۔

۵۔ اِن خطوں میں خیال کا سلسلہ۔ مقدس پولس کی زندگی کے آخری

حصہ میں اُس کے خیال کا عام سلسلہ اُس کے خطوں کے مختلف گروہوں سے آشکارا ہے۔ جب ان میں سے سب سے پہلا خط لکھا گیا تو مقدس پولس اپنی خدمت کے وسط میں تھا۔ اور کم از کم چودہ سال سے مسیحی اور انجیل کا مبشر رہ چکا تھا۔ اس کی عقل پختہ اور اس کی تعلیم ساری ضروری باتوں میں مکمل تھی۔ جس ترقی کا سراغ ان خطوں میں ملتا ہے گو کہیں اندرونی تجربہ کی تبدیلیوں کا بھی اظہار ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول کی رسالت میں ترقی ہوئی۔ کلیسیائیں بڑھتی گئیں اور کئی مصیبتوں اور آزمائشوں میں سے اس کو گزرنا پڑا۔ اثنائے زمانہ میں اُس کے خیالات روز افزوں زیادہ ماشر اور معلم کے ہوتے گئے۔ بجائے منشری اور مبشر کے۔ مقابلہ کرو۔ پہلے تھسلنیکیوں کے شروع کا تیمتھیس کے آخری سلسلہ سے۔ غیر قوموں کے رسول اور کلیسیا کے بانی ہونے کی حیثیت سے اُسے تین بڑے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلا حملہ تو اُن یہودی مسیحیوں کی طرف سے ہوا جو ذہنی مزاج تھے۔ اور سارے مسیحیوں کو موسیٰ کی شریعت کے ماتحت لانا چاہتے تھے۔ دوسرا ایسے شخصوں کی طرف سے جو پھر پہلی بت پرستی اور بد چلنی کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ ان خطوں کے دوسرے گروہ میں پہلی جنگ و جہد کا پتہ لگتا ہے جس لڑائی میں پولس کا اختیار آخر کار مان لیا گیا اور اس کی یہ خاص تعلیم ترقی کر گئی کہ آدمی ایمان کے ذریعہ راستباز ٹھہرتا ہے۔ اور نجات صلیب کے وسیلہ سے ہے۔ گلتیوں کے خط میں۔ یہ تعلیم اپنے عروج تک پہنچ گئی اور رومیوں میں اس مباحثہ نے آخری عملی صورت اختیار کی۔ اس عرصہ میں کرنتھیوں کے پہلے اور دوسرے خط سے صاف پتہ لگتا ہے کہ نو مریدوں کو بت پرستی میں دوبارہ گر پڑنے کا بڑا خطرہ تھا۔ تھسلنیکیوں کا پہلا خط ابتدا میں اور افسیوں کا خط مابعد میں اسی امر کے شاہد ہیں کلسیوں میں ایک اور عجیب قسم کی غلطی نے سر

نکالا۔ اور وہ برائیاں دوبارہ رونما ہوئیں جن پر چوپانی خطوط نے ملامت کی تھی۔ یعنی یونانی فلسفہ کا مسیحی صداقت کو اُلٹ دینا (کلسیوں ۲: ۸۔۲۳ + ۱۔ تیمتھیس ۶: ۲۰)۔ انہیں غلطیوں سے دوسری صدی کی گناسٹک بدعتیں پیدا ہوئیں۔ اس تعلیم کا چشمہ یہ تھا کہ مادہ سراسر بد ہے۔ اور اس لئے یہ مادی جہان خدا سے جدا ہے۔ اگر یہ رائے درست ہو تو حقیقی تجسم اور کفارہ کی گنجائش نہیں رہتی اور مسیحی دین کے سارے اخلاق کو اُلٹ پلٹ کر دیتی ہے۔ اس کی تاثیر کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ کرنتھس میں بدنی قیامت کا بھی انکار کرنے لگے (۱ کرنتھی ۱۵ باب) (اس گناسٹک تعلیم نے کبھی تو ریاضت کی صورت اختیار کی (کلسیوں ۲: ۲۰ سے ۲۳ + ۱ تیمتھس ۴: ۳ سے ۵)۔ اور بعض اوقات اخلاقی میں خلاف شرع (۲ تیمتھس ۳: ۱ سے ۹ + طیطس ۱: ۱۰ سے ۱۶)۔ اس تعلیم میں کچھ یہودی عناصر بھی آگھسے اور اسی وجہ سے غالباً یہ کوشش کی گئی کہ اسینی یا اسکندریہ کی یہودی صوفی کے مطابق انجیل بنائی جائے۔ چونکہ نجات کے بارہ میں مقدس پولس کی تعلیمات شرعی مباحثہ کے لحاظ سے لکھی گئیں (گلتیوں اور رومیوں کے خطوط) اس لئے ابتدائی گناسٹک تعلیم نے اپنی مخالفت کی وجہ سے اس امر پر مدد دی کہ مسیح کی شخصیت اور کلیسیا کی حقیقت کے مسئلہ کو ترقی دے اور اخلاقی اصولوں کو تکمیل تک پہنچائے (کلسیوں افسیوں۔ اور فلپیوں کے خط)۔

۶۵ء میں جب سخت بیماری میں پولس مبتلا ہوا۔ یعنی اُس عرصہ کے درمیان جو کرنتھیوں کے پہلے اور دوسرے خطوں کے درمیان گزرا۔ وہ اس کی زندگی کا نازک وقت تھا اور اُس کی آئندہ کی رایوں پر اُس نے بہت اثر کیا۔ پیشتر اس نے لکھا تھا کہ گویا وہ خداوند کی آمد کا اسی پشت میں منتظر تھا۔ (۱ تھسلنیکیوں ۴: ۱۵ سے ۱۷ + ۱ کرنتھی ۷: ۲۹ سے ۳۱ + ۱۵: ۵۲)۔ گو اُس نے کوئی خاص وقت اور محدود زمانہ بتانے سے پرہیز کیا (۱ تھسلنیکیوں ۵: ۲ + ۲ تیمتھس ۲: ۱ وغیرہ)۔ اس وقت سے لیکر وہ اپنی

موت کا ذکر کرنے لگتا ہے اور مسیح کی دوسری آمد کا خیال پس پشت ہوتا جاتا ہے اور کلیسیا اور انسانیت کی ترقی کا خیال بڑھتا جاتا ہے (دیکھو ۲ کرنتھی ۱: ۹ + ۵: ۱ سے ۸ + فلپیوں ۱: ۲۱ سے ۲۳ + ۲ تیمتھیس ۴: ۶ + افسیوں ۲: ۷ + ۱ تیمتھیس ۱: ۱۶ + ۲: ۶ + ۲ تیمتھیس ۲: ۲)۔ روم کی تاثیر نے بھی پولس کے خیال اور کام کی تائید کی۔ بے دین قیصر کے لی گولا (۳ سے ۱۲) اور ایشیا کوچک میں قیصر پرستی نے ۲ تھسلنیکے ۲ باب کے مخالفِ مسیح کے راز کو پیش کیا۔ برعکس اس کے مقدس پولس کا جو تصور عالمگیر کلیسیا کے بارہ میں تھا جس کا سر خود مسیح ہے اُس نے اس کے سامنے ایک عالمگیر سلطنت کا نظارہ کھول دیا۔ اس کی رسالت ایک شاہی اندازے پر ٹھیرائی گئی۔ اُس نے رومی تجارتی منڈیوں اور سلطنت کے دار الخلافوں اور صدر مقاموں میں کلیسیاؤں کی بنیاد ڈالی۔ جب پولس اپنی لڑائی لڑ چکا (۲ تیمتھیس ۴: ۷) اور اپنی دوڑ کو تمام کیا۔ اس وقت تک اُس نے سوریہ سے ہسپانیہ تک ہر جگہ انجیل سنائی اور غیر قوم سوسائٹی کے ہر درجے میں غلام سے قیصر تک اُس نے یہ خوشخبری دی۔ ظاہری ترقی کے ساتھ اس کی تعلیم بھی ترقی کرتی چلی گئی۔ مسیح کے راز کی تہ تک اُس کی رُوح نے غوطہ مارا۔ اس کے الہامی منطق اور زورِ طبیعت نے یہودیت اور غیر قوم برگشتگی پر انجیل کو غلبہ دیا۔ اور رفاہِ عام کی مخالفت کو توڑ ڈالا۔ اُس نے یہ سمجھ لیا کہ قوموں کے لئے وہ مسیح کا ایلچی تھا۔ ایمان و صداقت میں وہ غیر قوموں کا معلم تھا (۱ تیمتھیس ۲: ۷) اس کی تعلیم اُن کلیسیاؤں میں گویا مجسم تھی جو ساری سلطنت میں پائی جاتی تھیں۔ انجیل کی مداومت اور نوعِ انسان کے درمیان اس کی اشاعت کا ذمہ اُٹھا لیا تھا۔ ایک ستون اور بنیاد قائم کر دی گئی جس پر یہ صداقت ہمیشہ تک قائم رہے گی (۱ تیمتھیس ۳: ۱۵) +

۶۔ خطوں کی خصوصیت۔ خطوں کے ان چار گروہوں میں خیال کی معمولی

اور سرگرمی بتدریج کمال تک بڑھتی جاتی ہے۔ (۱) قبل از دوپہر کے (۲) دوپہر کے (۳) سہ پہر کے (۴) شام کے خطوط +

(۱)۔ **۱۔ تھسلنیکے کا پہلا خط۔** ایک مشنری خط نوجوان مریدوں کے لئے جن کو اُس نے ایمان میں بچہ چھوڑا تھا۔ اس میں اُن کی پُر محبت یاد۔ اور ان کے لئے آرزو کا ذکر ہے۔ ان مریدوں کو تسلی اور ترقی کی تعلیم دی اور تکرار و مباحثہ کا ذکر تک نہیں اور طرزِ عبارت بھی سلیس ہے۔ اس میں خاص آگاہی بُت پرستوں کی گندگی کے خلاف ہے (۴: ۱ سے ۸)۔ چونکہ مسیح کی دوسری آمد کی امید بہت شتابی کی جاتی تھی اس لئے اس غلطی کی اصلاح کی گئی (۴: ۱۳ سے ۵: ۱۱) + جس پوری "انجیل" کا بیان رومیوں کے خط میں پایا جاتا ہے اس کی طرف اشارہ۔ ۱ تھسلنیکے ۴: ۱۴ + ۵: ۹۔۱۰ میں ہے +

(۲) ۲ تھسلنیکے میں بھی اُس بے چینی کا ذکر ہے جو مسیح کی دوسری آمد کے بارہ میں کلیسیا میں پائی جاتی تھی (۱: ۵ سے ۲: ۱۲)۔ اور جس کی وجہ سے وہ لوگ دنیاوی کاروبار چھوڑ بیٹھے تھے (۳: ۶ سے ۱۵) +

۲۔ ۱۔ کرنتھیوں کا پہلا خط اطلاقاً صلیب کی تعلیم کا خط ہے۔ اور عملی طبقہ میں اُس کا وہی درجہ ہے جو رومیوں کے خط کا درجہ اثبات میں ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں (۱ سے ۶ باب) جو بیان ہے وہ اُن گھبرانے والی خبروں کی وجہ سے ہے جو کرنتھس سے ملی تھیں (دیکھو ۱: ۱۱ و ۱۳ + ۵: ۱)۔ اس کے دوسرے حصے میں (۷ سے ۱۶ باب تک) اُن سوالوں کا جواب ہے جو وہاں کی کلیسیا نے رسول سے پوچھے تھے۔ کلوری پر سے جو سرایت کنندہ روشنی چمکتی ہے۔ اُس روشنی میں رسول نے اُن اس سارے مسائل پر نظر ڈالی جو اُسے پیش آئے۔ یونانی حکمت اور کرنتھس کی بدکاری۔ کلیسیائی تفرقے اور حریف خادمانِ دین۔ عبادت میں بے ترتیبی۔

روحانی انعام اور اُن کا استعمال اور بگاڑ۔ اور تمدنی بڑے مسایل مثلاً بیاہ شادی غلامی اور امور خفیفہ مثلاً کھانے پینے کی ہدایات۔ بدن کا بحال ہونا۔ اور مُردوں کی حالت ان سب پر بحث کی گئی ہے اس لحاظ سے کہ آدمیوں کا رشتہ مسیح سے کیا ہے اور ان اصولوں پر جو "صلیب کے کلام" سے منتج ہوتے ہیں (۱: ۱۷ + ۲: ۲)۔ اس "کلام" میں یسوع کی قیامت کی صداقت کا ذکر معہ اُس کی موت کے (۱۵: ۳ و ۴) اور روح میں نئی زندگی اور مرنے والے اور سرفراز ہونے والے نجات دہندہ کے اتحاد (۱: ۳۰ + ۲: ۱۲ + ۳: ۱۶ + ۶: ۱۹ وغیرہ) شامل ہیں +

(ب) کرنتھیوں کا دوسرا خط۔ پولس کا معذرت نامہ۔ کرنتھیوں کے پہلے خط سے لیکر اب تک بہت کچھ وقوع میں آچکا تھا۔ "اندر جھگڑے باہر خوف"۔ پولس کی خطرناک بیماری (۱: ۹ + ۴: ۷ سے ۵: ۸)۔ ایک بغاوت جو بڑی مشکل سے فرو کی گئی اور اُس کی طرف وفاداری کے خیالات (۲: ۵ سے ۱۱ + ۷: ۲ سے ۱۶)۔ اُس کی تجاویز میں تبدیلی جس کی وجہ سے اُس پر تلون مزاجی کا الزام آیا (۱: ۱۵ سے ۱۸)۔ یہودی ایلچیوں کا جو اُس کے مخالف اور حریف تھے کرنتھس میں جانا۔ (۳: ۱ + ۱۰: ۱۲ + ۱۱: ۴ و ۱۲ سے ۱۵) + باب ۱ سے ۷ تک اُس جماعت سے مخاطب ہیں جن کے ساتھ اُس کی صلح ہوگئی تھی (دیکھو ۲: ۶)۔ کلیسیا کے سامنے اپنی خدمت کا یہی عذر اُس نے پیش کیا + ۱۰ سے ۱۳ باب۔ اپنے مخالفوں کے سامنے اپنی صفائی ثابت کی ۸ و ۹ باب جو ان دو حصوں کے بیچ میں آتے ہیں ان میں اس امر کی تاکید ہے کہ یروشلم کے لیے سخاوت سے چندہ دیں (۱۶ باب)۔ اس خط نے بہت خوش اسلوبی سے اس امر کو ظاہر کر دیا کہ پولس مسیح کا خادم اور آدمیوں میں آدمی تھا اور اس کے دل کے خزانے۔ اُس کی ذہانت

کی تیزی اور جوش اور اُس کی خوش مزاجی بخوبی آشکارا ہیں +

(ج) گلتیوں کی طرف کا خط شرعی پابندی کے مقابلہ میں انجیل کی صفائی وصداقت کا اظہار ہے "دوسری خوشخبری" (۱: ۶) کی منادی گلتیہ میں دلفریب طریقے سے کی گئی۔ کرنتھس میں یہودی مائل مسیحیوں نے پولس کے اختیار پر حملہ کیا۔ یہاں انہوں نے اس کی تعلیم پر الزام لگایا اور ختنہ پر زور دے کر کہا کہ کامل مسیحی درجہ کے لئے یہ لازمی ہے (۳: ۱ سے ۴ + ۵: ۳ و ۴)۔ یوں وہ غیر قوم ایمانداروں کو موسوی شریعت کے جوئے تلے لاکر ان کو یہودی دین کا جز بنانا چاہتے تھے شریعت پر زور دینے والے فریق نے مقدس پطرس اور یروشلم کی کلیسیا کے اختیار کو پیش کر کے کہا کہ پولس کو مسیح کا علم انہیں کے وسیلے حاصل ہوا ہے۔ پولس نے یہ بیان کر کے ان کی غلطیوں کو خشت از بام کر دیا کہ اس نے خود یسوع مسیح سے یہ اختیار حاصل کیا تھا اور غیر قوموں کے لیے آزادگی کی سند یروشلم کی کلیسیا سے حاصل کی ۲: ۱ سے ۵: ۱۲۔ سارے خط کا گویا مغز ہے۔ اور اس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ صرف مسیح مصلوب پر ایمان لانے کے وسیلے آدمی نجات پا سکتے ہیں اور موسوی شریعت کا درجہ بہت ادنے ۵: ۱۳۔ سے ۶: ۱۰ ایک اخلاقی وعظ ہے اور ناظرین کے قصوروں کی اصلاح کے لئے ہے اور ۶: ۱۱ سے ۱۶ اُس خط کا خلاصہ ہے۔ بلحاظ تاریخی دلچسپی اور قوت مباحثہ کے گلتیوں کا خط سارے خطوں میں اوّل درجہ رکھتا ہے +

(د) رومیوں کے خط نے سارے خطوں میں سے ایک خاص مقصد کو مدنظر رکھا ہے۔ نوع انسان کی نجات کے لئے جو خدا کی تجویز ہے اس کی یہ عالی شان تشریح ہے۔ مقدس پولس جلد روم کو جانے والا تھا اور وہاں وہ اپنے تئیں غیر قوموں کا رسول ثابت کیا چاہتا تھا۔ یہ کلیسیا جو چند سالوں سے موجود تھی اس میں اُس کے کئی ایک

دوست تھے (۱: ۵ و ۱۰ سے ۱۵ + ۱۵ : ۲۵ سے ۲۹ + ۱۶ : ۱ سے ۱۶)۔ اس نازک وقت میں اُس دوسری خوشخبری کے بالمقابل اُس نے پوری انجیل پیش کرنا چاہی یوں اُس نے اپنے جانے سے پیشتر روم میں تیاری کرنا چاہی اور حامیان شریعت کی تاثیر کو پیش قدمی کرکے ہٹانا چاہا۔ باب ۱ سے ۸ تک صلیب کے کلام کو اثباتی اور ہمدردانہ طریقہ سے مشرح کیا۔ جسے گلتیوں کے خط نے منفی اور مباحثہ کے طور پر پیش کیا تھا اور پہلے اور دوسرے کرنتھیوں نے اس کو تسلیم کر لیا تھا۔ ۹ سے ۱۱ باب میں اُس مشکل کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے انجیل کو رد کر دیا حالانکہ ان کے سامنے سب سے پہلے پیش کی گئی (۱: ۱۶)۔ رسول کے لئے یہ ایک مشکل معمہ تھا اور اس کی دلیل پر سخت اعتراض پیدا ہوتا تھا + ۱۲: ۱ سے ۱۵ ۔ ۱ اور ۱۳ باب میں مسیحی اخلاق کا خلاصہ بیان ہوا ہے اور ساتھ ہی خانگی اور تمدنی ہدایات ہیں کہ مسیح کی محبت کی شریعت کے ذریعہ بدن کی تقدیس کرو اور عقلوں کو بدل ڈالو۔ باقی سارا خط شخصی اور مقامی دلچسپی سے پُر ہے +

مذکورہ بالا چار انجیلی خطوط ہیں جن میں رسول کی تعلیم کا خلاصہ اور لُب لباب پایا جاتا ہے +

۳۔ (ا) کلسیوں کا خط۔ گلتیوں کے خط کی طرح یہ خط بھی مباحثہ سے پُر ہے۔ یہ خط مسیح کی سرافرازی کا خط ہے۔ وہ کلیسیا کا سر ہے کیونکہ وہ مخلوق جہانوں کا سر تھا (۱: ۱۵ سے ۲۰) جب ہم بخوبی سمجھ لیتے ہیں کہ فطرت اور فضل کے طبقات میں وہ سب پر فوق رکھتا ہے اور اس کے کفارہ کی وسعت غیر محدود ہے (۱: ۸ سے ۲۰ + ۲: ۹ و ۱۰)۔ اس لئے فرشتوں کے درمیانی ہوں اور اُن رسوم کی کچھ ضرورت نہیں جس غلطی میں مبتلا ہو کر کلسی مسیحی نجات دہندہ کے کام کی تکمیل کیا چاہتے تھے۔ دیکھو صفحہ ۲۶۰ اور کلسیوں کے خط کا دیباچہ۔ خط کے اخلاقی نصف حصہ میں (۳: ۱ سے ۴: ۶) بر فرض یہ

اس بنا پر زور دیا گیا کہ مسیح خداوند ہے اور خاندانی رشتوں پر بھی ایسا زور دیا گیا کہ اور خطوں میں ایسا نہیں (۳: ۱۸ سے ۴: ۱) مقابلہ کرو۔ صفحہ ۱۱۱ +

(ب) فلیمون کے خط کا علاقہ کلسیوں کے خط کے ساتھ ہے۔ یہ ایک عمدہ چھوٹے رقعہ کے طور پر ہے اور اس قسم کے اور بہت رقعے شاید اس نے لکھے ہونگے۔ اس سے مقدس پولس کی خانگی زندگی کی حقیقت کسی قدر منکشف ہوتی ہے اس میں اُس نے انیسمس کے آقا فلیمون سے درخواست کی کہ اپنے اس غلام کو پھر قبول کرے۔ یہ غلام بھاگ گیا تھا اور مسیحی ہو گیا۔ اس لئے اس کی درخواست ہے کہ "عزیز بھائی کی طرح" اُسے قبول کرو +

(ج) افسیوں کی طرف کا خط کلیسیا کے جلال کا خط ہے۔ اس میں کلیسیا مسیح کا بدن اور اُس کی دُلہن بیان ہوئی ہے۔ افسیوں اور کلسیوں کے خط خیال اور زبان میں مشابہ ہیں۔ افسیوں کا خط کلسیوں کے خط کی تکمیل اور تسلسل ہے۔ پھر بھی ایک خاص امر میں فرق ہے۔ کلسیوں کا خط مباحثہ سے پُر ہے۔ کبھی کبھی نشتر لگا دیتا ہے اور کبھی کبھی جلدی کے مارے بالکل موہوم سا خیال پیش کرتا ہے۔ افسیوں کا خط مقدس پولس کی تصنیفات میں بہت سنجیدہ اور وسیع معنی ہے۔ اُس نے کلسی غلطی کو اپنے دل سے خارج کر دیا اور وہ مسیح کے جلال اور کلیسیا پر دھیان کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ مباحثہ پیدا ہوا تھا۔ اخلاقی نصائح اور پند و وعظ میں (۴: ۱ سے ۶: ۲۰)۔ جس کے ساتھ کبھی کبھی الہیات کے خیالات بھی آمیختہ ہیں۔ افسیوں کا خط رومیوں کے خط سے مشابہ ہے اور تعلیمی اہمیت میں کلسیوں اور افسیوں کے خط رومیوں سے دوسرے درجے پر ہیں +

(د) فلپیوں کا خط سب سے زیادہ دلی شراکت کا خط ہے۔ اس کی سادگی اور آزادگی تھسلونیکیوں کے پہلے خط کو یاد دلاتی ہے۔ جیسے کرنتھیوں کے دوسرے

خط سے مصنف کی سیرت کی اعلیٰ شان ظاہر ہوتی ہے اور اُس کی خدمت کی فوق العادت قوتیں آشکارا ہوتی ہیں ویسے فلپیوں کے خط سے اُس کا باطنی ایمان اور مسیح کے ساتھ اس کی شراکت ہویدا ہے۔ رسول کی سوانح عمری کے لئے یہاں کئی ضروری امور ملتے ہیں۔ ۲: ۵ سے ۱۱ کی عبارت علم الٰہیات کے لئے اعلیٰ دلچسپی رکھتی ہے۔ مقدس پولس کے خطوں میں سے یہ سب سے زیادہ اطمینان سے پُر اور خوبصورت ہے +

۴۔ تین چوپانی خطوط کلیسیائی سیاست کے خطوط ہیں۔ تیمتھس کے پہلے خط اور طیطس کے خط میں پولس نے اپنے نمایندگاں کو جن میں سے ایک افسس میں تھا اور دوسرا کریتے میں بزرگوں (بشپوں) اور ڈیکنوں کے بارہ میں ہدایات لکھیں۔ ان ہدایات میں ان کی سیرت پر بہت زور دیا گیا۔ ان خطوں میں خود ان شخصوں کو حکم ہے کہ اپنے چال چلن کی خاص فکر کریں خاصکر بدعتی اور بدی کی تعلیم کے سامنے جو اب رواج پا گئی تھی۔ اسی قسم کی ہدایات معہ چند شخصی یادداشتوں اور پولس کی موت کی خبر کے تیمتھس کے دوسرے خط کا مضمون ہے۔ یہ الوداعی خطوط ہیں۔ "امانت کو حفاظت سے رکھ" اور ان باتوں کا فکر کر جو اس صحیح تعلیم کے شایان ہیں +

۷۔ تعلیم کا خلاصہ۔ الوہیت کا چشمہ (The Godhead)۔

"ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے یعنی باپ جس کی طرف سے ساری چیزیں ہیں اور ہم اُسی کے لئے ہیں" (۱ کرنتھی ۸: ۶)۔ یہ ایک خدا "ہمارے خداوند یسوع مسیح کا باپ ہے۔" اور اس کے وسیلے سے ہمارا باپ ہے "خدا اور انسانوں کے بیچ درمیانی بھی ایک یعنی مسیح یسوع ہے جو انسان ہے۔ جس نے اپنے آپ کو سب کے فدیہ میں دیا" (۱ تیمتھس ۲: ۵ و ۶)۔ مسیح باپ کے پہلو میں ایک ہی خداوند ہے یعنی یسوع مسیح جس کے وسیلے سے ساری چیزیں موجود ہیں اور ہم بھی اُسی کے وسیلے سے ہیں" (۱ کرنتھی

۸: ۶)۔ خدا کے بیٹے کی محبت اور "الوہیت کی ساری معموری اُسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے" (کلسیوں ۱: ۱۳ + ۲: ۹)۔ اُسی میں۔ چونکہ وہ انسان کی صورت میں ہو کر آیا۔ ایک کامل اور بے گناہ انسانیت ظہور پاتی ہے۔ (گلتیوں ۴: ۶ + فلپیوں ۲: ۷ و ۸ وغیرہ)۔ نوع انسان کی اغراض اور انجام نجات اور عدالت کے لئے اسی پر منحصر ہیں (رومیوں ۵: ۲۱ + ۲ کرنتھی ۵: ۱۰ وغیرہ)۔ آخرکار ہر گھٹنا اُس کے آگے ٹکیگا۔ اس وقت مسیح اپنی سلطنت خدا باپ کے حوالے کر دے گا اور بیٹا خود اُس کے تابع ہو جائے گا جس نے ساری چیزیں اُس کے تابع کر دیں تاکہ خدا سب میں سب کچھ ہو (فلپیوں ۲: ۱۰ و ۱۱ + ۱ کرنتھی ۱۵: ۲۴ سے ۲۸)۔ مسیح کی الوہیت الٰہی سرچشمہ کی یگانگت کو خراب نہیں کرتی بلکہ اُس کو ظاہر کرتی ہے اور روح القدس کی الوہیت کے بارہ میں بھی یہی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ رسول نے ۲ کرنتھی ۱۳: ۱۴ اور دیگر مقامات میں برکت کے کلمہ میں روح القدس کو باپ اور بیٹے کے ساتھ شامل کیا ہے۔ روح خدا ہے جو انسانی نفس (Soul)۔ اور کلیسیا میں بستا ہے (۱ کرنتھی ۲: ۱۲ + ۳: ۱۶ + ۶: ۱۹ + رومیوں ۸: ۲۶ + گلتیوں ۴: ۶ + افسیوں ۲: ۱۸ وغیرہ) وہ آدمیوں کے پاس خدا کے بیٹے کی روح کی حیثیت میں آتا ہے اور مسیح میں ان کے لے پالک ہونے کا وہ شاہد ہے۔ اور ان کی میراث کا بیعانہ۔ پاکیزگی کا وسیلہ، ساری انعاموں اور فضل کی قوتوں کا بخشنے والا (رومیوں ۸: ۱۴ سے ۱۷ + گلتیوں ۵: ۱۶ سے ۲۵ + ۲ کرنتھی ۱: ۲۱ و ۲۲ + افسیوں ۱: ۱۳ و ۱۴ + ۱ تھسلونیکیے ۴: ۷ و ۸ + ۱ کرنتھی ۱۲: ۴ سے ۱۱ وغیرہ)۔ چونکہ روح القدس نے یسوع کی قیامت میں تاثیر کی اس لئے وہ ان کے فانی بدنوں کے جلانے کا وسیلہ ہوگا جن میں کہ وہ بستا ہے۔ (رومیوں ۸: ۶ سے ۱۱)۔ فضل۔ خدا کا فضل ہمارے خداوند یسوع مسیح کا فضل یہی دین میں اس الٰہی سرچشمہ کی نمایاں صفت ہے +

گناہ اور نجات۔ سوائے ایک شخص یسوع مسیح کے جو خدا کا اپنا بیٹا ہے سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم رہے (رومیوں ۳: ۲۳ + ۸: ۳)۔ نوع انسان کے گناہ کے باعث خدا کا غضب نازل ہوا جس کی وجہ سے غیر قومیں اور یہودی اس شرمناک حالت تک پہنچ گئے (رومیوں ۱: ۱۸ سے ۳: ۲۰)۔ غیر تائب دل۔ اس قہر کے دن کے لئے اپنے واسطے غضب کما رہے ہیں۔ (رومیوں ۲: ۵ + ۱ تھس ۱: ۱۰ وغیرہ)۔ آدم سے لے کر ہماری نوع گناہ اور موت کی شریعت کی غلامی میں رہی ہے (رومیوں ۵: ۱۲ سے ۱۴ + ۷: ۲۳ و ۲۴ + ۸: ۲)۔ موسیٰ کی شریعت جس میں اس امر کا اظہار ہے کہ خدا کی عالمگیر شریعت جو ہر انسان کی ضمیر میں نقش ہے (رومیوں ۲: ۱۴ سے ۱۶ + ۳: ۱۹ + ۵: ۱۳)۔ وہ خطا کو روکنے کی بجائے اُسے تحریک دینے اور بڑھانے کا باعث ہوئی۔ (رومیوں ۳: ۱۵ + ۷: ۷ سے ۲۴ + گلتیوں ۳: ۱۹ وغیرہ)۔ وقت کے پورا ہونے پر جب شریعت اپنا کام پورا کر چکی تو مسیح نے ہمیں اُس کی لعنت سے چھڑایا۔ "جو گناہ سے واقف نہ تھا اُسی کو اُس نے ہمارے واسطے گناہ ٹھیرایا تاکہ ہم اُس میں ہو کر خدا کی راستبازی ہو جائیں" (گلتیوں ۳: ۱۳ + ۲ کرنتھی ۵: ۲۱)۔ ہمارے خداوند نے صلیب کی موت کے ذریعہ اپنے تئیں اپنے بھائیوں کی خاطر انسانی گناہ کے شرعی نتائج کے ماتحت کر دیا اور راستے راہ میں اُس پاک غضب کی برداشت کی جو خطاکاروں کو موت کی سزا دیتا ہے۔ یوں ایک سب کے لئے مُوا اور اپنے خون کے ذریعہ کفارہ بخش قربانی چڑھائی۔ اور اس کے وسیلے نوع انسان کا ملاپ (کفارہ) کرایا۔ اس امر کی اُس کی قیامت کے ذریعہ تصدیق ہو گئی۔ (رومیوں ۳: ۲۲ سے ۲۶ + ۴: ۲۵ + ۵: ۸ سے ۱۱ + ۲ کرنتھی ۵: ۱۸ و ۱۹)۔ جو ہمارے لئے موا اور جی اُٹھا اس پر ایمان لانا ہر فرد کو اس نجاتِ عامہ میں شریک کر دیتا اور خدا کے ساتھ اس کی صلح کرا دیتا ہے (رومیوں ۳: ۲۲ و ۲۵ + ۵: ۱ و ۲ + افسیوں

۲: ۱۳ سے ۱۸ وغیرہ)۔ ایمان گنہگار کا بھروسہ کرنے والا اور فرماں بردار ہاتھ ہے جس کے ذریعہ وہ خدا کے پھیلائے ہوئے ہاتھ کو مسیح میں جا پکڑتا ہے۔ اُس شخص کے بچانے میں جو یسوع پر ایمان لاتا ہے خدا کے فعل کو مُقدس پولس "راستباز ٹھیرانا" کہتا ہے۔ اِس سے اُس کی مراد محض منفی یعنی گزشتہ گناہوں کی معافی ہی نہیں بلکہ اثباتی مراد بھی ہے یعنی گناہگار شخص کو راستباز انسان کا درجہ دینا (رومیوں ۵: ۱۵ سے ۱۷) جو مسیح کی خاطر راستباز گنا جاتا اور ویسا ہی اُس سے سلوک ہوتا ہے۔ اس کے گزشتہ گناہ گویا کبھی وقوع میں آئے ہی نہ تھے۔ (رومیوں ۴: ۳ سے ۸ + ۲ کرنتھی ۵: ۲۱ + کلسیوں ۲: ۱۴) اور وہ گویا ایسی حالت میں رکھ دیا گیا تاکہ زندگی اور چلن میں راستباز ہو جائے" (رومیوں ۶: ۴ و ۱۸ + ۸: ۴)۔ پس راستباز ٹھیرنے سے مراد لے پالک بننا ہے۔ یعنی ایک اجنبی کا الٰہی خاندان میں شریک ہونا اور خدا کے بیٹے کی رُوح کا عطیہ حاصل کرنا۔ اور خدا کے فرزندوں کی میراث کا وارث ہونا (رومیوں ۸: ۱۴ و ۱۵ و ۳۱ و ۳۲ + گلتیوں ۴: ۴ سے ۷ + افسیوں ۱: ۵)۔ مسیح کے کفارہ کے لحاظ سے گنہگار کی یہ بحالی محض خدا کی طرف سے محبت کا ہی فعل نہیں۔ وہ عادل ہے گو وہ بے دین کو راستباز ٹھیراتا ہے (رومیوں ۳: ۲۶ + ۴: ۵)۔ اور اس کا یہ فعل اعلیٰ معنی میں شرع کے مطابق ہے (رومیوں ۳: ۲۷ سے ۳۱)۔ جو مخلصی مسیح یسوع میں ہے اُس میں بدن اور روح دونوں شامل ہیں۔ وہ اُس کے خون کے وسیلے خدا کے لئے خرید لی گئی ہیں (۱ کرنتھی ۶: ۲۰)۔ قبر میں سے بحال ہوئے یعنی آدمی کی نجات کی تکمیل کا پیمانہ اور گرو یسوع کی قیامت ہے (رومیوں ۴: ۲۴ + ۸: ۱۶ سے ۲۳ + افسیوں ۱: ۷ سے ۱۴ + ۱ کرنتھی ۱۵: ۲۰ و ۲۳ و ۴۵ سے ۵۷ + ۱ تھسلنیکی ۴: ۱ سے ۱۴ + ۲ تمیتھس ۱: ۱۰ وغیرہ)۔

مسیح میں نئی زندگی۔ مسیح کی موت میں ایمان کے وسیلے راستباز ٹھیرنے کے ذریعہ ایماندار زندہ مسیح کے ساتھ اتحاد رکھنے کے ذریعہ پاکیزہ بنتا جاتا ہے (رومیوں ۶: ۱ سے ۱۱)۔ مسیح میں جتنے ایماندار ہیں وہ "مقدس" ہیں (۱ کرنتھی ۱: ۲ + ۶: ۱۱ وغیرہ) خواہ وہ قدوسیت میں کیسے ہی ناقص ہوں۔ نجات بخش ایمان لانے کے ذریعہ ہی وہ خدا کے لئے مخصوص ہو گئے (رومیوں ۶: ۱۸ و ۲۲)۔ اور وہ آگے کو اپنے تئیں اپنا نہیں سمجھتے (۱ کرنتھی ۶: ۱۹ و ۲۰)۔ وہ عملاً خدا کے لئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس قدر ایمان اُن کو مسیح کے ساتھ ایک بنا دیتا ہے وہ پہلے اس کی موت کی مشابہت حاصل کرتے ہیں پھر اس کی قیامت کی (رومیوں ۶: ۴ سے ۱۱ + کلسیوں ۳: ۱ سے ۴ وغیرہ)۔ جو شخص مسیح یسوع میں ہے اُس کے لئے سارے انسانی رشتے اور دنیاوی ماجرے نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں (۲ کرنتھی ۵: ۱۵ و ۱۶)۔ وہ کسی کو محض جسم کے طور پر نہیں جانتا۔ کیونکہ وہ مرد روح ہے وہ اپنی عقل اور روح میں نیا ہو گیا ہے (افسیوں ۴: ۲۳ و ۲۴)۔ وہ ہر بات میں روحانی غرض اور مقصد رکھتا ہے (رومیوں ۸: ۹ + گلتیوں ۵: ۲۵ وغیرہ) مسیح کی شریعت کا لُب لباب یہ دو حکم ہیں خدا سے اور انسان سے محبت رکھنا اور یہی شریعت اس کی ساری زندگی کا دستور العمل ہے (رومیوں ۵: ۵ + ۱۲: ۹ وغیرہ)۔ ناپاکی سے اس لئے پرہیز کیا جاتا ہے کیونکہ اُس سے "خدا کی ہیکل" ناپاک ہو جاتی ہے (۱ کرنتھی ۶: ۱۹ + ۱ تھسلنیکیوں ۴: ۸)۔ جو لوگ ایک دوسرے کے اعضا ہیں ان کے لئے جھوٹ بولنا ناممکن ہے (افسیوں ۴: ۲۵)۔ نامہربانی مسیح کی خود قربانی کے نمونہ کے خلاف ہے (افسیوں ۴: ۳۱ + ۵: ۲)۔ صلیب کے کلام کا یہ اخلاقی نمونہ ہے۔ مسیحی شخص کے لئے خاندانی اور ملکی رشتے معدوم نہیں ہو جاتے بلکہ ایک گہرے معنی اور نئی تقدیس اختیار کر لیتے ہیں۔ بلکہ ان کا کھانا اور پینا

بھی خدا کے جلال کے لئے ہے (۱ کرنتھی ۱۰: ۳۱ + کلسیوں ۳: ۱۷ وغیرہ)۔ ساری اشیا اس کی خادم بن جاتی ہیں اور مل ملا کر اس کی بھلائی پیدا کرتی ہیں (۱ کرنتھی ۳: ۲۱ سے ۲۳ + رومیوں ۸: ۲۸ وغیرہ)۔ اپنے لئے اس کی اعلےٰ غرض یہ ہے کہ میں بالکل مقدس ہو جاؤں (۱ تھسلنیکیوں ۵: ۲۳)۔ اور اس وقت روح میں اور بعد ازاں بدن میں بھی اسکے ہم شکل بن جاؤں "خدا کے بیٹے کی صورت پر" (رومیوں ۸: ۲۹ + فلپیوں ۳: ۹ سے ۲۱)۔ دوسروں کے لئے وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ گناہ سے نجات حاصل کریں اور آخر کار مسیح میں کامل ہو کے خدا کے سامنے حاضر ہوں (رومیوں ۱۰: ۱ + کلسیوں ۱: ۲۸ + ۲ تمتھیس ۲: ۱۰ وغیرہ)۔ یوں اُس کی ساری ہستی مسیح میں جڑ پکڑتی اور تعمیر پاتی ہے اور اُسی میں ملبس ہے جو مخلصی یافتہ انسانوں کا سر اور روح ہے (گلتیوں ۲: ۲۰ + کلسیوں ۲: ۶ و ۷ + ۳: ۱۱ + افسیوں ۴: ۱۰ + ۲ کرنتھی ۸: ۹ + ۱۱: ۳ وغیرہ)۔

کلیسیا۔ مسیحی مخلصی تمدنی بھی ہے اور شخصی بھی "جس مسیح نے مجھ سے محبت رکھی اور اپنے تئیں دے دیا" (گلتیوں ۲: ۲۰ + افسیوں ۵: ۲۵)۔ خطوں میں جن مقدسوں اور ایمانداروں کا ذکر آیا ہے وہ سب کے سب مسیحی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اُسی کی اطاعت اُن پر لازم ہے (گلتیوں ۶: ۲ + افسیوں ۵: ۲۱ + ۱ کرنتھی ۱۲: ۱۲ سے ۲۷ وغیرہ)۔ "جس نے تمہیں اپنے بیٹے ہمارے خداوند یسوع مسیح کی شراکت کے لئے بلایا ہے" (۱ کرنتھی ۱: ۱۰)۔ پہلے خطوں میں فلاں فلاں مقامی کلیسیا کا ذکر تھا یا خدا کی کلیسیاؤں کا۔ رفتہ رفتہ پولس کے دل میں یہ تصور بڑھتا گیا۔ کلیسیا مسیح کا بدن۔ روح میں خدا کا مسکن۔ جس میں یہ جدا جدا کلیسیائیں داخل ہیں اور وہ سب بلا امتیاز اس میں شامل ہیں جو سر کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں (گلتیوں ۳: ۲۶ سے ۲۸ + کلسیوں ۳: ۱۱)۔ افسیوں کے خط میں یہ تصور اپنے کمال تک پہنچ گیا (۲: ۲۱ و ۲۲)۔ اور ایسا ہی چوپانی خطوط میں (۱ تمتھیس

۳: ۱۵ + ۲ تیمتھیس ۲: ۲۰)۔ کلیسیا مسیح کے لئے ایسی ہی ضرور ہے جیسے سر کے لئے بدن (افسیوں ۱: ۲۳ میں کلیسیا اس کی معموری اور تکمیل کہلاتی ہے۔ وہ اس کی پرورش کرتا ہے جیسے شوہر اپنی بیوی کی (افسیوں ۵: ۲۲ سے ۳۳)۔ اب کلیسیا دنیاوی۔ عارضی انجمن نہیں ساری پشتوں میں اور زمانوں کے زمانوں تک وہ مسیح کے جلال میں شریک ہے۔ اور خداوند کی آمد کے وقت اپنی پاکیزگی کی پوری شان کے ساتھ ظاہر ہوگی (افسیوں ۳: ۲۱ + ۵: ۲۷)۔ مسیحی امید کی یہ علت غائی ہے کہ ہم سب اُس کے پاس جمع ہونگے (۲ تھسلنیکیوں ۲: ۱ وغیرہ)۔

جو فضل افراد کو ملا ہے وہ سب کی ملکیت ہے۔ ہر مسیحی کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسروں کی چیزوں کا بھی خیال رکھے۔ اور محبت سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرے مسیح کے بدن کا کوئی کمزور سے کمزور عضو بھی بے فایدہ نہیں (افسیوں ۴: ۷ و ۱۶ و ۲۵ + گلتیوں ۵: ۱۳ + فلپیوں ۲: ۱ سے ۵ + ۱ کرنتھی ۱۲: ۱۴)۔ مسیح جس نے اپنے تئیں خالی کر دیا اور اپنے بھائیوں کی خاطر موت تک پست ہو گیا وہ مسیحی نمونہ ہے (رومیوں ۱۴: ۳ + فلپیوں ۲: ۵ سے ۸)۔ مختلف خدمتیں محض خاص خاص نعمتوں کے فایدہ عام کے لئے ہیں اور اسی مقصد کے لئے محبت کی روح سے ان کا استعمال ہونا چاہئے (۱ کرنتھی ۱۲: ۴ سے ۱۴: ۴۰ تک)۔ ان کی غرض یہ ہے کہ مقدسوں کو اُن کی خدمت کے کام کے لئے تیار و قابل کرے اور کلیسیا کی ساری عمارت کے وسیلے باہمی ترقی کا وسیلہ ہو (افسیوں ۴: ۱۱ و ۱۶)۔ اسی وجہ سے جب مقدس پولس نے تیمتھیس اور طیطس کو کلیسیائی عہدے داروں کے مقرر کرنے کے لئے ہدایت کی تو اُس نے ایمان پر خاص زور دیا نہ لیاقت پر۔ مسیحی اُستادوں اور چوپانوں کو گلہ کے ایمانداروں پر کوئی خداوندیت حاصل نہیں۔ وہ خدا کی نظر میں انسانی ضمیر کے مطابق ہونے چاہئے (۱ کرنتھی ۱۰: ۱۵ + ۲ کرنتھی

۱: ۲۳ + ۴: ۲ + ۲ تیمتھیس ۲: ۱۵)۔ مسیح کے تخت عدالت کے آگے وہ خدا کے بھیدوں کے خادم اور مختار کار کی طرح حساب دینگے (۱ کرنتھی ۴: ۱ سے ۴ + ۲ کرنتھی ۵: ۹)۔ مسیح کے ساتھ وفاداری۔ مسیح کا سا مزاج رکھنا اور انسانوں کے لئے محبت جس کے ذریعہ بے حد خود انکاری کرنی پڑتی ہے۔ انجیل کے خادم کی خاص صفات ہیں۔ (۱ کرنتھی ۲ سے ۴ و ۹ + ۲ کرنتھی ۱۲: ۱۵ + رومیوں ۱: ۱۴ و ۱۵ + ۹: ۳)۔ رسول نے بپتسمے اور عشائے ربانی کی رسوم پر بڑا زور دیا ہے ان کی تعلیمی اہمیت اور تاثیر کے لئے (رومیوں ۶: ۳ و ۴ + ۱ کرنتھی ۱۰: ۱۶ + ۱۱: ۲۳ سے ۳۴) اور اپنے انتظام پر وہ چنداں زور نہیں دیتا (۱ کرنتھی ۱: ۱۶ و ۱۷)۔

خدا کی سلطنت اور تکمیل۔ خدا اور مسیح کی سلطنت کا تصور کلیسیا کے تصور سے کچھ اونچا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن یہ تصور رسول کے خیال سے کبھی جاتا نہیں رہا۔ اس نے اس سلطنت کا تصور وہی پیش کیا جو عہد عتیق کی پیشگوئیوں میں پایا جاتا تھا اور جسے یسوع نے مانجھ کر زیادہ صاف کر دیا تھا۔ اس کلیسیا میں خدا کی سلطنت کے شہری داخل ہیں (افسیوں ۲: ۱۹ + فلپیوں ۳: ۲۰)۔ اس سلطنت میں وہ کل انتظام داخل ہے جسے خدا کی مرضی نے مسیح میں مقرر کیا اور اس میں زندگی کے طبعی اور دنیاوی طبقات شامل ہیں کیونکہ یہ سب فضل کے انتظام کے ساتھ وابستہ ہیں (رومیوں ۱۳: ۱ سے ۵ + کلسیوں ۳: ۲۲ سے ۴: ۱ + ۱ تیمتھیس ۴: ۳ سے ۵ + ۶: ۱۵)۔ خلقت اور مخلصی ایک ہی نظام کا جز ہیں۔ اور مسیح ان میں رشتہ اتحاد ہے (کلسیوں ۱: ۱۵ سے ۱۸)۔

خدا کی سلطنت کی تاریخ زمانوں کے پوشیدہ مقصد کا اظہار ہے۔ جسے خدا نے اپنی ہمہ دان حکمت میں ٹھیرایا تھا اور جو اس کی مرضی کی خوشنودی کے مطابق عملی صورت پکڑتا ہے۔ اس مقصد کا مرکز مسیح کی رسالت ہے اور نوع انسان کے درمیان

انجیل کی منادی کے ذریعہ منکشف ہو جاتا ہے (رومیوں ۱۶: ۲۵ سے ۲۷ + افسیوں ۳: ۲ سے ۱۱ + ۲ تیمتھیس ۱: ۹ و ۱۰ وغیرہ)۔ اس سلطنت کا تخت دل ہے (رومیوں ۱۰: ۱۰ + ۲ کرنتھی ۴: ۶ + فلپیوں ۳: ۱۵)۔ اس کی قدرت روح کی قدرت ہے اس کی دولت روح القدس میں راستبازی اطمینان اور خوشی ہے (۱ کرنتھی ۲: ۴ + ۴: ۲۰ + رومیوں ۱۴: ۱۷)۔ البتہ اس کی غرض یہ ہے کہ سارے دنیاوی کاروبار پر حکمران ہو (۱ کرنتھی ۳: ۲۱ و ۲۲ + ۶: ۲ + ۱۵: ۲۵)۔ اور خدا کے فرزندوں کے ساتھ فطرت کو بھی فنا کے قبضے سے آزاد کرے (رومیوں ۸: ۱۹ سے ۲۳) شیطانی قوتیں جو بت پرستوں اور بد لوگوں میں سلطنت کرتی ہیں وہ خدا اور مسیح کی دشمن ہیں (افسیوں ۶: ۱۰ سے ۱۳ + ۱ کرنتھی ۱۰: ۲۰ سے ۲۲ وغیرہ)۔ یہ تاریکی کی حکومت ہے اور خدا کے بیٹے کی محبت کی سلطنت سے برسرِ پرخاش ہے (کلسیوں ۱: ۱۳)۔ اور اُن کا انجام تباہی مطلق ہے۔ موت جو مسیح کا آخری دشمن ہے وہ بھی نیست ہو گی۔ (۱ کرنتھی ۱۵: ۲۶ و ۵۴ سے ۵۷ + ۲ تیمتھیس ۱: ۱۰)۔

اس رسول نے خدا کی بادشاہت کا اس کے آئندہ کمال کے لحاظ سے اکثر ذکر کیا ہے کہ جس کی امید رکھنی چاہئے اور جو میراث میں ملے گی (۲ تیمتھیس ۱: ۵ + ۱ کرنتھی ۶: ۹ وغیرہ)۔ "دنیا کی شکل بدلتی جاتی ہے" (۱ کرنتھی ۷: ۲۹ و ۳۱)۔ ہمارے خداوند یسوع مسیح کے ظہور یا آمد کے وقت یہ نابود ہو جائے گی (۱ کرنتھی ۱: ۷ + ۲ کرنتھی ۵: ۱ + ۱ تھسلنیکیوں ۳: ۱۳ + ۲ تھسلنیکیوں ۲: ۱ وغیرہ)۔ تب خدا کی سلطنت اپنے جلال میں ظاہر ہو گی (۱ تھسلنیکیوں ۲: ۱۲ + اس جہان میں سے خدا کے جلال کا ظہور گویا یہ نکلے گا (رومیوں ۵: ۲ + ططس ۲: ۱۳) اور اُس تخت نشین مسیح کی ذات میں مجتمع ہو گا (فلپیوں ۲: ۱۱ + ۲ تھسلنیکیوں ۲: ۸ و ۱۴ + ۱ تیمتھیس ۶: ۱۴)۔ لیکن بعضوں کے لئے مسیح کا ظہور شرم اور تباہی کا باعث ہو گا (۱ تھسلنیکیوں ۵: ۲ و ۳ + ۲ تھسلنیکیوں ۲: ۸ سے ۱۰)۔ وہ دوسری دفعہ بحیثیت منصف کے آئے گا اور کیونکہ

ضرور ہے کہ مسیح کے تخت عدالت کے سامنے جا کر ہم سب کا حال ظاہر کیا جائے" (۱ کرنتھی ۴: ۵ + ۲ کرنتھی ۵: ۱۰ + رومیوں ۲: ۱۶)۔ بے توبہ لوگوں کے لئے "خداوند کا دن" غضب اور خدا کی راستباز عدالت کے مکاشفہ کا دن ہے (رومیوں ۲: ۵ و ۶ و ۸ و ۹)۔ جی اُٹھے مقدس جو اس کی آمد کے وقت پسندیدہ ٹھہریں گے وہ مسیح کے جلالی بدن کے ہم شکل بن جائیں گے (فلپیوں ۳: ۲۱ + کلسیوں ۳: ۱ سے ۴ + ۱ کرنتھی ۱۵: ۴۹)۔ لیکن جو بھی مسیح کی دوسری آمد کے وقت بدن میں زندہ ہوں گے وہ بھی بدل جائیں گے۔ ان کے خاکی بدن آسمانی اور روحانی بدن سے مبدل ہو جائیں گے وہ خاکی بدن کے اوپر روحانی اور آسمانی بدن کو پہن لیں گے اور یوں ان کے فانی عنصر کو بقا نگل لے گی۔ (۱ کرنتھی ۱۵: ۵۱ سے ۵۵ + ۲ کرنتھی ۵: ۱ سے ۵ + ۱ تھسلنیکیوں ۴: ۱۵ سے ۱۷)۔ مسیح کا جی اُٹھنا پولس کے نزدیک اُس جلال کا پہلا پھل ہے جو اُن لوگوں کا حصہ ہے جو مسیح کے آنے پر مسیح کے ہونگے (۱ کرنتھی ۱۵: ۲۰ و ۲۳ + ۲ کرنتھی ۴: ۱۰ سے ۱۴ + ۲ تیمتھیس ۲: ۱۱ و ۱۲)۔ یہ جلال ساری فطرت میں سے چمک اُٹھے گا۔ اس جلال کے مقابلہ میں ان کی اشد مصیبتیں بھی کچھ وقعت نہیں رکھتیں (رومیوں ۸: ۱۷ سے ۲۱)۔ اس اثنائے میں جو مقدس لوگ مسیح میں مر جاتے ہیں وہ "مسیح کے ساتھ" رہتے ہیں اور وہ حالت موجودہ محنت اور مسافرت کی زندگی سے کہیں بہتر ہے (فلپیوں ۱: ۲۱ سے ۲۳ + ۲ کرنتھی ۵: ۸)۔ خدا جو سب چیزوں میں سب کچھ ہے وہی کل خلقت اور مخلصی یافتگان کی علت غائی اور مرکز ہے (۱ کرنتھی ۱۵: ۲۸)۔

۸۔ خطوں کی سند اور صحت۔ کسی نے کبھی انکار نہیں کیا (سوائے چند جنونی لوگوں کے) کہ رومیوں کا خط کرنتھیوں کا پہلا اور دوسرا خط اور گلتیوں کا خط پولس کی تصنیف ہیں۔ تھسلنیکیوں کے پہلے خط فلپیوں اور فلیمون کے خط پر گذشتہ صدی میں بعض نے شک تو ظاہر کئے لیکن اُن کی صحت اور تصنیف کی ایسی صفائی کے ساتھ شہادت مل گئی کہ اب کوئی شک نہیں کہ وہ بھی پولس کی تصنیف ہیں۔ باقی چھ پر اب تک بحث د

وتکرار ہے۔ ان میں سے کلسیوں کے خط پر بہت کم اعتراض ہیں۔ تین چھ باقی خطوں پر بہت اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اور تھسلنیکیوں کا خط مشتبہ حالت میں ہے۔ اور افسیوں کا خط اس سے بھی زیادہ۔ مخالف علما مانتے ہیں کہ طیطس کے خط اور تیمتھیس کے دوسرے خط میں بہت کچھ پولوسی عنصر ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ تھسلنیکیوں کا دوسرا خط اور تیمتھیس کا پہلا خط بھی پولس کے ہیں لیکن اُن میں بہت کچھ تحریف ہوئی ہے۔ افسیوں کے خط کو یا تو پورے طور سے اصلی پولُس کا مانیں یا بالکل جعلی۔ ہر خط کے لئے اچھی معقول دلایل ہیں کہ وہ پولُس کی تصنیف ہیں۔ دیکھو اُن خطوں کے الگ الگ دیباچے۔ بعض اوقات یہ تو تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ فلاں خط پولس کی تصنیف ہے لیکن اُس کی یگانگت پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ بعض لایق مفسروں نے سمجھا کہ ۲ کرنتھیوں کے ۱۰:۱ سے ۱۳:۱۰ تک کا باقی خط سے اتنا فرق ہے کہ وہ پولُس کے کسی دوسرے خط سے لے کر جو کرنتھس کو لکھا گیا تھا اس خط میں شامل کر دیا گیا۔ غالبًا جو خط کھو گیا تھا۔ (۲:۱ اور ۷:۸)۔ علاوہ ازیں ۲ کرنتھی ۶:۱۴ سے ۷:۱ کی عبارت بھی قرینے کے ساتھ بمشکل لگا کھاتی ہے اور شاید وہ کسی پہلے خط کا جز ہو جس کی طرف اشارہ ۱ کرنتھی ۵:۹ میں ہوا ہے۔ کبھی یہ سوال بھی اُٹھا کہ رومیوں ۱۶ باب میں جو طویل فہرست سلاموں کی ہے وہ شاید الگ رسالہ ہو گا جو اس خط کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا یا روم کے کسی دوسری کلیسیا کی طرف وہ سلام بھیجے گئے۔ شاید افسی کلیسیا کی طرف جہاں پولُس نے تین سال تک محنت کی۔ اس خط کا تہرا خاتمہ (۱۵:۳۳ + ۱۶:۲۰ + اور ۱۶:۲۵ سے ۲۷ میں) اور لفظ "روم میں" کا بعض قدیم نسخوں میں نہ ہونا (۱:۷) یہ خیال دلاتا ہے کہ یہ خط گشتی خط ہو گا جو مختلف کلیسیاؤں میں بھیجا گیا۔ دیکھو رومیوں کے خط کا دیباچہ +

مخفی نہ رہے کہ ان تیرہ خطوں میں جو سب سے زیادہ اہم ہیں وہ سب سے زیادہ

مستند ہیں خواہ کسی اور امر کا انکار کیا جائے تو کیا جائے لیکن اس امر کا انکار نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص پولس نامی مسیح یسوع کا رسول تھا کہ اُس نے چند خط جو اب ہمارے پاس ہیں مسیحی جماعتوں کے نام لکھے جو ایشیا کوچک۔ کرنتھس اور روم میں پائی جاتی تھیں اور یہ بھی خداوند یسوع کی وفات سے بیس سال کے عرصے کے اندر اندر۔ یہ تاریخی امر واقعہ اعلےٰ درجہ کی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ان خطوں میں مسیحی دین کی ساری ضروری اور لازمی تعلیم پائی جاتی ہے اور وہ جماعتوں میں ایک زندہ اور موثر قوت ثابت ہوتے ہیں۔ ان خطوں میں خداوند یسوع مسیح کی شخصیت۔ تعلیم۔ موت اور قیامت تسلیم شدہ امور ہیں +

خدا پر ایمان

بائبل کی تعلیم کا مرکز خدا ہے۔ کتاب کے شروع میں بیان ہے کہ اس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا (پیدائش ۱:۱)۔ اور آخر میں نئے آسمان اور نئی زمین کا ذکر ہے (مکاشفہ ۲۱ باب)۔ اسی کمال کی طرف ساری خلقت چل رہی ہے۔ اور اس میں خدا خود براہ راست نور کا چشمہ اور عبادت کا موضوع ہوگا۔

ساری بائبل میں خدا قادر مطلق۔ ہمہ دان۔ قدوس۔ کُل عالموں کا ازلی خالق پروردگار اور حاکم عادل کہلاتا ہے۔ وہ اپنی اشرف المخلوقات انسان کے ساتھ اعلیٰ رشتہ پیدا کرتا ہے۔ یہ انسان خدا کی صورت اور خدا کی مشابہت میں خلق ہوا (پیدائش ۱: ۲۶ و ۲۷)۔ تاکہ زمین پر اس کا خلیفہ ہو۔ (پیدائش ۱: ۲۶ سے ۲۸)۔ اور اس کے ساتھ زیادہ ہمدردی اور شراکت حاصل کر سکے۔ لیکن انسان نے اپنی اعلیٰ نعمت خودمختاری کو بُرے طور سے استعمال کیا اور اسی طرح سے گناہ دنیا میں داخل ہوا۔ اس خوبصورت خلقت پر یہ داغ لگ گیا اور اس کی اپنی نسل میں یہ جذبہ موروثی ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر خدا کے ساتھ انسان کے رشتہ میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ خوشی کی مہربانانہ محبت مخلصی کے مقصد کے لئے اشتیاقانہ محبت سے بدل گئی اور مناسب وقت پر خدا کے ساتھ خاص رشتہ رکھنے کے لئے ایک خاص فرقہ یا "ابراہیم کی نسل" چُنی گئی۔ اسرائیل چنا گیا۔ یعنی خاص حقوق اور ہدایت کے لئے چنا گیا۔ نہ محض طرفداری کے لحاظ سے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ نوع انسان کو برکت پہنچانے کا وسیلہ ہو۔ اسرائیل کو اور اسرائیل کے وسیلے سارے آدمیوں کو خدا کی سیرت اور ارادہ کا گہرا اور صاف مکاشفہ عطا ہوا۔ اسی مکاشفہ کا سلسلہ سارے عہد عتیق

میں پایا جاتا ہے۔ اور اس کا کمال یسوع مسیح میں ہوتا ہے (عبرانی ۱:۱ سے ۵)۔ جیسا جیسا موقعہ آئے گا خاص خاص غلطیوں کی تردید بھی کی جائے گی۔ کوہ سینا پر جو دس احکام کا مکاشفہ ملا اُس کے ذریعہ بت پرستی اور خدا کو انسان کے طور پر سمجھنے کے میلان روکے گئے۔ اور بلا تعظیم اور بے ادبی کے ساتھ خدا کے سامنے جانے کی رغبت کو شرعی رسوم کے ذریعہ روکا۔ آٹھویں صدی قبل از مسیح کے انبیا نے یہ ظاہر کیا کہ ظاہری شرعی اصلاح بے سود ہے اگر راستبازی کی سیرت پیدا نہ ہو۔ اور اس غلطی کو دور کرنے کی کوشش کی جو اس وقت تک پائی جاتی تھی کہ خدا ایک قوم کا خدا ہے جس کی حفاظت اور پرورش اس کا لازمی فرض ہے خواہ وہ قوم کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ "خداوند عدالت میں سربلند ہے" (یسعیاہ ۵: ۱۶) اور کسی کا طرفدار نہیں۔ گہری قربت خاص ذمہ واری پر دلالت کرتی ہے (عاموس ۳: ۲)۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی یہ تصور پایا جاتا ہے کہ سب کا خدا ایک ہی ہے۔ وہ سارے نوع انسان پر یکساں حاکم ہے اور سب کی فکر کرتا ہے (عاموس ۹: ۷؛ یسعیاہ ۲: ۲ و ۳؛ ۱۹: ۱۸ سے ۲۵) اور بعض مابعد مزامیر میں اس کا ذکر بہت زور کے ساتھ آیا ہے (زبور ۹۶ و ۱۰۰ و ۱۱۷) اور یونہ کی کتاب میں۔

اسی اثنا میں دُکھ و پریشانی کی تربیت جس نے عبرانی قوم کی ساری تاریخ میں ان پر اثر کیا تھا۔ خاص کر بابلی اسیری کے زمانہ کی تربیت نے مذہب اور زندگی کے معنی کو زیادہ خالص اور روحانی بنا دیا۔ اور دیانتداروں کے خیالات کو زیادہ زیادہ آئندہ زندگی کی طرف پھیرا۔ اس زندگی میں راستبازی پورے طور سے ظاہر ہوگی اور خوشحالی کی کمی کی تلافی ہو جائے گی۔ انسانی فطرت کی کمزوری اور ناپاکی تو ان پر منکشف ہوگی۔ اس لئے شخصی پاکیزگی اور خدا کے ساتھ شراکت رکھنے کی آرزو زیادہ زیادہ بڑھتی گئی اور آخرکار یہ موقعہ ملا کہ "خداوند کے دکھ اُٹھانے والے بندے کی

تصویر کھینچی جائے (یسعیاہ ۵۳ سے ۵۳)۔ تاکہ سب توبہ کرنے والے اور نجات یافتہ لوگوں کو اپنے میں جمع کرے۔ پرانے عہد نامہ میں یہ تصویر نہایت ہی عجیب ہے۔ اور نئے عہد نامہ کی مرکزی تصویر کا مؤثر نمونہ ہے۔

مقدس نوشتوں میں خدا کے بارہ میں جتنے بیانات آئے وہ بااختیار طرز سے آئے ہیں۔ وہ طول طویل دلائل کا نتیجہ نہیں "پر خداوند نے فرمایا" یا "اُس نے یوں کہا"۔ کبھی تاکید کے لئے پیغام کی صورت "خداوند یوں فرماتا ہے"۔ بائیبل کی تعلیم قیاسی یا منطقی طور پر منتج نہیں۔ خدا کی ہستی ثابت کرنے کے لئے کوئی صریح یا اثباتی دلایل پیش نہیں کیں۔ بلکہ ساری کتاب میں یہ ہستی مسلم ہے۔ اُس کی صفات دلائل کے ذریعہ دریافت ہو سکتی ہیں پر اس کی ہستی کبھی نہیں۔ اس کا عدل۔ اس کی حکمت۔ اُس کی قدرت پر عارضی طور سے دنیا میں بدی کی موجودگی کے راز کے باعث کچھ پردہ ظلمت چھا سکتا ہے جیساکہ ایوب کی کتاب سے ظاہر ہے۔ اتفاقی طور سے ایسی دلائل مل سکتی ہیں جن کا تعلق ذات الٰہی سے ہے مثلاً خلقت سے خالق کی دلیل نکالنا۔ دیکھو زبور ۹۴ "وہ جس نے آنکھ بنائی کیا نہیں دیکھتا" وغیرہ۔ منطقی طور سے دلیل لانے کے ذریعہ انسان کی شخصیت سے خدا کی شخصیت کا نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ اس قسم کی دلیلوں کا ذکر یا ان کی طرف اشارہ کتاب مقدس میں آیا ہے۔ لیکن خدا کی ہستی کا سوال کبھی اس دایرہ میں داخل نہیں ہوا۔ یہ تو سب کی تہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ اصولی تصور ہے جس کی روشنی میں باقی سب اشیاء پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ نہ صرف توریت اور انبیا اور مزامیر میں بلکہ تواریخی کتابوں میں بھی مثلاً روکھے اور مختصر بیانات جو بادشاہوں کی تخت نشینی۔ ان کے عہد سلطنت اور مختلف بادشاہوں کی وفات کے آئے ہیں اُن میں یہ صاف ظاہر کر دیا گیا ہے کہ ان واقعات میں برابر خدا کا

ہاتھ پوشیدہ کام کر رہا تھا اور یہ کہ وہ ہمہ جا حاضر ناظر حاکم عادل ہے جس کے ذریعہ سے حاکم اور محکوم دونو کے اعمال تولے جاتے ہیں۔ آستر کی کتاب میں بھی جہاں خدا کا نام ایک دفعہ بھی مذکور نہیں کچھ شک باقی نہیں رہتا کہ چھوٹے بڑے سارے کاروبار اسی کے ہاتھ سے سرانجام پاتے ہیں۔ جو کتابیں کہ خاص کر تھیولوجیکل نہیں۔ مثلاً ایوب۔ امثال۔ اور واعظ کی کتاب وہ ایسے داناؤں کی تصنیفات ہیں جو اسرائیل کے فلاسفر تھے۔ ان میں بھی اول سے آخر تک خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ وہ بُت پرست فلاسفروں کی طرح اُس کو ٹٹولتے یا اُس کی تلاش میں ہیں کہ کہیں سے ڈھونڈ نکالیں۔ وہ اس کی دریافت کی تلاش میں نہیں نکلتے بلکہ اس کی پہچان کی تلاش میں ہیں۔ اُس کا جو برتاؤ فطرت اور انسانی ذات کے ساتھ ہے اُس کے ذریعہ وہ اُس کی الٰہی شخصیت کو زیادہ دریافت کرنا چاہتے ہیں جس کو انہوں نے اپنے سارے مذہب میں تسلیم کر لیا ہوا ہے۔ اور جس کے ساتھ ان کے دلوں کو پاک شراکت حاصل ہے گو ان کی عقل کبھی کبھی حیران رہ جاتی ہے کہ جس دنیا پر وہ حکمران ہے اُس میں اُس نے بدی کو کیوں اجازت دی۔ جیسا ہم نے ذکر کیا۔ بائیبل خدا کی ہستی ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش نہیں کرتی۔ لیکن کچھ ایسا مصالحہ پیش کرتی ہے جو محض خالی دلایل سے کہیں اعلےٰ رتبہ رکھتا ہے۔ یہ ہمیں ایک مجسم تجربہ پر مبنی۔ اور مبین تھیولوجی دیتی ہے۔ اس میں دنیا کی تصویر کھینچی گئی ہے جس میں خدا کام کر رہا ہے جسے دیندار محسوس اور تسلیم کرتے ہیں کہ وہ سچا خدا ہے اس نے قصہ اور تاریخ کی صورت میں ہمیں بتایا ہے کہ عالم کیا ہے اور جب اس بیان کو صحیح طور سے سمجھ لیتے ہیں تو یہ ہمارے دلوں اور عقلوں کے تقاضات کو یکساں پورا کرتا ہے۔ یہ کتابیں ایسے خدا کو ہم پر منکشف کرتی ہیں جس کی سیرت اور جس کا رشتہ انسان کے ساتھ ایسا ہے کہ اُسی میں ہماری ضروریات اور ہماری

آرزوئیں اطمینان کلی حاصل کرتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اتفاقی طور پر انسانی ذات کا ایسا بیان کرتی ہیں (خاص کر دیکھو پیدائش ۱ سے ۳) جو ہماری ضروریات اور آرزوؤں کے حل کرنے کی تسلی بخش کلید ہے۔ ایک طرف تو یہ ظاہر کیا گیا کہ انسان کیسا حقیر ہے اور دوسری طرف یہ کہ وہ کیسی عظمت کے قابل ہے ✦

ہم پہلے اُس پیغام پر غور کریں جو بائبل انسان کے دل کے سامنے پیش کرتی ہے۔ بعد ازاں جو پیغام وہ انسان کے فہم تک پہنچاتی ہے ✦

انسان کے دل اور روح کی ضروریات اور آرزوئیں خدا کے ساتھ شخصی رفاقت رکھنے کے ذریعہ ہی پوری ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ زبور کی کتاب میں صاف طور سے ذکر آیا ہے (خاص کر زبور ۱۶ و ۱۷ اور ۳۱ و ۶۳ و ۷۳)۔ اس شراکت کا اعلےٰ اظہار نئے عہدنامہ کے دین میں ہوا ہے ✦

یہ دلی علم جس فرد کو حاصل ہے اس کے لئے وہ خدا کی ہستی کا اعلےٰ اور صریح ثبوت ہے۔ دلی علم سے یہ مراد ہے کہ ہماری مشخص روح اس کے ساتھ شخصی شراکت رکھے۔ ایسی شراکت کے لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "میں جانتا ہوں کہ خدا ہے۔ کیونکہ میں اُسے جانتا ہوں"۔ دعاؤں اور ساکرمینٹ میں اور دھیان میں میں تجربہ کرتا ہوں۔ میں اس کی حقیقت اور اس کی حضوری کا تجربہ کرتا ہوں اور میرا یہ یقین اسی درجہ کا ہے جیسا ان اشیا کی ہستی کے بارہ میں جن کو میں چھو اور دیکھ سکتا ہوں۔ اور جب مجھے یہ اعلےٰ شراکت حاصل ہوتی ہے تب یہ یقین بہت ہی صاف اور پختہ ہوتا ہے اور اُس وقت میں اُن ساری خوبیوں کو جو میری سیرت میں پائی جاتی ہیں اُس شراکت کا نتیجہ سمجھتا ہوں جیسا مجھ سے پیشتر ہزاروں نے سمجھا ✦

خدا کا اسی قسم کا علم مزامیر اور انبیا میں بلند آواز سے ہم کو پکارتا ہے اور

عہدعتیق کی دوسری کتابوں میں بھی اسی علم کا بیان پایا جاتا ہے۔ اور اس شراکت کا کمال یسوع مسیح میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلی تین اناجیل نے ہمارے سامنے بیان کیا ہے (لوقا ۱۰: ۲۲ بمقابلہ مرقس ۱۳: ۳۲)۔ لیکن خاص کر یوحنا کی انجیل میں (یوحنا ۵: ۱۹ + ۱۰: ۱۵ و ۳۰ + ۱۴: ۱۱ وغیرہ) اور اس کا گویا معراج مسیح کی سردار کاہنی دعا میں ہے (یوحنا ۱۷ باب)۔ ہمارے خداوند کے صعود اور روح القدس کے اترنے کے بعد اس نے مسیح کے شرکا کے لئے مبارک ثالوث باپ بیٹے اور روح القدس کے ساتھ شراکت کی صورت اختیار کر لی ہے (۲ کرنتھی ۱۳: ۱۴ + ۱ یوحنا ۱: ۳) ✦

مگر چونکہ ایک معنی میں یہ محض ایک شخصی اور فردی امر ہے اور شراکت کے یہ معنی ایسے روحانی ہیں کہ انہیں خدا کی ہستی کی دلیل میں پیش نہیں کر سکتے۔ معترض ہمیشہ یہ کہہ سکتا ہے "تم یہ بیان کرتے ہو کہ تمہارا یہ احساس ہے۔ میں تمہاری صدق دلی کو مانتا ہوں لیکن شاید تم فریب کھا گئے ہو"۔ ایسے اعتراض کا یہ جواب دینا کافی نہ ہوگا۔ کہ "اگر تم چاہو تو بفرض محال ایسی ہستی کو مان لو جیسا کہ ہم کو بہت باتیں امور زندگی میں ماننی پڑتی ہیں) جس کا اثباتی ثبوت تم دے نہیں سکتے اور اس مفروضہ کے مطابق عمل کرو تو تجربہ کے ذریعہ تم تیقن کے درجہ تک پہنچ جاؤ گے"۔ اگرچہ اس جواب کی تائید میں اُنیس سو برس سے زیادہ کا شخصی تجربہ پیش کر سکتے ہیں شہیدوں اور مقدسوں نے پشت در پشت نہایت زور سے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ "وہ خدا ہے"، "وہ اور اپنے طالبوں کو بدلہ دیتا ہے" (عبرانی ۱۱: ۶)۔ اور اس تیقن پر اپنے خون سے مہر لگانے کو تیار رہے ✦

ایسی شہادت سائنٹفک زور سے خالی نہیں چنانچہ جی۔ جے رومینس (G. J. Ramanes) اعلےٰ سائنس دان نے بڑے زور سے یہ بیان

کیا کہ جو اس دلیل کو نظرانداز کرتے ہیں وہ بے تعصب اگناسٹک اصولوں سے تجاوز کرتے۔ پھر بھی اکثر محققان کی تشفی اس سے نہیں ہوتی کیونکہ وہ ایسا عقلی ثبوت طلب کرتے ہیں جو شخصی احساس اور جذبات پر مبنی نہ ہو +

خدا کے وجود اور سیرت کے لئے ایسی دلایل ہیں اور ان میں بعض ہم تک نہایت قدیم زمانہ سے پہنچی ہیں۔ یہ تو ہم مان سکتے ہیں کہ یہ دلایل فرداً فرداً یا بحیثیت مجموعی اثباتی ثبوت کا درجہ نہیں رکھتیں لیکن ان سے (جیسا کہ ہم ذکر کریں گے) ایسے خدا پر اعتقاد رکھنے کے لئے ظن غالب پیدا ہو جاتا ہے جس کا مکاشفہ بائیبل نے دیا ہے +

ان دلایل میں سے جو زیادہ وزنی اور ضروری ہیں ان کا ہم مختصر خاکہ پیش کریں گے تب ہم بہتر اندازہ لگا سکیں گے کہ کہاں تک بائیبل کا مکاشفہ خدا کے لئے انسان کی عقلی تلاش کے مطابق ہے۔ لیکن ہم شروع ہی سے یہ یاد رکھیں کہ یہ دلایل جو قدیم زمانہ سے چلی آتی ہیں انسان کے ایمان کی علت اولی نہیں یا یہ کہو کہ ان دلایل کی وجہ سے انسان خدا پر ایمان نہیں لایا۔ بلکہ جہاں یہ مکاشفہ پہنچا بھی نہیں وہاں بھی انسان کا ایمان ایسی دلائل کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ جو ایمان پیشتر سے موجود تھا اس کی تصدیق یا تائید ان دلایل سے ہوتی ہے۔ پہلی صدی قبل از مسیح سیسرو کے زمانہ میں بلکہ اس سے بھی پیشتر بت پرست فلاسفروں نے بھی سوچ وفکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ انسانی فطرت میں مذہب ایک عالمگیر صفت ہے۔ اگرچہ زمانہ حال میں بعض دہریہ قبیلوں کی موجودگی سے اس دلیل کے خلاف نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی لیکن علم فطرت انسانی (anthropological science) قدیم رائے ہی کی تائید کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسے وحشی فرقے ہوں (حالانکہ یہ پایہ ثبوت تک نہیں پہنچا) جن کے درمیان کسی خاص دینی رسوم کے آثار نہ ملتے ہوں۔ لیکن کیا ایسے فرقوں کو ہم غیر نشوونما یافتہ انسانیت کا بھی

معمولی نمایندہ کہہ سکتے ہیں؟ کیا تنزل بھی کوئی شے ہے یا نہیں اور کیا ان بیچارہ وحشیوں میں دینی قابلیت کا کوئی بھی آثار نہیں؟ کیونکہ ہماری دلیل کے لئے اتنا ہی دریافت کرنا درکار ہے۔ مسیحی مشن جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں وہ ڈنکے کی چوٹ پکار رہے ہیں کہ انسانوں میں کوئی قوم یا فرقہ ایسا نہیں پایا جاتا خواہ وہ کیسا ہی پست اور بظاہر دہریہ ہی معلوم کیوں نہ ہو جس میں دینی قابلیت کی چنگاری موجود نہ ہو جس کو ذرا اکسانے سے ایک زبردست شعلہ پیدا نہ ہو سکتا ہو؟ +

پس جب یہ تسلیم ہوا کہ دینی قابلیت نوع انسان میں عالمگیر ہے تو پس امر واقعی کے معنی کیا ہونگے؟ قدیم زمانہ سے یہ ایک دلیل مانی گئی ہے اور کبھی کبھی وہ غلطی سے ثبوت سمجھ لی گئی۔ کہ خدا موجود ہے۔ اس دلیل کا نام "نوع انسان کی عام رضامندی سے دلیل" آیا ہے۔ اور اس پر یہ مثل صادق آسکتی ہے کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔ کل دنیا بحیثیت مجموعی اس فیصلہ میں راستی پر ہوگی۔ اگر جہان ذی عقل جہان ہے تو یہ گمان حد سے زیادہ گھٹ جاتا ہے کہ دین جیسا عالمگیر منظر جو انسانی زندگی اور ترقی کے اہم امور کے ساتھ ایسا وابستہ اور پیوستہ ہو وہ محض ایک سراب ایک دھوکا ہو۔ لیکن دینی اصول کا ظاہری اظہار مختلف زمانوں اور ملکوں میں ایسا مختلف اور نقیض اور موہوم طور سے ہوا ہے کہ ہم براہ راست اس امر کو خدا کی ہستی اور سیرت کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کر سکتے۔ اس دلیل کا زور یہ ہے "ایسی شہادت کی شہادتیں ہیں" اگر دینی حس عملی طور پر عالمگیر ہو تو یہ دریافت کرنا بہت مناسب ہوگا کہ کیا یہ انسانی ذات یا فطرت کا لازمی جزو ہے یا نہیں؟ اور یہ تحقیقات ہمیں خدا کی ہستی کی دیگر دلائل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس دینی حس کی بنا کچھ تو اس فقدان میں ہوگی جو انسان کا بیرونی جہان کے ساتھ ہے اور کچھ خود انسانی فطرت کی ساخت ہی میں ہوگی +

انسان کے چاروں طرف جو یہ بیرونی جہان پایا جاتا ہے عام طور سے اُس پر غور کرنے کے ذریعہ ایک علتِ ازلی کی طرف ہمارا خیال چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس جہان کی تفصیل اور فروغ پر غور کرتے اور دیکھتے ہیں کہ کیسے اشیا کا باہمی رشتہ اور تعلق ہے تو دل پر یہ نقش ہو جاتا ہے کہ اس سب میں تجویز پائی جاتی ہے اور ضرور کوئی مجوّز ہوگا۔ یعنی ایسی ازلی علت جو ذی عقل اور خود مختار ہو۔ اور جب ہم اپنے ادراک پر غور کرتے ہیں اور اس امر پر کہ بیرونی جہان ایک عجیب مستریہ طریقہ سے ہمارے خیال کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے تو ایک اولیٰ اور عالمگیر ادراک کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ساری حقیقت پر حاوی ہے اور جو خیال اور اشیا میں ایک رشتہ کی زنجیر ہے۔ بالآخر ہماری اخلاقی ضمیر (Conscience) یا نورِ قلب جس کی آواز ایسی مختارانہ اور حاکمانہ ہے کہ اُسے ہم محض آرزو و مذاق۔ خواہش اور خود غرضی سے باسانی امتیاز کر سکتے ہیں ہمیں ایک عالمگیر شارع کی طرف ہدایت کرتی ہے جو سب سے اعلےٰ اور کامل ہے۔ اور یہ اندرونی ناصح اور حاکم صرف اُسی اعلےٰ حاکم کی آواز ہو سکتی ہے۔ اس علتِ ازلی میں وہ ساری صفات ہیں جو شخصیت کا خاصہ ہیں جیسا کہ انسان میں نظر آتی ہیں۔

ان دلایل میں سے پہلی کے بارہ میں کچھ زیادہ بیان کی ضرورت ہے۔ انسان اپنے اندر اصولِ اسباب پاتا ہے جس کے ذریعہ وہ بیرونی جہان کو سمجھ سکتا ہے۔ جو مناظر سلسلہ وار پیدا ہوتے ہیں ان کو وہ علت و معلول سمجھے بغیر نہیں رہ سکتا یعنی ہر ایک کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوگی۔ لیکن جب وہ اسی یا اُس علت پر غور کرتا ہے تو پھر اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقی یا مطلق علت نہ تھی بلکہ یہ خود کسی اور علت کا نتیجہ تھی اور یہی سلسلہ لا انتہا جاری رہتا ہے۔ اس کے اپنے اندر کسی قدر اس حقیقی علت کا پتہ لگ سکتا ہے۔ لیکن یہ ماننا کہ میں ہی اس سب کی علت ہوں اس کی نزدیک جہالت ہے اور

عقل یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ سلسلہ علت معلول اسی طرح سے چلا آیا ہے اور چلا جائے گا۔ وہ اِس امر کو محسوس کرتا ہے کہ ان سب کے پیچھے ایک حقیقی علت ہوگی جو کسی نہ کسی طرح سے انسان کی قوتِ ایجاد کے مشابہ ہوگی۔ لیکن اُس سے کہیں اعلےٰ۔ ایسی علت جس کی کوئی علت نہیں بلکہ وہ اپنی علت آپ ہی ہے۔ وہ اپنا آپ ہی چشمہ ہے کوئی دوسرا نہیں ساری چیزیں معہ انسان کے اسی ازلی علت کے معلول ہیں۔

تیسری دلیل عالمگیر ادراک کی تائید میں ایسے مختلف طریقوں سے پیش کی گئی ہے کہ عوام الناس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک کہ آدمی نے علم کلام میں تربیت حاصل نہ کی ہو۔ تیسری اور چوتھی دلائل یعنی تجویز اور ضمیر سے دلایل کے مفصل بیان کی ضرورت ہے کیونکہ زمانہ حال کے سائنس نے ان پر بہت کچھ روشنی ڈال دی ہے۔

دلیلِ تجویز شاید سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بائبل میں باقاعدہ طور سے اس دلیل کا بیان نہیں ہوا۔ کیونکہ جیسا ہم ظاہر کر چکے ہیں بائبل نے خدا کی ہستی کو دلایل کا موضوع نہیں بنایا۔ لیکن اس کی بنا مخلوق جہان کی باہمی عجیب مطابقت کئی ایک مزامیر میں مذکور ہے (مثلاً ملاحظہ کرو زبور ۱۹ و ۱۰۴ و ۱۴۷ و ۱۴۸) اور مقدس پولس نے تقریباً اسی دلیل کو بیان کیا (رومیوں ۱: ۲۰)۔ جہاں اُس نے بت پرستوں کی باطل پرستی اور بدچلنی پر ملامت کی ہے "اس کی ازلی قدرت اور الوہیت بنائی ہوئی چیزوں سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہیں یہاں تک کہ ان کو کچھ عذر باقی نہیں"۔

بالفرض مان لو کہ جہان کی عین ہستی ایک علتِ ازلی پر دال ہے۔ ہم اُس علت کے بارہ میں کیا سیکھ سکتے ہیں؟ سب سے قریب شے اس حقیقی علتِ اولیٰ کے لئے جس کا کہ مجھے تجربہ ہو سکتا ہے وہ میری اپنی شخصیت ہے۔ اس لئے یہ گمان گزرتا ہے کہ جہان کی علتِ اولیٰ کم سے کم متشخص ہوگی۔ لیکن ہمارے پاس صرف یہ گمان ہی نہیں فطرت میں ایسے خاص آثار پائے جاتے ہیں کہ اگر ہم اُن پر زیادہ غور سے نظر کریں تو یہ خیال

کرنا ناممکن ہو جائیگا کہ وہ علت اولےٰ محض کیمیائی وجود ہے۔ بلکہ اُسے ہم ذیعقل اور خودمختار مانیں گے۔ ایسی ذات جو ہماری ذیعقل ذات سے مشابہ ہو البتہ ہم سے کہیں اعلیٰ اور ہماری رسائی سے کہیں پرے ۔

فطرت میں ہر جگہ یہ نظر آتا ہے کہ وسائل مقاصد کے عین مطابق ہیں (جسے ٹیلیوجیکل (Teliological) اصول کہتے ہیں)۔ اور زمانہ حال آیندہ زمانہ کا محکوم ہے۔ وسائل اور مقاصد میں یہ حیرت افزا تطبیق مرکب طریقہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ انسانی اعضا میں۔ ادنیٰ اور اعلیٰ حصوں میں اور کل میں۔ فی الحقیقت ہر جگہ مقصد اور تجویز کے آثار ملتے ہیں کیونکہ ان کی تطبیق انہیں کا اظہار ہے۔ میرے اپنے تجربہ میں اس قسم کا منظر میری اپنی شخصیت ہے اور اس لئے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ایک مجوز ہے ۔

البتہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جن وسائل کے ذریعہ طبعی بدنوں میں اصول ارتقا عمل کرتا ہے اُن پر زیادہ گہری نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ غلط ٹھیرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علم ارتقا نے دلیل تجویز کو بالکل رد کر دیا ہے۔ یہ طاقتیں جو عجیب طریقے سے باہمی عمل کرتی ہیں جن کا مشاہدہ فطرت میں ہوتا ہے وہ ایک مفصل کل کا کامل فرد نہیں جو مجوز کے ہاتھ سے ابھی نیا نکلا ہو۔ اس کو تو ایک دراز زمانہ گذر چکا ہے اور اس زمانہ کو ہم حال ہی میں صحیح طور سے سمجھنے لگے ہیں۔ اشیا کی موجودہ حالت ایک باقاعدہ اور باصحت عمل کا نتیجہ نہیں جس میں کہ ہر عضو اپنی مناسب جگہ میں ٹھیک طور سے نصب ہو۔ برعکس اس کے ہر صیغہ زندگی میں بقا کے لئے ایک سخت اور لگاتار جنگ کا نتیجہ ہے جس جنگ میں صرف وہی بچ رہے جو سب سے زیادہ "مضبوط" تھے۔ فطرت میں جو کچھ ضائع ہوتا رہتا ہے وہ اس کامیابی اور بقیہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اب اس کا اثر دلیل تجویز پر کیا پڑتا ہے؟ جن اصلی وسیلوں سے اس ارتقا میں یہ بہشتی ترقی ہوتی ہے وہ ہم کو صرف

جزو نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ اختلاف کا اصول ہے۔ اولاد اپنے والدین سے ایک خاص حد تک اختلاف رکھتی ہے۔ دوسری طرف قدرتی انتخاب کا اصول ہے۔ جس کے ذریعہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی بچ رہیں جو بچ رہنے کے نہایت لائق ہیں۔ پس تجویز اور مجوز کی کہاں گنجایش رہی؟ جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارتقا کا بنیادی اصول اور مبدا ہم کو اب تک دریافت نہیں ہوا۔ وہ کونسا امر ہے جس کے ذریعہ اختلاف پیدا ہوتا ہے جسے قدرتی انتخاب مقرر کرتا اور آیندہ ترقی کی بنیاد ٹھیراتا ہے؟ اب اسے یا خدا کہو یا اتفاق کہو۔ ایسے اتفاق یا غیر ذیعقل طاقت کے ذریعہ ایسے مناسب اور مطابق وسائل کا لگاتار پیدا ہوتے رہنا اور ایسی ترتیب اور انتظام کا نتیج ہونا ماننے کے لئے زیادہ مشکل ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ہم خدا کو مان لیں اور زمانہ حال کے معلومات نے اس مشکل کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ کیونکہ اگر کل جیسا باقاعدہ جہان جس میں نہ تو کامیابی کو گنجایش ہے نہ ضائع اور تلف شدہ اشیا کو تجویز اور مقصد ہم پر نقش کر سکتا ہے تو کتنا زیادہ یہ نتیجہ اُس وقت نکلے گا جب بے ترتیبی میں سے ترتیب جھگڑے میں سے صلح اور بھدے مادے میں سے خوبصورت جہان نکل آئے۔ اس جنگ درد اور تلف اشیا کے ضائع ہونے کا بھید سمجھنا مشکل تو ہے پر نتیجہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اختلاف اور قدرتی انتخاب کے اصولوں کے عمل کے پیچھے عقل۔ ارادہ اور مقصد ہے ۔

زمانہ سابق میں اس دلیل کو ایسے طور سے بیان کرنے پر شاید سائنس دان ہنسی اڑاتے لیکن اس دلیل نے زمانہ حال کے معلومات کے ذریعہ زیادہ زور حاصل کیا ہے۔ آسا گرے (Asa Gray) صاحب نے ڈارون کو کہا کہ مسٹر ارتقا دلیل تجویز کو دایرہ سائنس میں کھینچ لایا ہے ۔

اخلاقی دلیل۔ یہ دلیل ضمیر (Conscience) سے نکالی جاتی ہے اور دلیل تجویز کی طرح اس پر بھی حملہ کیا گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بعضوں نے یہ خیال

پیش کیا کہ کانشنس کا چشمہ عدم اخلاق ہے ۔ اور یوں اُس کی حاکمانہ سیرت کی صفت کو معدوم کرنے کی کوشش کی ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کانشنس ارتقا کے ایک طویل اور پیچیدہ عمل کا نتیجہ ہے ۔ اور یہ فی الحقیقت اندرونی ناصح کی الٰہی آواز نہیں بلکہ پشتوں اور زمانوں کی قومی خود مطلبی کا نتیجہ ہے ۔ لیکن کانشنس کو شخصی اور فردی خود مطلبی کا اصول ٹھیرانا بیہودگی میں داخل ہے کیونکہ بارہا یہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ خود مطلبی اور کانشنس کے تقاضا ضدین ہوتے ہیں ۔ مگر جماعت یا قوم کا فایدہ امر متفرق ہے ۔ یکے بعد دیگرے پشتوں نے فطرتی طور پر اپنے شرکا پر یہ رغبت نقش کردی کہ جو کچھ اُس قوم یا جنس کے لئے مفید ہو ویسا ہی کام کریں ۔ یوں یہ بے غرضانہ اصول ایک طرح کی فطرت ثانی ہوگیا ۔ البتہ جیسے جیسے کسی قوم نے ترقی کی ویسے ہی اس اصول میں بھی کمی بیشی ہوتی گئی پھر بھی انسان کی بحیثیت انسان یہ ایک دائمی خاصہ ہوگیا ✦

اس قسم کی دلیل کی تائید اس لحاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ایسے ظاہرا ضمیری افعال کے آثار ان حیوانات میں پائے جاتے ہیں کہ جن کو ہم غیر ذیعقل سمجھتے تھے ۔ اور نوع انسان میں تہذیب کے مختلف مدارج اور مراتب کے کانشنس میں بھی از حد فرق ظاہر ہوتا ہے ✦

لیکن کانشنس اور اخلاقی دلیل پر ان امور کے ذریعہ اعتراض کرنا طبعی سائنس کی نسبت غلط فہمی رکھنے پر مبنی ہے ۔ طبعی سائینس کا طبقۂ عمل اشیا کے آغاز اور ان کی ہستی کے مقصد اور انجام پر حاوی نہیں ۔ اُس کا کام تو صرف یہ ہے کہ اشیا کی موجودہ حالت کا بیان کرے اور اُس عمل کی تشریح کرے جس کے ذریعہ کہ وہ اس حالت میں پہنچی ہیں ۔ کانشنس بلا لحاظ اُس عمل کے جس کے ذریعہ کہ وہ اس حالت کو پہنچا ہے کانشنس ہے جیسا کہ آدمی آدمی ہے ایک ذی عقل معقول ۔ اخلاقی اور روحانی وجود خواہ وہ کتنی ہی منزلیں طے کرکے پستی سے اس عروج تک پہنچا ہو اس میں کچھ شک نہیں کہ اشیا کی نسبت

صحیح رائے دلیل تجویزی ہی میں نظر آتی ہے ۔ کیونکہ اس کے ذریعہ انسان ایک ذرا سے بیج میں ایک عظیم آیندہ درخت کو دیکھتا ہے لیکن جو رائے انسان اور کانشنس کو ان کے مناسب نام ہی دینا نہیں چاہتی کیونکہ ان کے خیال میں ایسا وقت تھا جب یہ دونوں موجودہ حالت سے صدہا کوس نیچے پستی کی حالت میں پڑے تھے ✦

اب رہا یہ سوال کہ کانشنس میں یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک اصول اس کی تہ میں پوشیدہ ہے اور جس اصول کو ان لفظوں میں ظاہر کرسکتے ہیں ”وہ مجھے چاہئے“ یا ”مجھ پر فرض ہے“ ۔ جیسا آدمی ہوگا جیسی اس کی قابلیت ہوگی اور جس قسم کے حالات میں وہ ہوگا اُسی کے مطابق کانشنس کی ہدایت اور عمل ہوگا ۔ اور اسی وجہ سے ہم کہا کرتے ہیں کہ کانشنس تربیت اور ترقی کے قابل ہے لیکن کانشنس کی صورت برابر یکساں رہتی ہے ۔ یہ استعمال کے مطابق کمزور ہوگا ۔ یا زور آور لیکن بذاتہ اُس میں کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ اخلاقی مجبوری کا یہ اصول ہے ۔ نہایت نازک معاملات میں جہاں کسی انسانی حاکم کا خواب و خیال بھی نہیں ہوتا ۔ اور کسی ارادہ کا اظہار بھی نہیں ہوتا ۔ نہ عام سوسایٹی کے فایدہ کا کوئی خیال ہوتا ہے ایسے موقعوں پر بھی وہ ہمارے فرض پر شہادت دیتا ہے جس کا اشارہ عالمگیر اخلاقی حاکم اور شارع کے سوا اور کس کی طرف ہو سکتا ہے جس کی مرضی اخلاقی طور پر کامل مانی جاتی اور جس سے کہیں اور اپیل نہیں ہو سکتا ✦

کانشنس کے ارتقا کی تاریخ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو انسان کی اخلاقی ذات کی شہادت صریح اور لا غلط ہے ۔ یہ دنیا اور انسان کی ازلی علت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں نہ صرف قوت خالقہ اور حکمت پائی جاتی ہے بلکہ جو اخلاقی پاکیزگی سے بھی مزین ہے ✦

کیا تاریخ کی شہادت سے اس کی تشریح ہو سکتی ہے؟ کیونکہ اگر نوع انسان

کے عالم کی حقیقی اور عملی ترتیب کانشنس کی شہادت کی صاف طور سے تردید کرے تو
ہم ایسی شہادت کو دھوکا تصور کریں گے ۔

بشپ بٹلر صاحب نے بخوبی ظاہر کر دیا کہ گو دنیا کی حکومت ایک ایسا نظام ہے
جس کو ہم پورے طور سے سمجھ نہیں سکتے تو بھی اخلاقی حکومت کے ایسے آثار ملتے ہیں
جن کا ہم انکار نہیں کر سکتے ۔ وہ ایسے آثار ہیں کہ جو قوت جہان کو چلا رہی ہے وہ کچھ ہے
اور جو کچھ کر رہی ہے اُس کا نتیجہ راستبازی ہے ۔ سلطنتوں کا برپا ہونا اور گر جانا
اور ان کا تواتر ۔ قوموں کا فرقوں اور قبیلوں کا ترقی اور زوال پانا افراد کی زندگی کے
انقلابات اگرچہ بہت حیرت انگیز اور لاینحل مشکلات پیش کرتے ہیں جن کا ہم آگے چل کر
کچھ زیادہ ذکر کریں گے وہ سب بحیثیت مجموعی اس کی راستبازی پر شاہد ہیں جو جہان کے
تخت پر متمکن ہے ۔

انسانی فطرت کے طبعی پہلو پر جہاں ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ یہ اشیا خود بخود
عمل کرتی چلی جائیں گی ۔ اخلاقی قانون شاید سب سے بڑھ کر ظاہر ہوتا ہے ۔ اکثر صورتوں
میں بدچلنی اپنی سزا آپ پیدا کرتی ہے کہ گناہ اور دکھ عموماً ہر حالت میں علت اور
معلول سمجھے جا سکتے ہیں مگر تجربہ یہ سکھاتا ہے اور ایوب کی کتاب میں بائیبل نے بھی
یہ تعلیم دی ہے کہ جس کو ہم عموماً بدی سمجھتے ہیں ۔ مثلاً درد دکھ یا مالی نقصان جن لوگوں کو
ملتا ہے وہ ہمیشہ اخلاقی بدچلنی کا نتیجہ نہیں اور مسیح نے بھی صاف طور سے منع کیا کہ ایسے
دکھوں کو گناہ سے منسوب نہ کریں کہ گویا وہ اس کی لازمی علت ہے (لوقا ۱۳: ۲
و ۳ و ۴) ۔ فی الواقعہ دکھ ہمیشہ فی زمانہ بدی ہی نہیں ہوتے گو ہم انہیں اس ہستی کی
ناکامل اور ناقص حالت سے منسوب کرتے ہیں ۔ بلکہ بعض اوقات یہ نیکی کا نتیجہ ہوتے
ہیں جن کے ذریعہ سے روح کو زیادہ اعلےٰ پرواز کرنے کی تحریک ملتی ہے ۔

تاریخ میں اخلاقی حکومت کی سب سے زیادہ عجیب تصویر اسرائیل کی زندگی

کے انقلابات میں پائی جاتی ہے ۔ یہاں ہم طبعی دین کو چھوڑ کر مکاشفہ کی سرحد تک
پہنچ جاتے ہیں ۔ لیکن بائیبل نے جو عبرانی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے اگر وہ بالعموم صحیح
مان لی جائے تو اس میں تاریخ عام کی کلید ہمارے ہاتھ آ جائے گی اور ایماندار کے
اس یقین کی تصدیق ہو جائے گی کہ عہد عتیق کی تاریخ دنیاوی تاریخ سے مضمون کے
لحاظ سے اس قدر متفرق نہیں جتنی اس لحاظ سے ہے کہ اُس نے اس تاریخ کو
کسی غرض سے استعمال کیا ہے ۔ اور یہ تاریخ بے نظیر ہے ۔ نہ محض اس لحاظ سے کہ
برگزیدہ امت کی تعلیم و تربیت بے نظیر طریقے سے ہوئی بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ صرف
اسی تاریخ میں وہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور شخصی اور قومی چلن کے حقیقی نتائج ایسے
صاف ظاہر ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ اُس پر آشکارا ہیں جس کے ہاتھ نے نوع
انسان کی تاریخ کی رہنمائی شروع سے اب تک کی ہے ۔ تاریخی طریقے میں بکثرت ترقی
کرنے کے بے حد وسیع معلومات سے جو فایدہ حاصل ہوتا ہے اس کے باوجود
دلیری سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ حال کے مورخ صداقت کی تہ تک پہنچتے ہیں لیکن اسرائیل
کے ملہم مورخوں سے ہرگز سبقت نہیں لے گئے ۔ گو وہ ان کی طرح سائنس دان اور
عالم نہ تھے ۔

مکاشفہ ۔ طبعی دین تو انسانی ذات کی شہادت خدا کے بارہ میں ہے اور
وہ اپنی تکمیل کے لئے منکشف دین کا محتاج ہے ۔ انسان کا دل اس بیرونی فطرت پر
غور کرتے کرتے دانائے مطلق ۔ قادر مطلق اور مہربان مطلق خالق اور حاکم کے تصور
تک جا پہنچتا ہے ۔ لیکن کئی ایک ایسے امور ہیں جن سے دینی تجویز کی کچھ ہیٹی ہوتی اور
اس کے زور کو گھٹا دیتی ہے ۔ انسان کو اپنے معمولی دائرہ خیال سے باہر کی طرف
سے یقین ملنا درکار ہے ۔ تاکہ جو مشکلات بے قاعدگیاں نقص اور بربادی کے ذریعہ پیدا
ہوتی ہیں ان کا مقابلہ کر سکے خاص کر دکھ کی موجودگی کا ۔

نیز انسان کی فطرت پر اخلاقی شریعت کا نقش لگا ہوا ہے جس کے ذریعہ وہ قدرتی
عالمگیر شارع پر ایمان لانے کی ہدایت پاتا ہے تو بھی انسانی سوسائٹی میں کئی
ایک ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو بالکل اس کے برعکس نے جاتی ہیں۔ کوئی شخص مزامیر
اور ایوب کی کتاب کو پڑھ نہیں سکتا اور نہ زمانہ انسانی سوسائٹی کے امور واقعی
کو دیانتداری سے مطالعہ نہیں کرسکتا بلا اس حیران و پریشان کرنے والے احساس
کے جو بدی کی کامیابی سے اور ظلم کے بے سزا رہنے اور بے وجہ دکھوں سے پیدا
ہوتا ہے +

کانشنس کے تیقن دلانے کی نسبت کچھ زیادہ صریح تیقن درکار ہے تاکہ ہم
پورے یقین سے یہ کہہ سکیں۔

"خدا اپنے آسمان میں ہے"
اس لئے دنیا میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے"

اور قدرتی طور پر یہ سوال آتا ہے کہ وہ اگر ایسا خدا ہو جیسا کہ انسانی فطرت سمجھاتی
یا طلب کرتی ہے تو کیا وہ یہ کر نہیں سکتا یا کرنا نہ چاہے گا کہ اپنے تئیں اپنی ذی عقل
مخلوق پر منکشف کرے ؟

بائیبل نے شروع سے یہ مان لیا کہ اُسے ایسے وسیلے حاصل ہیں اور اُس نے
طبعی دین کی تکمیل بواسطت مکاشفے کی ہے۔ اس سارے مکاشفے
کا مرکز ایک الہیٰ انسان یسوع مسیح ہے جس کی خبر پہلے سے عہد عتیق میں دی گئی
تھی اور جس کی لوگ انتظاری کرتے تھے اور اُس کے کاموں اور تعلیم کا ذکر
عہد جدید میں ہے۔ اور کلیسیا میں اپنے روح کے ذریعہ ہمیشہ موجود ہے۔ البتہ
دہریہ لوگ ایسے مکاشفے کے منکر ہیں۔ لیکن مکاشفہ کے بغیر ہی دہریہ پن اپنی بے جا
جرأت کے باعث مجرم ٹھہر جاتا ہے۔ کوئی صیغہ کیوں نہ ہو اثبات نفی نہایت مشکل امر ہے

اور دہریوں کا یہ دعوے ہے کہ ہم نے نفی کو ثابت کر دیا ہے سب سے زیادہ وسیع
طبقے یعنی کل عالم میں اور وہ بھی فطرت اور انسانی ذات کی چند در چند شہادت کے
بالمقابل جب تک کہ کل عالم کا بحیثیت مجموعی اور باتفصیل علم کسی کو حاصل نہ ہو وہ
خدا کی ہستی کے قطعی انکار کا مجاز نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ پورے طور
سے کہہ سکتا ہے کہ ساری مخلوقات کو میں نے چھان ڈالا لیکن اس کے آثار پائے
نہیں جاتے جو خدا کی ہستی کے ممد ہوں۔ اور عقل جب تک غیر محدود اور ہمہ جا
حاضر اور ہمہ دان نہ ہو ایسا دعوے نہیں کرسکتی۔ اور جب دہریہ اس قسم کا دعوے
کرتا ہے تو وہ فی الحقیقت اپنے سے وہ ذات وصفات منسوب کرتا ہے حالانکہ
خدا کی ہستی کا وہ انکار کرتا ہے +

ایک اور سلسلہ دلائل ہے جو مکاشفہ کا مخالف ہے جسے آج کل اگناسٹک
(Agnostic) کہتے ہیں۔ اس کا سارا زور یہ ہے کہ انسان محدود العقل
اور محدود القوئے ہے اور جب وہ ایک خاص حد سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو ورطہ حیرت
میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا یہ دعوے ہے کہ یہ محدود العقل انسان خواہ
کیسا ہی اعلےٰ کیوں نہ ہو وہ غیر محدود اور مطلق تک رسائی حاصل کرنے کی امید نہیں
کرسکتا۔ اس کا مقولہ ہے کہ جو طاقت وجود عالم سے ہم پر منکشف ہوتی ہے وہ دائرہ
تلاش سے باہر ہے" فطرت میں جو بے قاعدگیاں اور مشکلات پائی جاتی ہیں اُن پر بھی
یہ لوگ زور دیتے ہیں۔ ارتقا کے تاریک پہلو پر۔ کہ اس میں ناکامیابی جنگ اور
زوال پائے جاتے ہیں۔ انسانی ذات کے تاریک پہلو پر۔ مثلاً دنیا میں بدی کی موجودگی
وہ یہ کہتے ہیں کہ جو خوبیاں نظر آتی ہیں ان کے مقابل اس تاریک پہلو کا پلہ زیادہ بھاری
ہے۔ اس لئے ہمیں یقین نہیں ہوسکتا کہ دنیا میں کوئی حکومت ہے اور وہ ایسی حکومت
ہے جس کی غرض راستبازی ہے +

انسانی زندگی میں ان دو امور پر جو اگناسٹک لوگ زور دیتے ہیں تو وہ کسی قدر راست بھی ہیں۔ لیکن انہیں دو امور کی وجہ سے یہ مکاشفہ سب سے زیادہ ممد ہے۔ بدی کے مسئلہ پر بحث کرنے کی تو یہاں جگہ نہیں۔ لیکن اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسئلہ خواہ کیسا ہی حقیقی اور مشکل کیوں نہ ہو مکاشفہ کی روشنی میں وہ ایمان کے لئے لاینحل رکاوٹ نہیں۔ رہا ہمارے قوائے ناقص ومحدود کا لحاظ ہم خود آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ طبعی دین میں بھی یقین اور تکمیل کا درجہ حاصل نہیں اور بائبل میں یہ بخوبی تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ایک معنی میں بائبل کا خدا ادراک اور یافت سے پرے ہے اور عقل کی رسائی سے باہر۔ وہ اپنے راہوں اور خیالوں میں ایسا اعلےٰ ہے جیسے آسمان زمین سے بلند ہے (یسعیاہ ۵۵: ۹)۔ اور اس کی تصویر یوں کھینچی گئی۔ وہ "گھٹا کی تاریکی میں رہتا ہے (۱سلاطین ۸: ۱۲)۔ یا "ایسے نور میں رہتا ہے۔ جس تک کسی کی گزر نہیں" (۱تیمتھیس ۶: ۱۶)۔ "خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا" (یوحنا ۱: ۱۸) "کوئی نہیں جانتا کہ باپ کون ہے سوائے بیٹے کے" (لوقا ۱۰: ۲۲)۔ نیز انسان جیسا کہ ہم اسے جانتے ہیں خدا کے حقیقی علم کے بالکل ناقابل ہے۔ نفسانی انسان خدا کی روح کی باتیں سمجھنے کے ناقابل ہے (۱کرنتھی ۲: ۱۴)✦

انبیا نے جس قدر اس فرض کی تاکید سامعین کو کی اور کسی فرض کی ایسی نہیں کی کہ "خداوند کو جانو"۔ اس سے غافل رہنے کی وجہ سے برگزیدہ امت کو رنج و ناکامیابی حاصل ہوئی (یسعیاہ ۱: ۳؛ ۵: ۱۳؛ ہوسیع ۴: ۶)۔ لیکن اس کی موجودگی راستباز رفتار کی گویا ضمانت ہے۔ نئے عہدنامہ میں باپ اور بیٹے کی پہچان "ہمیشہ کی زندگی" کہلاتی ہے (یوحنا ۱۷: ۳)۔ اس ظاہرا مخالفت کی وجہ کیا ہے؟ آدمی کی اس افتادہ حالت میں گو گناہ نے خالق کی صورت کو اس میں بہت کچھ بگاڑ دیا ہے تو بھی اس میں اب تک اس شراکت کی قابلیت ہے جس کے لئے وہ خلق ہوا تھا۔ گو

وہ اپنی سعی سے ڈھونڈھ کر خدا کو پا نہیں سکتا (ایوب ۱۱: ۷)۔ تو بھی وہ توبہ کرکے خدا کے فضل کے ساتھ ہمدم ہوکر اس واحد حقیقی کی صحیح پہچان حاصل کرسکتا ہے جو اس کے فردوس میں جدا ہونے کے پہلے روز ہی سے اس کی تلاش کر رہا ہے (پیدائش ۳: ۹) اور زمانہ سابق میں اس نے اپنے تئیں کئی ایک دنوں پر منکشف کیا۔ "حصہ بحصہ اور طرح بطرح" (عبرانی ۱: ۱)۔ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے تو انسانی رسائی سے پرے ہے لیکن خدا چاہتا ہے کہ شخصی شراکت کے ذریعہ اس کا علم حاصل ہو۔ اس نے آدمی کو ایسی شراکت کی قابلیت عطا کی ہے۔ اور گو انسان نے اسے رد کردیا لیکن خدا نے ایسے وسائل پیدا کر دیئے تاکہ یہ جلاوطن ہمیشہ کے لئے اس سے مردود نہ رہے۔ (مقابلہ کرو ۲سموئیل ۱۴: ۱۴)۔ عہد عتیق کے ایک بزرگ نبی نے عجیب الفاظ میں خدا کی اس فروتنی کے معمّا کا بیان کیا ہے (یسعیاہ ۵۷: ۱۵)۔ نئے عہدنامہ میں اس عجیب منظر کا مکاشفہ مسیح میں ملا جس کی انتظار انبیا اور زبور نویس صدیوں سے کر رہے تھے۔ تب خدا اور انسان کا مکاشفہ ایک ہی شخص کی زندگی میں کامل طور سے ایک ہی دفعہ مل گیا ✦

یسوع مسیح میں خدا کے مکاشفہ کا امتحان بہت صدیاں کر چکی ہیں۔ اس میں انسانی ذات کی اعلیٰ آرزو اور نہایت ضروری تقاضات نے تشفی حاصل کی۔ اس خصوصیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ٹھیک ایسے ہی مکاشفہ کا محتاج تھا۔ ایک صورت میں تو یہ "قادر مطلق خدا کی سیرت کا مکاشفہ ہے جو نہایت اعلیٰ اور اشرف معنی میں "ہمارا باپ" ہے۔ دوسری صورت میں یہ انسان کامل کا مکاشفہ ہے۔ ہزارہا پشتوں سے انسانی عقل گرداب حیرت میں بڑی غوطے مار رہی تھی کہ انسانی زندگی کے معنی، مقصد اور انجام کیا ہے۔ اس معمّا کو نئے عہدنامے نے حل کردیا۔ جو کچھ مسیح نے پہاڑی وعظ اور دیگر مقامات میں ہمارے فرض اور موجودہ زندگی اور حیات

بعد ممات کے بارہ میں تعلیم دی اُسے اس نے اپنی ذات میں عملی طور پر دکھا دیا۔ کہ آسمانی باپ کے ساتھ اُس کی پوری شراکت تھی۔ اور اُس شراکت کے زور پر اس نے ہر طرح کی آزمایش پر فتح حاصل کی۔ اُس نے تسلیم مطلق کا پورا ثبوت دیا بلکہ عین موت کے وقت تک دکھوں کے ذریعہ فتح پائی اور قبر کے بعد نئی زندگی اور جلال کو حاصل کیا۔ اُس کے مکاشفے کے یہ لازمی اجزا ہیں۔ لیکن یہ مکاشفہ صداقت اور اُس کمال کا محض اظہار ہی نہیں جو کمزور اور افتادہ انسان کے لئے بالکل ناقابل تحصیل تھا "فضل اور سچائی یسوع مسیح کے وسیلے پہنچے" (یوحنا ۱: ۱۷)۔ اس مکاشفہ اور دیگر مکاشفات میں مابہ الامتیاز یہ ہے جو کمال یہ انسان کے سامنے پیش کرتا ہے وہ نہایت ہی اعلےٰ ہے۔ یعنی پوری کاملیت (متی ۵: ۴۸)۔ تو بھی ایسی محرک قوت بھی بہم پہنچاتا ہے جس کے ذریعہ انسان اس کمال تک پہنچ سکتا ہے ۔

محض صداقت کا مکاشفہ مایوسی پیدا کرتا ہے اور ہمیشہ اس کی خصوصیت یہی رہی کہ اس نے گناہ کا احساس پیدا کیا۔ کیونکہ جب قادر مطلق کی قدوسیت مطلق کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ اور یہ بھی مطالبہ ہو کہ ایسی ہی پاکیزگی انسان کو درکار ہے اور یہ عملی طور پر انسان مسیح یسوع میں ظاہر ہوئی تو کانشنس اپنی ناپاکی اور آلودگی کی کہانی آپ ہی بیان کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ خوفناک مقابلہ جب خدا کی منکشف محبت کے نور میں کیا جائے تو بذات خود سخت پچھتاوا ہمارے اندر پیدا کردے گا لیکن فضل کے مزید مکاشفہ کے ذریعہ یہ پچھتاوا توبہ سے بدل جاتا ہے۔ یعنی ان وسائل کی صورت میں جنہیں الٰہی محبت نے انسان کی بحالی کے لئے تجویز کیا۔ اور اس لئے گناہ کا احساس تبدیلی دل کی طرف لیجاتا ہے۔ بائبل میں جو کفارہ کی تعلیم ہے جس کا کمال یہ ہے کہ مسیح نے اپنے تئیں آپ قربانی کے لئے پیش کیا۔ اس میں نوع انسان کا حقیقی نمائندہ نظر آتا ہے جو گناہ کے ذریعہ پیدا شدہ سدراہ کو دور

کر دیتا ہے۔ اور خدا کے پاس جانے کی راہ کھول دیتا ہے۔ اور یوں انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ الٰہی حیات اور طاقت میں ساکرمینٹی طور پر شریک ہو اور روح کی اس آرزو اور تقاضا نے زمانہ قدیم میں قربانی کے دستور کو مقرر کر دیا۔ اور یہ قربانی کا دستور نوع انسان کے ابتدا ہی سے عالمگیر رہا ہے۔ وہ آرزو اب پوری ہو جاتی ہے۔ تجسم کے بارہ میں جو تعلیم ہے۔ "وہ کلام مجسم ہوا" ابن خدا نے کسی ایک فرد انسان کی شخصیت کو اختیار نہیں کیا بلکہ ہماری ذات کو عالمگیر طریقے سے تاکہ وہ انسان کا حقیقی نمائندہ ہو سکے۔ اُس حقیقی تصور کی تکمیل اس میں ہوئی جو کبھی کبھی عجیب اور ناشائستہ قصہ کہانیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔ مثلاً ہندوؤں کے اوتاروں کے اور دیگر مذہبی قصوں میں۔ اس تجسم میں انسانی اشخاص ایک ایک کر کے مسیح کے بدن میں مثل اعضا کے شامل ہو جاتے ہیں۔ اسی شراکت اور شمولیت کی وجہ سے مسیح کی کفارہ بخش قربانی ہر ایک میں موثر ہوتی ہے۔ اسی تجسم میں تمدنی روح کا کمال بھی پایا جاتا ہے اور باقی سب تمدنی شراکتیں اس زندہ شراکت کے مقابلہ میں محض استعارہ دکھائی دیتی ہیں جو کلیسیا میں ہے جو "وہ اُس کا بدن ہے"۔

آخر کار ان دونوں صورتوں میں اس مکاشفہ کی عالیشان توضیح ہو گئی ہے۔ جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ مسیح کی زندگی دکھ کو کامل طور پر نہیں مسیح کے ہزارہا پیروؤں میں فی الحقیقت پیدا ہو گئی۔ مسیح کے یہ شاگرد اپنی خطاؤں اور قصوروں سے بخوبی واقف ہو گئے تو بھی اپنے ہونٹوں اور زندگی کے ذریعہ فوراً یہ کہہ اٹھے "اب میں زندہ ہوں تو بھی میں نہیں بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے" (گلتیوں ۲: ۲۰)۔ "میں مسیح کے وسیلے سب کچھ کر سکتا ہوں جو مجھے زور دیتا ہے"۔

یسوع مسیح کا تشخص

۱۔ مسیحی دین کی موجودہ حالت۔ نوع انسان کے تقریباً ایک تہائی حصہ کا مذہب مسیحی ہے۔ گذشتہ صدی میں اس کو اس قدر ترقی حاصل ہوئی اور اسی وقت اس کے لئے ایسی امیدیں ہیں کہ اس کے بانی کی یہ مشہور پیشین گوئی کہ آخر کار سارا جہان اُس کا مرید ہو جائے گا۔ تکمیل کی منزل سے تھوڑی دور ہی رہ گئی ہے۔ ایسی مشہور تحریک کے آغاز کی تفتیش کرنا اور اُس کے بانی اعظم کی سیرت اور شخصیت کا صاف خیال حاصل کرنا اس فصل کا مقصد ہے۔

۲۔ مسیحیت کیا ہے؟ مغرب کی قوموں کے درمیان خواہ وہ مسیحی عقیدہ کو رد بھی کرتی ہوں۔ اب تک یسوع مسیح کی تعظیم کی جاتی ہے اور اُسے سب سے اعلےٰ اور اشرف مانتی ہیں کہ تاریخ میں کوئی ایسا شخص اس کے برابر نہیں گزرا۔ جان سٹوارٹ مِل صاحب فرماتے ہیں کہ "یسوع کی زندگی اور اقوال میں ایسی شخصیت کا نقشہ جما ہوا ہے جو اعلےٰ درجہ کے علم لدنی سے مزین تھی۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کی وجہ سے ناصرت کے نبی کا درجہ ان لوگوں کے خیال میں بھی جو اُس کو ملہم نہیں مانتے ایسا اعلےٰ اور ممتاز ہے کہ کسی اور انسان کو کبھی حاصل نہیں ہوا۔ جب مذہب نے ایسے انسان کو انسانیت کے نمائندہ اور رہنما ہونے کے لئے انتخاب کیا تو اُس نے غلطی نہیں کی اور جو لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے اُن کو بھی اب تک اس سے بڑھ کر صداقت کی مثال نہیں ملے گی کہ وہ ایسی زندگی بسر کرے جسے مسیح پسند کر سکے"۔ اور رینن صاحب کہتے ہیں کہ "یسوع ہر طرح سے لاثانی ہے اور کوئی اُس کا ہم پلہ نہیں ٹھہر سکتا۔ آئندہ کا نظارہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو کوئی یسوع پر سبقت نہیں لے جائے گا۔ اے شریف شروع کرنے والے

اب تو اپنے جلال میں آرام کرتا رہ۔ تیرا کام پورا ہو چکا۔ تیری الوہیت قائم ہو گئی۔ اپنی موت کے وقت سے لے کر ہزار ہا گنا زیادہ زندہ اور ہزار ہا گنا زیادہ محبوب تو ثابت ہوا، بہ نسبت اُن دنوں کے جب کہ تو یہاں دنیا میں زندہ تھا۔ تُو تو انسانیت کے کونے کا پتھر ہو گیا۔ یہاں تک کہ تیرے نام کا اس دنیا سے اکھاڑنا دنیا کی بنیادوں کو ڈھا دینا ہوگا۔ اب کوئی انسان تیرے اور خدا کے درمیان فرق نہ کرے گا"۔ مگر مسیحیوں کے لئے یسوع اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ چند یونی ٹیرین لوگ تو اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ نبیوں میں سے اعلےٰ انسان نبی تھا۔ لیکن مسیحیوں کا ایک بہت بڑا حِصّہ اس زمانہ اور اس سے ماقبل زمانوں میں یہ مانتا ہے اور مانتا چلا آیا ہے کہ وہ خدا کا ازلی بیٹا ہے۔ اُس نے ہماری ذات اختیار کی تاکہ اُسے شخصی دے اور صلیب پر دُکھ اُٹھانے کے بعد مُردوں میں سے جی اُٹھا اور آسمان پر چڑھ گیا اور عالم کے تخت پر جا بیٹھا۔ اور اُس کی تعظیم ایسی ہی کی جاتی ہے جیسے باپ کی۔

۳۔ تجسّم کے بارہ میں مسیحی تعلیم۔ یہ عقیدہ کہ تاریخی شخص یسوع مسیح خدا کا ازلی بیٹا انسان بن گیا (ایک پرانے گیت کے الفاظ کے مطابق) "وہ خدا ہے باپ کے جوہر سے سب عالموں سے پیشتر مولود اور انسان ہے جو اپنی ماں کے جوہر سے اس عالم میں پیدا ہوا ہے۔ وہ کامل خدا اور کامل انسان ہے۔ نفس ناطقہ اور انسانی جسم سے موجود۔ الوہیت کی راہ سے باپ کے برابر۔ انسانیت کی راہ سے باپ سے کمتر"۔ یہی تجسّم کا مسئلہ ہے۔ تجسّم کا خیال کہ وہ الٰہی ذات کے ظاہر ہونے کا ایک طریقہ ہے بالکل مسیحی دین ہی کی خصوصیت نہیں۔ مشرق کے کئی ایک مذاہب میں یہ خیال پایا جاتا ہے۔ خاص کر ہندوستان کے مذاہب میں۔ برہمنی تعلیم کے مطابق وشنو جو تریموُرتی میں سے ایک دیوتا ہے اُس نے کئی بار تجسّم لیا۔ اُس کا سب سے مشہور اوتار نواں تھا جس میں وہ بطور کرشن یعنی سیاہ فام کے ظاہر ہوا۔ کئی ایک

بہادرانہ کام کرنے کے بعد مثلاً اپنے والدین کے قتل کا انتقام لینے اور کالیہ ناگ کو قتل کرنے کے بعد وہ ایک تیر کے ذریعہ مارا گیا اور مرتے وقت یہ پیشین گوئی کی کہ اُس کی وفات سے تیس سال بعد لوہے کا زمانہ یا کل جگ شروع ہوگا۔ ان مشرقی اوتاروں اور مسیح کے تجسم میں مشابہت صرف سرسری ہے۔ یہ اوتار عارضی تھے۔ مسیح کا اوتار مستقل تھا۔ ان اوتاروں میں دیوتا ہر طرح کا بُرا کام کرتا ہے لیکن مسیح کی زندگی بے عیب اور تقلید کے لئے کامل نمونہ تھا۔ ان اوتاروں نے کوئی نجات حاصل نہیں کی سوائے اس کے کہ بعض اوقات چند ظالموں کے ظلم سے بعضوں کو رہائی دی۔ لیکن مسیح نے گناہ سے نجات دی اور نوع انسان کے آگے ابدی زندگی پیش کی۔ ان دیگر مذاہب کے اوتار بہت نکمے۔ غیر روحانی۔ پست کرنے والے اور بہت تنگ تھے اس لئے ان کا مقابلہ مسیح کے اوتار کی شان کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ گناہ کا کفارہ دے۔ بدی کی طاقت کو نیست کرے اور کل نوع انسان کو خدا کے ساتھ شراکت رکھنے کے قابل کرے ۔

۴۔ **تجسم کی معقولیت۔** مسیحی لوگ تجسم کو محض اسی لئے تسلیم نہیں کرتے کہ بائبل میں اس کی تعلیم ہے۔ یا کہ کلیسیا کے عقیدہ کا یہ جزو چلا آیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ بذاتہٖ معقول اور خدا اور انسان کے بارہ میں جو اعلےٰ اور افضل تصورات ہیں ان کے بعین مطابق ہے ۔

(۱)۔ یہ اس تصور کے مطابق ہے کہ انسان خدا کی صورت پر مخلوق ہوا جو بڑے بڑے دین ہیں وہ یہ مانتے ہیں کہ الٰہی ذات اور انسانی ذات آپس میں بہت ہی مشابہ ہیں۔ اس کا زیور عقل سے مزین ہونا۔ حق و ناحق کا علم رکھنا۔ فعل مختار ہونا پاکیزگی کی آرزو۔ خدا کی تلاش جو کسی نہ کسی قدر نہایت پست قوموں میں بھی پائی جاتی ہے یہ سب امور اس کا ایما ہیں کہ خالق اور مخلوق کے درمیان حقیقی روحانی نسبت

اور مشابہت ہے۔ خدا کی ذات اور سیرت کا اظہار کسی قدر طبعی دنیا کی صنعتوں میں ہوتا ہے۔ لیکن کامل اور کافی اظہار انسان کی ذی عقل اور روحانی ذات میں۔ یہ ذات اپنی اس افتادہ حالت میں بھی خدا کی ذات سے ایسی مشابہت رکھتی ہے کہ دنیا میں کوئی اور شے جو ہمیں معلوم ہو ایسی نہیں رکھتی۔ اس لئے یہ بالکل قابل اعتقاد ہے کہ نوع انسان پر خدا کے آخری مکاشفہ کے لئے انسانی ذات بطور وسیلے کے چُنی جائے۔ ایسی اعلیٰ کامل انسانی زندگی جو انسانی قیود میں بسر ہوسکے اور معمولی انسانی مشکلات میں سے گزرے وہ زیادہ تسلی بخش اور اخلاقی طور سے زیادہ ثمر آور مکاشفہ ہے بہ نسبت کسی ایسے مسائل کے جو خدا کے بارہ میں کسی کتاب میں قلمبند ہوں ۔

(۲)۔ دوسرے ہر قسم کے مکاشفوں کی نسبت مسیح کا تجسم خدا کی محبت کو زیادہ موثر طور سے منکشف کرتا ہے۔ یہ تو طبعی دین کی تعلیم اور رائے ہے کہ خدا فی الحقیقت اپنی مخلوقات کو پیار کرتا ہے۔ لیکن خلقت کی موجودہ حالت میں بہت باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو اُس کے نقیض معلوم ہوتی ہیں اس لئے ایسے خاص مکاشفہ کی سخت ضرورت تھی جو اس تعلیم پر مُہر صداقت ثبت کرسکے بھونچال آندھی و طوفان۔ وبا اور مری۔ ہلاک کرنے میں مقدس اور گنہگار کسی کا امتیاز نہیں کرتے۔ فطرت اندھا دھند اُن طاقتوں کا ایک سنگین انتظام معلوم ہوتا ہے جو ہمیشہ سیلاب کی طرح رواں ہیں اور انسانی حاجتوں۔ آنسوؤں اور آہ و نالہ کی اُن کو کچھ پروا نہیں۔ اس لئے جو مکاشفہ انسانی ضرورتوں کو رفع کرنا چاہے اس میں اس امر کی از حد ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ الفاظ سے بڑھ کر ایک خاص قابل احساس ثبوت پیش کرے کہ جو فطرت پر حکمران ہے۔ وہ ایک متشخص وجود ہے جو نوع انسان کا دوست اور ہر فرد بشر کی ضرورتوں کی فکر کرتا ہے۔ مسیح کے

تجسّم کے ذریعہ ایسا ہی نبوت پیش کیا جاتا ہے۔ خدا نے آسمان سے محض ایک پیغام نہیں بھیجا جس نے یہ اعلان دیا ہو کہ وہ نوع انسان کا دوست ہے۔ اُس نے اپنے بیٹے کو بھیجا کہ انسانی زندگی بسر کرے۔ اور دوسرے لوگوں کی طرح گناہ سے جنگ کرے۔ اور دیگر انسانوں کی طرح غم، محنت اور مایوسی میں مبتلا ہو اور آخرکار شہید کی طرح جام شہادت نوش کرے۔ مسیح میں خدا اپنی ہمدردی ہمارے دُکھوں کے ساتھ یوں ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے ساتھ دُکھوں میں شریک ہوتا ہے "کیونکہ ہمارا ایسا سردار کاہن نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد نہ ہو سکے بلکہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا تاہم بے گناہ رہا" +

نہ صرف دُکھ اُٹھانے میں بلکہ اعمال میں بھی یسوع مسیح نے خدا کی محبت کو منکشف کیا "وہ بھلائی کرتا اور اُن سب کو جو ابلیس کے ہاتھ سے ظلم اُٹھاتے تھے شفا دیتا پھرا کیونکہ خدا اُس کے ساتھ تھا" اُس نے دیوانوں کو دانائی، اندھوں کو بصارت، مفلوجوں کو جسمانی زور۔ اور مُردوں کو زندگی عطا کی۔ جو معجزہ اُس نے کیا وہ مہربانی و خیرخواہی کا معجزہ تھا تاکہ انسانوں کو اس امر کا یقین دلائے کہ جس باپ کی ذات کو وہ منکشف کرنے آیا تھا وہ انسانوں کا حقیقی خیرخواہ اور سچا مہربان اور عادل ہے +

(۳)۔ **مسیح کا تجسّم** گناہ کے کفارہ کے لئے اُن سب سے بڑھ کر کافی طریقہ ہے جو ہمارے قیاس میں آ سکتے ہوں۔ خدا اور انسان کے درمیان جو بڑی حد فاصل ہے وہ گناہ ہے۔ اور نوع انسان کی دینی حس یہ محسوس کرتی ہے کہ انسان اپنے آپ اس حد فاصل کو دور نہیں کر سکتا۔ بعض سرسری غور کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ خدا کے ساتھ ملاپ حاصل کرنا ضروری اور لازمی نہیں۔ اور اگر یہ لازمی بھی ہو تو انسان محض انسانی توبہ کے ذریعہ یہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں کچھ صداقت تو ہے لیکن

نیم صداقت ہے۔ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ توبہ گناہ کے لئے کافی اور مناسب کفارہ ہے۔ مثلاً جب ایک انسان دوسرے کا گناہ کرتا ہے تو توبہ اُس کے لئے کافی کفارہ سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ خدا کے خلاف گناہ کا بھی حقیقی توبہ کافی کفارہ ہوگا لیکن انسان کی بیدار تمیز جانتی ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ گناہ کے لئے اُس کی توبہ اُس کے دیگر نیک اعمال کی طرح کمزور اور غیرموثر ہے۔ اور اُسے کوئی تبدیل کنندہ طاقت کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ اُس کی توبہ کامل ہو سکے مسیح کا تجسّم یہی طاقت بہم پہنچاتا ہے۔ خدا کا مجسّم بیٹا نوع انسان کے سر کی اور اس کے لئے ذمہ وار ہونے کی حیثیت میں جہان کے گناہوں کے لئے کافی غم اور پچھتاوا خدا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور ہر فرد کو اپنے ساتھ رشتہ اتحاد سے باندھنے کے ذریعہ ایسا فضل عطا کرتا ہے تاکہ اس کی توبہ زیادہ زیادہ گہری ہوتی جائے تاکہ آخرکار اس کی توبہ کامل ہو جائے اور خدا اُس توبہ کو کافی سمجھے +

(۴)۔ **تجسّم** کا مقصد یہ بھی ہے کہ بے گناہ کمالیت کو ممکن کر دے۔ نیک بخت لیکن بتدریج۔ یہ عمل نہ محض مسیح کے کامل نمونہ کی تاثیر سے ہوتا ہے بلکہ اس فوق العادت فضل کے متواتر ملتے رہنے کے ذریعہ جو اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ایمان کے ذریعہ چلتے ہیں۔ مسیحی رائے کے مطابق مسیح اپنے پاک تجسّم کی تاثیر سے نوعِ انسان کا ایک نیا جد امجد بن جاتا ہے۔ جیسے ہم اپنی طبعی پیدائش اور تربیت کے وسیلے اپنے والدین کی بدذاتی اور گناہ آلودہ رغبتوں کو ورثہ میں حاصل کرتے ہیں ویسے ہی اپنی نئی اور روحانی پیدائش کے ذریعہ سے ہم مسیح کی پاک اور بے گناہ انسانی ذات میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور اُس ذات کی قوت کے ذریعہ گناہ پر کامل فتح حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ بعض تو اسے استعارہ سمجھیں گے اور بعض محض خیالی پلاؤ لیکن یہ مسیحیوں کا حقیقی زندہ اور دینی تجربہ ہے

جن لوگوں نے دینی زندگی میں ترقی کی ہے وہ اِس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ فی الحقیقت خدا کے ساتھ مسیح کے وسیلے ان کا زندہ اتحاد ہوا ہے۔ اور بدی کی طاقتوں کے مقابلہ میں اُن کو نئی طاقت ملی ہے ✦

(۵)۔ تجسم کے ذریعہ دین کا نہایت اعلےٰ اور کامل مقصد حاصل ہوتا ہے یعنی عابد اور معبود کے درمیان کامل رشتہ۔ مسیح میں انسانی ذات کا اتحاد شخصی طور پر خدا کے ساتھ ہو گیا ہے۔ اور چونکہ ہر ایمان دار کا تعلق مسیح کے ساتھ ایسا ہے جیسے اعضا کا سر کے ساتھ یا جیسے شاخوں کا تنہ کے ساتھ اِس ذریعہ ان کا فوق العادت اتحاد حیات خدا کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس جہان میں اِس الٰہی زندگی کا پورا ثمرہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن آئندہ جہان میں جب انسانی ذات دُکھوں کے وسیلے کامل ہو چکے گی اور گناہ کے ہر دھبہ سے مبرّا اور منزّہ ہو جائے گی تو ہر سچا ایمان دار خدا کو ایسا ہی دیکھے گا جیسا کہ وہ ہے۔ اور عرفان اور محبت کے ذریعہ اُس کے ساتھ کامل اتحاد ہوگا اور اُس کی ذات میں ایسے پورے طور سے شراکت ہوگی کہ وہ ایک طرح سے خود الٰہ بن جائے گا ✦

(۶)۔ تجسم انسانی جنسیت اور انسانی برادری پر زور دیتا ہے مسیح کی انسانیت فردی یا قومی نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔ وہ کل انسانیت کا بحیثیت مجموعی کمال ہے۔ اور اُس کے ذریعہ قوم اور افراد کا روحانی رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتا ہے اور وہ سب مل کر ایک کلیسیا۔ ایک خاندان یا ایک برادری بن جاتے ہیں۔ تجسم انسان کو افراد کی حیثیت میں نجات نہیں دیتا۔ بلکہ مسیح کے بدن کے اعضا کی حیثیت میں اور آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے تمدنی فرائض کا ادا کرنا لازمی ہے ✦

۴۔ **مسیح کی الوہیت**۔ یہ تو ہم ظاہر کر چکے کہ تجسم کے بارہ میں مسیحی تعلیم کیسی

معقول ہے۔ اب ہم مسیح کی الوہیت کے صریح ثبوت پیش کریں گے ✦

(۱)۔ ابتدائی مسیحیوں نے۔ نہ صرف جو غیر قوموں میں سے مسیحی ہوئے تھے۔ بلکہ جو یہودیوں میں سے بھی مسیحی تھے مسیح کی الوہیت کو مان لیا ✦

پولس کے خطوط جن میں سے تقریباً سب سوائے چوپانی خطوط کے بلا تکرار تسلیم شدہ ہیں وہ ۵۱ء (۱ و ۲ تھسلونیکی) اور ۶۷ء (۲ تیمتھیس) کے مابین لکھے گئے۔ اُن سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح کے صعود سے تقریباً بیس سال کے عرصے ہی میں مسیح کی الوہیت کا مسئلہ کلیسیا میں مسلم ہو چکا تھا۔ اِس کی نہ دلیلیں دی گئیں نہ اِس کے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ یہ اُن اصولی باتوں میں سے تھا جس پر سب مسیحیوں کا اتفاق تھا۔ چنانچہ ایک جگہ یہ بیان ہے کہ وہ دنیا میں پیدا ہونے سے پیشتر موجود تھا (۱ کرنتھی ۱۰: ۴ و ۹)۔ بلکہ فی الحقیقت وہ ساری خلقت سے پیشتر تھا۔ (کلسیوں ۱: ۱۷)۔ خدا کے برابر تھا (فلپیوں ۲: ۶)۔ اور باپ کے گماشتہ کے طور پر اُس نے دُنیا کو پیدا کیا۔ اور اب تک اُسے قائم رکھتا ہے (کلسیوں ۱: ۱۶ و ۱۷ + ۱ کرنتھی ۸: ۶)۔ نوع انسان کو مخلصی دینے کے لئے وہ انسان بن گیا (گلتیوں ۴: ۴)۔ اور صلیب پر مرگیا۔ (کلسیوں ۱: ۲۰)۔ وہ ایمان داروں میں اُن کی روحانی زندگی کے چشمہ کے طور پر بستا ہے۔ (۲ کرنتھی ۱۳: ۵)۔ وہ خدا کا بیٹا ہے (رومیوں ۸: ۳۲)۔ اور فی الواقع خدا ہے (رومی ۹: ۵ + ططس ۲: ۱۳)۔ اس لئے اس کی الٰہی اور انسانی ذات میں فرشتے اور انسان اُس کی عبادت و تعظیم ویسی ہی کریں جیسی خدا کی کرتے ہیں (فلپیون ۲: ۱۰)۔ اُس سے دعا مانگنا ایک معمولی بات سمجھا گیا۔ اس نے مسیحیوں کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہر جا اپنے خداوند یسوع مسیح کا نام لیتے ہیں (۱ کرنتھی ۱: ۲)۔ البتہ پولس یہ تو مانتا ہے کہ بیٹے ہونے کی حیثیت سے اُس کا درجہ باپ سے کمتر ہے (۱ کرنتھی ۱۵: ۲۸)۔ لیکن اُس نے مسیح کے نام کو باپ کے نام کے ساتھ ایسا ملحق کیا ہے جیسے

کہ وہ باپ کے برابر ہے۔ فضل اور برکت اور ساری خوبی کا وہ سرچشمہ ہے (۲ کرنتھی ۱۳: ۱۴)۔ اور جن کلیسیاؤں کی بنیاد پولس نے ڈالی اُن میں یسوع کی تعظیم الٰہی وجود کے طور پر ہوتی تھی۔ اور اِن خطوں کو جو غور سے پڑھے گا اُس کے دل میں اس کی نسبت کچھ شک نہیں رہ سکتا۔

لیکن اب شائد کوئی یہ کہے کہ ہمیں کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ پولس کی اس رائے کے ساتھ دیگر رسولوں کو بھی اتفاق تھا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ دیگر بارہ رسول یسوع کو محض انسانی مسیح سمجھتے ہوں اور کہ پولس نے ہی پہلے پہل کلیسیا میں یہ خیال ڈالا کہ وہ خدا تھا؟ خوش قسمتی سے ہمارے پاس اس سوال کا جواب دینے کی وجوہات ہیں۔ پولس کے خط ہی اس کی ایک اہم شہادت پیش کرتے ہیں۔ اُن سے پتہ لگتا ہے کہ بارہ رسولوں اور پولس کے درمیان اگرچہ کبھی کبھی نااتفاقی بھی ہوئی اور گاہے گاہے دینی مسائل پر سخت مباحثے بھی ہوئے لیکن وہ بحث مباحثے ادنیٰ امور کے بارہ میں تھے (مثلاً ختنہ۔ رسمی شریعت۔ کلیسیا میں غیر قوم مسیحیوں کا درجہ۔ پولس اور بارہ رسولوں کا الگ الگ اختیار) مگر ساری اصولی باتوں کے بارہ میں سارے فریقوں کا اتفاق تھا۔ گلتیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر قوموں کے رسول نے یہودی مسیحیت کے ارکان کے آگے انجیل کا ایک بیان پیش کیا جس کی وہ منادی کرتا تھا۔ اُنہوں نے اس پر پورا اطمینان ظاہر کیا۔ اس کی تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی اُنہوں نے نہ چاہی اور اُسے "شراکت کا داہنا ہاتھ دیا" اور اُسے صحیح عقیدہ کا رسول مان لیا (گلتیوں ۲: ۱ سے ۱۰)۔ اس کے مطابق مقدس پولس نے ہمیشہ یہ سمجھ رکھا کہ اس کی اپنی خوشخبری اور بارہ رسولوں کی خوشخبری ایک ہی تھی (مثلاً ۱ کرنتھی ۱۵: ۱۱) "پس خواہ میں ہوں۔ خواہ وہ ہوں۔ ہم یہی منادی کرتے ہیں اور اسی پر تم ایمان بھی لائے"۔ اگر مسیح کی ذات کے اور خدا اور انسان کے ساتھ

اُس کے رشتہ کے بارہ میں ان کا اختلاف ہوتا تو وہ یہ کبھی نہ لکھ سکتا۔

لیکن اس سے بھی بڑھ کر ہمارے پاس ثبوت ہے۔ اِن بارھوں کا جو سرگروہ رسول تھا اُس کا ایک خط ہے جس کے بارہ میں قدیم کلیسیا کو کوئی شک نہ تھا اور جس کے بارہ میں قدیم زمانہ سے اور اس کثرت سے ایسے ثبوت چلے آتے ہیں کہ اُن کو رد کرنا نہایت نامعقول ہوگا۔ کلیمنٹ رومی (۹۵ء)۔ پولیکارپ (۱۱۰ء) پےپیاس (۱۳۰ء) سے برابر شہادت کا سلسلہ چلا آیا ہے جنہوں نے مقدس پطرس کے پہلے خط کو قدیم اور مستند مانا۔ اس خط میں مسیح کی ذات کے بارہ میں جو تعلیم پائی جاتی ہے وہ مقدس پولس کی تعلیم کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہے۔ اس خط کے مطابق مسیح اپنی پیدائش سے پیشتر موجود تھا کیونکہ اسی نے عہد عتیق کے نبیوں کو الہام بخشا (۱: ۱۱)۔ اُس کی موت کی تاثیر فوق العادت تھی کیونکہ وہ کفارہ بخش قربانی تھی جس کے وسیلے نوع انسان کو گناہوں کی معافی حاصل ہوئی (۱: ۲ و ۱۹ ۲: ۲۱ و ۲۴ + ۳: ۱۸)۔ اب وہ خدا کے داہنے ہاتھ ہے اور اُسے کل دنیا پر اعلیٰ اختیار حاصل ہے یہاں تک کہ فرشتے بھی اُس کی اطاعت کرتے ہیں (۳: ۲۲)۔ اور دنیا کی عدالت کے لئے وہ پھر آئے گا (۱: ۷ و ۱۳ + ۴: ۵ و ۱۳ + ۵: ۴)۔ وہ مسیحی محبت اور جان نثاری کا مرکز ہے (۱: ۸)۔ وہ اکیلا درمیانی ہے جس کے ذریعہ روحانی عبادت اور دعا میں باپ تک رسائی ہو سکتی ہے (۲: ۵ + ۴: ۱۱)۔ روحانی طور سے اس کا اتحاد اُس کے لوگوں کے ساتھ ہے اور وہ اُن کے دلوں میں موجود ہے (۳: ۱۵ و ۱۶ + ۵: ۱۰ و ۱۴)۔ نجات اُس کے وسیلے ملتی ہے اور اُس پر ایمان لانے کے وسیلے (۱: ۹ + ۵: ۱۰)۔ مسیح کی مطلق الوہیت خاص کر ۱: ۱۱ میں ظاہر ہے۔ جہاں روح القدس کی نسبت جس نے قدیم نبیوں کو الہام بخشا لکھا ہے کہ وہ مسیح کا روح ہے۔ کلمہ تمجید ایسا یقینی نہیں (۴: ۱۱) جس کا اشارہ غالباً

مسیح کی طرف ہو لیکن ممکن ہے کہ باپ کی طرف ہو۔ اس لئے یہ بالکل روشن ہے
کہ مسیح کی ذات کے بارہ میں مقدس پطرس کی تعلیم مقدس پولس کی تعلیم سے بہت قریب
مشابہت رکھتی ہے۔ نہ صرف غیر قوم کلیسیاؤں میں بلکہ عبرانی کلیسیاؤں میں بھی
مسیح کی ذات کے بارہ میں بہت اعلےٰ تصور کی تلقین ہوئی تھی۔ اسی طرح جو
دیگر شہادت ہمارے پاس ہے اُس کا اشارہ بھی اسی طرف ہے۔ مقدس
یوحنا کا پہلا خط جس کی تائید ایسے زور سے ہوئی ہے۔ اور جس کی نسبت قدیم
کلیسیا میں کسی کو شک نہیں ہوا مسیح کی نسبت یہ بیان کرتا ہے کہ اپنے تجسم سے پیشتر
بحیثیت لوگاس یا کلام کے اپنے باپ کے ساتھ موجود تھا اور اس کی ازلی الٰہی
زندگی میں شریک تھا (۱:۱و۲)۔ وہ جسم میں ظاہر ہوا تاکہ شیطان کے کاموں کو نیست
کرے۔ گناہ کو دور کرے اور سارے جہان کے گناہوں کا اپنی موت کے ذریعہ
کفارہ دے اور اپنے خون کے وسیلہ گناہ سے رُوح کو پاک کرے (۱:۷ +
۲:۲ وغیرہ)۔ اور باپ بیٹے کا ایسا گہرا تعلق ہے کہ نجات کے لئے دونوں پر
ایمان لانا ضروری ہے (۲:۲۳ سے ۲۵ وغیرہ)۔ مقدس یعقوب کا خط جس کی نسبت
اکثر بحث ہوتی رہی لیکن جو بہت قدیم اور غالباً مقدس یعقوب کا اصلی خط ہے
یہ بیان کرتا ہے کہ مسیح خدا کے ساتھ ہمیشہ سے ہے (۱:۱)۔ اور مقدس پولس کی طرح
اُسے "جلال کا خداوند" کہتا ہے (۲:۱)۔ اس لقب سے اس کی فوق الانسان
عظمت اور قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ اور اُس میں عدالت کے لئے اُس کی
دوسری آمد کا ذکر ہے (۵:۸و۹)۔ عبرانیوں کا خط گو رسول کی تصنیف نہ ہو لیکن
رسولوں کے کسی شاگرد کی تصنیف ہے۔ اس میں مسیح کا یہ بیان ہے۔ کہ وہ ازلی
ہے (۱:۱۲ + ۱۳:۸)۔ خلقت میں باپ کا گماشتہ یا مختار ہے (۱:۲و۳ ۱۰)۔ خلقت
کا سنبھالنے والا ہے۔ فرشتوں سے اعلےٰ ہے اور پرستش کا مستحق ہے (۱:۴ سے ۶)۔

اعمال کی کتاب میں مقدس پطرس کی تقریریں جو مقدس پولس کے ایک رفیق نے
قلمبند کیں۔ مسیح کی نسبت یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ سب کا خداوند ہے یعنی کل عالم کا
(۱۰:۳۶)۔ وہ رُوح القدس کو بھیجتا ہے (۲:۳۲)۔ وہ زندگی کا سردار یا بانی
ہے (۳:۱۵)۔ خدا اور انسان کے درمیان وہی اکیلا درمیانی ہے اور وہی اکیلا
نجات بخشتا ہے (۴:۱۲)۔ وہ بے گناہ ہے (۳:۱۴ + ۷:۵۲)۔ اور زندوں اور
مُردوں کی عدالت وہی کرے گا (۱۰:۴۲)۔ اُس وقت بھی یروشلم کی کلیسیا نے
مسیح سے دعا مانگی (اعمال ۷:۵۹ + غالباً ۱:۲۴ میں بھی)۔ اور مسیحوں کے بارہ میں
یہ الفاظ آتے ہیں یعنی جو یسوع کا نام لیتے ہیں" (۹:۱۴)۔
(۴) یعنی الٰہی ابنیت کے بارہ میں مسیح نے خود تعلیم دی۔ رسولی کلیسیا میں اس
قسم کی تعلیم کے رواج سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ یسوع نے اپنے لئے ایسا اعلےٰ
دعوے کیا جو کسی دوسرے دین کے بانی نے نہیں کیا۔ گوتم۔ محمد۔ کنفیوشش جیسے
معلموں نے یہ دعوے تو کیا کہ ہماری تعلیم پر ایمان لاؤ۔ لیکن یہ دعوے نہیں کیا
کہ ہم پر ایمان لاؤ۔ لیکن یسوع نے یہ صاف دعوے کیا کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میرے
حکم کو مانو اور یہ لاثانی قسم کا دعوے تھا۔ یسوع کی تعلیم کا علم ہمیں تقریباً سب
کا سب چاروں اناجیل سے ملتا ہے۔ ان میں سے دوسری انجیل کی نسبت عموماً
یہ مانا جاتا ہے کہ وہ مقدس پطرس کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ پہلی انجیل میں
خاص کر یسوع کی تقریریں مقدس متی کے ذریعہ ملیں اور تیسری انجیل کو مقدس
پولس کے رفیق نے تحقیق کر کے تصنیف کیا۔
البتہ چوتھی انجیل کے بارہ میں علما کا ایسا اتفاق نہیں۔ اس تفسیر میں ہم نے
عموماً یہ تسلیم کر لیا ہے کہ یہ انجیل مقدس یوحنا کی تصنیف ہے اور انگریز علما کی عموماً
یہی رائے ہے۔ البتہ جرمن علماء کا اس سے اختلاف ہے۔ ایسے نتائج نکالنے

کے لئے جن پر کسی کو شک نہ رہے۔ ہم اس فصل میں صرف وہی شہادت پیش کریں گے جو دوسرے مصنف بیان کر چکے ہیں ٭

مقدس مرقس کی انجیل میں ہمارے خداوند کی تقریباً کوئی بھی تقریر مندرج نہیں اور اس لئے زیر بحث مسئلہ کے متعلق اُس سے بہت کم مدد مل سکتی ہے لیکن اس انجیل سے بھی اتنا تو ظاہر ہے کہ یسوع نے فوق الانسان عظمت کا دعوےٰ کیا۔ اُس کو لوگوں نے اس لئے مروایا تھا کہ نہ صرف اُس نے مسیح ہونے کا دعوےٰ کیا تھا بلکہ خدا کا بیٹا ہونے کا دعوےٰ کیا تھا۔ اور اِسے لوگوں نے کفر سمجھا اور اُس نے پیشین گوئی کی تھی کہ میں آیندہ کو خدا کے داہنے ہاتھ بیٹھا رہوں گا اور عدالت کے لئے دوسری دفعہ آؤں گا (مرقس ۱۴: ۶۲)۔ اُس نے اپنی موت سے ایسے معنی منسوب کئے جو سمجھ میں نہیں آسکتے اگر ہم اُس کو محض انسان سمجھیں اُس نے یہ تعلیم دی کہ میری موت بہتوں کے لئے فدیہ ہوگی (۱۰: ۴۵) گناہ کے لئے کفارہ ہوگی۔ اور خدا اور انسان کے درمیان نیا عہد قائم کرنے کا وسیلہ ہوگی (۱۴: ۲۴)۔ گو ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنی دوسری آمد کے دن اور گھنٹے سے ناواقف تھا لیکن اُس نے اپنے سے ایسا رتبہ منسوب کیا جو فرشتوں سے اعلےٰ تھا اور صرف خود آپ تعالےٰ سے دوم درجہ پر تھا۔ "اُس دن یا اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا۔ مگر باپ" (۱۳: ۳۲) یہاں اس امر کا لحاظ کرو کہ اکیلا لقب "بیٹا" مستعمل ہوا ہے جیسے کہ چوتھی انجیل میں ٭

مرقس نے جو شہادت پیش کی وہ اُن مفصل تقریروں سے تصدیق ہوئی ہے جو پہلی اور تیسری انجیل میں مندرج ہیں۔ ان تقریروں میں یسوع نے دعوےٰ کیا کہ اُس پر پورا پورا ایمان رکھیں۔ ایسی شدت کا ایمان اور ایسی جان نثاری جس کا

سوائے خدا کے کوئی دوسرا مستحق نہیں ہو سکتا (لوقا ۱۴: ۲۶ + متی ۱۰: ۱۴ و ۱۵ و ۳۲ و ۳۳ و ۳۷ و ۴۰ + ۱۱: ۲۸)۔ وہ ایسے اختیار سے کلام کرتا ہے جو کسی نبی کو حاصل نہ تھا۔ اپنے ہی اختیار سے اُس نے موسوی شریعت کی ترمیم کی یعنی ان مقدس الفاظ کی جو خود خدا نے کوہ سینا پر فرمائے تھے (متی ۵: ۲۱ وغیرہ)۔ اور اُس نے خاص طور پر بار بار یہ دعوےٰ کیا کہ میں آئندہ کو دنیا کا منصف ہوں گا۔ جس پہاڑی وعظ کو محض اخلاقی تعلیم کا مجموعہ قرار دیا جاتا ہے اُس میں بھی یہ تعلیم ہے (متی ۷: ۲۲ و ۲۳)۔ اور پھر بار بار اُن تقریروں میں جو بالجملہ مندرج ہیں (متی ۱۶: ۲۷ + لوقا ۱۲: ۸ و ۹ + متی ۲۵: ۳۱)۔ اور اس کا ذکر ایسی تمثیلوں میں بھی پایا جاتا ہے جو یسوع کی تعلیم کی خاص خصوصیت تھی اور جو تبدیلی اور بگاڑ کے ناقابل ہیں۔ مثلاً کڑوے دانوں کی تمثیل میں "دونوں کو اکٹھا بڑھنے دو اور فصل کے دن میں کاٹنے والوں سے کہدوں گا کہ پہلے کڑوے دانے جمع کر لو اور جلانے کے واسطے ان کے گٹھے باندھ لو اور گیہوں میرے کھتے میں جمع کر دو . . . . . . ویسے ہی دنیا کے آخر میں ہوگا۔ ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اُس کی بادشاہت میں سے جمع کریں گے اور اُنہیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں رونا اور دانتوں کا پیسنا ہوگا" (متی ۱۳: ۳۰ و ۴۰ سے ۴۲)۔ اور دس کنواریوں کی تمثیل میں بھی جہاں خود مسیح یہ فتوےٰ دیتا ہے کہ اُسے خارج کر دو (متی ۲۵: ۱۲)۔ اور جو تمثیل اس کے بعد آتی ہے۔ جہاں مسیح کے بارہ میں یہ بیان ہے کہ گویا وہ دور ملک کو جا رہا ہے اور وہ پھر واپس آکر اپنے نوکروں کو اجر دیتا ہے۔ جیسا جیسا کسی نے اُس کی غیر حاضری میں کام کیا تھا (متی ۲۵: ۱۴ + بمقابلہ لوقا ۱۹: ۱۲)۔ آخری عدالت کا بیان اِس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے (متی ۲۵: ۳۱)۔ جہاں

ابن آدم اپنے جلال کے تخت پر بیٹھتا ہے۔ ساری قوموں کو اپنی حضوری میں طلب کرتا ہے۔ نیکوں کو بدوں سے جدا کرتا ہے جیسے گڈریا بھیڑوں کو بکریوں سے جدا کرتا ہے اور وہ بھیڑوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے "آؤ میرے باپ کے مبارک لوگو جو بادشاہت بنائے عالم کے وقت سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے اُسے میراث میں لو"۔ لیکن دوسروں سے کہے گا "اے ملعونو میرے سامنے سے دور ہو اُس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اُس کے فرشتوں کے لئے تیار کی گئی ہے"۔

یسوع نے جو اپنے تئیں خدا کا بیٹا کہا اُس سے اُس کی کیا مراد تھی؟ متی ۱۱: ۲۷ اور لوقا ۱۰: ۲۲ سے خوب تشریح حاصل ہوتی ہے "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اُس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کرنا چاہے"۔ اس عبارت میں جسے سب مانتے ہیں کہ مقدس متی کے اصلی "لوگیا" کا جز ہے سب سے اعلیٰ امر یہ نہیں کہ بیٹے کو قدرت کاملہ حاصل ہے یا یہ امر کہ صرف اُسی کو باپ کا علم ہے بلکہ یہ قابل غور بات کہ بیٹے کی ذات ایسی اعلیٰ ہے کہ صرف باپ ہی کو اس کا ادراک حاصل ہے۔ کیا یہ روشن نہیں کہ جو وجود ایسا سرافراز ہو کہ جو باپ کی طرح قدرت کامل رکھتا ہو اور جسے باپ کے سوا کوئی دوسرا مخلوق ادراک بھی نہیں کر سکتا اس کی اور باپ کی ماہیت ایک ہی ہو گی اور وہ اُس کے تخت اور اس کی صفات میں شریک ہو گا۔

پہلی تین اناجیل نے مسیح کی الوہیت کو ایسے صاف طور سے سکھایا ہے کہ بپتسمہ کے کلمہ کو اُس کی تائید میں پیش کرنے کی کچھ ضرورت نہیں (متی ۲۸: ۱۹)۔

اس تفسیر میں اس بپتسمہ کے کلمہ کی تائید اور تردید میں جو مختلف آرائے ہیں وہ مفصل بیان ہوئی ہیں۔ لیکن خواہ یہ اصلی ہو یا مابعد زمانہ کی ایزاد ہو لیکن جو تعلیم اس میں مندرج ہے وہ اصلی ہے اور خود مسیح نے وہ تعلیم دی تھی۔ اور قدیم نسخوں سے یہ ثابت ہے۔ پس یہ امر واقعی نہیں (اگرچہ بعضوں نے ایسا بیان کیا)۔ کہ مسیح کی الوہیت کا مسئلہ ابتدائی سادہ انجیل پر مابعد زمانہ کی ایزاد ہے۔

۵ مسیح کی الوہیت کی مزید شہادت۔ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ تجسم کا مسئلہ اُس علم کے عین مطابق ہے جو ہمیں خدا کی ذات اور انسان کی ذات کے بارہ میں حاصل ہے اور اس لئے وہ معقول مسئلہ ہے۔ ہم یہ بھی کہہ چکے کہ نئے عہد نامہ نے اس مسئلہ کی تعلیم دی ہے۔ اور یہ تصدیق کی کہ مسیحی دین کا بانی یسوع مسیح خدا بھی ہے اور انسان بھی۔ اس عقیدہ کے قبول کرنے کی تائید میں ہم چند صاف دلائل پیش کریں گے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایسے مسئلہ پر پوری بحث کے لئے ایک الگ رسالہ درکار ہو گا۔ اور اس مختصر فصل میں اُس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

(۱)۔ **مسیح کی بے گناہی**۔ اگر یسوع مسیح فی الحقیقت خدا تھا تو اس کی زندگی ضرور پاک اور خیر خواہی عام کی زندگی ہو گی۔ اس کی خوبی کچھ تو اس کی اعلیٰ اخلاقی اور مذہبی تعلیم سے ظاہر ہوتی ہے جو کہ دوسرے معلموں سے اخذ نہیں کی گئی۔ بلکہ خود اس کی اپنی تعلیم ہے۔ سب سے بڑے ریشنل (Rational) یعنی معقول پسند علماء کی یہی رائے ہے۔ کائم (Keim) صاحب کہتے ہیں کہ اس کی زندگی میں اخلاقی نیکی کا تصور کامل طور سے حکمران تھا۔ اور مزید برآں وہ یسوع کی زندگی خلوت اور جلوت دونوں میں اعلیٰ درجہ کی مقدس اور پاک تھی اور ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُس کا لڑکپن بھی بے داغ تھا اور وہ اسی اعلیٰ

تصوّر کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جن چند قصوروں کو بعضوں نے اُس میں گرفت کیا ہے وہ گناہ نہیں اور اس اعلےٰ اور فوق الانسان زندگی میں ایسے غائب ہو جاتے ہیں جیسے چند قطرے سمندر میں۔ ہمارا یہ یقین قائم اور مضبوط رہتا ہے کہ وہ مجسم نیکی تھا جس نے زمین پر قدم رکھا اور یہ خیال جس کا اقرار قدیم علماء افسوس سے کیا کرتے تھے کہ بے گناہی ناممکن ہے اور نیکی کا تصوّر معدوم ہے۔ اس کی زندگی کے سامنے اُن کا خیال مسترد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے سٹراؤس (Strauss) لکھتے ہیں کہ ایسے خدا کا علم جو سب پر مہربان ہو (جیسا کہ پہاڑی وعظ میں مذکور ہے)۔ وہ یسوع نے اپنے وجود ہی سے نکالا ہوگا۔ یہ اُس عالمگیر خیر خواہی سے صادر ہوا ہوگا جو اُس کی اپنی ذات کا خاص خاصہ تھا اور جس کی وجہ سے اس نے محسوس کیا کہ خدا کے ساتھ اس کی عین مطابقت تھی۔ اس کی سیرت کی زبردست صفت وہ محبت تھی جو ساری مخلوقات پر محیط ہے اور یہی صفت اُس نے الٰہی ذات کا خاصہ بیان کیا ✣

یسوع کی نیکی کی تصدیق اُن لوگوں نے بھی کی جو ایسا کرنے کے سبب زیادہ مجاز تھے یعنی جن لوگوں کو تین سال تک اس کے ساتھ گہرا تعلق رہا اور جو اس کی عین قربت اور رفاقت میں رہے۔ چنانچہ مقدس پطرس اس کو بالکل بے گناہ کہتا ہے "ایک بے عیب اور بے داغ برہ" (۱-پطرس ۱: ۱۹)۔ "وہ نہ اُس نے گناہ کیا اور نہ اُس کے منہ سے کوئی مکر کی بات نکلی۔ نہ وہ گالیاں کھا کر گالی دیتا تھا" (۱پطرس ۲: ۲۲و۲۳) "مسیح نے بھی یعنی راستباز نے ناراستوں کے لئے گناہوں کے باعث ایک بار دُکھ اُٹھایا تاکہ ہم کو خدا کے پاس پہنچائے" (۱پطرس ۳: ۱۸)۔ اس کے ساتھ ہم پطرس کے اقرار کا مقابلہ کریں (یوحنا ۶: ۶۹)

"ہم ایمان لائے اور جان گئے ہیں کہ خدا کا قدوس تو ہی ہے" ✣

مقدس یوحنا جو یسوع کا سینہ دوست تھا اور جو یسوع کو پطرس کی نسبت زیادہ گہرے طور سے جانتا تھا۔ وہ بھی اُسے بے گناہ لکھتا ہے "یسوع مسیح راستباز" (۱ یوحنا ۲: ۱)۔ "اگر تم جانتے ہو کہ وہ راستباز ہے تو یہ بھی جانتے ہو کہ جو کوئی راستبازی کے کام کرتا ہے وہ اُس سے پیدا ہوا ہے" (۱ یوحنا ۲: ۲۹) "تم جانتے ہو کہ وہ اسی لئے ظاہر ہوا تھا کہ گناہوں کو اُٹھا لے جائے اور اُس کی ذات میں گناہ نہیں" (۱ یوحنا ۳: ۵) ✣

یہوداہ اسکریوطی پکڑوانے والے نے بھی یسوع کو بے گناہ تسلیم کیا تھا "میں نے گناہ کیا کہ بے قصور کو قتل کے لئے پکڑوایا" (متی ۲۷: ۳و۴) ✣

جس کا کوئی رشتہ بھی یسوع سے نہ تھا انہوں نے بھی یسوع کی نیکی کی تصدیق کی۔ مثلاً پلاطوس نے "میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں" (متی ۲۷: ۲۴) "کیوں اس نے کیا بُرائی کی ہے" (مرقس ۱۵: ۱۴) "میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا" (لوقا ۲۳: ۴و۱۴و۲۲ + یوحنا ۱۸: ۳۸ + ۱۹: ۴و۶و۱۲)۔ پلاطوس کی بیوی نے "تو اس راستباز سے کچھ کام نہ رکھ" (متی ۲۷: ۱۹) چوروں میں سے ایک نے "اس نے کوئی بیجا کام نہیں کیا" (لوقا ۲۳: ۴۱)۔ صوبہ دار نے "بیشک یہ آدمی راستباز تھا" (لوقا ۲۳: ۴۷) ✣

اس قرینہ میں خاص کر یہ امر یاد رکھیں کہ یسوع کو اپنے میں گناہ کا وقوف ہی نہ تھا جو کہ اُن سارے پاک لوگوں میں اُن کی پاکیزگی کے مطابق ہوتا ہے یعنی جس قدر وہ پاکیزگی میں ترقی کرتے ہیں اسی قدر اُن کو اس کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ یہ امر بہت ہی قابل لحاظ ہے۔ نوع انسان کی عام رائے نے بیگناہی کو ناممکن ٹھہرایا ہے "دیماس تھنیز (Demosthenes) نے بیگناہی کو صرف دیوتاؤں ہی سے منسوب

کیا۔ سسرو (Cicero) نے انکار کیا کہ اُس نے کوئی کامل دانا شخص نہ دیکھا اور نہ سنا۔ محمد نے بھی بے گناہی کا دعوے نہیں کیا اور قرآن میں خدا کا یہ حکم مندرج ہے کہ "تو اپنے گناہوں کی معافی کے لئے دعا مانگ"۔ شروع ہی سے گوتم بے گناہ نہیں مانا گیا بلکہ یہ کہ بتدریج وہ بیگناہی کی حالت کو پہنچا۔ سقراط نے اپنے بُرے دل میں ساری برائیوں کے بیج دیکھے۔ موسےٰ سے سخت گناہ سرزد ہوا (خروج ۲: ۱۲)۔ یسعیاہ ناپاک ہونٹ والا شخص تھا (یسعیاہ ۶: ۵)۔ ایلیاہ نے اقرار کیا کہ "میں اپنے باپ دادوں سے بہتر نہیں" (۱ سلاطین ۱۹: ۴)۔ مقدس پطرس توبہ کر کے زار زار رویا (مرقس ۱۴: ۷۲)۔ مقدس پولُس نے اپنے تئیں سب سے بڑا گنہگار کہا (۱ تیمتھیس ۱: ۱۵)۔ مقدس یوحنا جو نئے عہد نامہ کے سارے مقدسوں سے زیادہ پاک نظر آتا ہے وہ یہ کہتا ہے "اگر ہم کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں تو اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں اور ہم میں سچائی نہیں۔ اگر اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو وہ ہمارے گناہوں کے معاف کرنے اور ہمیں ساری ناراستی سے پاک کرنے میں سچا اور عادل ہے۔ اگر کہیں کہ ہم نے گناہ نہیں کیا تو اُسے جھوٹا ٹھہراتے ہیں" (۱ یوحنا ۱: ۸)۔ برعکس اس کے یسوع نے اپنے اندر کبھی کوئی عیب نہیں پایا (مرقس ۱۰: ۱۷ کی شرح دیکھو)۔ اس کی بے گناہی کے صریح بیان چوتھی انجیل میں پائے جاتے ہیں (یوحنا ۸: ۴۶ + ۱۴: ۳۱ + ۸: ۲۹ + ۱۰: ۱۱ + ۱۷: ۴)۔ لیکن پہلی تین اناجیل میں بھی ایسی ہی پُرزور شہادت ملتی ہے۔ نوع انسان کی اخلاقی شریعت کے مجسم ہونے کا دعوے اور نہ عدالت میں کھڑے ہونے والوں میں سے بلکہ خود منصف ہونے کا دعوے بیگناہی پر دال ہے۔ ویسا ہی اس کا یہ دعوے کہ میری موت کل جہان کے گناہوں کے لئے کفارہ بخش قربانی ہے (مرقس ۱۰: ۴۵)۔ وہ مقام بھی بالکل قطعی ثبوت ہے (متی ۱۱: ۲۸)۔ جہاں اس ذکر کے بعد کہ "کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے" اُس نے یہ کہا "اے محنت اٹھانے والو

اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دونگا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی"۔ اس قسم کی دعوت اگر کوئی گنہگار شخص اپنے ہم گنہگار جنسوں کو دے تو وہ سخت تکبر اور بے دینی متصور ہوگی ؞

اس لئے یسوع ایک بے نظیر انسان تھا جس میں لاثانی پاکیزگی پائی جاتی تھی تو بھی اُسے اپنے میں کسی گناہ کا وقوف نہ تھا۔ یہ اس عقیدہ کے عین مطابق ہے کہ یسوع کی شخصیت محض انسانی نہ تھی بلکہ فوق الانسان تھی ؞

(۲)۔ **مسیح کے معجزے**۔ انسانی فطرت سے ہم انسانی قابلیت کے کاموں کی توقع رکھتے ہیں۔ طبعی مسیح شاید معجزوں کے بغیر رہ سکتا تھا۔ لیکن فوق الانسان مسیح معجزوں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ فوق الانسان مسیح سے فوق العادت کاموں کی توقع اور مطالبہ عین درست اور جائز ہوگا۔ اور اگر ایسے فوق العادت کام اُس سے سرزد ہوں گے تو یہ نتیجہ نکالنا معقول ہوگا کہ یہ فوق العادت مسیح فوق العادت تھا۔ اب مسیح کی خدمت ایسے عجیب کاموں سے پُر ہے جو انسانی طاقت سے بڑھ کر تھے اور وہ معجزے ہی ہو سکتے ہیں۔ ان معجزوں کے قابل اعتبار ہونے پر ایک خاص فصل میں بحث ہوگی اور ناظرین اس فصل کو پڑھیں۔ یہاں ہم صرف اتنا ہی ذکر کریں گے جتنا کہ مسیح کی ذات کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ ہر بے تعصب شخص جو اس نتیجہ کو پہنچا کہ وہ سچ ہیں یہ باتیں مانے گا۔ (۱) کہ وہ اس رائے کے مطابق اور اس کے مصدق ہیں کہ مسیح فوق الانسان شخص تھا۔ اور (۲) کہ ان کے ذریعہ یسوع کی تعلیم پر الٰہی منظوری کی مُہر ثبت ہوئی ہے۔ اور اس کی الٰہی ابنیت اس کی تعلیم کا جزو تھی۔ خاص کر یہ اس کی قیامت پر صادق آتا ہے۔ یسوع کو کفر بکنے والے کی سزا کے لئے موت ملی۔ کیونکہ اُس نے اپنی پیشی کے وقت اس دعوے کی از سر نو تصدیق کی کہ میں خدا کا بیٹا ہوں۔ خدا باپ نے اُسے مُردوں میں سے جلانے کے ذریعہ جہان پر یہ اعلان

کر دیا کہ اس کا دعوے سچا تھا۔ پس مقدس پولس نے یہ بالکل راست کہا کہ یسوع مردوں میں سے جی اُٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا" (رومی ۱: ۴)۔ دیکھو فصل "قیامت"۔

(۳)۔ **مسیح کی تاثیر دُنیا پر**۔ ان گذشتہ دو ہزار برسوں میں یسوع مسیح کی جو اخلاقی اور روحانی تاثیر دنیا پر ہوئی ہے وہ ایسی اعلےٰ ہے اور اس رائے کے عین مطابق ہے کہ وہ الہٰی شخص تھا۔ ایک منصف مزاج مصنف نے یہ کہا "یہ اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا فضول ہے کہ مسیحی دین کے بانی کی اعلیٰ دلکش ذات نے کلیسیا کو وہ ساری زندگی دی ہے۔ اس امر کی شاہد ساری تاریخ ہے۔ اور یہ شہادت بھی کچھ کم یقینی نہیں کہ جو تاثیریں اس دنیا پر ہوئی ہیں ان میں سے یسوع کی تاثیر سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ جو مشہور اشخاص دنیا میں گزرے ہیں اُن سب کو گنو خواہ وہ بادشاہ ہوں یا فاتح۔ یا مدبر یا محب وطن، شاعر، فلاسفر، سائنس دان ان سب کی تاثیر مقابلہ یسوع مسیح کی تاثیر کے ہیچ کا رتبہ رکھتی ہے۔ جو اپنی ظاہری صورت میں گلیل کا ایک دہقان تھا۔ جو مجرم کی موت موا۔ اس نے ایک روحانی سلطنت قایم کی جو انیس سو برس سے برابر چلی آتی ہے۔ اور باوجود بے ایمانوں کی ہنسی تمسخر کے اُس میں زوال کو کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ نہایت تھوڑے سے شروع ہو کر اب اُس میں نوع انسان کی سب ترقی کرنے والی قومیں شامل ہیں اور جو اس کو نہیں مانتے وہ حالت سکون اور زوال میں ہیں۔ تہذیب کی ہر حالت کے یہی ایک کلیسیا مطابق ہے۔ یہ ساری دوسری ریاستوں اور جماعتوں سے اس میں متفرق ہے کہ اس کی بنیاد نہ توجبر پر رکھی گئی اور نہ خودغرضی پر بلکہ اس کے بانی کی اعلےٰ دلکش سیرت پر ..... تاریخ اس امر کی مصدق ہے کہ یسوع مشہور لوگوں میں سے ایک مشہور آدمی ہی نہیں۔ ہاں ان سب سے بڑا ہی نہیں بلکہ وہ ان سب سے بے حد بلند اور سرافراز ہے۔ وہی اکیلا عالمگیر، گنیتھا لک شخص ہے

جو انسانیت کا کمال ہے۔ تاریخ میں جس کی موجودگی اور تاثیر ایسی ہے کہ اخلاقی اور روحانی جہان میں جتنی دوسری طاقتیں جو ہمیں معلوم ہیں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اس کا لازمی نتیجہ کیا نکلے گا؟ میرا یہ جواب ہے کہ جن طاقتوں نے انسان میں اس دنیا میں یسوع کے ظہور سے لے کر آج تک اس کا ہمتا انسان پیدا نہیں کیا تو ہم ضرور ایک "اخلاقی معجزے کے حضور میں ہیں"۔

(۴)۔ **مسیحی تجربے سے دلیل**۔ صفحہ قرطاس پر جو دلیل سب سے زیادہ کمزور معلوم ہوتی ہے لیکن جو کسی طرح سے سب سے زیادہ مضبوط ہے وہ ایمانداروں کے تجربہ کی دلیل ہے۔ لوگ کیوں مسیحی رہتے ہیں اور کیوں دوسرے لوگ مسیحی ہوتے جاتے ہیں فی الحقیقت ایسا امر واقعی ہے جس کے ذریعہ اُس کے پیرؤں کو وہ خوشی اور اطمینان۔ اور خدا کے ساتھ شراکت اور بدی کی قوتوں پر فتح حاصل ہوتی ہے جن کا اُس نے ذکر کیا تھا کہ وہ دے گا۔ جو ایمان کے ساتھ یسوع کے پاس آتے ہیں وہ اس سے مایوس نہیں ہوتے۔ وہ اُس سے روحانی زندگی اور زندگی بخش قوت حاصل کرتے ہیں۔ ان کی خصلتیں بتدریج بدلتی جاتی ہیں اور وہ ایسی شجاعت اور اعلیٰ اخلاق کے کاموں کے قابل ہو جاتے ہیں جو مسیح کے بغیر وہ ہرگز کر نہیں سکتے تھے۔ ان کی روحوں میں ایسی شانتی اور اطمینان آجاتی ہے جو انسان کی فہم سے باہر ہے جس میں زندگی کے شدید آندھی و طوفان بھی خلل نہیں ڈال سکتے۔ محنت اور بوجھ سے دبے وہ اپنے خداوند کے پاس جاتے ہیں۔ اور اس میں وہ اپنے دلوں کا آرام حاصل کرتے ہیں۔

(۵)۔ **بڑا معمّا**۔ ہم یہ نتیجہ نکال چکے ہیں کہ مسیحی دین کا بانی جس کی تعظیم نہ صرف مسیحی لوگ کرتے ہیں بلکہ نہایت آزاد خیال اور Free thinkers بھی جسے سب سے اعلےٰ انسان مانتے ہیں اور سب سے بڑا دینی اور اخلاقی مصلح تسلیم کرتے ہیں اُس نے خدا ہونے کا دعوے کیا۔ اس نتیجہ کی تائید طرح طرح کی دلیلوں اور شہادتوں سے

ہوتی ہے کہ حقیقی شک کو گنجائش نہیں رہتی اس لئے ہمیں ایک بڑے معما سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ "یا تو مسیحی دین کا بانی خدا تھا۔ یا وہ نیک نہ تھا" اس معما سے بچنے کے لئے جو کوششیں کی گئیں اُن میں سے خاص یہ ہیں۔ (ا) بعضوں نے یہ کہا کہ یسوع دیوانہ تھا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ جس دین اور اخلاق کی دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوموں کے دماغ اور کانشنس نے ایسی تعریف کی ہو وہ ایک دیوانہ شخص کی ایجاد ہو۔ (ب) یہ بھی بعضوں نے کہا کہ یسوع نے اپنے تئیں خدا سمجھ لیا۔ نہ اس وجہ سے کہ اُسے اس امر کا باطنی علم تھا بلکہ اس وجہ سے کہ اُس نے عہد عتیق اور خاص کر دانیال کی پیشین گوئیوں کے ایسے معنی سمجھے کہ مسیح موعود ضرور خدا ہوگا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ کوئی محض انسان جس نے ان پیشین گوئیوں کے یہ معنی لئے (بشرطیکہ وہ دیوانہ نہ ہو) اپنے تئیں مسیح موعود تصور نہ کر سکتا تھا +

پس اس معما سے ہم بچ نہیں سکتے۔ یا تو مسیح خدا تھا جیسا کہ اُس نے دعوےٰ کیا۔ یا وہ خود دھوکا باز تھا۔ وہ دھوکا باز تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اُس نے سب سے اعلیٰ دین اور اخلاق کی بنیاد ڈالی جس کی نظیر دنیا میں پائی نہیں جاتی۔ اس لئے وہ ضرور خدا ہوگا جیسا کہ خود رسولوں نے اور کلیسیا نے شروع سے مانا +

لوقا ۲: ۴۰ + مرقس ۱۳: ۳۲ اور فلپیوں ۲: ۷ کی شرحوں کو بھی دیکھو +

ثالوث

اگرچہ مسئلہ ثالوث کی علم الہیات کے مطابق ٹھیک تعریف کرنے میں ایک زمانہ لگا۔ گو یہ تعریف پانچویں صدی یا اس سے بھی بعد تک تکمیل کو نہ پہنچی۔ لیکن یہ تعلیم سارے نئے عہد نامہ میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں ہر جگہ باپ۔ بیٹے اور روح القدس سے الٰہی صفات منسوب کی گئی ہیں اور انسانی مخلصی کے انتظام میں اُن کا کام علیحدہ علیحدہ بیان ہوا ہے۔ نئے عہد نامہ نے الٰہی اقانیم کے رشتوں کا خاص کر انسان اور عالم سے بیان کیا ہے۔ باپ کا بطور خالق کے۔ بیٹے کا بطور درمیانی اور مخلصی دہندہ کے اور روح القدس کا بطور تقدیس کنندہ کے۔ یہ گویا (انتظامی ثالوث ہے)۔ لیکن ایسے اشارات کی کمی نہیں جن سے ظاہر ہو کہ خلقت اور مخلصی میں یہ تہرا کام خود الوہیت میں خاص اندرونی اور ازلی امتیازات کا بیرونی اظہار ہے (یعنی ذاتی ثالوث Essential Trinity)۔ ابتدائی کلیسیا میں منارخی اور خاص کر سبی لی این (Monarchians, Sabellians) بدعتیوں نے انتظامی ثالوث پر خصوصیت سے ایسا زور دیا کہ انہوں نے اس امر کا بالکل انکار کر دیا کہ الٰہی ذات میں کوئی حقیقی امتیازات ہیں اور یہ تعلیم دی کہ باپ۔ بیٹا اور روح صرف تین مختلف طریقے ہیں جن میں ایک شخص خدا اپنے تئیں ظاہر کرتا اور آدمی پر اثر کرتا ہے۔ مگر مسیحیوں کا عام مسلمہ خیال یہ تھا اور یہی عقیدہ ہمیشہ رہا کہ یقیناً باپ۔ بیٹا اور روح القدس الٰہی ذات میں ازلی اور لازمی امتیازات کو ظاہر کرتے ہیں یہ امتیازات شخصی اور اخلاقی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ مسیحیوں نے مسئلہ ثالوث میں نہ صرف ایک عقلی بلکہ اخلاقی اور روحانی سر کا شفہ اعلیٰ درجہ کا

دریافت کیا ✣

۱۔ شخصیت انسانی اور الٰہی۔ تعلیم توحید خدا کو شخص مانتی ہے اور مسیحی دین تثری شخصیت مانتا ہے۔ لیکن لفظ شخص جب خدا کے بارہ میں اور خدا کے اندر اقانیم کے بارہ میں مستعمل ہوتا ہے تو اس کے وہی معنی نہیں ہوتے جو اس وقت ہوتے ہیں جب ہم اس لفظ کو انسانوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ انسانی شخصیت محدود ہے۔ الٰہی شخصیت غیر محدود ہے۔ ان دونوں میں ایسا وسیع فرق ہے کہ بعض اہل فکر نے اس کا انکار کیا کہ خدا میں شخصیت کا خیال ہو بھی سکتا ہے۔ ان کے خیال میں شخصیت بذاتہ محدود ہے۔ یہ ایک خاص محدود شے ہے جو خاص حدود کے ذریعہ دیگر اشیاء سے ممیز ہوتی ہے اور اگر وہ حدود دور کر دی جائیں تو شخصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتے ہیں اگر بلا نقص خدا سے شخصیت منسوب بھی کی جائے تو وہ محدود یا ناکامل قسم کی ہوگی اور اس لئے کامل وجود سے اس کو منسوب کرنا مناسب نہ ہوگا ✣

ہمارا جواب یہ ہے کہ گو انسان کی ناکامل شخصیت کا خاصہ محدودیت ہو مگر شخصیت کے ذاتی اور عینی تصور کا یہ جز نہیں۔ جب ہم کسی وجود کو "شخص" کہتے ہیں تو ہماری خاص یہ مراد ہوتی ہے کہ (۱) وہ ذیعقل ہے۔ (۲) وہ عارف نفس ہے یا وقوف نفسی رکھتا ہے۔ (Self Consceioms)۔ (۳) وہ صاحب ارادہ ہے۔ اب ان صفات میں سے ایک میں بھی بذات خود محدودیت یا ناکاملیت کا خیال نہیں۔ ایک کامل عقل کا خیال کرنا ایسا ہی آسان ہے جو سب موجودات اور ممکنات کا علم رکھتا ہو جیسے انسان کی سی محدود عقل کا۔ اس لئے عقل جو کامل اور غیر محدود ہو جائز طور پر خدا سے منسوب ہو سکتی ہے۔ وقوف نفسی بھی عقل کامل میں داخل ہے کیونکہ اگر کامل ذیعقل وجود اپنے آپ کا ہی علم نہ رکھے تو اس کی عقل محدود

ہوگی۔ اسی طرح سے ارادہ حقیقی کمالیت کے قابل ہے۔ محدودیت اس کی کوئی لازمی یا ذاتی شرط نہیں۔ ایک مطلق آزاد اور قدرت غیر محدود والے ارادہ کا خیال کرنا ایسا ہی آسان ہے جیسے کہ انسان جیسے غیر محدود ارادہ کا۔ اس لئے یہ کہنا بالکل جائز ہے کہ خدا اپنی عقل کے مطابق صاحب ارادہ ہے یعنی جو کچھ ممکن ہو سکتا ہے وہ اس کی تحصیل کے قابل ہے۔ اس لئے شخصیت بالقوہ غیر محدود ہے اور نہ صرف بلا نقص بلکہ مناسب اور صحیح طور پر غیر محدود اور مطلق خدا سے منسوب ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ غیر مکتفی طور پر انسان سے ✣

دوسرا امتیاز یہ ہے کہ گو انسانی شخصیت بیرونی ہے اور ہر دیگر شخصیت کو خارج کرتی ہے۔ ثالوث کے الٰہی اشخاص (اقانیم)۔ باہمی شراکت اور شمولیت رکھتے ہیں۔ یہ عجیب صفت (جسے اصطلاح میں circuminsession کہتے ہیں) صاف طور پر ہمارے ادراک میں نہیں آسکتی کیونکہ اس قسم کا کوئی انسانی تجربہ نہیں ہوا۔ شاید اس کے معنے کچھ دھندلے سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی ہمدردی کا تصور لو اور اس کو غیر محدود تعمیق اور توسیع دو۔ اگر دو دوستوں کی مثال میں ممکن ہو کہ ایک دوست دوسرے کے دل کے خیال، احساس یا ارادہ کو نہ صرف معلوم کرے بلکہ اس خیال۔ احساس یا ارادہ کو اپنا سمجھے تو یہ ایک انسانی تشبیہ ہوگی ایک حقیقی گو نہایت ہی غیر مکتفی تشبیہ اس گہرے اعلیٰ اتحاد و شراکت کی جو الٰہی اشخاص میں موجود ہے ✣

۲۔ ثالوث اور الٰہی وقوف نفسی۔ انسان میں وقوف نفسی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نفس اپنے تئیں غیر نفس سے امتیاز کرتا ہے یعنی جب صاحب خیال کے وقوف یا علم کے روبرو کوئی اور موضوع یا خیال موجود ہے جو خود اس سے متفرق ہے ✣

اب مسئلہ ثالوث یہ ظاہر کرتا ہے کہ جو انسان کے بارہ میں راست ہے وہ خدا کے بارہ میں بھی راست ہے۔ ازل سے باپ اور بیٹا بلحاظ شخصیت ایک دوسرے سے ممیز وجود تھے۔ جو ایک دوسرے کا اور اپنا علم رکھتے کہ میں باپ ہوں اور میں بیٹا ہوں پس ثالوث کے ماننے والوں کو اس امر کے سمجھنے میں کچھ مشکل نہیں کہ کیسے خدا خلقت موجودات کے پیشتر بھی وقوف نفسی رکھتا تھا یعنی پیشتر اس سے کہ کوئی مخلوق اُس کے نفس کے سوا مخلوق ہو جس سے کہ وہ اپنا امتیاز کر سکے +

۳۔ ثالوث اور خدا کا اخلاقی کمال۔ چونکہ مسیح نے محبت کی فوقیت کی اور عالمگیر خیر خواہی کے فرض کی تعلیم دی اس لئے روز بروز لوگ یہ محسوس اور تسلیم کرنے لگے کہ انسانی نیکیوں میں سے محبت سب سے احسن نیکی ہے اور الٰہی کمالات میں سے سب سے زیادہ قابل تعظیم۔ لیکن کامل محبت صرف ہم پلہ اشخاص ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی انسان کسی ادنےٰ حیوان کو خواہ کتنا ہی پیار کرے۔ اس کی محبت کے قوائے کو پوری تشفی اور تسلی نہیں ہو سکتی ویسی ہی خدا کو پوری تشفی اور تسلی انسان یا مخلوق کو پیار کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ اگر خدا فی الحقیقت محبت ہے تو ضرور اس کی محبت کا موضوع ہمیشہ سے موجود ہوگا۔ کوئی ہم ذات یا مسیحی اصطلاح کے موافق ایسا بیٹا جس کی اور باپ کی ایک ہی ماہیت ہو جو باپ کی طرح ازلی ہو اور باپ کے برابر ہو +

۴۔ ثالوث اور تمدنی زندگی۔ جو اعلےٰ کامل زندگی خیال میں آسکتی ہے وہ تمدنی زندگی ہے۔ دوستانہ برتاؤ اور تمدنی راہ و ربط اور خیر خواہی کی زندگی ایک گوشہ نشینی کی زندگی سے کہیں اعلےٰ ہے جو گوشہ نشینی میں صرف اپنی ہی کمالیت کا متلاشی ہے۔ اس لئے اگر سرچشمہ الوہیت کی زندگی ایسی کامل ہے جیسی کہ خیال میں آسکتی ہے تو وہ زندگی بھی بالضرور تمدنی ہوگی۔ یعنی

اس الٰہی توحید میں ضرور اشخاص کی کثرت موجود ہوگی جن میں نہایت کامل شراکت ہو۔ سرچشمہ الوہیت کا یہ تصور کہ وہ ایک کامل سوسائٹی ہے تثلیث ماننے والوں کی خاص تعلیم ہے۔ اخلاقی طور سے یہ تعلیم زیادہ ثمر آور اور عملی طور سے زیادہ محرک ہے بہ نسبت یونی ٹیرین (موحد) تعلیم کے جس کے مطابق خدا ایک مجرد شخص ہے تمدنی زندگی کے ناقابل یا حقیقی محبت کے ناقابل محض خود غرض اور خود محبت۔ مسئلہ تثلیث کے ماننے والے اور صرف یہی لوگ اُس کامل محبت کو سمجھ سکتے ہیں جو اس معبود میں پائی جاتی ہے اور سرچشمہ الوہیت کی اصلی ذات میں خاندان کلیسیا اور ریاست کا کامل نمونہ پہچان سکتے ہیں +

۵۔ نئے عہد کی تعلیم۔ نئے عہد نامہ کی جن آیات میں تثلیث کا ذکر آتا ہے ان کی تشریح تفسیر میں دی گئی ہے۔ یہاں صرف ان کا حوالہ دیتے ہیں۔ متی ۳: ۱۳+ ۱۹:۲۸ + لوقا ۱: ۳۵ + یوحنا ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ (خاص کر ۱۴: ۱۶ + ۱۵: ۲۶ + ۱۶: ۱۳ سے ۱۵)۔ ۱ کرنتھی ۱۲: ۳ سے ۶ + ۲ کرنتھی ۱۳: ۱۳ + ۱ پطرس ۱: ۱ و ۲ + (۱ یوحنا ۵: ۷)۔ بیٹے کی الوہیت کے بارہ میں دیکھو فصل (یسوع مسیح کی ذات)۔ روح القدس کی الوہیت اور شخصیت کے لئے دیکھو یوحنا ۱۴: ۱۶ سے ۲۶ + ۱۵: ۲۶ + ۱۶: ۷ + ۲۰: ۲۲ + اعمال ۲: ۳۳ + رومیوں ۸: ۲۶ + گلتیوں ۴: ۶ +

معجزہ

۱۔ دیباچہ۔ جو لوگ فوق الفطرت دین کے مخالف ہیں ان کا وطیرہ معجزوں کے بارہ میں گذشتہ دو صدیوں میں بہت بدل گیا ہے۔ نیچری لوگوں نے جو حملے کئے تھے ان کو بٹلر اور پیلی جیسے لوگوں نے ایسے اوزاروں سے شکست دی تھی جو بہت کچھ پرانے اور بوسیدہ ہو گئے ہیں اور اس لئے اب سامنے سے حملہ کرنے کی بجائے وہ بازوؤں پر حملہ کرنے لگے ہیں مثلاً (۱) تاریخی اور علمی جرح (criticism) کی سمت سے (۲) زمانہ حال کی طبعی سائنس کی سمت سے۔ پہلے پہل تو مشہور ٹوبنگن (Tubingen) سکول کے عالمان جرح نے تحریری شہادت کا اعتبار توڑنے کی سخت کوشش کی اور نیا عہدنامہ گویا جلتی بھٹی میں ڈالا گیا۔ لیکن وہاں سے وہ آگے سے بھی زیادہ زور و طاقت سے نکل آیا۔ پرانی مروجہ قدیم رائے بعض امور میں کچھ تبدیلی کے ساتھ عام طور پر اور صاف طور پر تسلیم ہوئی۔ اس سخت حملہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تحریروں کا رشتہ قدیم مسیحی عقیدہ کے ساتھ بے تبدیل رہا اور ان کی اعلیٰ درجہ کی تاریخی شہادت نئی بنیاد پر قایم ہو گئی۔ کم و بیش مخالف نکتہ چینی جو تحقیقات میں زیادہ ترقی کر رہی ہے اب تک جاری ہے اور وقتاً فوقتاً اس کے بعض زیر بحث مسائل پر اہم روشنی پڑتی ہے۔ لیکن نئے عہدنامہ کے نوشتوں کا اعتبار بحیثیت مجموعی مستقل طور سے قائم ہو گیا اور پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط بنیاد پر۔

نئے عہدنامہ کے بعد پرانا۔ ہم زمانہ حال کے ان مباحثوں سے آشنا ہیں جو (Higher criticism) کے نام (اعلیٰ نکتہ چینی یا علم جرح) سے مشہور ہیں اور ہم یہ ماننے کو تیار ہیں کہ اس نے زیر بحث نوشتوں کی بیرونی تاریخ اور

نشوونما کے بارہ میں ہماری رائے بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ لیکن یہ الہام پر ہمارے یقین کو جنبش نہیں دے سکا۔ اور نہ پرانے عہدنامہ کے نوشتوں کی قدر کو کم کیا ہے۔ بلحاظ اس امر کے کہ نوع انسان کے لئے وہ خدا کے بتدریج ترقی کرنے والے مکاشفہ کی ابتدائی منزلوں کے تحریری بیان ہیں۔ برعکس اس کے ہم شکرگزار ہیں کہ جو یقینی نتائج اس نکتہ چینی سے سرزد ہوئے ان سے اس مکاشفہ کے مختلف طبقات زیادہ روشن ہو گئے ہیں اور بائبل کا الہی پہلو چھینے بغیر اس کا انسانی پہلو ہم کو پھر واپس دیا گیا۔

اس لئے ہم بہت سادہ اور راست طریقے سے اس مضمون کا بیان کریں گے۔ اور اس غرض کے لئے ہم یہ فرض کریں گے کہ یہ نوشتے عموماً قابل اعتبار ہیں۔ گو ہم ان خاص باتوں پر غور کرنے کے لئے تیار رہیں گے جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوں گی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ بائبل میں خدا کا وہ مکاشفہ مندرج ہے جو اس نے انسان کو عطا کیا۔ اگر یہ سچ ہو تو ہم یہ توقع رکھیں گے کہ ایسے مکاشفے کے خاص آغاز اور مقصد کے آثار بکثرت ہیں حالانکہ ہم موجودہ انسانی زندگی سے صاف صاف واسطہ رکھیں۔ ہم یہ توقع رکھیں گے کہ اشیا کی جو معمولی حالت ہم کو نظر آتی ہے اس سے اعلیٰ حالت کے آثار بکثرت ہوں۔ یعنی ایک اعجازی عنصر ہویدا ہو۔

اور فی الحقیقت صورت حال یہی ہے۔ اس فصل کا مقصد یہ ہے کہ اس امر پر زور دے کہ اس کی توضیح کرے کہ اعجازی عنصر بائبل میں ایسا مخلوط ہے کہ اس کو جدا نہیں کر سکتے۔ پھر ہم اس کی موجودگی کی علت اور اس کے مقصد پر غور کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ یہ مکاشفہ کا ایک صحیح اور لازمی جزو ہے۔ یوں ہم ان اعتراضات کا جواب دے سکیں گے جو اکثر معجزوں کے امکان پر کئے جاتے ہیں اور ان کی بنا یہ ہوتی ہے کہ معجزے طبعی قانون کے سائنٹفک اصول کے خلاف ہیں۔ یہاں تو صرف سرسری بیان ہی ممکن ہوگا۔ زیادہ تفسیر کے لئے جابجا جو تشریحیں بڑے بڑے معجزوں کی گئی ہیں

اُن کو دیکھو ۔

۲۔ معجزے کو بائیبل سے الگ نہیں کر سکتے۔ جب ہم یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ معجزہ بائیبل کا لازمی جزو ہے تو ہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عام طور پر اعجاز (خاص معجزوں کی نسبت خواہ کچھ ہی خیال ہو) بائیبل کی ساخت میں تار و پود کی طرح ایسا بنا ہوا ہے کہ اگر اس کو دور کریں تو بائیبل خود کالعدم ہوگی ۔

خاص خاص معجزوں کا معاملہ اَور ہے ۔ ہم سب معجزوں کو ایک ہی رتبہ دینے پر مجبور نہیں نہ تو اُن کی اہمیت کے لحاظ سے اور نہ اُن کی تصدیق کے لحاظ سے ۔

ہم یہ ماننے پہ تیار ہیں کہ بائیبل میں جو مختلف واقعات مندرج ہیں ان کی شہادت یا اس امر کی شہادت کہ فلاں یا فلاں واقعات اعجازی تھے بہت مختلف ہے ۔ مثلاً ہمارے خداوند کی قیامت کی بیرونی شہادت بائیبل کے دوسرے معجزوں کی شہادت سے بہت مضبوط ہے بلکہ قدیم تاریخ کے کسی دوسرے واقعہ کی شہادت ایسی مضبوط نہیں۔ برعکس اس کے اُس کے کنوآری سے پیدا ہونے کی تحریری شہادت اُس سے کم مضبوط ہے۔ اگرچہ دو الگ الگ شاہدوں کی مجموعی شہادت کا زور اس کی تائید میں ہے معہ دیگر امور کے جن کی تشریح بلا اس امر کے ماننے کے کہ نا دشوار ہے۔ جو زندگی اور سیرت اس کی قلمبند ہوئی ہے وہ دیگر لوگوں کی قلمبند شدہ زندگی اور سیرت سے بہت مختلف ہے۔ اس کی کیا وجہ ہوگی؟ عہد عتیق کے بارہ میں بیرونی شہادت عموماً اس کثرت سے پائی نہیں جاتی۔ اور یہاں بھی تصدیق کے درجے مختلف ہیں۔ مثلاً مصر سے خروج۔ جو ایک معنی میں اعجازی تھا اور موسےٰ کے زمانہ میں واقع ہوا ایک ایسا امر ہے کہ مختلف اور بکثرت حوالجات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور عبرانی قوم کے دل پر اس کا ایسا نقش ہوا تھا کہ کوئی اس پر شک نہیں کر سکتا سوائے ایسے لوگوں کے جو معجزے کے مطلق منکر ہیں اور وہ بھی اتنا تو غالباً مان لیں گے کہ اس کی بنا کوئی تاریخی امر واقعی ہے

لیکن سورج کے کھڑے رہنے کے معجزے کی طرف قانونی کتابوں میں بمشکل سے کوئی اشارہ ہے ۔ بلکہ جس شاعرانہ عبارت میں اُس کا ذکر ہوا ہے وہ اُس کے رتبہ کو اُس لڑائی کے واقعہ سے بالکل علیحدہ کر دیتا ہے جس میں اُس معجزے کا وقوع مذکور ہے (دیکھو یشوع ۱۰: ۱۲ کی شرح) ویسے ہی یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ داور قرینے سے اس خیال کی کچھ تائید ہوتی ہے ، کہ گدھی کے بولنے کا واقعہ بلعام کے خواب میں سرزد ہوا جس کے بعد وہ اٹھا اور بلق کے سواروں کے ساتھ گیا (گنتی ۲۲: ۳۵) ۔ یونہ کا قصہ کو بعض اصحاب کی تمثیل سمجھتے ہیں کہ خدا نے یہودی کلیسیا سے کیسا سلوک کیا۔ اور یہ قصہ عمدہ تمثیل کا کام تو دیتا ہے ۔ الغرض ہر خاص معجزہ کی قدر کس کی الگ الگ شہادت پر موقوف ہے ۔ لیکن مضمون زیر بحث زیادہ وسیع ہے ۔

کیا اعجازی عنصر کو بحیثیت مجموعی بائیبل میں اتفاقی اور غیر ضروری الحاق تصور کریں یا ہم معجزوں کی ایسی تشریح بحیثیت مجموعی یا فرداً فرداً کر سکتے ہیں جس سے کہ وہ ایک عام واقعہ سمجھے جائیں یا کوئی معدودے چند ایسے معجزے بھی ہیں جن کی ایسی تشریح نہیں ہو سکتی؟

اب بحیثیت مجموعی سارے معجزوں کے رد کرنے کے دو طریقے ہیں ۔ (۱) اول طریقہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں وہم پرستی کا ایک میلان ہے جس کے ذریعہ بعید واقعات کو فوق العادت لباس پہنایا جاتا ہے ۔ (۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ غیر سائنس میلان کا نتیجہ ہے کہ جن واقعات کو وہ فی زمانہ علم سے سمجھ نہ سکیں ان کو اعجازی سمجھ لیں ہم یہ تو انکار نہیں کرتے کہ ان دو طریقوں میں سے ہر ایک کو بعض واقعات پر جو معجزے سمجھے گئے عائد کر سکتے ہیں ۔ لیکن ہم زور سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ طریقے بائیبل کے سارے معجزوں پر عائد نہیں کر سکتے ۔

(۱) اگر پہلی دلیل درست ہو۔ تو سارے معجزات اُن قدیم کتابوں میں ہی ہوں گے

جو عبرانی قوم کی ابتدا سے علاقہ رکھتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ نہیں۔ معجزات کا ذکر کلیہ طور پر یا کثرت سے پرانے عہد نامہ کی قدیم یا نامعلوم زمانہ کی کتابوں ہی میں پایا نہیں جاتا اور نہ صرف معجزے پرانے عہد نامہ کی چاردیواری کے اندر محدود ہیں بلکہ نئے عہد نامہ میں بھی ان کا بہت ذکر ہے۔ اور خاص کر مسیح کی زندگی میں معجزات ایسے مخلوط ہیں کہ اُن کو اناجیل سے علیحدہ کرنا ان نوشتوں کو بالکل پاش پاش کرنا ہے۔ اگر انجیل کے مضمون کو اتنا ہی لیں جو تینوں اناجیل میں مشترک ہے تو معجزے وہاں بھی ہیں گے بلکہ اگر اناجیل سے اعجازی حصہ کو بالکل نکال ڈالیں تو باقی حصہ کا سمجھنا ویسا ہی مشکل ہوگا جیسے مقدس یوحنا کے چھٹے باب کی تقریر کو بلا پانچ ہزار کے کھلانے کے معجزے کے سمجھنا مشکل ہے۔ اگر مصنفین اور ان کے ہمعصروں کے نکتہ خیال کا لحاظ کیا جائے تو ہم یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انجیل کے پہلے مبشروں نے کیسی دلیری سے مسیحی دین کی صداقت کی خاطر اس امر پر اپنی جانوں کو جوکھوں میں ڈالا کہ مسیح جی اٹھا اور اُنہوں نے خاص معنی میں یہ سمجھا کہ وہ اس کی قیامت کے گواہ تھے در رسول ہونے کی یہ خاص صفت تھی جیسے کہ متھیاس کے معاملہ میں بیان ہوا۔ دیکھو اعمال ۱: ۲۲۔ بمقابلہ ۲: ۳۲ کے ۳+ : ۱۵ + ۴ : ۲۰ و ۳۳ وغیرہ)۔ مقدس پولس نے جس کی زندگی اور تعلیم میں قیامت کا اس قدر اعلےٰ ذکر ہے۔ چنانچہ اعمال کی کتاب میں ذکر ہے کہ اس نے خود اس کی تصدیق کی بمقام انطاکیہ تھسلونیکے اور آتینی میں۔ اور صدر مجلس، فیلکس، فیسطس اور اگرپہ کے سامنے۔ اس مضمون کے متعلق کرنتھیوں کے سامنے یہ بڑی دلیل دی کہ پانسو سے زیادہ لوگوں نے مسیح کو جی اٹھا دیکھا (۱ کرنتھی ۱۵: ۶) +

جس حالت میں کہ بائیبل موجود ہے اس کی نسبت اعتبار سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ معجزات کا ذکر جیسے ابتدائی حصوں میں پایا جاتا ہے ویسے ہی مابعد حصوں میں بھی لیکن ان

نوشتوں کے سن تصنیف کی وجہ سے اور بھی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ سارے معجزے ان نوشتوں میں مجتمع ہیں جو ان واقعات سے بہت دیر بعد لکھے گئے جن کا ان میں ذکر ہے +

اگر گنجائش ہوتی تو یہ ظاہر کرنا آسان ہوتا۔ اس قیاس کے مطابق بھی جو اکثر عالمان جرح (Higher critics) نے اختیار کیا ہے کہ یہ صورت نہیں۔ عہد عتیق میں ہونے کے معجزوں کا بیان کلیتہً یا جزیتہً ایسے نوشتوں کے ذریعہ نہیں پہنچا جنہیں عالمان جرح کاہنی روایات "(Priestly Traditions)" یا زیادہ پرانے "دو نبیانہ بیانات" کہتے ہیں۔ مثلاً طوفان کا مفصل بیان۔ مصری آفتوں کا بیان۔ بحر قلزم سے عبور کرنے وغیرہ کا بیان۔ بادشاہی کے زمانہ کے معجزات تواریخ کی کتابوں ہی میں محدود نہیں جو کہ موجودہ صورت میں سلاطین کی کتابوں سے بھی پیچھے کی ہیں۔ برعکس اس کے نہایت مشہور مثالیں معجزات کی سلاطین کی کتاب کے بہت پرانے حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ایلیاہ اور الیشع کے بیان ہیں +

رہا نئے عہد نامہ کا ذکر۔ وہاں معاملہ اور ہی ہے۔ یہ تو گمان غالب نہیں کہ اس کی آخری کتاب نئے زمانہ کی پہلی صدی کے بہت کچھ گزر جانے کے پیشتر لکھی گئی۔ حالانکہ سب سے پہلی کتاب مسیح کی صلیب سے پچیس سال کے اندر لکھی گئی +

پس ان بیانات کو ہم خواہ بائیبل کی ترتیب کے مطابق لیں یا جن نوشتوں میں ان کا ذکر ہے ان کی تحقیق شدہ تاریخ کے مطابق لیں تو ہم معلوم کریں گے کہ اس رائے کی تائید کسی طرح نہیں ہوتی کہ معجزہ اس وہم پرستی کے میلان کا نتیجہ تھا جسے مابعد زمانہ نے بڑھا کر معجزے بنا لیا۔ خاصکر جن واقعات کا تعلق قومی بڑے واقعات سے تھا اور ان کو فوق العادت رنگ دیا +

یہ تو درکنار کہ معجزے صرف انہیں نوشتوں میں محدود ہوں جو اُن واقعات

سے بہت عرصے بعد لکھے گئے۔ سب سے بڑے معجزے اور جو سب سے زیادہ ضروری
ہیں مثلاً مسیح کی قیامت کی تصدیق ایسی شہادت سے ہوتی ہے جسے ہم ہمعصر شہادت
کہتے ہیں +

(۲)۔ اب ہمیں دوسرے اعتراض کا مقابلہ کرنا ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ وہ
واقعات بہت کچھ ایسے طریقے ہی سے واقع ہوئے جس طریقے سے کہ وہ قلمبند ہوئے
ہیں تو کیا ان کی فوق العادت تفسیر پر اعتراض نہیں ہو سکتا؟ ہمعصروں بلکہ عینی گواہوں
کے بیانات پر بھی اُسی زمانہ کا رنگ چڑھا یا گیا جس میں وہ واقع ہوئے تھے۔ کیا ہم اس
بات کا لحاظ نہ رکھیں کہ قوانین فطرت کا سائنٹفک علم اُس زمانہ کے لوگوں کو نہ تھا جیسا کہ
آج کل کے لوگوں کو ہے؟ اور خاص کر عبرانی لوگوں کی طبیعت سائنس فہم نہ تھی۔ وہ
لوگ ادنےٰ علتوں کو بالکل نظر انداز کرتے تھے اور سارے واقعات کو خدا کی انگلی
ہی سے منسوب کرتے تھے۔ کیا یہ سچ نہ ہوگا کہ جن واقعات کا ذکر عہد عتیق میں ہوا
اُس میں وہ بلا وساطت قادر مطلق کی مداخلت سمجھتے تھے جن واقعات کو مابعد
زمانہ کے لوگ اپنی سائنس دانی اور زیادہ علم کی وجہ سے طبعی قوتوں کا نتیجہ خیال کرتے
تھے یا ایک غیر معمولی اتفاق کہا کرتے تھے؟ مثلاً کیا بحر قلزم اور دریائے یردن کے سوکھ جانے کی
تشریح یوں نہیں کر سکتے کہ معمولی قوائے فطرت کا یہ مجموعی اثر تھا البتہ معمول سے بڑھ کر زور سے عمل ہوا
کیا بہت مصری آفتوں میں اُسی قسم کا تجربہ اکثر نہیں ہوا؟ پھر کیوں بالکل ایک نیا تجربہ
اُن سے منسوب کریں؟ کیا کوہ سینا پر شریعت دینے کے وقت جو نظارہ نظر آیا کیا وہ
اُسی قسم کا نہ تھا جو کسی آتش خیز پہاڑ کی آتش فشانی یا خوفناک برقی قوتوں سے پیدا
ہوتا ہے؟ یا اگر ہم اس سے بھی زیادہ مقدس زمین پر قدم دھریں اور مسیح کے شفا کے
بہت معجزوں کو خواہ وہ آسیب زدگاں کے متعلق ہوں یا دیگر بیماریوں کے۔ زورِ طبیعت
اور شدتِ توجہ سے منسوب نہ کریں جس کے ذریعہ ایک روح دوسری پر اثر کرتی ہے؟

جیسا کہ روحانی سائنس نے آج کل بہت کچھ ظاہر کر دیا ہے؟
اس قسم کے اعتراض کو رفع کرنے کی کوشش کے وقت ہم یہ ماننے کو تیار
ہوں گے کہ بعض صورتوں میں اس کا امکان تو ہے۔ لیکن اس اصول کو مان کر ہر ایک کا
اُس کی حقیقت کے مطابق فیصلہ کریں۔ پس ہم دو باتیں پیش کریں گے۔ اول کہ یہ اعتراض
سب پر حاوی نہیں۔ دوم کہ جو ہماری مراد معجزے سے ہے اُس کی نسبت ہم غلط فہمی
کرتے ہیں +

(۱) یہ سب پر حاوی نہیں۔ جہاں تک کہ سائنس نے ترقی کی ہے بہت معجزات
اور خاص جن کی شہادت بہت ہی مضبوط ہے وہ اس کے احاطہ سے باہر ہیں چند
معجزے ایسے ہیں جن کی اور کوئی تشریح ہم کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں نئے عہد نامہ کو لینا
کافی ہوگا۔ یہاں ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے شفا کے بعض معجزے گو اس قسم کے نظر
آتے ہیں جو آج کی سائنس ہسٹریا (Hysteria) وغیرہ میں کیا کرتی ہے لیکن
بعض معجزے ایسے ہیں اور بڑے بڑے ڈاکٹر مانتے ہیں کہ جن میں جسم میں ایسی تبدیلی
واقع ہوئی جو کسی شدتِ توجہ یا ارادہ کی قوت سے پیدا نہیں ہو سکتی کہ جس کا تجربہ
زمانہ حال کی سائنس نے کیا ہو۔ علاوہ ازیں بعض معجزات عین اشیائے فطرت پر
ہوئے مثلاً پانی کا مے بنانا۔ چار اور پانچ ہزار کو کھانا کھلانا۔ آندھی کو بند کرنا
سمندر پر چلنا۔ ان سب کی طبعی سائنس کچھ تشریح بتا نہیں سکتی اور پھر رہا سب کا مرکز
اور سب سے بڑا معجزہ مسیح کے جی اُٹھنے کا جس کی شہادت ایسی لاثانی ہے جو کسی
دوسرے کی نہیں +

(ب)۔ یہ تو گویا معجزے کے معنی کے بارہ میں غلط فہمی ہے کہ یہ سمجھ لیں کہ حامیان
معجزہ کا یہ فرض ہے کہ طبعی قانون کے خلاف ثابت کریں یا ایسے معاملات میں علتوں
کی تاثیر کو کم کریں یا بالکل رد کریں۔ وہ قانون فطرت کی خلاف ورزی کی تائید نہیں

کرتا کیونکہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ معجزوں کا بانی فطرت اور اُس کے قوانین کا بانی بھی ہے۔ کہ وہ ادنیٰ علتوں کے خلاف ہے۔ اگر معجزہ کوئی شے ہے جو بیرونی جہان پر خاص اثر کرتا ہے تو اعجازی اور غیر اعجازی دونو قسم کے واقعات پر یہ صادق آئے گا کہ کسی نہ کسی قدر ان کا بیان سائنس کے مطابق ہو سکتا ہے +

مثلاً نعمان کی یا جس اندھے کو مسیح نے بیت صیدا میں بصارت دی (مرقس ۸: ۲۲ سے ۲۶)۔ ان کی جسمانی حالت طبی تشخیص کے قابل تھی لیکن طبی سائنس کے احاطہ سے جو امر باہر رہتا ہے وہ وہ قوت ہے جس نے یہ طبعی صحت عطا کی +

ایک اور قسم کی مثال لیجئے۔ دریائے یردن کے پانیوں کا کھڑا ہو جانا۔ (دیکھو یشوع ۳: ۱۶ کی شرح) عجیب طور سے اُس عربی قصہ کی مانند ہے جو وسطی زمانوں میں بیان ہوا ہے۔ جو اُسی دریا میں اُسی طرح وقوع میں آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ادھر کی طرف ایک بڑا پہاڑ دریا میں گر پڑا تھا جس کی وجہ سے پانی کا بہاؤ تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا اور پھر بڑے زور سے جاری ہو گیا۔ یہ کم از کم ممکن ہے کہ جس واقعہ کا ذکر یشوع کی کتاب میں آیا ہے اس کا کوئی سبب اس قسم کا ہو لیکن جو طبعی سائنس کی رسائی سے پرے ہے وہ یہ امر ہے کہ کیسے یشوع کو اس عجیب فطرتی نظارہ کا علم پیشتر سے ہو گیا اور وہ اسرائیلی فوج کی ضروریات اور مقصد کے عین مطابق اتفاق تھا +

عہد عتیق کے بہت دوسرے معجزات کا اس طرح بیان کر سکتے ہیں اور یہی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ جس غیر معمولی لباس میں وہ ظاہر ہوتے ہیں اُس لباس کو بہت کچھ اُتار سکتے ہیں کیونکہ ایسے لباس کو زمانہ حال کے لوگ بہت بھدا اور ڈھنگا مُشتی خیال کرتے ہیں۔ ہم یوں تشریح کر سکتے ہیں کہ یہ کلام کا ایک طریقہ تھا۔ یا استعارہ کے طور پر بیان ہوا تھا اور مابعد زمانوں نے اسے لفظی سمجھ لیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ مشرقی لوگ اسی قسم کے خیال دوڑایا کرتے ہیں۔ کیونکہ شاعرانہ اور مصورانہ طبیعت کے لوگ ہیں۔ لیکن اس طریقہ سے

ہم سب معجزات کا بیان نہیں کر سکتے +

معجزات محض اس لئے معجزات نہیں کہ ان کی ذاتی سیرت خاص کر یہی ہے۔ بلکہ ان کے اعجازی ہونے کا دعوےٰ ان کے عین وقوعے میں ہے۔ اور اس کا ظاہری رشتہ اُس بڑے نظام کی ضرورتوں اور خواص کے ساتھ ہے جس میں کہ وہ رکھے گئے ہیں اور اس امر میں کہ اکثر ان کی خبر پیشتر سے دی گئی۔ اور یہ عقیدہ کہ خدا نے خاص مقصد کے لئے خود مداخلت کی اس لحاظ سے جنبش نہیں کھاتا کہ بانی فطرت نے طبعی قوتوں کو استعمال کیا جن سے وہ عموماً کام لیا کرتا ہے +

۳۔ معجزے بائیبل کے مکاشفہ کا لازمی جزو ہیں۔

یہاں تک تو ہم کہہ چکے کہ معجزوں کو ہم بائیبل سے جدا نہیں کر سکتے۔ اور مقدس نوشتوں میں جن معجزوں کا ذکر آتا ہے ان کی نسبت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہم پرست لوگوں نے ایسے واقعات کو معجزے بنا لیا جن کو سائنس دان لوگ طبعی اسباب کا نتیجہ بتا سکتے تھے اور اثنائے تحقیقات میں بعض ایسے اشارات ہم نے دیکھے جن سے اعجازی عنصر کو نظر انداز کرنا دشوار رہا ہے +

اگر ہم اپنے دل میں صاف طور سے یہ سمجھ لیں کہ بائیبل میں معجزے کی جگہ کیا ہے اور اس کا رشتہ مکاشفہ کے ساتھ کیا ہے تو ہم ایک قدم اور آگے بڑھا سکتے ہیں کہ ان سوالات کا جواب دے سکیں جو طبعی قانون کے ساتھ معجزے کے رشتہ کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ گزشتہ صدی میں جیسے طبعی سائنس میں تبدیلیاں ہوئیں ویسے ہی الٰہیات اور بائیبل کی تفسیر میں تبدیلیاں ہوئی ہیں +

خلقت کے بارہ میں قدیم تصور جیسا کہ ملٹن نے بیان کیا ہے۔ بالکل بدل گیا ہے اور اس کی جگہ organic (جیسے بیج میں سے پودا نکلتا ہے) تصور قائم ہو گیا۔ پیلی صاحب نے جو جہان کی مثال ایک گھڑی سے دی تھی اب اُسے بہتر طور سے ایک پودے سے مثال دے سکتے ہیں۔ جو بڑھتا نشو و نما پاتا اور ترقی کرتا اور

اپنی ہستی کے قانون کو پورا کرتا جاتا ہے اور یوں زیادہ زور سے اپنے پیدا کرنے
والے اور پرورش کرنے والے کی الٰہی حکمت اور طاقت پر شاہد ہے جو اس کی
زندگی کا ہمہ جا حاضر اصول بھی ہے۔ اسی طرح سے معجزوں نے ایک نئی صورت
اختیار کی ہے۔ اب معجزوں کو قدیم زمانہ کی طرح یہ نہیں سمجھتے کہ وہ مکاشفہ کے
گویا سارٹیفکٹ ہیں۔ یہ ایک مصنوعی ضمیمہ تھا۔ معجزوں کی قدر بطور شہادت کے
پورے طور سے مان سکتے ہیں۔ لیکن ان کی نسبت اب یہ ماننا چاہئے کہ وہ خود
مکاشفہ کے بدن کے اعضا یا اجزا ہیں۔ مثلاً مسیح کے معجزے فوق العادت طاقت
کے علیحدہ علیحدہ ظہور نہ تھے تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کو محض حیرت اور تعجب ہو تاکہ لوگ
ماننے پر مجبور ہوں۔ اس قسم کے معجزوں سے مسیح نے بالکل انکار کیا (مرقس
۸: ۱۱ وغیرہ)۔ بلکہ وہ اُس کی عجیب اور پرفضل سیرت کا نتیجہ تھے۔ اور اُس کی تعلیم کا
اصلی جز تھے۔ یہ ایسے جز تھے کہ اگر ہم ان کو نکال دیں تو اُس سیرت کے خال و خط سارے
معدوم ہو جائیں گے۔ اور جیسا ہم بیان کریں گے سب سے بڑا معجزہ مسیح خود ہے
اُس کی قدرت کے کام۔ خاص کر بعض۔ اُس کی الوہیت کے نشان تھے۔ (مثلاً اُس کی
قیامت کو مقدس پولس نے ایسا ہی سمجھا (رومی ۱: ۴ بمقابلہ یوحنا ۵: ۳۶ +
۱۰: ۲۵ و ۳۸ + متی ۱۱: ۲ سے ۵)۔ وہ نشان تو تھے لیکن ایمان لانے پر مجبور کرنے
کے لئے نہیں کیونکہ مجبوری کا ایمان ایمان ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ایسے نشان جو موجودہ
ایمان کے بیج کو تحریک اور تقویت اور ترقی دیں تاکہ وہ پختہ یقین کے درجہ تک
پہنچ جائے۔ مقدس یوحنا نے (۲: ۱۱) مسیح کے قانا میں پہلے معجزے کی نسبت یہی
بیان کیا جو ہمدردی اور مہربانی کا صریح نشان تھا اور اُس کے جلال کا اظہار بھی
لیکن یہ اظہار اس کے شاگردوں کے اندرونی حلقہ کے لئے تھا۔ ویسے ہی خود مسیح
نے اپنے شفا کے معجزوں کو مع دیگر کاموں کے اپنے مسیح ہونے کے ثبوت میں پیش کیا

لیکن مخفی نہ رہے کہ اس شہادت میں یوحنا بپتسمانی مخاطب ہے ÷

معجزہ کے بارہ میں یہ رائے کہ وہ مکاشفہ کا اصلی جز ہے کسی قدر اُس فرق کی تشریح
کر دیتی ہے جو پرانے اور نئے عہد کے معجزوں میں پایا جاتا ہے جسقدر زیادہ ہم اس امر پر غور کرتے
ہیں اُسی قدر ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکاشفہ ترقی کن ہے۔ اس میں بتدریج الٰہی صداقت انسان
پر کھلتی رہی ہے۔ طرح بہ طرح اور حصہ بہ حصہ (عبرانی ۱: ۱) جس قدر کہ وہ برداشت
کرنے کے قابل تھا۔ تو کیا اعجازی حصہ بھی ترقی کن ظاہر نہ ہوگا؟ کیا ہمیں تعجب ہوگا اگر
عہد عتیق کے بعض معجزے مثلاً آخز کی دھوپ گھڑی یا موسیٰ کے عصا کا کلیانا
ایسی روحانی تعلیم اور نمونہ سے خالی ہو جو مسیح کے قلمبند شدہ کاموں میں ایسے
آشکارا ہیں؟ کوئی یہ جرأت کر کے کہہ سکتا ہے کہ جیسے اخلاق کے ایام طفولیت
میں ابرہام اور یشوع کو خدا نے حکم دیئے جو ہم کو نہیں دیئے جا سکتے۔ ویسے ہی
معجزے جیسے ابتدائی زمانہ میں ظاہر اور مفید و ممد ہو سکتے تھے ویسے ما بعد یا ہمارے
زمانہ میں وہ نہیں ہو سکتے بلکہ محض ایمان کی ٹھوکر کا باعث ہوں گے۔ تو بھی عہد عتیق کے
سادہ سے سادہ معجزات کو بھی اس نقطہ خیال سے اُن بے معنی اور ہنسی انگیز معجزات
پر فوقیت حاصل ہے جو اپوکرفل انجیلوں اور وسطی زمانہ کی روایتوں میں پائے جاتے
ہیں ÷

خلقت کے بارہ میں رائے کی ترقی ہوئی ہے۔ اور طبی سائنس نے ہمیں ایسا اچھا
سبق سکھایا ہے کہ قادر مطلق قانون اور ترتیب کا خدا ہے اس لئے جو کچھ متلون
مزاجی اور دھینگا مشتی کا کام پایا جاتا ہے اُسے ہم اُس خدا کے ناشایاں خیال کرتے
ہیں۔ پرانے عہد نامے کے معجزات میں سے بہت ایسے ہیں کہ اگر وہ آجکل کے زمانہ
میں کئے جاتے تو وہ مناسب نہ بیٹھتے اور تعریف کے خلاف ہوتے۔ اُن کے بارہ میں
چند وسیع خیالات پر ذرا غور کریں۔ بادی النظر میں وہ بالکل اتفاقی اور بے قاعدہ معلوم

ہوتے ہیں۔ شائد دھندلی سی ترقی اُن میں معلوم ہوتا ہو سوائے چند مستثنیات کے۔
مثلاً نویں صدی قبل از مسیح کے معجزے۔ خاص کر ایلیاہ اور الیشع کے محبت بھرے
معجزے مسیح کے معجزوں کے زیادہ مشابہ معلوم ہوتے ہیں بہ نسبت موسےٰ کے
معجزوں کے جو سات صدیاں پہلے وقوع میں آئے تھے۔ یہ پہلے معجزے جو اپنے
موقعہ کی حالات کے عین مطابق تھے عوام الناس کے دلوں پر زیادہ اثر کرتے تھے
بہ نسبت مابعد معجزوں کے جو زیادہ شخصی تھے۔

بائیبل کے معجزات میں قانون اور قاعدے کے دیگر نشانات بھی ملتے ہیں
اُن میں سے خاص معجزے تہری تقسیم کے قابل ہیں۔ ان معجزوں میں سے اکثر تین زمانوں
میں مجتمع ہیں۔ ایسے زمانے جن میں خدا کی عظمت کا ظہور نہایت ضرور تھا اور یہ ان تین
شخصوں میں پائے جاتے ہیں جو تبدیل صورت کے پہاڑ پر اکٹھے ملتے ہیں۔ یعنی موسیٰ
ایلیاہ اور مسیح۔

(۱) پہلا یا موسوی معجزوں کا زمانہ مصر سے مخلصی کے وقت شروع ہوتا ہے۔
جب الٰہی شریعت دی گئی اور عبرانی الٰہی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ (۲) دوسرا زمانہ اُس
وقت شروع ہوا جب اخیاب اور ایزبل نے دین میں نئی باتیں داخل کیں اور
حقیقی خدا کی پرستش اسرائیل میں معرض خطر میں پڑ گئی اور غیر معبودوں کی پرستش
شاہی دربار کی طرف سے شروع ہوئی۔ (۳) تیسرا زمانہ ان سب سے بالا ہے۔
یسوع مسیح کے معجزے جو عقل کو زیادہ پسند آتے ہیں اور جذبات انسانی اور
کانشنس کے دل پسند ہیں وہ عہد عتیق کے معجزات پر کثرت سے روشنی ڈالتے ہیں
چنانچہ ڈاکٹر سنڈے (Sanday) صاحب فرماتے ہیں "عہد عتیق
کے مکاشفہ کا مرکز یہ تھا کہ خدا زندہ خدا ہے۔ کہ جہان مُردہ جہان نہیں بلکہ زندگی سے
معمور ہے اور وہ ساری زندگی اُس سے حاصل ہوئی ہے۔ نیا عہد نامہ اسی مضمون

کو لیتا ہے اور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مسیح کلمہ آدمیوں کا "نور اور زندگی" تھا۔
اس میں کچھ شک نہیں کہ عہد عتیق کے معجزے خدا کو زندہ خدا ظاہر کرتے ہیں
اور ان کا کمال مجسم زندگی میں ہوتا ہے۔ یعنی اناجیل کے مسیح میں۔ زمین پر جس کی
خدمت کا دورہ قیامت اور صعود پر ختم ہوا جس کے ذریعہ سے دنیا کو
نئی زندگی ملی۔ اور اُس فوق الفطرت شخص میں ہم پر یہ معجزے ظاہر ہوئے
جو ایسی اعلےٰ اور افضل ذات کے ساتھ ہمیں غیر معمولی معلوم نہیں دیتے۔ اُس کی
سیرت سب سے بڑھ کر ایک اعلےٰ اعجوبہ ہے۔ اُن سارے بڑے بڑے معجزوں سے
کہیں بڑھ کر۔ یہ معجزے تو اُس معموری کا جو اُس میں تھی جزوی نشان تھے۔ اُسے خواہ ہم
اناجیل کے صفحوں پر پڑھیں یا مقدس پولس نے جو بیان محبت کا کیا ہے (۱ کرنتھی ۱۳ باب)
اُس میں پڑھیں اُس میں وہ اعلےٰ کمال نظر آتا ہے جس میں ساری مردانہ مسلمہ نیکیاں
مجتمع تھیں اور وہ سب نیکیاں بھی جو عموماً زنانہ نیکیاں سمجھی جاتی تھیں۔ اس میں
ایک طرح سے اجتماع ضدین تھا۔ صبر۔ نرمی۔ حلم معہ سختی اور زور کے جس کی نظیر
دنیا میں پائی نہیں جاتی۔ وہ وسیع عالمگیر خیالات ایسے شخص میں پائے گئے جس نے
سب سے تنگ خیال لوگوں میں تربیت حاصل کی تھی۔ ایک طرف تو اُس نے فوق الانسان
دعاوی کئے اور دوسری طرف لاثانی فروتنی اور معقولیت دکھائی۔ اُسے اُس کی
خدمت کے لئے فوق الانسان قوتیں حاصل تھیں لیکن اُن قوتوں کو اُس نے نہ اپنے
ذاتی فایدہ یا آرام کے لئے استعمال کیا اور نہ اپنے شاگردوں کی دنیوی ترقی
کے لئے۔ مزید براں کامل اخلاق اُس میں پایا گیا۔ اُس کی زندگی اور تعلیم میں ایسی خوبی
تھی کہ دشمن بھی مان گئے اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ اُس کے اقوال جو قلمبند ہوچکے
ہیں خواہ وہ اخلاق کے متعلق ہوں یا کسی اور صیغہ کے اُن میں سے کوئی بھی متروک
یا قابل ترمیم ثابت نہیں ہوا اگرچہ انسانی علم نے اُس وقت سے لے کر بہت ترقی

کی ہے +

لیکن اگر زمین پر مسیح ایک عجوبہ ہے ۔ آسمان پر سرافراز شدہ مسیح اور بھی زیادہ عجوبہ ہے ۔ یہ مسیح کی سیرت ہے جو اس کی کلیسیا کی تاریخ میں ظاہر ہوئی اور نشوونما پا گئی جس کا نقش مابعد زمانوں اور مختلف قوموں پر ایسا جما کہ بلا لحاظ آب وہوا ۔ قومیت ۔ رواج اور تہذیب وشائستگی کے اعلےٰ سے اعلےٰ اثر اُس نے کیا ۔ اور اس کی یہ زندگی بخش طاقت ہے جو دلوں کو آج تک تبدیل کر رہی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ معجزوں کا زمانہ گزر نہیں گیا ۔ ایمان داروں کا یہ یقین ہے کہ مسیح نے خود جو وعدہ کیا تھا اُس کی یہ تکمیل ہے کہ " ان سے بڑے کام تم کرو گے " اور ایمان دار ایسا کرتے ہیں " کیونکہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں " (یوحنا ۱۴ : ۱۲) +

معجزہ کا باقاعدہ نتیجہ ۔ جو موسیٰ ۔ ایلیاہ اور مسیح کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے وہ نئے عہد نامہ کے ختم ہونے پر ختم نہیں ہو جاتا ۔ اگرچہ اس کی سیرت زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے ۔ ہمارے لئے جو دیکھے بھالے بغیر کچھ نہیں مانتے اور اس سائنس کی روشنی کے زمانہ میں ایسے " نشان اور عجیب کام " جن کا ذکر بائبل میں آتا ہے بجائے مدد کے رکاوٹ کا باعث ہوں گے ۔ اگرچہ ہم ایمان میں زیادہ زور بھی حاصل کریں ۔ لیکن وہ جس نے صعود کے بعد رسولوں کے ہاتھوں سے نشان اور عجیب کام دکھائے (اعمال ۲ : ۴۳ + ۵ : ۱۲) ۔ اور " کلام کو اُن معجزوں کے وسیلے سے جو ساتھ ساتھ ہوتے تھے ثابت کرتا رہا " (مرقس ۱۶ : ۲۰) اعمال ۴ : ۲۹ و ۳۰) ۔ اب تک اخلاقی اور روحانی معجزے کرتا رہتا ہے اور اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ میں اپنے قلمبند شدہ وعدے کے مطابق ان ساری صدیوں میں زندہ اور موجود رہا ہوں " دیکھو میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے

ساتھ ہوں " (متی ۲۸ : ۲۰) +

۴ ۔ معجزہ مکاشفہ کے لئے بحیثیت مکاشفہ کے لازمی ہے ۔ ہم شاید یہ دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بائبلی مکاشفہ کے لئے معجزے لازمی تھے ۔ کیا ہم ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ نہ کہیں کہ مکاشفہ کے اعلےٰ معنی کے لحاظ سے بھی معجزہ لازمی تھا ۔ کیونکہ جہاں تک قیاس جاتا ہے یہی سب سے اچھا طریقہ تھا جس کے ذریعہ خدا اپنے تئیں انسان پر زیادہ بہتر طریقے سے منکشف کر سکتا ۔ بہ نسبت اس کے جو اُس نے اسباب موجودات میں مکاشفہ دیا ۔ اس مضمون کے بارہ میں پہلے پہل یہ کافی سمجھا جاتا تھا کہ الہٰی پیغام کا کافی اعتبار صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب اس کی تصدیق کے لئے فوق العادت نشان دکھائے جائیں اور اس لئے معجزے مکاشفہ کے لئے لازمی سارٹیفکٹ تھے لیکن فی زمانہ ایسا بیان تسلی بخش نہیں +

جیسا اوپر ذکر ہوا ہم معجزوں کو مکاشفہ کا لازمی ضمیمہ یا لازمی سارٹیفکٹ خیال نہیں کرتے ۔ یہ تو درست ہے کہ معجزہ ایسا اعتبار پیدا کرتا ہے ۔ لیکن اس کی شہادت ذاتی یا باطنی ہے ۔ یہ مکاشفہ کی صداقت پر منکشف شخص کی سیرت پر گواہی دینے کے ذریعہ گواہی دیتا ہے ۔ مسیح کے معجزوں کا یہ اعلےٰ رتبہ ہے کہ وہ مجسم خدا کا کام ہے ۔ لیکن جو دوسرے معجزے بھی اس شخص خدا سے ظاہر ہوئے اُن پر بھی دقوف شخصی اور ارادہ کا نقش ثبت ہے ۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی ارادہ کے ذریعہ فطرت کے کاموں میں تبدیلی کر سکتے ہیں اور وہ بھی قوانین فطرت کے توڑے بغیر ۔ مثلاً جب کوئی جراح (surgeon) کامیابی سے چیر پھاڑ کرتا ہے (operation) یا کوئی طبیب اپنی ادویات کے ذریعہ کسی بیماری کی رفتار کو روک دیتا ہے ۔ ویسے ہی کسی قانون کی خلاف ورزی کئے بغیر جو اُس نے دنیا چلانے کے لئے مقرر کیا ہو باری

چیزوں کا شخص خالق اور حاکم مداخلت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مداخلت براہ راست ہو یا
اُس کے کسی مخلوق کے ذریعہ۔ اور یوں رفتارِ واقعات میں وہ دخل دیتا ہے۔ اور
جس دخل کے بغیر وہ رفتار حسبِ معمول جاری رہتی۔ ایسی مداخلت جو اپنے بیرونی
نتائج میں محدود اور عجیب ہو ہمارے معنی میں معجزہ کہلائے گی۔ ہماری محدود عقلوں
اور ارادوں کے فعل سے یہ کئی امور میں متفرق ہوگی۔ خاص کر اپنے زور اور تاثیر اور اپنے
مقصد کی متواتر تکمیل میں۔ اس پر متلون مزاجی کا الزام عائد نہیں ہوسکتا جو ہمارے
ارادوں میں اکثر پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے ہمارے کام اکثر فطرت کی رفتار کے
مطابق نہیں ہوتے۔

معجزہ کے بارہ میں جو ہم نے یہ خیال پیش کیا کہ وہ شخصیت کا اظہار ہے۔ اُس کے
ذریعہ اس کے متعلق بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اپنے ارادہ کی تشبیہ کے ذریعہ
ہمیں اس بات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ یہاں کوئی متلون مزاجی کا اصول دنیا میں
داخل نہیں کیا گیا جہاں کہ ہم قانون اور ترتیب کی سلطنت دیکھنے کے عادی تھے۔
علاوہ ازیں اس سے ہمیں معجزے کی جگہ اور مقصد کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ
معجزہ ایک بہترین طریقہ سے حاکمِ عالم کی شخصی سیرت پر شہادت دیتا ہے اور جنہیں ہم
پروردگاری کے معمولی کام خیال کرتے ہیں اور جو کام غیر معمولی سمجھے جاتے ہیں اور جن کو ہم
معجزہ کہتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک پیوند کرنے والی کڑی مہیا ہو جاتی ہے۔ یہ دونو قسم
کے کام شخصی عقل۔ ارادہ اور قدرت کے کام ہیں اور کامل فطرت کے قانون کے مطابق
عمل کرتے ہیں۔ لیکن ایک قسم کے ظہورات کا خاص منشا یہ ہے کہ وہ دوسری قسم کے کاموں
کا تتمہ اور تشریح ہوں۔

پس ہم پھر مسیح کی طرف مُنہ موڑتے ہیں کہ وہ سب سے اعلیٰ معجزہ اور فوق الفطرت
کو عین الفطرت ظاہر کرنے والا ہے۔ کیونکہ جس میں آسمان اور زمین۔ انسان اور خدا

آپس میں ملتے ہیں۔ وہ اپنے قلمبند شدہ معجزوں کے ذریعہ بھی اور اپنے کلام اور زندگی
کے ذریعہ بھی اُس کی مکمل سیرت منکشف ہوتی ہے جس کو "نہ کسی آدمی نے دیکھا اور نہ دیکھ
سکتا ہے"۔ اور جس کی نسبت اُس نے خود فرمایا کہ "جس نے مجھے دیکھا ہے اُس نے باپ
کو دیکھا ہے"۔ مجسم خدا میں جسے ہم معجزہ کہتے ہیں وہ ایک معمولی فعل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ
اس میں خدا مشخص طور سے انسان پر منکشف ہوا جس نے انسانی زندگی کی قیود کے اندر
شخصی طور پر کام کیا۔

۵۔ معجزہ اور قانونِ فطرت۔ لیکن چونکہ قانونِ فطرت کی تعلیم کی وجہ سے
آج کل معجزہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اس لئے یہ ضرور ہے کہ معجزے اور قانونِ قدرت کے
درمیان جو رشتہ ہے اُس کا کچھ زیادہ مفصل ذکر کریں۔

موجودہ سائنس کی ساری عمارت کی بنیاد یہ ہے کہ فطرت یکساں باقاعدہ کام
کرتی ہے۔ اگر واقعات ایسے طور سے وقوع میں آئیں جیسے مرض کابوس میں یا خواب
میں واقع ہوتے ہیں تو فطرت کا مطالعہ کرنا فضول ہوگا۔ اگر معجزے کے ہونے کے ذریعہ
فطرت کی یکسانی اور باقاعدگی (uniformity) میں فرق آئے اور
دنیا میں بے ترتیبی پیدا ہو تو جو لوگ معجزے کے امکان پر غور کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کو
ہم معذور رکھیں گے۔ لیکن کیا یہ سچ ہے کہ معجزہ کو ماننا فطرت میں قانون کی حکومت کو رد
کرنا ہے؟ یہ تو روزمرہ کی بات ہے کہ عموماً معجزے کے ماننے والے اپنی روزانہ زندگی
میں ایسی بات چیت اور عمل کرتے ہیں جیسے کہ وہ لوگ جو مانتے ہیں کہ فطرت ہموار اور یکساں
ہے اس کی توقع۔ اُس کی دور اندیشی اس کی تجویزیں ٹھیک ویسی ہی مستقل اور عملی طور سے
اس اصول پر بھروسہ رکھتی ہیں جیسے ان کی جو معجزوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟
کیونکہ معجزے کا عین امکان فطرت کی یکسانی اور باقاعدگی پر منحصر ہے۔ معجزہ کا بستہ قانون
فطرت کا عمل ہے۔ یہ قانون قدرت کو خارج نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کی نسبت

ہے۔ اگر ہر ایک چیز ناقابل تشریح ہوتی اور اس کی علت معلوم نہ ہو سکتی تو معجزے کو کہاں جگہ رہتی؟ مقدس آگستین نے معجزے اور قانون فطرت کے درمیان رشتہ کا درست تصور قائم کیا تھا جب اُس نے یہ کہا کہ خدا کے سب معمولی کام بھی عجیب یا معجزانہ ہیں۔ لیکن چونکہ ہم روزمرہ انہیں مشاہدہ کرتے ہیں اس لئے ہمارے دل اور ذہن کند ہو جاتے ہیں کہ ہم فصل اور پھلوں کے سالانہ معجزے کو محسوس نہیں کر سکتے۔ فطرت کے خداوند نے سال بسال قدرتی عمل کے ذریعہ جو اُس نے مقرر کیا ہو کے انسانوں کے لئے روٹی کا ذخیرہ بکثرت بہم پہنچایا ہے اور مینہ کے پانی کو عرق انگور سے بدل دیا ہے تاکہ انسان کے دل کو خوش کرے۔ اُسے ایک دفعہ یہ مناسب معلوم ہوا کہ اپنے ارادہ کے ذریعہ جس کے آگے ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ ان باتوں کو آناً فاناً کر دے۔ معجزے اگر کبھی وقوع میں آئیں تو وہ اُسی شارع کا کام ہوں گے جو ہمیں روزبروز فطرت کے عمل کے معمولی عجائبات دکھاتا رہتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ خود معجزے اُس قانون کے مطابق ہوں۔ البتہ وہ قانون اس قانون سے اعلےٰ ہوگا جس سے طبعی سائنس آشنا ہے۔ فطرت اور کانشنس دونو کا تقاضا یہ ہے کہ ہم خدا کی نسبت یہ خیال کریں کہ وہ "ابتری کا نہیں بلکہ امن کا بانی ہے" (۱ کرنتھی ۱۴: ۳۳) چونکہ وہ مطلقاً کامل ہے اس لئے وہ نقیض ذات نہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ دنیا میں کوئی شے خلل انداز ہے۔ یعنی کوئی ایسا اصول عمل کر رہا ہے جو قانون کے اصول کے مطلق خلاف ہے۔ جسے بائبل نے گناہ سے منسوب کیا۔ بقول مقدس یوحنا گناہ "خلاف شرع" ہے (۱ یوحنا ۳: ۴)۔ لیکن گناہ کوئی اثباتی وجود کوئی مخلوق شے نہیں۔ بلکہ یہ اُس انتخاب کا بد استعمال ہے جو خالق عالم نے انسان کے ہاتھ میں دیا تھا اور بالضرورت یہ اختیار انتخاب اُس کو بخشا تاکہ وہ فعل مختار ہو۔ یہ امکان کہ انسان حق کو چنے اس امکان پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ ناحق کو چنے۔ ہمیں یہاں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ

کہاں تک انسانی یا ملکی گناہ طبعی جہان کی ان خرابیوں کا ذمہ وار ہے جو گاہے گاہے قانون فطرت کے طالب علم کو حیران اور سرگردان کرتی ہیں۔ اس خلل انداز عنصر کی موجودگی ایک خیال پیدا کرتی۔ اگر معجزہ اندھا دُھند اور شدید معلوم ہو تو کیا اس کی یہ وجہ نہ ہوگی کہ جب اس نیک دنیا میں گناہ کے داخل ہونے سے اس کی حالت بگڑ گئی تو اُس اصلی حالت کے بحال کرنے کے لئے کسی شدید اور سخت علاج اور طریقے کی ضرورت پڑے؟

اور علاوہ ازیں کیا یہ شدید اور سخت علاج اصلی حالت کی بحالگی کے لئے کسی اعلیٰ اصول فطرت کے مطابق ہو؟

انسانی شخصی فعل کی جو تشبیہہ اوپر دی گئی وہ یہاں ہمیں مدد دے گی۔ یعنی ذرا یہ کہ جب طبیب طبابت کے سائنس کے قوانین کے مطابق عمل کرتے ہوئے بدن کی صحت کو بحال کرتا ہے اگرچہ وہ طبعی عملوں کے سلسلہ میں خلل ڈالتا ہے جو بغیر اس کی مداخلت کے اپنا پورا عمل کرتے۔ تو بھی وہ قدرتی اور معمولی عامل سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی شاید قابل لحاظ ہوگا کہ جن غیر معمولی حالات کا اُس کے ہنر اور ارادہ نے مقابلہ کیا اور جن پر اُس نے فتح پائی وہ اکثر باوساطت یا بلاوساطت انسانی گناہ کا نتیجہ تھے۔ تو کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جن معجزوں کا بائبل میں ذکر آیا ہے یعنی حقیقی مداخلت کا وہ فضل کی مداخلت نہ تھی بلکہ اُس گناہ کی جس کی وجہ سے اس کی ضرورت پڑی؟

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ بائبل کے معجزوں میں عموماً قانون اور انتظام کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور کہ ان میں سے اکثروں میں کلیہ طبعی نتائج ایک خاص وقت اور ایک خاص مقصد کے لئے طبعی طاقتوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتے تھے۔ مگر بعض دیگر معجزے ہیں جن کو ایسے اسباب کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے معجزوں کو طبعی قانون سے منسوب نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی اعلےٰ نظام کے جھکاؤ سے

ہوں جن کو بہتر نام نہ ملنے کی وجہ سے ہم فوق العادت قانون کہیں گے ۔ خود فطرت نے
ہمیں ایک مثال دی ہے (اور وہ مثال سے کچھ بڑھ کر بھی ہے) جس کے ذریعہ ہم کچھ
سمجھ سکیں گے کہ یہ ظن غالب ہے بلکہ یہ فطرتی بات ہوگی کہ وہ قوانین ان کی نسبت
اعلیٰ اور ان کی رسائی سے پرے ہوں جنہیں ہماری عقل دریافت کر سکتی ہو تا قانون کا
ایک اعلیٰ طبقہ جو ہماری معمولی عقل کے سامنے فوق العادت اور اعجازی معلوم ہو ۔

خارجی فطرت میں ہمیں چار مختلف عالم نظر آتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک ادنیٰ پر
مبنی ہے ایک معنی میں ادنیٰ اعلیٰ میں داخل ہے تو بھی اس سے الگ اور ممیز ہے ۔

(ا) پہلے تو بے ترتیب عالم (Inorganic) جس میں کیمیائی عناصر
اور ان کے مرکبات پائے جاتے ہیں یا جسے ہم مردہ مادہ کہتے ہیں ۔ یہ عالم اپنے قوانین جر ثقیل
اور اتصال وغیرہ کے ماتحت ہے ۔

(ب) اس کے اوپر مترتب یا منتظم عالم (organic) ہے ۔ جس کی
ساخت اس بے ترتیب عالم سے ہوتی ہے اور اس لحاظ سے قوانین مادہ کے ماتحت ہے
لیکن اس کے سوا اس میں ہستی کی ایسی پوشیدہ قوتیں اور شرائط پائی جاتی ہیں جو بے ترتیب
عالم کو معلوم ہی نہیں اور اس کی وجہ سے یہ ایک اور قسم کے قوانین کے تابع ہے جن کا
ادنیٰ طبقہ سے کچھ تعلق نہیں یعنی منتظم (organic) زندگی کے قوانین ۔

(ج) ان سے اوپر حیوانی زندگی ہے جس کی اپنی خاص صفات ۔ شرائط نشو و نما ۔
پرورش ۔ حرکت وغیرہ کے قوانین ہیں ۔ (د) اور اس بالاتر انسان کی ذی عقل مدرک
اور اخلاقی زندگی ہے ۔

عالموں کے اس زینہ کا ہر جز ادنیٰ طبقات کے لحاظ سے فوق العادت اور
اعجازی ہے اگرچہ حقیقی معنی میں وہ ادنیٰ طبقات کے قوانین کے ماتحت بھی ہے ۔
ان میں سے کوئی بھی بے قانون اندھا دھند یا دھینگا مشتی نہیں ۔ اگرچہ زینہ میں جس قدر

اوپر چڑھو گے اسی قدر ظاہرا تم کو یہ معلوم ہوگا کہ وہاں کوئی قانون اور باقاعدگی
نہیں ۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اعلیٰ اور زیادہ پیچیدہ اور زیادہ پُر راز قوانین
کے ماتحت ہیں ۔

بائبل کی تعلیم یہ معلوم ہوتی ہے کہ بے ترتیب ۔ باترتیب اور حیوانی ذی عقل
عالموں کے اوپر اور بالا تو ایک اور اعلیٰ عالم باترتیب ہے ۔ (د) یعنی خالص روحانی
عالم جس کے چمکارے وقتاً فوقتاً ہم کو دکھائی دیئے ۔ جنہیں ہم معجزے کہنے لگے ۔ یہ
چمکارے ممکن ہیں کیونکہ خود انسان ایک طرف تو روحانی ہے ۔ اس لئے کہ وہ "خدا کی
صورت" پر مخلوق ہوا اور فوق العادت عالم سے تعلق رکھتا ہے ۔ وہ اسے اعجازی
معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اس کی عقل جس کا احاطہ عمل یہ طبعی جہان ہے ۔ وہ روحانی
جہان سے اب تک مانوس نہیں ۔ وہ چمکارے اس لئے دیئے گئے کیونکہ اس
فوق العادت عالم کا حاکم جو اس طبعی عالم کا بھی حاکم ہے اپنی ذی عقل مخلوق انسان سے
شخصی رفاقت و شراکت چاہتا ہے ۔

اگر فوق الفطرت کا رشتہ طبعی یا فطرتی جہان سے ویسا ہی ہو جیسا کہ ہماری
مثال سے واضح ہے ۔ یعنی اگر فوق الفطرت طبعی جہان میں ساری ہو اور اس کی
تکمیل کنندہ ہو اور ساتھ ہی اس سے کہیں اعلیٰ ہو تو ہمیں یہ توقع کرنی چاہئے ۔
گو وہ قانون جس کے مطابق معجزے ظہور میں آتے ہیں ہماری عقل کی رسائی سے
پرے ہوں تو بھی ان میں کچھ نہ کچھ ایسی بات پائی جائے گی جو ان کی معقولیت پہ
دلالت کرے اور اس قانون کے اصول کے ساتھ اس کی نسبت ہو جس کا عمل ہم اپنے
چاروں طرف مشاہدہ کر رہے ہیں ۔ ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ کسی حد تک یہی حال ہے
اور اگر وہ غور کرے تو اس یقین کی تصدیق ہو جائے گی کہ بائبل کے معجزات اس اعلیٰ
قانون کے عمل کی مثالیں ہیں نہ کہ ادنیٰ جہان کے قوانین کی خلاف ورزی ۔

اس قرینہ میں یہ خیال بھی ظاہر کرنا مناسب ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ یہ خیال معجزے کے کل دائرہ پر محیط ہوگا یا یہ کہ اس کے ذریعہ سے بائیبل کے سارے معجزات کی تشریح ہو جائے گی +

ہم یہ بھی ذکر کر چکے ہیں کہ مسیح کے بعض معجزات مابعد انسانی ترقی کے نتائج کی لاانجیل پیش بینی تھی۔ اور یقیناً یہ کہنا بالکل راست ہوگا کہ انسانی ترقی کی مابعد منزل کی یہ خاص پیش بینی بذات خود ایک معجزہ ہے۔ معجزے کے سوا اس کو اور کیا کہہ سکتے ہیں مثلاً اگر کسی نے ملکہ این (anne) کے دنوں میں بے تار تاربرقی کو استعمال کیا ہوتا جو اس زمانہ کے علم و تجربہ سے کہیں باہر تھی تو کیا اُس زمانہ کے لوگ اُسے معجزہ خیال نہ کرتے اور وہ گویا زمان حال کی ترقی کی پیش بینی ہوتی۔ اس نقطہ خیال سے مسیح کے عجائب کاموں کے اعجاز میں کچھ کمی نہ ہوگی اگر زمانہ حال یا استقبال کا علم طب یا سائنس ویسے ہی نتیجے پیدا کر دے۔ جس دین اور اخلاق کو مسیح نے پیش کیا جو معجزوں کی نسبت کہیں زیادہ فوق رکھتے ہیں اُن میں قدیم زمانہ کی ساری آرزو اور ان کی روح کے تقاضات پورے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس منزل مقصود کو ظاہر کرتے ہیں جس کی طرف انسانوں کی اخلاقی ترقی بتدریج حرکت کر رہی ہے۔ پس اس کی باتیں کبھی ٹل نہیں جاتیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مادے اور ذہن کے ساتھ اس کے عجیب تعلقات اُسی طرح سے کامل انسانیت کی قابلیت کو ظاہر کریں؟ یہ وہ منزل مقصود ہے جس کی طرف عقل اور سائنس گذشتہ صدہا سال کے تجربہ کی مدد سے حرکت کر رہے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اس سے ان کے اعجازی ہونے میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ اور اُس دلیل میں پرانے اور نئے دونوں عہدنامے شامل ہیں۔ پس اگر فی زمانہ ناقابل تشریح ترقی اعجازی ہو تو پرانے عہدنامہ کی شریعت نبوت اور تاریخ کے بارہ میں کیا کچھ دعوے

نہیں کر سکتے +

نتیجہ۔ انسان ذیعقل اور روحانی جہانوں کی سرحد پر آباد ہے۔ ایک طرح سے اس کا تعلق دونو کے ساتھ ہے۔ اعلےٰ اسی قدر اس کا ورثہ ہے جس قدر ادنیٰ ہے۔ لیکن اعلےٰ کے ابھی صرف چمکارے ہی اس کو حاصل ہیں۔ بائیبل کے معجزوں کے بیان کا ایک بڑا مقصد۔ (جن معجزوں میں مسیح کا جی اٹھنا سب سے بڑا معجزہ ہے جس کے بغیر مابعد تاریخ سمجھ میں نہیں آسکتی)۔ یہ ہے کہ اُس مزاج اور رُوح کے خلاف ہم کو آگاہ کرے جو ان چمکاروں کو بے اعتبار سمجھتی اور ان کا انکار کرتی ہیں۔ اور ادنیٰ طبقہ ہی میں زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہیں +

انسان کے حق پیدائش کی ایسی تحقیر ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں جن کے نزدیک مسیحی عقیدہ کے بیانات تاریخی واقعات ہیں۔ مسیح مجسم خدا طبعی بھی ہے اور فوق الفطرت بھی ہے۔ مسیح نے جو مصلوب ہوا اور جی اُٹھا۔ جس نے صعود کیا اور جو سرفراز کیا گیا ان کے لئے اعلےٰ عالم کی راہ کھول دی "تم دیکھو گے کہ آسمان کو کھلا اور خدا کے فرشتوں کو ابن آدم پر چڑھتے اور اُترتے دیکھتے ہیں" (یوحنا ۱: ۵۱) +

قیامت

جیسا بعض اوقات دیگر معجزوں کے بارہ میں کہا جاتا ہے ویسا قیامت کے بارہ میں کہا نہیں جاتا۔ سب سے بڑا سوال جس سے ہر انسان کو واقف ہونا چاہئے وہ یہ ہے کہ آیا آیندہ زندگی ہے یا نہیں۔ پاسکل صاحب کہتے ہیں "یہ جاننا ساری زندگی سے علاقہ رکھتا ہے کہ آیا روح فانی ہے یا غیر فانی۔ اگر فوق العادت مکاشفہ کسی طرح سے ممکن ہے (اور جو لوگ شخص خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو اپنی مخلوقات کو پیار کرتا ہے اُن کو تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ آیندہ زندگی ہے)۔ حیات آیندہ کے بارہ میں مکاشفہ سب سے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ کیونکہ اس بڑے سوال کی موجودگی میں کل انسانی علم دیوالیہ ہے۔ سائنس خود شناس روح کی تاریخ کا سراغ صرف موت تک ہی لگا سکتی ہے۔ انسانی دل کی آرزو بقا کے لئے ہے۔ اس کے بارہ میں فلسفہ قیاس دوڑا سکتا ہے۔ لیکن وہ اسے ثابت نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑھ کر سقراط نے روح کی بقا ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس پر موت کا فتویٰ دیا گیا وہ صرف اتنا کہہ سکا "اب انتقال کی گھڑی آپہنچی ہے اور ہم اپنی راہ لیتے ہیں میں مرنے کی راہ لیتا ہوں اور تم جینے کی۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ ان سے بہتر کون ہے"۔

مسیحی کلیسیا کا یہ دعوے ہے کہ اُسے اس بڑے سوال کے بارہ میں خدا کی طرف سے خاص مکاشفہ ملا ہے۔ اُس کا یہ خاص عقیدہ ہے کہ خدا نے اُس کے بانی کو خاص مقصد کے لئے مُردوں میں سے زندہ کیا تاکہ نوع انسان پر (۱) آیندہ زندگی (۲) اُس زندگی کی حقیقت کو منکشف کرے۔

۱۔ اس شہادت کی کیفیت۔ مسیح کے جی اُٹھنے کے بارہ میں اس قسم کی شہادت ہے جو روحانی انسان کی روحانی قابلیت زیادہ محسوس کر سکتی ہے۔ جو کہ خدا کو جانتے اور اُس سے محبت رکھتے ہیں وہ اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے ساتھ ابدی شراکت کی اُنہیں آرزو ہے۔ اور اُسے اس امر کا بھی احساس ہے کہ جو بے انصافیاں مایوسیاں اور ناکامیابیاں اس زندگی میں پیش آتی ہیں وہ سب حیات آیندہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس میں خدا کی راستبازی اور محبت آخر کار پورے طور سے ظاہر ہوگی وہ یسوع مسیح کے جی اُٹھنے کی شہادت کو پرکھنے کی طرف زیادہ توجہ کریں گے۔ لیکن برعکس اس کے جو لوگ شخص خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے نزدیک فطرت محض بے تبدیل قوانین کا سلسلہ ہی ہے وہ یا تو اس شہادت کو بلا تفتیش رد کر دے گا۔ یا اگر تفتیش کرے گا تو وہ اسے غیر مکتفی سمجھے گا۔ اگرچہ آخری فیصلہ اس امر پر موقوف ہوگا کہ آدمی روحانی اور اخلاقی صداقت کی نسبت عام خیال کیا رکھتا ہے۔ تو بھی قیامت مسیح کا دعوے یہ ہے کہ میں ایک تاریخی واقعہ ہوں اس لئے اس کی شہادت جہاں تک کہ وہ تاریخی ہے اُسی قسم کے قوانین سے پرکھی جا سکتی ہے جن سے کہ دوسری تاریخی شہادت پرکھی جاتی ہے۔ اس لئے یہ مسیحیوں کا فرض ہے کہ قیامت کی شہادت کو نہایت باریکی سے چھان بین کریں۔

۲۔ نوشتے۔ زمانہ حال کے سارے علمائے جرح (criticism) سوائے ان کے جو حد سے باہر نکل گئے ہیں یہ مانتے ہیں کہ پولس کے بڑے بڑے خطوط صحیح اور اُسی کی تصنیف ہیں اور چونکہ وہ رسول مسیح کی قیامت کے تھوڑی دیر بعد ہی مسیحی ہو گیا (بقول ہارنک Harnack سنہ ۳۰ء ہیں اور کسی صورت میں سنہ ۳۵ء کے بعد نہیں) اُس کے خطوط اس امر کی شہادت کے لئے نہایت بیش قیمت ہوں گے کہ اس کے بارہ میں پہلے مسیحیوں کا عقیدہ کیا تھا۔ مسیح کے جی اُٹھنے کا مسئلہ

نہ صرف ان کلیسیاؤں میں تسلیم ہو چکا تھا جن کی بنیاد مقدس پولس نے ڈالی بلکہ اُن کلیسیاؤں میں بھی جو پہلے رسولوں نے قائم کی تھیں۔ یہ بھی ان خطوں سے ثابت ہے خاص مقام اکرنتھی ۱۵: ۳ ہے جس میں مقدس پولس نے مسیحی دین کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ قیامت کے بارہ میں اُس نے یہ لکھا "میں نے سب سے پہلے تم کو وہی بات پہنچا دی۔ (یہ اس واقعہ کے تیس سال بعد ۵۰ء میں ہوا)۔ جو مجھے پہنچی تھی کہ مسیح کتاب مقدس کے بموجب ہمارے گناہوں کے لئے مُوا اور دفن ہوا اور تیسرے دن کتاب مقدس کے بموجب جی اٹھا اور کیفا کو اور اُس کے بعد اُن بارہ کو دکھائی دیا۔ پھر پانچ سَو سے زیادہ بھائیوں کو ایک ساتھ دکھائی دیا۔ جن میں سے اکثر اب تک موجود ہیں اور بعض سو گئے۔ پھر یعقوب کو دکھائی دیا پھر سارے رسولوں کو اور سب سے پیچھے مجھ کو جو گویا ادھورے دنوں کی پیدائش ہوں دکھائی دیا ...... پس خواہ میں ہوں خواہ وہ ہوں ہم یہی منادی کرتے ہیں اور اسی پر تم ایمان بھی لائے"۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یسوع مسیح کی قیامت مسیحی دین کا ایک بنیادی اصول تھا۔ "اور سب نو مریدوں کو سب سے پہلے" اسی عقیدے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ اس نئے عقیدہ کی نہایت ضروری اور مقدم صداقت تھی۔ اور اس مضمون کے بارہ میں مقدس پولُس کی تعلیم وہی تھی جو دوسرے رسولوں کی تھی اور پانسو سے زیادہ مسیحی اشخاص (اور جن میں سے بعض مقدس پولس کی تحریر کے وقت زندہ تھے) یہ تصدیق کر سکتے تھے کہ ہم نے جی اُٹھے مسیح کو دیکھا ہے۔ اس لئے مسیح کی قیامت ایک متلوّن مزاج عورت کی اکیلی شہادت پر مبنی نہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا۔ بلکہ عورتوں پر کسی ظہور کا یہاں ذکر نہیں آتا۔ اس فہرست میں کلیسیا اور اُس کے عہدہ داروں پر ظاہر ہونے کا ذکر ہے۔ ایک ظہور مقدس پطرس پر ہوا جو رسولوں میں سر کردہ تھا۔ ایک بارھوں پر جو مسیحی جماعت کے مسلمہ رکن تھے۔ ایک خداوند کے بھائی یعقوب پر۔ جو پیچھے یروشلم

کی کلیسیا کا نگران ہوا۔ ایک سارے رسولوں پر یعنی بارھوں کے ماسوا دیگر بزرگوں پر شاید کُل ستروں پر (لوقا ۱۰: ۱)۔ ایک کل کلیسیا پر جس موقعہ پر کہ پانچ سو سے زیادہ حاضر تھے۔ اور ایک مقدس پولس پر جو غیر قوم مسیحیت کا بانی تھا۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان ظہوروں میں سے دو غیر ایمان داروں پر تھے۔ اناجیل میں مقدس یعقوب کے نہ ایمان لانے کا خاص ذکر ہے (یوحنا ۷: ۵ + مرقس ۳: ۲۱ + متی ۱۵: ۳۷)۔ اور شاید اسی ظہور کی وجہ سے وہ ایمان لایا (اعمال ۱: ۱۴)۔ رہا مقدس پولس کا ذکر۔ اُس کے رفیق اور مورخ نے ہمیں بتایا کہ وہ "ابھی تک خداوند کے شاگردوں کے دھمکانے اور قتل کرنے کی دُھن میں تھا" (اعمال ۹: ۱)۔ جب کہ جی اُٹھا مسیح دمشق کے پھاٹکوں کے باہر اُس پر ظاہر ہوا۔ اس عبارت میں جس شہادت کی طرف مقدس پولُس اشارہ کرتا ہے وہ شہادت کا موثر مجموعہ ہے۔ نہ صرف قدیم رائے کے حامیوں کی یہ رائے ہے بلکہ حال کے منفی عالمان جرح کی بھی۔ مثلاً شمیڈل صاحب (Schmiedel) لکھتے ہیں کہ "جی اُٹھے مسیح کے ظہوروں کا سب سے قدیم بیان اس عبارت میں تلمبند ہے۔ یہ اس وقت تک ہمیں پہنچا دیتا ہے کہ جب رجوع لانے سے تین سال بعد وہ یروشلم میں پندرہ روز جا کر رہا تو پطرس نے یہ باتیں اُسے بتائی ہوں گی" (گلتیوں ۱: ۱۸)۔ ویزساکر صاحب (Waizsacker) کہتے ہیں کہ "پولس کو ان باتوں کا علم ابتدائی کلیسیا کے ارکان کے ذریعہ حاصل ہوا ہوگا"۔ وَنل صاحب (Weinel) کہتے ہیں "یہ عین شروع ہی کے زمانہ میں مقدس پولس کو یہ اطلاع مقدس پطرس کے ذریعہ ملی ہو گی"۔ کائم صاحب (Keim) لکھتے ہیں کہ مقدس پولس نہایت دینداری سے یہ صداقت پیش کرتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان واقعات کا تجربہ ہوا اور لوگ ایمان لائے۔ ویسی ہی دیانت داری سے ان کا بیان اس سے کیا گیا اور اُس نے ویسی ہی دیانت داری سے ان کا ذکر اوروں سے کیا۔ پولس کی مردے کے

ذریعہ یہ سوال ایک خاص صورت اختیار کر لیتا ہے +

مقدس پولُس کی اس اہم شہادت کی تصدیق مقدس پطرس کی چشم دید شہادت کے ذریعے ہوتی ہے۔ مقدس پطرس کا پہلا خط سارے قدیم نوشتوں میں سے بہترین تسلیم شدہ نوشتوں میں گنا گیا اور چونکہ اس کے مضامین اس کی مسلمہ تاریخ اور تصنیف کے مطابق ہیں اس لئے اس کی شہادت کے قبول کرنے میں ہمیں کچھ تامل کرنا نہیں چاہئے۔ مسیح کی قیامت کے بارہ میں اس کی شہادت بہت ہی مضبوط ہے۔ کیونکہ مقدس پطرس کے نزدیک مسیح کی قیامت محض ایک خیال یا قیاس نہیں۔ بلکہ ایک یقینی امر واقعہ اور مسیحی کی امید کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "ہمارے خداوند یسوع مسیح کے خدا اور باپ کی حمد ہو جس نے یسوع مسیح کے مُردوں میں سے جی اُٹھنے کے باعث اپنی بڑی رحمت سے ہمیں زندہ امید کے لئے نئے سرے سے پیدا کیا"۔ (۱: ۳)۔ "اور پھر یہ "جس نے اُس کو مُردوں میں سے جلایا اور جلال بخشا تاکہ تمہارا ایمان اور امید خدا پر ہو" (۱: ۲۱)۔ دو دیگر رسولوں کی شہادت بھی بیان بڑھا سکتے ہیں۔ مقدس متی کی انجیل خواہ وہ براہ راست اُس رسول کی قلم سے نکلی ہو خواہ اُس کے اصلی عبرانی "لوگیا" پر مبنی ہو۔ لیکن مستند کتاب ہے۔ مسیح کی قیامت کے بارہ میں اس کی شہادت بہت صریح و صاف ہے (متی ۲۸ باب)۔ مقدس یوحنا کی انجیل پر گو زمانہ حال کے چند علما نے شک ڈالا قدیم زمانہ میں سب لوگوں نے اُسے تسلیم کیا تھا اور اس کی تائید میں بہت وزنی شہادت ہے اندرونی بھی اور بیرونی بھی کہ یہ مقدس یوحنا کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف نے قیامت کے بارہ میں اپنی شخصی شہادت پیش کی ہے اور اُس نے مسیح کے تین ظہوروں کا بیان کیا جسے اُس نے خود دیکھا +

ان ابتدائی چشم دید شہادتوں کے علاوہ دوسرے درجہ کی شہادتیں بھی بڑی ضروری ہیں۔ مقدس لوقا، انطاکیہ کا غیر قوم تھا جس کو دیر تک قیصریہ میں رہنے کے ذریعہ

(اعمال ۲۴: ۲۷)۔ سنہ ۵۶ سے ۵۸ تک بہت موقعے ملے ہوں گے کہ ایسے لوگوں سے دریافت کرے جن کے یہ چشم دید واقعات تھے اور ہمارے پاس ماننے کی معقول وجہ ہے کہ اُس نے ایسا کیا (لوقا ۱: ۱ سے ۴)۔ اس لئے اُس کی انجیل اور اعمال کی کتاب کو ایک بیش بہا سند سمجھنا چاہئے۔ مسیح کی قیامت کے بارہ میں ان کی شہادت بلا غلطی کے ہے۔ مقدس مرقس تو مقدس پطرس کا ترجمان اور سکرٹری تھا (۱ پطرس ۵: ۱۳)۔ اس لئے اس کو بہت موقعہ ملے کہ اس صداقت کو معلوم کرے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس انجیل کا خاتمہ کھو گیا ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ جس نے یہ انجیل لکھی اُس نے ایسے نقطہ خیال سے لکھی جو مسیح کے جی اُٹھنے پر ایمان رکھتا ہو اور اس کی مکمل صورت میں اس واقعہ کا بیان ہوگا +

۳۔ ظہوروں کا شمار۔ مقدس مصنفوں نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ جی اٹھا مسیح بہت دفعہ ظاہر ہوا (یوحنا ۲۱: ۲۵ + اعمال ۱: ۳)۔ دس یا گیارہ ظہوروں کا تو صاف ذکر ہے :-

(۱) مریم مگدلینی پر۔ (یوحنا ۲۰: ۱۶ + بمقابلہ مرقس ۱۶: ۹)۔

(۲) دوسری عورتوں پر (متی ۲۸: ۹)۔

(۳) پطرس پر (لوقا ۲۴: ۳۴ + ۱ کرنتھی ۱۵: ۵)۔

(۴) عماؤس کو جاتے ہوئے دو شاگردوں پر (لوقا ۲۴: ۱۵)۔

(۵) دس رسولوں پر بلا توما کے (لوقا ۲۴: ۳۶ + یوحنا ۲۰: ۱۹)۔

(۶) رسولوں پر جب توما حاضر تھا (یوحنا ۲۰: ۲۶)۔

(۷) سات شاگردوں پر جن میں پطرس۔ توما۔ نتھانیل۔ یعقوب اور یوحنا تھے (یوحنا ۲۱: ۱) +

(۸) گلیل کے پہاڑ پر گیارہ شاگردوں پر (متی ۲۸: ۱۶) جو شاید وہی ظہور ہے جس کو

(۹) کتنے ہیں پانچ سو سے زیادہ بھائیوں پر یکبارگی ظاہر ہوا (اکرنتھی ۱۵: ۶)۔

(۱۰) خداوند کے بھائی یعقوب پر (اکرنتھی ۱۵: ۷)۔

(۱۱) صعود کے موقعہ پر رسولوں پر (اعمال ۱: ۴) +

(۱۲) مقدس پولس پر (اعمال ۹: ۳ وغیرہ)۔

۴۔ شہادت میں جو اختلاف بتایا جاتا ہے ۔ مذکورہ بالا مقامات کو اگر اکٹھا لیں تو ایک مجتمع شہادت نکل آتی ہے جو دل پر بہت اثر کر سکتی ہے جس کا زور اُس صورت میں بھی کم نہ ہوگا اگر یہ بھی ظاہر کیا جائے کہ ان بیانات میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیونکہ تاریخی جرح (Historic Criticism) کا یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ تفصیل میں گواہوں کے بیانات کا اختلاف ان بڑے واقعات کی شہادت کو باطل نہیں کر دیتا جن کے بیان میں کہ ان کو اتفاق ہے۔ بلکہ ایک خاص حد تک مختلف بیانات میں اختلاف کا ہونا بجائے تردید کے تائید کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ جعلی بیانات تاریخی اعتبار حاصل کرنے کے لئے ذرا ذرا تفصیل میں بھی اتفاق کرنے کی کوشش کرتے ہیں +

اب رہا یہ سوال کہ آیا مسیح کی قیامت کے بیانات میں جو اختلافات ہیں وہ ایسے بے شمار اور بڑے ہیں کہ اس کل تاریخ کو بے اعتبار ٹھہرا سکیں؟ خاص مشکلات مفصل ذیل ہیں:۔ مقدس لوقا اور مقدس یوحنا دو فرشتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مقدس متی اور مقدس مرقس صرف ایک کا۔ پہلی تین انجیلوں میں ذکر ہے کہ عورتوں کو فرشتے دکھائی دیئے۔ مقدس یوحنا کی انجیل میں ذکر ہے کہ صرف مریم مگدلینی کو دکھائی دیئے۔ مقدس لوقا اور مقدس متی کہتے ہیں کہ عورتیں یہ خبر لائیں کہ قبر خالی تھی اور کہ یسوع جی اٹھا تھا۔ لیکن مقدس مرقس لکھتا ہے کہ انہوں نے کسی سے کچھ بیان نہ کیا کیونکہ وہ ہراساں تھیں۔ حالانکہ مقدس یوحنا کہتا ہے کہ خالی قبر کی خبر نہ کہ مسیح

کے جی اُٹھنے کی)۔ صرف مریم مگدلینی لائی۔ اگرچہ یہ اشارہ ہے (یوحنا ۲۰: ۸)۔ کہ دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ علاوہ ازیں مقدس متی اور مرقس نے جو الفاظ فرشتے کے نقل کئے ہیں کہ وہ گلیل میں ظاہر ہوگا وہ متفق ہیں۔ لیکن مقدس لوقا نے وہی الفاظ ایک خاص تبدیلی کے ساتھ دیئے ہیں۔ لفظ گلیل تو بحال رکھا ہے لیکن گلیل کے ظہور کی طرف اشارہ نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ مقدس لوقا کا یہ منشا ہی نہ تھا کہ گلیل کے ظہوروں کا ذکر کرے +

الغرض مقدس نوشتوں کے بیانات میں جو مسیح کے جی اُٹھنے کے بارہ میں ہیں پہلے بڑے اختلاف بتائے جاتے ہیں۔ وہ تقریباً سب یہ بیان کرتے ہیں کہ قیامت کی صبح کو عورتیں گئیں۔ اور اس امر کی یہ تشریح آسانی سے ہو سکتی ہے کہ فرشتے کے ظہور سے وہ ایسی گھبرا گئی تھیں (متی ۲۸: ۸ + مرقس ۱۶: ۸ + لوقا ۲۴: ۵)۔ کہ وہ اپنے تجربہ کا ٹھیک ٹھیک ایک ہی جیسا بیان نہیں دے سکیں (مقابلہ کرو لوقا ۲۴: ۱۱)۔ یہ اعتراض جو اکثر کیا جاتا ہے کہ ظہور کی جگہ کے بارہ میں ایک مصنف دوسرے کے نقیض بیان کرتا ہے۔ بعض تو اس ظہور کو یہودیہ میں بتاتے ہیں۔ اور بعض گلیل میں۔ ہم اس کا صرف یہ جواب دے سکتے ہیں کہ کوئی کافی وجہ بتائی نہیں گئی جس سے یہ ناممکن ہو کہ یہ ظہور دونوں جگہ واقع نہ ہوئے ہوں۔ بائیبل کے مصنف ان میں کوئی غیر مطابقت نہیں دیکھتے۔ ان میں سے ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ سارے ظہور ایک ہی علاقہ میں ہوئے۔ مقدس متی نے ایک ظہور کا ذکر یروشلم میں کیا اور ایک ظہور کا ذکر گلیل میں۔ حالانکہ مقدس یوحنا نے تین ظہوروں کا ذکر یروشلم میں کیا اور ایک کا گلیل میں۔ مقدس پولس نے ان ظہوروں کی کوئی جگہ نہیں بتائی +

پس یہ اختلافات ایسے خفیف ہیں جن سے کل بیان پر بحیثیت مجموعی شک نہیں پڑ سکتا آجکل کے بہت معقول پسند (Rationalists) علماء کی یہی رائے ہے

مثلاً ایف۔ سی۔ بور (F. C. Baur) نے یہ لکھا ہے" شاگردوں کے لئے یہ قیامت
ایسی ہی حقیقی تھی جیسے کہ کوئی تاریخی واقعہ ہوتا ہے۔ اس یقین کا باعث خواہ کچھ ہی
کیوں نہ ہو"۔ مسٹر مکن (Macan) یہ تحریر کرتے ہیں "ہم دو وسیع امور
واقعی کو تحقیق سمجھیں کہ پولس کو اور دوسرے رسولوں کو خاص رویتیں ملیں اور
ان رویتوں کی وجہ سے انہوں نے یقین کر لیا کہ یسوع مُردوں میں سے جی
اٹھا ہے۔

۵۔ امورِ واقعی کی تشریح۔ جن واقعات کا ابھی ذکر ہو چکا ہے ان کی
تشریح کے لئے کئی کوششیں کی گئی ہیں۔ ان میں ایک نے بھی یہ نہیں مانا کہ یہ معجزہ وقوع
میں آیا۔ ان میں سے خاص یہ ہیں:۔

(۱) کہ اس میں فریب ہے۔ یہ سب سے پرانا اعتراض ہے۔ مسیح کے جی اٹھنے
کے تھوڑی دیر بعد ہی یہودیوں نے یہ مشہور کیا کہ شاگرد مسیح کے بدن کو چرا
لے گئے۔ اور یہ مشہور کیا کہ وہ جی اٹھا ہے۔ (متی ۲۸: ۱۳ سے ۱۵)۔ جسٹن
شہید۔ ترتلیاں اور اوریگن نے اس الزام کا ذکر کیا ہے۔ اور پیلاطوس کے غیر قوم
اعمال کی کتاب میں اور وسطی زمانہ کی یہودی کتاب تولیدات یشوع میں اس کا
ذکر ہے۔ اور بعض جرمن علما نے (Reimarus ۱۶۹۴ سے ۱۷۶۸ء)
اس کی حمایت کی۔ ہمارے زمانہ میں معقول پسند (Rationalists)
بھی اس رائے کو رد کرتے ہیں اور اسے نفرتی اور بیہودہ سمجھتے ہیں (Keim)
سب لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسیحی دین جیسی پاک صاف اخلاقی تحریک اس
دانستہ فریب سے پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۲) بدن کے طبعی طور سے غائب ہونے کی رائے۔ کسی نامعلوم
شخص یا اشخاص نے لاش کو نکال لیا۔ (مالی نے یا کسی نامعلوم گلیلی شاگرد نے۔

(حرم مگر یہ نے۔ صدر مجلس نے۔ یا پیلاطوس نے یا کسی اور نے)۔ لیکن یہ نامعلوم
اشخاص یا تو لاش کو پیدا کر دیتے یا کم سے کم یہ بیان کر دیتے کہ ہم لاش کو نکال لے
گئے تھے جب کہ رسولوں نے یہ منادی کرنی شروع کی کہ مسیح قبر میں سے جی اٹھا ہے۔

(۳) ظاہراً موت کی رائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یسوع صلیب پر
مر نہیں گیا تھا بلکہ اُسے غش آ گیا تھا۔ اور دفن ہونے کے بعد وہ ہوش میں آ گیا
اور قبر میں سے نکل آیا۔ اس کی وجہ سے یہ شہرت ہو گئی کہ وہ مُردوں میں سے
جی اٹھا ہے۔ ایک وقت تو معقول پسند علما میں یہ رائے بہت عام تھی۔ لیکن
اب تقریباً متروک ہے۔ شٹراؤس صاحب (Strauss ۱۸۶۴ء) میں یہ
کہتے ہیں "ایک انسان نیم مردہ ضعف اور تکان کا مارا اگر قبر سے گھسٹ کر نکلے
جس کے ایسے زخم لگے ہوں جن کے لئے طبی علاج کی سخت ضرورت ہو کیا وہ ایسی
حالت میں اپنے شاگردوں کے دل پر یہ نقش کر سکتا تھا کہ اس نے موت اور قبر پر
فتح حاصل کی۔ کہ وہ زندگی کا شاہزادہ تھا۔ ایسا نقش جس کی وجہ سے اس کے
شاگردوں نے پیچھے ایسے ایسے بڑے کام کئے اور اپنی جانوں کو جوکھوں میں
ڈال دیا۔

۴۔ خیالی رویت کی رائے۔ آج کل معقول پسند علما کی یہ مسلمہ رائے
ہے۔ پہلے پہل تقریباً موجودہ صورت میں سلسس (Celsus) نے ۱۷۰ء
میں یہ رائے ظاہر کی تھی۔ اُس نے یہ کہا تھا "جی اٹھے مسیح کو کس نے دیکھا۔ بقول
تمہارے نیم پاگل عورتوں نے۔ اور شاید کسی ایسے دوسرے شخص نے جو اسی قسم کے
دھوکے کے نظام میں تربیت پا چکا تھا۔ اُس نے یا تو یہ خواب دیکھا۔ کیونکہ اس کی دلی
حالت ایسی ہی تھی۔ یا پریشان قوت متخیلہ کی تاثیر سے اپنی ہی منشا کے مطابق اپنے
وہم میں ایک ایسی صورت دیکھ لی جیسا کہ اکثروں پر وارد ہو چکا ہے" (دیکھو

اوریگن۔ بخلاف سلسس جلد ۲ فصل ۵۵)۔ زمانہ حال کے علما جو اس رائے کے حامی
ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ان ظہوروں کی تشریح سائیکولوجی (Psychology)
کے معمولی قوانین سے نہیں کر سکتے جب تک کہ فوق العادت علت کو داخل نہ کریں۔
اس قسم کے پریشان خیال اور طرح طرح کی اشکال کا دیکھنا ایسے لوگوں کی حالت
میں ہوا کرتا ہے (۱) جو خاص جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ (۲) جو دیوانے ہوتے
ہیں (۳) یا ایسے شخصوں کو جو گو دیوانہ نہیں ہوتے لیکن جن کے رگوں پٹھوں میں
کچھ فتور آ گیا ہے۔ (۴) ایسے تندرست لوگوں کو جو پہلے سے کچھ خیال باندھے
بیٹھے ہوتے ہیں۔ (۵) بعض اچھے مصنفوں نے بھی اسے مانا ہے لیکن عموماً یہ
تسلیم نہیں کیا جاتا کہ ایک دل اندرونی طور پر بلا کسی بیرونی وسیلے کے دوسرے
دل پر اثر کرتا ہے۔ بقول شخصے۔ دل را بدل رہیست۔ یہ خاص طبیعت و مزاج
کے لوگ ہوتے ہیں اور اس قسم کی رویت دیکھا کرتے ہیں +

انصافاً یہ کہہ نہیں سکتے کہ جی اُٹھے مسیح کے ظہوروں کو ان اصولوں کے مطابق
بیان کر سکیں۔ کیونکہ ۱ کے لحاظ سے جنہوں نے مسیح کو جی اُٹھے دیکھا اُن میں سے
کوئی بھی بیمار نہ تھا۔ بلحاظ ۲ کے اُن میں سے کوئی بھی دیوانہ نہ تھا۔ بلحاظ ۳
کے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مریم مگدلینی اور مقدس پولس کسی خاص پٹھوں کی
بیماری میں مبتلا تھے۔ یہ بارہ۔ یا یعقوب یا پانچ سو بھائیوں کی نسبت نہیں کہہ
سکتے۔ ۴ کے لحاظ سے یہ تو تحقیق ثابت ہے کہ شاگردوں کو پہلے سے یہ خیال نہ تھا
اور نہ اس دُھن میں تھے کہ مسیح جی اُٹھے گا۔ یسوع کی ذلت کی موت نے ان شاگردوں
کو منتشر کر دیا تھا اور وہ سخت مایوسی میں پڑے تھے۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے
کہ کسی شخص نے اپنے سردار پر اعتماد کلی کیا ہو اور جواب تعجب کرنے لگا ہو کہ کیا
میں نے اُس پر اعتماد کرنے میں کچھ غلطی تو نہیں کی۔ چاروں اناجیل سے بخوبی واضح

ہے کہ جب کبھی ہمارے خداوند نے اپنے جی اُٹھنے کی پیشین گوئی کی تو شاگردوں
نے اُس پر کان ہی نہیں دھرا (متی ۱۶: ۲۲ + مرقس ۹: ۱۰ + یوحنا ۲۰: ۹ وغیرہ)
اور اُن میں شاگردوں کی مایوسی کا خاص بیان ہوا ہے۔ (متی ۲۶: ۵۶ + مرقس
۱۶: ۱۰)۔ اور وہ اس خوشخبری کے ماننے کو راضی نہ تھے (متی ۲۸: ۱۷ + مرقس
۱۶: ۱۱ و ۱۳ و ۱۴ + لوقا ۲۴: ۱۱ و ۲۵ و ۳۷ و ۳۸ + یوحنا ۲۰: ۲۵)۔

۵ کے لحاظ سے۔ اگر اس قسم کی اشکال اور رویات کا دیکھنا ایک دل سے
دوسرے دل تک (Telepathically) جا سکتا ہے (اور
اس میں شک ہے)۔ تو یہ ایسے اشخاص پر ہی وارد ہوگا جن کی دلی حالت شاذ و
نادر کیفیت کی ہو۔ یہ ماننا کہ بارھوں اور پانچ سو کی دلی حالت ایسی شاذ و نادر
کیفیت اور قسم کی تھی کہ مریم مگدلینی کی رویتیں اُن کے دلوں میں پہنچ گئیں اعتبار
کے قابل نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں۔ حال کی تحقیقات نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ جہاں
کہیں یہ اشکال رویت کے طور پر نظر آتی ہیں تو وہ اکثر گویا نہیں ہوتیں اور جب
کبھی گویا ہوتی بھی ہیں تو ایک یا دو لفظ سے زیادہ نہیں بولتیں۔ لیکن جی
اُٹھے مسیح نے اپنے ہر ظہور کے وقت کلام کیا اور شاگردوں کے ساتھ لمبی چوڑی
تقریریں کیں۔ خالی قبر کے معنی کے بارہ میں۔ چھونے اور کھانے کے موقعہ پر یہ
سارے موقعے اس رائے کے نقیض ہیں اور اس کی نسبت اگلی فصل میں بھی
کچھ کہا جائے گا +

(۵) روحانی قیامت۔ یا صوری رویت کی رائے۔ جو لوگ کہ قدیم
مسیحی رائے بدنی قیامت کے بارہ میں نہیں مانتے اور اس میں اور بالکل نفی
کے درمیان کوئی وسطی رائے کی تلاش کرتے ہیں وہ صوری رویت کی رائے
مانتے ہیں۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ یسوع مارا گیا پر اُس کا بدن جی نہیں اٹھا۔ البتہ

خدا نے اجازت دی کہ اس کی جلال یافتہ اور غیر فانی روح شاگردوں پر ظاہر ہو۔ اس بات کے ثبوت ہیں کہ یسوع کی تعلیم پر خدا نے تصدیق کی مُہر لگا دی اور خاص اس امر کے ثبوت ہیں کہ انسانی روح کا غیر فانی ہونا ایک امر واقعی ہے اس رائے کو اکثر "روحانی قیامت" کے نام سے نامزد کرتے ہیں اور یہ عملی طور پر وہی رائے ہے جسے عموماً صحیح (orthodox) رائے کہتے ہیں اس لئے اس سے زیادہ ہمدردانہ اور مودبانہ سلوک درکار ہے۔ اس پر ہمارا اعتراض یہ ہے۔ کہ اس کے ذریعہ اُن مشکلات میں سے کوئی بھی رفع نہیں ہوتی جو قدیم رائے کی نسبت بتائی جاتی ہیں بلکہ نئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں ہمارے خداوند کے جی اٹھنے کو جو لوگ نہیں مانتے وہ اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ایک طرح کا معجزہ ہے اور وہ کسی معجزے کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اب اس صوری رویت کے ماننے والے اس اعجاز کو یوں نکالنا چاہتے ہیں کہ مسیح کی بدنی قیامت کا انکار کریں اور اس کی روحانی قیامت کو وہ مان لیتے ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے بھی یسوع کی قیامت معجزہ ہی رہتی ہے۔ ترتیب فطرت میں یہ اسی قدر خلل اندازی ہے اور اس لئے ویسا ہی معجزہ ہے کہ بدن سے خارج شدہ روح پھر واپس آئے اور زندہ اشخاص سے بات چیت کرے۔ یا یہ کہ خدا آسمان سے کوئی تار برقی بھیجے (Heaven)۔ جیسے کہ لاش کا جی اٹھنا۔ یہ غلط خیال ہے کہ معجزوں پر فلاسفرانہ اعتراضات کلیہ طور پر یا خاص طور پر صرف طبعی معجزوں پر ہی عاید ہوتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے معجزوں پر یکساں وارد ہوتے ہیں۔ لاکلام مادہ کی نسبت اُن کے طبعی امکان کی حدود کا ٹھہرانا زیادہ مشکل ہے۔ لیکن جب وہ حدود ہماری عقل کی رسائی سے پرے ہیں مثلاً یہ مان لینا کہ روح واپس آتی ہے یا کہ آسمان سے کوئی تار برقی آتی ہے تو فلسفہ کے اعتراض روحانی

معجزے کے بارہ میں ویسے ہی پر زور ہیں جیسے کہ طبعی معجزوں کے بارہ میں تھے اس لئے یہ شخص مردہ دل یا نیم خاطر رشنلزم (Rationalism) جو روحانی قیامت کو تو مان لیتا ہے۔ لیکن بدنی قیامت کا منکر ہے وہ معجزے کی ٹھوکر کو ویسا ہی دور نہیں کر سکتا جیسے کہ صحیح تعلیم (orthodoxy) دور نہیں کر سکتی بلکہ اُسے یہ ایک وقت اور پیش آتی ہے کہ اس شہادت کو محض من گھڑت طور سے تفسیر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اس کے نہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے جسے کہ شنکل (Schenkel) صاحب بھی صحیح مانتا تھا کہ قبر تیسرے دن خالی پائی گئی اور جی اٹھے مسیح نے اپنے شاگردوں کو اس امر کا قائل کرنے کے لئے کہ وہ محض صوری یا مثل بھوت نہ تھا اپنے تئیں چھونے دیا اور اُن کے سامنے کھایا +

(۶) بدنی قیامت کی رائے

بحیثیت مجموعی کوئی رائے ان امور واقعی کو حل نہیں کر سکتی سوائے اس قدیم رائے کے کہ مسیح بدن کے ساتھ جی اٹھا۔ تیسرے دن کی صبح کو قبر خالی تھی۔ یہ امر واقعی باوجود ان لوگوں کے انکار کے جو روحانی قیامت کے حامی ہیں قایم رہتا ہے۔ اس کی تصدیق نہ صرف تو اُنہی کی جن کو اس خبر کے پانے کے عمدہ وسائل حاصل تھے۔ بلکہ مرقس نے بھی تصدیق کی (یا یہ کہو کہ پطرس نے)، متی، یوحنا اور یہودیوں نے (متی ۲۸: ۱۳)۔ اور ظاہرا مقدس پولس نے بھی کیونکہ اس امر سے یہی قدرتی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اُس نے جی اٹھنے کے ساتھ دفن ہونے کا بھی ذکر کیا (اکرنتھی ۱۵: ۴)۔ ایسے امر واقعی کا انکار کرنا جس کی اس قدر تصدیق ہو عقلمندی کا میں داخل نہیں پھر قبر خالی تھی۔ اور چونکہ لاش کا شاگردوں یا یہودیوں کے ذریعہ نکال لیجانا قطعاً ناقابل اعتبار ثابت ہو چکا ہے اس لئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ یسوع کا بدن نئی زندگی کے ساتھ جی اٹھا۔ دیگر شہادت بھی اسی کی تائید کر رہی ہے پس جی اٹھے مسیح نے شاگردوں کے اس خیال کو جو وہ پہلے رکھتے تھے دور کر دیا تاکہ وہ بلا بدن

رُوح ہے اور اس لئے اُس نے پیش کیا کہ اُس کو چھوئیں اور اپنے ہاتھوں۔ پاؤں اور پسلی کے زخم دکھلائے (لوقا ۲۴: ۳۷ + یوحنا ۲۰: ۲۰)۔ شاگردوں کے سامنے اور ان کے ساتھ کھانے کے ذریعہ (لوقا ۲۴: ۴۳ + اعمال ۱۰: ۴۱ + بمقابلہ اعمال ۱: ۴ + مرقس ۱۶: ۱۴) + یہ کہنا تو اس کا کافی جواب نہیں کہ جی اُٹھا مسیح ٹھوس مادہ میں سے گزر سکتا تھا (یوحنا ۲۰: ۱۹ و ۲۶)۔ اچانک غائب اور حاضر ہو سکتا تھا (لوقا ۲۴: ۳۱ و ۳۶)۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آناً فاناً انتقال کر سکتا تھا (لوقا ۲۴: ۳۱ سے ۳۶) اس لئے ضرور وہ صوری شکل یا رُوح ہوگی۔ اگر ہم عام معمولی رائے کو اختیار کریں کہ مسیح کی قیامت کے وقت اس کا بدن بدل گیا تھا اور ذوالجلال اور روحانی ہو گیا تھا وہ مادہ کسی معمولی شرائط اور قوانین سے محدود نہ تھا تو کچھ نقص پیدا نہیں ہوتا۔ ہم یہ مانیں گے کہ خداوند کا جی اُٹھا بدن آسمانی طبقہ سے علاقہ رکھتا تھا نہ کہ زمینی طبقے سے اور یہ محض اُس کی فروتنی تھی کہ شاگردوں کے ایمان کو مضبوط کرنے کے لئے وہ ان خاکی آنکھوں کو دکھائی دیا اور انسانی ہاتھوں نے اُسے چھوا اور زمینی خوراک کے کھانے کے قابل تھا اُس کا جی اُٹھا بدن بیوہ کے بیٹے یا لعزر کے بدن کی طرح نہ تھا بلکہ جلالی مقدسوں کے بدن کی طرح (۱-کرنتھی ۱۵: ۳۵) +

۱۶۔ قیامت کے مستقل معنی

بہت باتوں کے لحاظ سے مسیح کی قیامت انسانی تاریخ میں نہایت ہی اہم واقعہ تھا۔ اور اس کے مختلف معنی اور فوائد ظاہر کرنے کے لئے ایک ہزار رسالہ بھی کافی نہ ہوگا۔ اس لئے جہاں تک اس کا تعلق انسانی زندگی اور خیال کے ساتھ ہے اُس کا بہت مختصر خاکہ یہاں دیا جاتا ہے +

(۱) مسیح کی قیامت نے جو روشنی انسانی بقا پر ڈالی ہے اُس کے ذریعہ جہان میں ایک نئی امید اور خوشحالی پھونک دی ہے (۱-پطرس ۱: ۳ و ۴)۔ معقول پسند (Rationalist) بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً جان سٹوارٹ مل صاحب فرماتے ہیں کہ "ایسی امید انسانی

بقا کی کا مفید اثر ہرگز خفیف نہیں ہو سکتا۔ اس کے ذریعہ زندگی اور انسانی ذات کو زیادہ عظمت حاصل ہوتی ہے اور جو خیالات ہمارے ہم جنسوں کے ذریعہ اور عام نوع انسان کے ذریعہ ہم میں پیدا ہوتے ہیں ان کو زیادہ پختگی اور سنجیدگی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ فطرت کی نسبت وہ حیرت انگیز معاملہ حل ہو جاتا ہے کہ جب کسی نے بہت جانفشانیوں اور محنتوں کے بعد تجربہ اور دانائی حاصل کی اور جب اس کا وقت آیا کہ دنیا کو اپنے عقل و تجربہ سے فائدہ پہنچائے وہ یک لخت کیوں گم ہو جاتا ہے اور اس سے اکثر کیسی تکلیف اور رنج حاصل ہوتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ زندگی کوتاہ ہے اور فن طول ہے اور قدیم زمانہ سے اس قید سے بہت مایوسی چلی آتی ہے۔ بقا کی یہ امید اس امکان کو مانتی ہے کہ جس فن کے ذریعہ کوئی رُوح زیور حسن و خوبی سے آراستہ ہوئی وہ کسی دوسری زندگی میں کام آئے اگرچہ اس زندگی میں وہ بے سود اور رائیگاں معلوم ہو"

(۲) قیامت کے ذریعہ خدا کی عدالت اور مہربانی کو ظاہر کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اگر صرف یہی زندگی ہے اور بس تو خدا کو کامل طور سے عادل اور مہربان نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ وہ اکثر راستباز کو مصیبت میں پڑنے دیتا ہے بلکہ ناراستی سے قتل کئے جانے دیتا ہے جب کہ شریروں کو کوئی سزا نہیں ملتی اور وہ دنیا میں پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ قیامت ظاہر کرتی ہے قبر سے پرے کوئی زندگی ہے جس میں کہ ساری ناراستیوں کی تلافی ہو جائے گی اور ہر شرارت کو کافی سزا مل جائے گی تو بخوبی ثابت ہو جائے گا کہ خدا نیک ہے اور اس کی سیرت اخلاقی ہے +

(۳) قیامت یہ ظاہر کرتی ہے کہ حیات آئندہ نہ صرف رُوح کی ہوگی بلکہ ایسی رُوح کی جس کو مناسب بدن عطا ہوگا۔ مسیحی لوگ مانتے ہیں کہ وہ مادہ کی اپنی ذاتی خوبی ہے صدہا سال کی نشو و نما کے بعد اب وہ اپنے کمال کو پہنچا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ ایک خاص حالت خالق کی طرف ساری خلقت حرکت کر رہی ہے تو بظن غالب ہے کہ نہ

صرف رُوح بلکہ مادہ بھی آخر کار کامل اور ذوالجلال ہو جائے گا (دیکھو رومی ۸: ۱۸ سے ۲۵
۲ پطرس ۳: ۱۳ + مکاشفہ ۲۱: ۱)۔ اور کہ حیات آیندہ میں ہمیں کسی طرح کا مادی بدن یا لباس
ملے گا۔ اگر اس زندگی کے بعد ہم کو بدن عطا نہ ہو تو یہ سمجھنا مشکل ہو گا کہ ہم ایک دوسرے کو
بھی کس طرح پہچانیں گے۔ اور اگر وہاں خوبصورت اشیا نہ ہوں تو یہ سمجھنا مشکل ہو گا کہ ہم
کس طرح بقول افلاطوں کامل خوبصورتی کا دھیان کر سکیں گے ٭

(۴) مسیح کی قیامت یسوع کی تعلیم پر الٰہی پسندیدگی کی مُہر ثبت کر دیتی ہے۔
خاص کر اس امر پر کہ

(۵) کہ یسوع خدا کا الٰہی بیٹا ہے۔

ان پچھلی دو باتوں کے بارہ میں دیکھو فصل "یسوع مسیح کی ذات"۔

کفارہ

کفارہ کے لئے جو انگریزی لفظ مستعمل ہے وہ اٹون منٹ (Atonement)
ہے جس کے معنے "ایک ہو جانا" یا ملاپ کر لینا ہے ٭

نئے عہدنامہ میں یہ لفظ صرف رومی ۵: ۱۱ میں انگریزی بائیبل میں تھا لیکن
نئے ترجمہ میں وہاں سے بھی غائب ہو گیا۔ اب اس کی جگہ لفظ "میل" یا
(Reconciliation) آیا ہے۔ مقابلہ کرو رومی ۵: ۱۰+۱۱: ۱۵ +
۲ کرنتھی ۵: ۱۸ وغیرہ۔ ان مقامات میں یونانی لفظ وہی ہے جو رومی ۵: ۱۱ میں ہے ٭

یہ لفظ کفارہ (Atonement) عہدِ عتیق سے لیا گیا ہے جہاں یہ لفظ
تقریباً پچاس دفعہ آیا ہے اس فعل کے ساتھ جس کے معنی "ڈھانپنا" ہے۔ مثلاً خروج ۳۰: ۱۵
میں ہے "اپنی جانوں کا فدیہ (دینا نے) ہیں"۔ احبار ۹: ۷ میں ہے "اپنے لئے اور قوم
کے لئے کفارہ دے" (بنا)۔ یہاں کفارہ اُس عبرانی لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہے جس کے معنی
ہیں "ڈھانپنا"۔ اور یہودیوں کی قربانیوں کا "ڈھانپنا" بیان ہوا ہے۔ یعنی گناہ کا
اور ناپاکی کا دور کرنا۔ اور یوں خدا اور انسان کے درمیان شراکت کو بحال کرنا۔ پس
جب مسیح کی موت کے لئے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے تو اس لفظ سے یہ مراد ہوگی کہ مسیح کی
موت قربانی کی موت تھی اور اس کا اثر یہ ہے کہ گناہ کے ذریعہ خدا اور انسان کے درمیان
جو جدائی ہو گئی ہے اس کو دور کر دے ٭

اگرچہ لفظ اٹون منٹ (کفارہ) نئے عہدنامہ میں پایا نہیں جاتا (R.V) لیکن
یہ خیال ساری کتاب میں مفہوم ہے۔ مثلاً مرقس ۱۰: ۴۵ میں مسیح نے کہا "وہ اپنی جان بہتیروں
کے بدلے فدیہ میں دے"۔ اور مرقس ۱۴: ۲۴ میں مسیح نے فرمایا "یہ عہد کا میرا وہ خون ہے جو
بہتیروں کے لئے بہایا جاتا ہے"۔ یوحنا ۱: ۲۹ میں یوحنا بپتسمہ دینے والے نے یہ اشتہار دیا "دیکھو

یہ خدا کا برہ ہے جو دنیا کا گناہ اٹھا لے جاتا ہے" رومیوں ۵: ۱۰ میں مقدس پولس
نے لکھا کہ "جب باوجود دشمنی ہونے کے خدا سے اُس کے بیٹے کی موت کے وسیلے
سے ہمارا میل ہو گیا" اور ۱ پطرس ۱: ۱۹ میں لکھا ہے "ایک بے عیب اور بے داغ
برے یعنی مسیح کے بیش قیمت خون سے" مقابلہ کرو یوحنا ۳: ۱۴ + ۶: ۵۱ + ۱۰: ۱۱ و
۱۵ + ۱۲: ۲۴ + ۱۵: ۱۳ + رومیوں ۳: ۲۴ + ۴: ۲۵ + ۸: ۳ و ۳۲ و ۳۴ + ۱ کرنتھی
۱: ۳۰ + ۶: ۲۰ + ۷: ۲۳ + ۱۵: ۳ + ۲ کرنتھی ۵: ۱۸ + گلتیوں ۱: ۴ + افسیوں ۵: ۲ + ۱
تیمتھیس ۲: ۶ + طیطس ۲: ۱۴ + عبرانی ۷: ۲۷ + ۹: ۱۱ و ۲۶ + ۱۰: ۱۰ + ۱۲: ۲۴ + ۱۳: ۱۲ + ۱
پطرس ۱: ۲ + ۲: ۲۴ + ۳: ۱۸ + ۱ یوحنا ۱: ۷ + ۲: ۲ + ۳: ۵ و ۱۶ + ۴: ۱۰ + مکاشفہ
۱: ۵ + ۵: ۶ و ۹ + ۷: ۱۴ + ۱۳: ۸ ٭

ان مقامات میں اس مضمون کے متعلق جو تعلیم نئے عہد نامہ کی ہے وہ صاف
طور سے بیان ہوئی ہے۔ اس کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں۔ مسیح ہمارے لئے
موا۔ وہ فدیہ ہوا اور اُس نے ہمیں مخلصی دلائی۔ وہ ہمارے گناہوں کے لئے
بدلہ ہوا۔ وہ ہمارے لئے لعنت بن گیا اور ہماری خاطر گناہ بن گیا۔ اس کی موت
کے وسیلے۔ اس کے خون کے بہائے جانے کے وسیلے۔ اس کی صلیب کے وسیلے معافی
پاکیزگی۔ گناہوں سے علیحدگی اور ابدی زندگی ملتی ہے ٭

اگرچہ نئے عہد نامہ میں اس کی موت اور ہماری نجات کے درمیان جو تعلق
ہے وہ ایسی صفائی سے بیان ہوا ہے تو بھی جب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کس طریقے سے
مسیح کی موت کے ذریعہ ہمیں معافی ملتی ہے تو کتاب مقدس سے ٹھیک جواب نہیں
ملتا۔ لیکن بلا اس جواب کے انسان کے دل کی تشفی ناممکن ہے۔ اس کے دل کو
مسیح کی صلیب میں خدا کے ساتھ اطمینان اور آرام حاصل ہو تو ہو لیکن اس کی عقل یہ
کہتی ہے کہ صلیب کے راز کو سمجھے۔ اس عقلی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے چند

کوششیں کی گئی ہیں ٭

ابتدائی مسیحیوں نے یہ خیال کیا کہ مسیح کی موت کے ذریعہ زر فدیہ شیطان کو ادا
کیا گیا تا کہ اس کی غلامی سے نوع انسان کو مخلصی ملے۔ بعد ازاں یہ تعلیم دی گئی کہ
مسیح نے اپنی بے گناہ زندگی اُس قرضہ کے عوض میں دی جو انسان خدا کا دھرتا
تھا۔ کیونکہ خدا کی اطاعت اور عزت کا جو حق انسان پر تھا وہ انسان نے ادا نہ کیا تھا
پھر یہ رائے ہوئی کہ خدا نے اپنے عدل کو اس طرح پورا کیا کہ نوع انسان جس سزا
کی مستحق تھی وہ مسیح کو دی گئی۔ یا یہ کہ مسیح نے خدا کا عدل ظاہر کرنے کے لئے دُکھ
اٹھایا تا کہ ہمارے عوض سزا اٹھانے کے ذریعہ ہم گناہ کی شرارت کو سمجھ سکیں ٭

ان رائیوں کی تائید آجکل خواہ کسی قدر کیوں نہ ہو۔ آجکل کے دیندار دل
کے سامنے ایسی مشکلات پیش آتی ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی اور رائے تشفی
خاطر کے لئے درکار ہے۔ ہم نہ تو یہ خیال کر سکتے ہیں کہ خدا بے گناہ کو سزا دے گا یا یہ کہ
بے گناہ کو سزا دینے کے ذریعہ مجرم کو از روئے عدل چھوڑ سکتا ہے۔ ہم یہ بھی
خیال نہیں کر سکتے کہ ہمارا رشتہ خدا سے کوئی ظاہری یا جبلی ہے۔ یہ ناتسلی بخش
آراء اسی طرح سے پیدا ہوئیں کہ جو اشارے تشبیہیں یا تفصیلیں کتاب مقدس
میں استعمال ہوئیں ان پر حد سے زیادہ زور دیا گیا یا ان کو لفظی طور سے لیا۔
حالانکہ ان کو وسیع معنی میں لینا چاہئے تھا۔ "فدیہ" اور "مخلصی" کی تشبیہ سے مراد
یہ ہے کہ مسیح کی قربانی کی عظمت ظاہر ہو۔ اور اُس کا مقصد اور نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں
گناہ اور اُس کے نتائج سے چھڑائے "بدلہ" یا "میل" یا "راستباز ٹھہرنے"
سے یہ مراد ہے۔ نہ کہ خدا کے منانے کی ضرورت ہے بلکہ یہ کہ مسیح کے کام کا اثر جب
گنہگار انسان کے دل میں آجائے تو اس کے وسیلے سے تو وہ حد فاصل اُٹھ جاتی ہے
جو گناہ کے ذریعہ انسان اور خدا کے درمیان حائل تھی۔ اور توبہ اور اطاعت کے ساتھ

انسان خدا کی طرف واپس آتا ہے۔ مسیح اپنی قربانی میں باپ کے ساتھ متفق الرائے تھا۔ خدا کو دنیا سے
دشمنی نہ تھی بلکہ اُس نے دُنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا"۔

تعزیری آراء کے خلاف بعضوں نے یہ گمان کیا کہ مسیح کی موت ہماری
نجات کا وسیلہ محض اس لئے ہو گئی کہ اس کے ذریعہ ہمیں خدا کی محبت کا ایسا مکاشفہ
ملا جو دلوں کو گرویدہ کرے اور محبت اور شکر گزاری کے ساتھ خدا کے سپرد ہم اپنے
تئیں کریں۔ اس رائے میں کسی قدر صداقت تو ہے لیکن اس میں اس امر کا کافی
بیان نہیں کہ مسیح کی موت ہمارے گناہوں کے لئے بطور قربانی کے خدا کے سامنے
چڑھائی گئی تاکہ خدا کی راستبازی کو ظاہر کرے۔

کفارہ کے معنی امور واقعی میں ڈھونڈھنے چاہئے۔ سب سے بڑا امر واقعہ
مسیح کی موت تھی۔ خود مسیح نے اور اُس کے رسولوں نے اُس کی موت ہی پر بڑا
زور دیا۔ یہ نہیں کہا کہ اُس نے گناہوں کی معافی کے لئے زندگی بسر کی۔ بلکہ یہ
کہ اس کا خون اس مقصد کے لئے بہایا گیا۔

اب تاریخی طور پر مسیح کی موت ایک طبعی واقعہ تھا۔ اُس کی موت کا طریقہ
اور جو زندگی اُس نے بسر کی تھی اس کا طبعی نتیجہ تھا۔ اُس کی زندگی کا بڑا خاصہ یہ
تھا کہ اُس نے دانستہ اور متواتر ہر بات میں اپنے باپ کی مرضی کی تابعداری کی
جس انسانی سوسائٹی میں وہ رہا۔ جس انسانی تمدنی انتظام سے وہ گھرا تھا
اُس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی مرضی کو اُس سوسائٹی اور انتظام ملکی کی مرضی اور خواہشات
کے مطابق بنائے۔ اور وہ مرضی اور خواہشات خود غرضی اور خود مطلبی کی تھیں
علاوہ ازیں چونکہ وہ ہماری انسانی ذات میں شریک ہوا اس میں انسان کے
طبعی احساس تھے جو دکھ اور قربانی سے جھجکتے اور حظ نفس چاہتے ہیں جیسا بیان
ہوا۔ اس کے پاس نافرمانی کی وہ ساری کل د machinery موجود

تھی لیکن انسانی سوسائٹی کی مرضی اور انسانی ذات کی آزمائشوں نے اُس پر
بے فائدہ زور مارا۔ اُس کی زندگی سراسر خدا کی مرضی کا کامل اظہار اور اس کے عین
مطابق تھی۔

طبعاً ایسی زندگی کا نتیجہ صلیب تھا۔ انسان کے گناہ آلودہ جذبات
جو مسیح کو اپنی سطح تک کھینچ کر نہ لا سکے وہ دشمنی سے اس کے خلاف مشتعل ہو گئے
اور اس کو مروا ڈالا۔ پس انسانوں کے لحاظ سے تو صلیب ارتکاب قتل تھا۔
لیکن مسیح کے لحاظ سے صلیبی موت اُس راستبازانہ زندگی کا معراج تھا اور خدا
کی مرضی کی اطاعت کا خوشی سے قبول کر لینا۔ یہ گناہ کی طرف سے موت یا گناہ
کا انکار تھا جو آخری وقت تک کیا گیا اور فتح حاصل کی۔

اگر اس طریقہ سے نظر کریں تو مسیح کی موت راستبازی کا کامل اظہار اور
الٰہی مرضی کے ساتھ اتحاد کی کامل تکمیل تھی اور انسانی گناہ پر مطلق فتوے جرم۔

لیکن مسیح کی زندگی اور موت ایک فرد انسان کی زندگی اور موت سے
بڑھ کر تھی۔ وہ بہتوں میں ایک فرد نہ تھا۔ بلکہ سارے انسانوں میں انسان
ابن آدم۔ آدم ثانی۔ انسانی نسل کا کامل نمایندہ۔ وہ ساری باتوں میں اپنے
بھائیوں کی مانند بن گیا تاکہ وہ انسان کے سامنے اور خدا کے سامنے ظاہر
کر سکے کہ انسان کے خیالات خواہشات اور اعمال کیسے ہونے چاہئے۔ اس کی
زندگی خدا کے آگے ایک نذر تھی نہ محض اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے۔ جو
اس بات کا اظہار تھی کہ گناہ آلودہ انسانیت خدا کی طرف مڑ گئی ہے۔ انسانی
ذات کے لئے یہ ایک نئی اور اصلاح یافتہ روش تھی۔ مسیح جو سب سے افضل
انسان اور انسانوں کا طبعی پیشوا تھا اس کی زندگی اور موت انسان کی طرف
سے خدا کے آگے سفارش کر رہی تھی۔ اب باقی نوع انسان کا یہ کام رہ گیا کہ

اُس کامل دُعا کے آخر میں جو آمین ہا کہیں ◆

پس یسوع مسیح انسانوں کا بڑا بھائی ہے جس کا اُن کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ ہے کہ بعضوں نے یہ خیال کیا کہ اگر انسان گناہ بھی نہ کرتا تو بھی ابن خدا مجسّم ہوتا۔ لیکن چونکہ نوع انسان نے گناہ کیا تو ابن آدم کو جو انسان سے محبت تھی اور اس کی راستبازی اور پاکیزگی نے اُس میں انسان کے گناہ کے لئے غم پیدا کیا ہوگا۔ گنہگار کا غم اُس کے گناہ کے لئے بشرطیکہ وہ سچا غم ہو پچھتاوا یا توبہ کہلاتا ہے۔ مسیح تو بے گناہ تھا۔ لیکن چونکہ اُس کا رشتہ انسان سے ایسا گہرا تھا اور اس کی محبت انسان کے لئے ایسی بڑی تھی تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ اُس کا غم انسان کے گناہ کے لئے شرم سے پُر ہوگا اور وہ حقیقی پچھتاوا اور توبہ ہوگی جو انسان خود محسوس نہ کرسکا۔ جیسے پرمحبت اور دیندار ماں اپنے بیٹے کے گناہ کے باعث شرم اور توبہ (پچھتاوا) کو محسوس کرتی ہے۔ سو اُس سے کہیں زیادہ اور پرلے درجے تک اُس پرمحبت اور پاک ابن خدا نے نوع انسان کے گناہ کے لئے شرم اور پچھتاوا سہا۔ اُس نے اُن کو "اُٹھایا" جب کہ اُس نے اپنے تئیں ہمارے گناہوں کے ساتھ ایسے طریقے سے ایک بنایا کہ جیسا لکھا ہے۔ وہ گناہ بن گیا (۲ کرنتھی ۵: ۲۱) ۔ اُس کے دل پر ہمارے غموں کا جو بوجھ تھا اُس سے اُس کی وہ حالت نزع سمجھ میں آتی ہے جو گتسمنی باغ میں ہوئی تھی اور اُس کا یہ کلمۂ صلیبی بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" ◆

اس کے مطابق جب صلیب اس کی راہ میں آئی تو اُس نے صلیب کو قبول کیا اور اُس سے گریز نہ کیا۔ اُس نے یہ محض اس لئے قبول نہ کی کہ باپ کی مرضی کے ساتھ اتحاد کامل تھا بلکہ اس لئے بھی کہ اُس موت کی شرم میں اور

خدا کے سامنے اپنے خالی کر دینے میں اُس نے انسان کے گناہ کے لئے انسان کی حقیقی توبہ یا پچھتاوے کو ظاہر کیا ◆

پس صلیب کی موت انسان کی طرف سے دُہری قربانی گزرانی گئی۔ یہ خدا کی مقدس اور راستباز مرضی کے آگے خودی (Self) کی قربانی کا اظہار تھی۔ اور حقیقی توبہ اور راستبازی کی قربانی۔ یہ قربانی چونکہ خود شار محبت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ یہ خدا کے آگے سب سے اعلےٰ اور شریف فعل تھا جو اُس کی نظر سے گزرا۔ یہ خدا کے آگے خوشبو کی مانند خدا کی نذر تھی" (افسیوں ۵: ۲) ◆

لیکن کیسے یہ توبہ اور راستبازی کی قربانی جو مسیح نے چڑھائی۔ خدا کے ساتھ ہمارے رشتہ کو بدل سکتی ہے؟ اس کا جواب کچھ تو اس اتحاد میں ملتا ہے جو مسیح اور نوع انسان کے درمیان ہے۔ جس کے وسیلے سے ساکرمنٹی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ایک سب کے لئے موا" (۲ کرنتھی ۵: ۱۴)۔ لیکن عملی طور پر اور فی الواقع ہر ایک انسان کے لئے جواب اس اتحاد میں ملتا ہے جو ایماندار کا مسیح کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مقدس پولس نے اپنے خطوں میں واضح کیا ہے کہ جو مسیح پر ایمان رکھتا ہے وہ راستباز ٹھہرتا ہے یعنی خدا اس کو قبول کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس کا رُخ راست سمت کی طرف ہے۔ کیونکہ ایمان ایک خیالی مان لینا نہیں۔ بلکہ بھروسے سے بھی کچھ بڑھ کر ہے یہ محبت تعلق مسیح کے ساتھ ہے جس کی تخم بویا گیا ہے جس سے زندگی کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ "وہ اس وجہ سے جو کچھ مسیح ہے اور جو کچھ اُس نے کیا اُس سب کو وہ پیار کرتا ہے" اس مصلوب کو صلیب کی خاطر اور صلیب کو اُس مصلوب کی خاطر پیار کرتا ہے۔ اس لئے ایماندار کی سیرت اُس کے ایمان کے ذریعہ بدل جاتی ہے۔ وہ مسیح کی صلیب کے معنی کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور اپنی صلیب اٹھا کر مسیح کی پیروی کرتا ہے۔ وہ بھی

مسیح کے ساتھ اتحاد کے باعث خدا کی مرضی پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس امر کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے یا آنکھ نکالی جائے۔ وہ بھی جہان کے گناہ کی نسبت مرجاتا ہے۔ اپنے دل، مرضی اور زندگی کے لحاظ سے وہ نہ صرف مسیح کی راستبازی میں شریک ہوتا ہے بلکہ اس کے گناہ کے رد کرنے میں بھی۔ اور اسی پرمحبت ایمان کی طاقت کے وسیلے وہ یہ سب کچھ کرسکتا ہے بلکہ روح القدس کے وسیلے بھی جو اس مصلوب کی روح ہے۔ جو ایمان داروں کو ملتی ہے۔ اور جس کے وسیلے مسیح اس میں پیدا ہوجاتا ہے اور اُسے اُسی کی صورت پر بدلتا جاتا ہے جس پر یہ بات صادق آتی ہے وہ خدا میں مسیح کے ساتھ ایک ہوگیا ہے ۔

الہام

لفظ الہام کے معنی ہیں "دل میں ڈالنا"۔ انگریزی لفظ کے معنی ہیں "کسی کے اندر پھونکنا"۔ حکمت کی کتاب ۱۵: ۱۱ میں اس کے معنی کی توضیح پائی جاتی ہے "چونکہ اسے اپنے بنانے والے کا علم نہ تھا اور نہ اُس کا جس نے اُس کے اندر ایک متحرک نفس ڈالا اور زندہ روح پھونکی"۔ لفظ الہام (Inspiration) دو دفعہ پرانے ترجمہ میں آیا ہے۔ (۱) ایوب ۳۲: ۸ "انسان میں روح ہے۔ قادر مطلق اپنے دم (Inspiration) سے انہیں فہمید بخشتا ہے"۔ (۲) ۲-تیمتھیس ۳: ۱۶ "ہر ایک صحیفہ جو خدا کے الہام (Inspiration) سے ہے ... فائدہ مند بھی ہے"۔ اس دوسرے مقام میں نیا ترجمہ جو یہاں دیا گیا ہے وہ قدیم معنی کے مطابق ہے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ لفظ جو پہلے جسمانی معنی میں استعمال ہوئے تھے وہ کسی روحانی معنی میں مستعمل ہونے لگے۔ مقدس پولس کا جملہ مقدس پطرس کے جملہ سے اتفاق رکھتا ہے جس نے ذکر کیا کہ آدمی روح القدس کی تحریک کے سبب خدا کی طرف سے بولتے تھے" (۲-پطرس ۱: ۲۱) ۔

چونکہ ہر ایمان دار مسیحی روح القدس کی تحریک پاتا ہے جو اُس کے اندر بستا ہے اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر مسیحی ملہم ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ روح القدس ہر مسیحی کو اُسی درجہ تک صداقت کی پہچان دیتا ہے۔ یا یہ کہ صداقت کے مختلف حصوں کی پہچان میں کوئی ترقی پائی نہیں جاتی۔ یا روح القدس ہر شخص کو حکم دیتا ہے کہ اسی ایک درجہ تک اپنے الہام کو ظاہر کرے۔ ایسا ماننے سے بائیبل کے معنے سمجھنے میں بے شمار مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ کیونکہ بائیبل سے تو الہام کے نہ صرف مختلف درجے ظاہر ہوتے ہیں اور ظاہر کرنے کے مختلف طریقے بلکہ الٰہی صداقت کے گرفت کرنے میں فردی

اور عام ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ اس امر کو یاد رکھ کر ہم تلاش کریں کہ بائیبل کے مصنفوں کے الہام سے کیا مراد ہے +

عام طور پر مسیحی شخص الہام کے یہ معنی سمجھتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ایک تحریک ہے جس سے بعض اشخاص لکھنے لگ جاتے ہیں اور ان کو ہدایت ملتی ہے کہ وہ کس طرح سے لکھیں تاکہ دوسروں کی روحانی ترقی ہو۔ اگرچہ اُس کا قریب تعلق مکاشفہ (Revelation) سے ہے تو بھی الہام اور مکاشفہ ایک ہی بات نہیں۔ مکاشفہ کے ذریعہ خدا بعض رُوحوں پر اُن صداقتوں کو جو انہیں پہلے معلوم نہ تھیں ظاہر کر دیتا ہے۔ لیکن یہ ہرگز لازمی امر نہیں کہ ملہم مصنف نئی صداقتوں کو مکاشفہ کے ذریعہ حاصل کرے۔ مثلاً مقدس مرقس کو الہام ملا کہ اپنی انجیل لکھے لیکن اُس کو ایسی صداقتوں کے لکھنے کی تحریک ملی جو اُسے اور دوسروں کو مقدس پطرس کی تعلیم کے ذریعہ پہلے سے معلوم تھیں۔ اگرچہ کلیسیا نے ہمیشہ ان کتابوں کے الہامی ہونے کو مانا جو قانون میں داخل ہیں لیکن اُس نے کبھی نہیں بتایا کہ الہام کا طریقہ کیا تھا۔ یا کیسے رُوح القدس نے مصنف کے طبعی قوائے پر عمل کیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ الہام کے طریقہ کی نسبت رائے کی بہت گنجائش ہے تو بھی چند حدود ہیں جن کا ہم ذکر کریں گے +

الہام کی حقیقت کی تحقیقات اسی طرح سے کرنی چاہئے (۱) خود مقدس نوشتوں کی صحیح تلاوت کے ذریعہ۔ ان کی شہادت کو ان کے آغازانہ تجویز اور سند کے بارہ میں کلیہ طور سے ماننا چاہئے۔ (۲) کلیسیا کے فعل کے ذریعہ مقدس نوشتوں اور ان کے معنی کے متعلق اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ الہام کیا ہے ہم نہ صرف اس امر پر غور کریں کہ کیسے وہ کتابیں لکھی گئی تھیں بلکہ اس پر بھی کہ کلیسیا کی زندگی پر ان کا کیا اثر ہوا اور کلیسیا نے ان کے بارہ میں کیا شہادت دی۔ (۳) مسیحی شخص کو چاہئے کہ الہام کے تابع ہو کر الہام کے معنی دریافت کرے۔ جس آدمی کی اپنی زندگی پر روح القدس کی تاثیر نہیں اُس سے

الہام سمجھنے کی توقع بھی نہیں ہو سکتی۔ جس نسبت سے مسیحی شخص اس الٰہی سوسائٹی کے عضو ہونے کی حیثیت سے عمل کرتا ہے جس نے ان نوشتوں کو پیدا کیا اور ان پر اپنی مُہر لگائی۔ اُسی نسبت سے وہ ان مقدس نوشتوں پر نظر ڈالتا ہے +

مذکورہ بالا اصولوں پر چلنے کے ذریعہ ہم انتہائی آرائے میں مبتلا ہونے سے بچے رہیں گے۔ جو لوگوں نے بائیبل کے الٰہی اور انسانی اجزا کے بارہ میں اختراع کی ہیں۔ انتہائی کہنے سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر رائے جس کو ہم انتہائی کہیں بالضرور غلط ہو گی یا جو رائے متوسط کہلاتی ہے وہ بالضرور صحیح ہو گی۔ ہمیں کسی مسئلہ کو ماننا ہے نہ اس لئے کہ وہ متوسط ہے بلکہ اس لئے کہ وہ راست ہے۔ اور نہایت انتہائی رایوں کو بائیبل کے بارہ میں رد کرنا چاہئے نہ اس لئے کہ وہ انتہائی ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ جھوٹی ہیں۔ وہ یا تو بائیبل کے الٰہی جزپر اتنا زور دیتے ہیں جس سے کہ انسانی جز کو غیر حقیقی ٹھیرائیں یا انسانی جز پر اتنا زور دیں جس سے الٰہی جز کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ یوں اُن کی غلطیاں تقریباً اُسی قسم کی ہیں جو ہمارے خداوند کی ذات کے بارہ میں ہوئی ہیں۔ ابتدائی زمانوں میں گناسٹک۔ اپولے نیرئیس۔ اور مونوفزائٹ لوگوں نے ہمارے خداوند کی انسانیت کو تقریباً کالعدم کر دیا تھا اور بعض اڈاپشن اسٹ (Adoptionist) اور سارے نسطورین لوگ مسیح کی انسانیت پر اتنا زور دیتے تھے کہ اس میں الٰہی ذات کو اُڑا دیا۔ ایک انتہائی تعلیم اکثر دوسری انتہائی تعلیم کی ضد ہوا کرتی تھی یہی حال بائیبل کے بارہ میں رہا ہے۔ اصلاح کے وقت پروٹسٹنٹ لوگوں کے درمیان یہ میلان تھا کہ کلیسیا کی روایات کے خلاف بائیبل کو پیش کریں اور بائیبل کو زور آور موثر طریقے سے پیش کرنے کے لئے انہوں نے اُس کے الٰہی جز پر بہت زور دیا۔ اور اس زور دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ حد سے زیادہ مبالغے پیدا ہو گئے۔ بعض علماء نے اُس یہودی کی رائے کو اختیار کیا جس کا نام ڈی روسی (De-Rossi) تھا جس کی یہ رائے تھی کہ عبرانی بائیبل کے چھوٹے چھوٹے نقطے اور

شوشے بھی الہام سے تھے اور اعراب بھی الہام سے تھے۔ اُس نے اس رائے کی تائید
اس طرح سے کی کہ اعراب خدا نے فردوس میں آدم کو سکھائے۔ اور پھر سینہ بہ سینہ موسیٰ کو
پہنچے۔ ۱۶۷۵ء میں بعض سوئس پروٹسٹنٹوں نے اعراب کے الہامی ہونے کو اپنے عقیدہ کا
کا ایک جز ٹھہرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنا عقیدہ بائیبل کے چند الگ الگ مقاموں
پر قائم کیا نہ کہ اُس کی عام تعلیم پر۔ اور اس بنا پر انہوں نے تاریخی اور سائنٹفک تحقیقات
پر بھی کفر کا فتویٰ لگایا جو بائیبل کے مصنف بھی نہ لگاتے۔ پس عہد عتیق کے حوالے غلامی
کی حمایت میں دیئے جاتے تھے۔ حالانکہ اُس کے قائم رکھنے کا زمانہ جاتا رہا تھا۔ اور کئی
نظیریں گلی لیو کو مجرم ٹھہرانے میں بنائی گئیں جس نے یہ دعوےٰ کیا تھا کہ زمین سورج کے گرد
گھومتی ہے۔ اور افسوس کی بات ہے کہ بہت لوگ مسیحی گرجاؤں سے اسی لئے نکالے گئے
کہ وہ بائیبل کے بارہ میں ان کی دعاوی کو نہ مانتے تھے جن کو کہ خود بائیبل بھی اپنے لئے
پیش نہیں کرتی۔

پھر اس کے خلاف اثر ہوا۔ دہریہ اور اگناسٹک لوگ موسیٰ کی غلطیوں پہ زور
دینے لگے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر یہ ثابت کیا جائے گا کہ موسیٰ نے بعض غلطیاں کیں تو مسیحی
سامعین مسیح کو ترک کردیں گے۔ معقول پسند (Rationalist) مصنفوں
نے دانستہ یہ کوشش کی کہ عہد عتیق میں جو فوق العادت ہے اُس کو نکال ڈالیں اور نئے
عہد نامہ کے معجزوں کو ایک فسانہ ٹھہرائیں۔ ان کے خیال میں یہ معجزے مبشروں نے اپنی
خاص رایوں کی تائید کے لئے ڈالے یا اس لئے کہ نادان لوگ ایسے قصوں کو پسند کرتے
ہیں۔ اس لئے بائیبل میں الٰہی جز کا یا تو کلیۃً انکار کیا گیا یا یہاں تک گھٹایا گیا کہ اتنا ہر شخص
کو ہر جگہ مل سکتا ہے۔

راست اور وسطی طریقہ ہمارے لئے یہ ہے کہ الہام کا الٰہی جز انسانی الفاظ اور
خیالات کے انسانی جز میں دیکھیں۔

انسانی جزو

اسے ہم پہچان سکتے ہیں (الف) انسانی قوائے عقل کے روح القدس کی قوت
کے ساتھ ہم خدمت ہونے میں۔ مزمور نویس جس نے اپنے دل اور روح کو مزمور ۵۱ میں کھول کر
بیان کیا وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہوگا کہ وہ خود معافی کے لئے التجا کر رہا تھا اور
دیگر فروتن مقدسوں کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ سب کچھ روح القدس کی تحریک سے ہو رہا
تھا۔ اسی طرح سے انبیا بھی اکثر خدا کے وہ سارے معنی سمجھنے میں بے خبر تھے جو خدا نے
ان کے الفاظ میں مفہوم رکھے تھے۔ جب مزمور نویس نے یہ کہا "انہوں نے میرے
ہاتھ اور پاؤں چھیدے" اور جب ہوسیع نے کہا "جب اسرائیل بچہ تھا تو میں نے اُسے
پیار کیا اور اپنے بیٹے کو مصر سے بلایا" ہمیں یہ قیاس کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان کو اس
امر کی خبر تھی کہ ان کے الفاظ میں مسیح کا تجربہ بیان ہوا ہے۔

انسانی جز کو ہم پہچان سکتے ہیں (ب) اُن اسباب میں جو مقدس مصنفوں نے
استعمال کئے اور جس طریقے سے ان کا اجتماع ہوا۔ ان مصنفوں نے مختلف چشموں کے
ذریعہ آگاہی حاصل کی جیسا کہ حال کے مصنف کرتے ہیں۔ مثلاً گنتی ۲۱: ۱۴ میں
"خداوند کے جنگ نامے" کا ذکر آتا ہے۔ اور سموئیل، سلاطین اور تواریخ کی کتابوں میں
کئی اور کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ نئے عہد نامہ میں بھی مصنف آزاد تھے کہ
دیگر الہامی نوشتوں کو جو اُن سے پہلے موجود تھے نئی ترتیب سے یا کچھ تبدیلی کے ساتھ
استعمال کریں۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدس لوقا اور مقدس متی نے مقدس مرقس
کی انجیل سے بہت کچھ اپنی اناجیل میں درج کیا۔ اور مقدس لوقا نے کوشش کی کہ زیادہ
شستہ یونانی میں لکھے۔ اور نیز یہ امر کہ مرقس ۱۶: ۹ سے ۲۰ اور یوحنا ۷: ۵۳ سے ۸: ۱۱
تک غالباً ان انجیل نویسوں کی تحریر میں ان کے الہام پہ کچھ حرف نہیں لاتا۔ کلیسیا نے انہیں
صحیح تسلیم کر لیا اور انہیں مقدس بیان کے ساتھ ملحق کیا جن کے درمیان کہ وہ عبارتیں

پائی جاتی ہیں +

انسانی جزو کو پہچان سکتے ہیں (ج) اُن بعض بیانات میں جو غیر صحیح معلوم پڑتے ہیں۔ مقدس جیروم نے صاف طور پر یہ کہا کہ متی ۳۵:۲۳ و ۹:۲۷ میں غلطی ہے۔ اور حال کے علمائے دین اس سے آگاہ ہیں۔ اور جب مختلف بیانات ملائے گئے تو ظاہر نقص دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً پیدائش ۳۲:۲۸ + اور ۳۵:۱۰ میں اسرائیل کے نام کی دو مختلف وجہ تسمیہ پائی جاتی ہیں۔ باوجود ان اختلافات کے بائیبل کی تاریخ تاریخی کتابوں کے درمیان بھی اعلیٰ قدر و منزلت رکھتی ہے۔ علاوہ ان بیش بہا تعلیمات کے جو ایمان اور اخلاق کے بارہ میں اُن میں پائی جاتی ہیں +

انسانی جزو کو پہچان سکتے ہیں (د) اس امر میں کہ ان کتابوں اور مصنفوں کا الہام ترقی کن ہے (possessing [illegible]) صرف ہمارے خداوند یسوع مسیح کو بلا اندازہ رُوح القدس عطا ہوا تھا۔ باقی سارے معلموں کو الہام بھی وقفہ کے ساتھ ملتا تھا (یرمیاہ ۴۲:۷ + اگر نتھی ۷:۱۰)۔ اُن کو مختلف درجہ کی روشنی عطا ہوئی تھی۔ الہام اس وسیلہ کے مطابق ہوتا تھا جس کے ذریعہ وہ ملتا تھا۔ اور اُن لوگوں کی عقلوں کے مطابق جن کے فائدے کے لئے وہ شروع میں دیا گیا تھا۔ مثلاً ہم آسانی سے یقین کر سکتے ہیں کہ بددعائیہ مزامیر میں مصنف ظلم اور ایذا رسانیوں کے ذریعہ جو انہیں ان کے دشمنوں کے ہاتھ سے ملیں ایسے مشتعل ہو گئے تھے کہ دین کے لازمی تصورات رحم اور معافی کے کچھ عرصہ کے لئے وہ بھول گئے۔ اس سے کچھ کم درجہ میں حالات اور ماجرات کے انسانی قیود نے غالباً ایسی کتابوں پر تاثیر کی مثلاً غزل الغزلات، و آعظ، آستر۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی ایک خاص جگہ اور ایک خاص مقصد عہد عتیق میں ہے۔ یہودی تاریخ کا ہر عالم اس سے واقف ہے ”عہد عتیق کے بہت قوانین کی قدر و منزلت اس امر پر موقوف نہیں کہ وہ سارے زمانوں کے لئے دستور العمل ہوں بلکہ اس امر میں کہ اس زمانہ

کے لئے انہوں نے اعلےٰ دستور العمل پیش کیا اور آیندہ کے لئے جو افضل تھا اس کے لئے انہوں نے تیار کیا۔ اور عہد عتیق کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خدا نے کس طرح ناقص العقل انسانوں کو اور ایسے علمی طریقوں کو استعمال کیا جو قوم کی طفولیت سے علاقہ رکھتے تھے۔ لیکن گویہ مٹی کے برتن تھے۔ ان میں آسمانی خزانے بند تھے +

الٰہی جزو۔ یہ (۱) نبوت میں نظر آتا ہے جو نہ صرف عہد عتیق کا بلکہ نئے عہد نامہ کا بھی خاصہ ہے۔ مقدس یوحنا نے مکاشفہ ۲۲:۹ میں ظاہر کیا کہ یسعیاہ اور عاموس کی طرح وہ بھی نبیوں میں شامل تھا۔ ان نبیوں کو یہ پورا یقین تھا کہ ان کا الہام ان کے اندر سے پیدا نہیں ہوا لیکن باہر سے آیا۔ موسیٰ کی ہلاہٹ (خروج ۳ و ۴) ظاہر کرتی ہے کہ وہ نبی ہونے کے لئے اپنی مرضی کے خلاف مجبور کیا گیا۔ یسعیاہ نے اپنی بلاہٹ بڑے تامل اور انکساری کے ساتھ قبول کی۔ یرمیاہ کا یہی حال تھا۔ بار بار انبیا نے ظاہر کیا کہ ان کو ایک اٹل تحریک ملی اور خدا کے ساتھ گہری شراکت رکھنے کے بعد وہ کلام کرنے پر مجبور ہوئے۔ اعمال ۲:۱۷ و ۱۸ سے ظاہر ہے کہ رسولوں نے پنتیکست کے دن اسی قسم کی تحریک کو محسوس کیا۔ اور گلتیوں ۱:۶ میں مقدس پولس نے اسی قسم کے اندرونی مکاشفہ کی شہادت دی جیسا کہ موسیٰ کو ملا تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دعا کے جواب کی طرح الہام بھی خدا کی طرف سے ایک جواب تھا (یرمیاہ ۳۵:۲۳ + حبقوق ۳:۷)۔ کبھی کبھی الہام تحریر کرنے کے لئے ایک صریح حکم تھا (یسعیاہ ۸:۱ + یرمیاہ ۳۶:۲ و ۲۸ + مکاشفہ ۲۱:۵)۔ نبی ”مرد خدا“ تھے۔ اور ترجمان تھے۔ وہ کامل اتحاد کے ساتھ اخلاق اور دین پر ہمیشہ زور دیتے تھے اور خدا کی مرضی کی روشنی میں اپنے زمانہ کے واقعات کی تفسیر کرتے تھے۔ انہوں نے یہودی سلطنت کے تباہ ہونے کی ویسی خبر دی جیسے مقدس یوحنا نے روم کے تباہ ہونے کی خبر دی اور انہوں نے اس پر زور دیا کہ بربادی کی یہ قوتیں خدا کے اوزار تھے۔ لیکن خدا کی ذات اور لوگوں کے

فرائض کے بارہ میں ان کی تعلیم آیندہ کی حالت کے لحاظ سے ایک الہام تھا۔ انبیا غیب بین تھے۔ اور پیشین گوئی ان کی تعلیم کا لازمی حصہ تھا (دیکھو یسعیاہ ۶۵ و ۶۶ + ہوسیع ۱۴ + عاموس ۹)۔ انہوں نے شریروں کی سزا کی خبر دی۔ اور آنے والی خدا کی سلطنت کی اور کامل بادشاہ کی۔ ہم ہمیشہ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نبوتوں کی ساری تفصیلیں پوری ہو چکی ہیں۔ لیکن ہم اکثر کہہ سکتے ہیں کہ ان تفاصیل میں وہ صداقتیں مرکوز ہیں جو وقوع میں آنے والی تھیں +

(ب)۔ الٰہی جز بائبل کے قوانین اور عبادت میں پہچان سکتے ہیں۔ دس احکام کے تاکیدی اوامر اور نواہی میں ایسی شرائط بیان ہوئیں جو نوع انسان کے لئے ضروری تھیں۔ اور انہوں نے ظاہر کیا کہ ان احکام کی عدولی جو نوع انسان کے فائدے کے لئے دیئے گئے خدا کے خلاف گناہ تھا۔ بیرونی عبادت کے مفصل قاعدے قوانین میں الٰہی مقصد تھا کہ انسان کو یہ سکھائے کہ اُسے نجات دہندہ کی ضرورت تھی اور یوں کاہنی کام مسیح کے کام کا سایہ تھا۔ خلوتی یا برملا عبادت کی دعاؤں اور حمدوں میں جنہیں ہم عہد عتیق میں پڑھتے ہیں۔ ان میں ایسی روحانی خوشی اور خود انکساری کا ذکر ہے جس کی نظیر سارے علم ادب میں پائی نہیں جاتی +

(ج)۔ الٰہی جز کو بائبل کی تاریخ میں پہچان سکتے ہیں۔ ایک معنی میں تاریخ کے واقعات خدا کے الفاظ ہیں اور ملہم مورخ ان الفاظ کی تفسیر کرتے ہیں۔ اسرائیل اور یہوداہ کی ترقی اور تنزل میں اور جو قومیں ان کے ارد گرد تھیں ان کی ترقی اور تنزل میں ان مصنفوں نے سمجھا اور بیان کیا کہ وہ دنیا کی دینی تربیت کے لئے تھی۔ اُس قوم کی روایات اور انقلابات اس طور پر ظاہر کی گئیں کہ وہ انسان کے ساتھ خدا کے برتاؤ کی مثالیں تھیں۔ گناہ پر خدا کی سزا۔ اُس کا ایک خاص آدمی کو بُلانا تاکہ سارے جہان کے لئے اُس کی رسالت ہو۔ اس برگزیدہ قوم کو تدریج محدود

کرتے جانا۔ اس قوم کے لئے اس کی فکر۔ بدی کو بھی ایسے طور سے محکوم کرنا کہ اس کا مقصد پورا ہو۔ عہد عتیق کے مورخوں کے نزدیک اور زیادہ تر عہد جدید کے مورخوں کے نزدیک ان کی تحریریں غیر متعلقہ واقعات کا سلسلہ نہ تھیں یا طبعی یا مادی کوائف کی کہانی نہ تھیں بلکہ وہ اس بات کا بیان تھیں کہ خدا کا اپنی سلطنت کے قائم کرنے میں کیا مقصد تھا +

(د)۔ الٰہی جز اس اثر میں بھی دریافت کر سکتے ہیں جو خدا کے کلام کا آدمیوں کی روحوں پر ہوا۔ کبھی کبھی ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ بائبل کو ہم ویسا ہی پڑھیں جیسا کسی اور کتاب کو پڑھتے ہیں۔ بائبل کی زبان اور صرف و نحو کے لحاظ سے تو یہ درست ہے۔ لیکن بائبل کے مضمون کے بارہ میں یہ درست نہیں۔ کیونکہ اس لحاظ سے بائبل کسی دوسری کتاب کی طرح نہیں۔ اس پر خدا کی مُہر ثبت ہوئی ہے۔ اور یسوع مسیح کی ذات اور کلام کا گویا احاطہ ہے جو کہ انسانی تاریخ کا مرکز ہے۔ بائبل ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دنیا کی نئی پیدائش کیسے ہو سکتی ہے اور ہم کیسے بچ سکتے ہیں۔ اس کے اکثر غلط استعمال کا علاج یہ نہیں کہ اسے کم پڑھیں بلکہ زیادہ پڑھیں اور زیادہ ادب سے پڑھیں۔ ہم کو معافی درکار ہے۔ اس کے لئے خداوند کی دُعا اور زبور ۵۱ سے بہتر اور کونسی عبارت ہو سکتی ہے۔ ہمیں ہمت درکار ہے تو اس کے لئے ان الفاظ سے بہتر کون ہو سکتے ہیں کہ "خداوند ہمارا چوپان ہے"۔ ہمیں تسلی درکار ہے تو اُس کے تصفیہ سے زیادہ جس نے ہمارے غموں کو اُٹھا لیا اور کونسا بیان ایسی تسلی دے سکتا ہے؟ ہمیں اخلاقی زندگی کی سادگی درکار ہے۔ بھلا پہاڑی وعظ سے بہتر اس کا بیان اور کہاں مل سکتا ہے؟

بائیبل کا مطالعہ

۱۔ بائیبل کے مطالعہ میں کانشنس کا کام

خدا نے انسان کو نہ صرف بائیبل عطا کی ہے بلکہ کانشنس بھی۔ ان کی ساخت ایسی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مطابق ہوں۔ جیسے خدا نے آنکھ کو بنایا کہ وہ روشنی کے مطابق ہو اور روشنی آنکھ کے مطابق۔ بائیبل کا خاص کام یہ ہے کہ وہ کانشنس کو ترقی دے۔ کانشنس کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ وہ بائیبل کی تفسیر کرے۔ اگر تم کانشنس کے اس کام کو نظر انداز کر کے بائیبل کو پڑھو تو تم اس کے سمجھنے میں غلطی کرو گے۔

کانشنس کی ساخت ایسی ہے کہ وہ حق اور ناحق کے درمیان اور جو کرنا چاہئے اور جو نہ کرنا چاہئے اس کے درمیان امتیاز کرے۔ اگر ہم دو فہرستیں بنائیں۔ اگر راستی۔ درستی۔ فیاضی۔ خود نثاری کو ہم ایک فہرست میں رکھیں۔ اور جھوٹ۔ نادرستی کمینگی اور خود غرضی کو دوسری فہرست میں رکھیں تو کانشنس ہمیں مجبور کریگا کہ ایک کو ہم کہیں "کرنا چاہئے" اور دوسرے کو کہیں "نہ کرنا چاہئے" اور ہم ایسا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کوئی صحیح الحواس شخص اس ترتیب کو بدل نہیں سکتا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ پہلی فہرست پر عمل کرنے کے ذریعہ دکھ پہنچتا ہے اور دوسری پر عمل کرنے کے ذریعہ خوشی پہنچتی ہے تو بھی ہم اپنے اس فیصلہ کو الٹ نہیں سکتے۔ بلکہ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ یہ انسان صرف اسی دنیا سے علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ "چاہئے اور نہ چاہئے" کا دائرہ اعلےٰ طبقات تک خدا کے فرشتوں بلکہ خود خدا تک وسیع ہے۔ ناحق کو اگر خدا سے بھی منسوب کریں تو وہ بھی کم ناحق نہ ٹھیریگا۔ کوئی مکاشفہ کوئی بیرونی عجیب الخلقت نشان ہمیں اس کے خلاف

سمجھنے کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ اگر آسمان سے کوئی آواز بھی ہمیں کہے کہ جھوٹ اور بددیانتی حق ہیں تو بقول اَن سلیم (Anselm) ہم یہ نہیں سمجھیں گے کہ یہ باتیں حق ہیں بلکہ یہ کہ وہ آواز خدا کی آواز نہ تھی۔ بائیبل کی تلاوت میں بھی ہم اس یقین کو اپنے ساتھ رکھیں۔ یہی حقیقی ایمان ہے۔ خدا پر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص پر ایمان رکھیں ایک سیرت پر ایمان رکھیں۔ غیر محدود عدل۔ محبت۔ اشرافت اور فیاضی پر ایمان رکھیں۔ ایسے خدا پر ایمان جس کے لئے ناراستی نادرستی یا نامہربانی کسی انسان سے ناممکن ہوگی۔

اس لئے اگر ہمیں بائیبل میں کوئی ایسا مطلب سمجھائے جو انسان کے اُن اعلےٰ خیالات کے خلاف ہو جو فیاضی اور راستی کے بارہ میں اُسے حاصل ہیں تو ہم اُس اختلاف کو نظر انداز نہ کریں۔ ہم اُس وقت تک اُس معنی کو قبول نہ کریں جب تک اُس کی نسبت مزید تحقیقات نہ کرلیں۔ مثلاً اگر ہمیں کہا جائے کہ فرعون کے دل کے سخت کرنے میں خدا نے فرعون کو ایسے کام کی سزا دی جس سے وہ کسی طرح گریز کر ہی نہ سکتا تھا تو ہم اس معنی کے قبول کرنے سے انکار کریں۔ اگر ہم رومی ۹ باب میں برگزیدگی کے بارہ میں وہ مشہور عبارت پڑھیں اور کوئی آدمی ہمیں اُس کے یہ معنی بتائے کہ خدا بعضوں کو بہشت کے لئے مقرر کرتا ہے اور بعضوں کو ابدی دوزخ کے لئے نہ ان کی اپنی کسی نیکی یا بدی کے باعث بلکہ اپنے جلال کے لئے اپنی عظمت بڑھانے کے واسطے تو ہم بلا تامل ایسی تفسیر کو رد کریں گے۔ یہ بائیبل پر شک کرنے کا سوال نہیں بلکہ آدمی کی تفسیر کے رد کرنے کا۔ حقیقی ایمان ایسے معنی قبول نہ کرے گا جو خدا کی شان کے خلاف ہو۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی سکول کا لڑکا اپنے باپ سے کوئی خط پائے جس میں کوئی مقام ایسا ہو جس کے بُرے معنی نکل سکتے ہوں۔ اُس کا کوئی رفیق اُسے کہے کہ اس مقام کے یہ بُرے معنی تھے۔ لڑکا اگرچہ اُس کے معنی نہ سمجھے وہ قدرتی

طور پر ایسے معنی کو رد کرے گا کیونکہ وہ اس کے باپ کی سیرت کی شان کے خلاف ہیں
اگر وہ اس کے معنی دریافت نہ کر سکے تو اس وقت کے لئے اُسے وہ ایک راز ہی
سمجھ لے گا۔

یہ کہنا نہایت ضرور ہے۔ لیکن یہ احتیاط بھی شرط ہے تاکہ ہر آدمی کو یہ جرأت
نہ ہو کہ اپنی مرضی کے مطابق کسی بات کو مانے اور کسی بات کو نہ مانے۔ کسی خاص شخص
کے کانشنس سے گریز کرنا محض اس خیال سے مناسب نہیں کہ اس میں کچھ غیر معمولی
ہوگا۔ لیکن جب وقت کسی کو یہ یقین ہو کہ مقدس نوشتوں کے فلاں معنی گو وہ اور طرح
سے ممکن بھی ہوں۔ حق اور ناحق کے بہترین تصورات کے نقیض ہیں تب اُن کو رد کرنا
درست ہوگا۔

کانشنس کے ایسے انکسارانہ اور دعائیہ لیکن نڈر استعمال سے ایسے سوال لازم
آتے ہیں جن سے اہم نتائج نکل سکتے ہیں۔ کیونکہ پرانے عہد نامہ میں ایسے بیانات
ملتے ہیں جو منور شدہ مسیحی کانشنس کے مطابق معلوم نہیں ہوتے اور جن کو مسیح پسند نہ
کرتا۔ مثلاً غلامی۔ کثرت ازدواج۔ طلاق وغیرہ کی اجازت۔ بددعائیہ مزامیر میں
سخت انتقام کے الفاظ آئے ہیں۔ کانشنس ہمیں ان باتوں کے پوچھنے پر مجبور کرتا ہے
اور یہ کانشنس بائبل کی تعلیم سے جس قدر زیادہ منور ہوگا اُسی قدر زیادہ وہ یہ
سوال کرے گا۔

۲۔ بائبل میں الٰہی اور انسانی عنصر

یہ دو جواب ہیں۔ اول یہ کہ بائبل میں الٰہی اور انسانی اجزا مخلوط ہیں (دیکھو
فصل الہام)۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ بائبل ایک مطلقاً کامل کتاب ہے جس میں خدا خود
مصنف ہے جو انسانی ہاتھوں اور دماغوں کو صرف اس طرح سے استعمال کرتا جیسے کوئی

آدمی اپنے ٹائپ رائیٹر Type writer کو۔ خدا نے آدمیوں کو
استعمال کیا نہ کلوں کو۔ ایسے آدمیوں کو جو ہماری طرح کمزوری تعصب اور جذبات سے
بھرے تھے۔ گو اس کے روح القدس کی تاثیر سے بہت کچھ پاک و صاف ہو گئے تھے۔
یہ ایسے آدمی تھے جن کے اپنے اپنے خواص اور مزاج تھے بعض تعلیم یافتہ تھے اور بعض
بلا تعلیم۔ کوئی اشیا پر ایک طرح سے نظر کرنے والا تھا کوئی دوسری طرح سے۔ کسی کا
تجربہ کچھ تھا اور کسی کا کچھ۔ ان کے الہام کا یہ مطلب نہ تھا کہ ان کے طبعی قوائے کو معطل
کر دے۔ اُس سے اُن کی شخصیت زائل نہ ہوگئی نہ تعلیم اور سیرت کے اختلاف کو
اُس نے معدوم کر دیا۔ بلکہ زمینی جذبات سے ان کو بالکل مبرا نہیں کر دیا۔ اس نے اُن کو
کل نہیں بنا دیا بلکہ آدمی ہی رہنے دیا۔
اس لئے بعض اوقات یہ پتہ لگتا ہے کہ ان کا علم ان کے ہمعصروں سے اعلےٰ
نہ تھا۔ اور ظلم اور ناحق پر ان کا غصہ کبھی ایسا بھڑک اٹھا کہ انتقام کے آرزومند ہوئے
اگر ایسے نیک آدمیوں میں بھی یہ کمزوری پائی جائے جس کی نسبت ہمیں معلوم ہے کہ وہ
خدا اور راستبازی کی تلاش کرتے تھے تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ بائبل میں ایسی بات
دیکھنے سے ہمیں اس لئے تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے پہلے سے کچھ غلط خیالات قایم کئے ہوئے
ہیں۔ چونکہ یہ بائبل میں ہے۔ اس لئے ہم توقع نہیں کرتے کہ وہ اشخاص حقیقی اور طبعی
ہوں گے۔ چونکہ لفظ الہام کے بارہ میں ہمارے تصورات غلط ہیں اس لئے جب ہم الٰہی
اجزا کو انسانی اجزا کے ساتھ مخلوط پاتے ہیں تو ہم حیران ہوتے ہیں۔
الٰہی اور انسانی اجزا کے درمیان ہم خطِ فاصل کھینچ نہیں سکتے۔ کسی حصہ کی نسبت
ہم یہ کہہ نہیں سکتے کہ یہ "الٰہی ہے" یا "وہ انسانی ہے"۔ بعض حصوں میں مثلاً اناجیل
میں الٰہی جزو زیادہ ہیں اور بعض حصوں میں مثلاً تواریخ کی کتابوں میں انسانی جزو زیادہ
ہے۔ یہ مثل سونے کی کان کے ہے جہاں سونا چٹان اور مٹی کے ساتھ ملا ہوتا ہے

کسی حصہ میں سونا زیادہ ہوتا ہے کسی حصہ میں کم۔ لیکن سارے حصے ایک درجہ تک سونے سے چمکتے ہوتے ہیں۔ یہ مثل دھوپ کے ہے جو رنگ دار کھڑکی میں سے گزرتی ہے۔ جن شیشوں کے ذریعہ سے وہ آتی ہے اُن کے رنگوں سے وہ رنگین ہوتی ہے۔ اور کسی طرح سے یوں نہیں سکتی۔ بعض صورتوں میں وہ رنگ زیادہ گہرے اور زیادہ ناقص ہوتے ہیں۔ بعضوں میں سے بڑی آب و تاب کے ساتھ یہ دھوپ گزرتی ہے۔ اس لئے انسانی وسیلے کو نظرانداز کرنا نادانی میں داخل ہوگا جس کے ذریعہ سے کہ یہ نور آیا ہے۔ لیکن الٰہی نور کو نظرانداز کرنا اور یہ سمجھنا اور بھی نادانی ہوگا کہ رنگ دار شیشہ بذات خود منور ہے کہ آسمان کا نور زمین ہی سے ہے۔ دونوں کو ہم دل میں رکھیں۔ الٰہی اور انسانی کو اگر ہم بائیبل کو صحیح طور سے سمجھنا چاہتے ہیں +

۳۔ مکاشفہ کا ترقی کُن ہونا

کانشنس کے سوالات کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم انسانی زندگی کو خدا کا ایک بڑا اسکول سمجھیں جہاں بتدریج صبر سے ان سارے زمانوں میں وہ انسانیت کی تربیت شریف زندگی کے لئے کر رہا تھا۔ عہدِ عتیق کو ہم اس طریق سے نہ پڑھیں کہ وہ کامل احکام کا مجموعہ ہے جو سارے آدمیوں پر سارے زمانوں میں یکساں عائد ہوتے ہوں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ انسانیت کو خدا کی طرف سے بتدریج تربیت دینے کا بیان ہے۔ یہ اسی قسم کی بتدریج تربیت و تعلیم ہے جیسی آج کل ہم اپنے بچوں کو دیا کرتے ہیں۔ ہم سب سے ادنےٰ اصول علم سے شروع کرتے ہیں۔ شروع شروع میں بہت سادہ اور ناقص تصورات ہماری تشفی کے لئے کافی ہیں گو اعلیٰ علم کا سارا جلال رفتہ رفتہ بچہ کے سامنے کھلا ہوتا ہے لیکن وہ جب تک بالغ نہ ہو اُسے جزوی طور پر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ عہدِ عتیق کے سمجھنے میں شاید بہتر

مثال یہ ہے کہ زمانہ حال کے مشنری ادنےٰ قوموں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ شروع شروع میں اُن سے کیا توقع رکھنی چاہئے۔ بہت باتوں کی جن سے اُسے رنج پہنچتا ہے اُسے برداشت کرنی پڑتی اور بہت کچھ نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔ وہ اُس پر قناعت کرتا ہے کہ آہستہ قدم رکھے۔ نیکی کے لئے ہر کوشش پر وہ خوشی مناتا ہے۔ اگرچہ اُس میں بہت کچھ بدی کی آمیزش ہو وہ ایسے کاموں پر بڑی خوشی ظاہر کرتا ہے جو ان غریب وحشیوں کے لئے فی الحقیقت ترقی ہے۔ وہ مانتا ہے کہ خدا انسانوں کی اپنے روح القدس کے ذریعہ مدد کر رہا ہے۔ گو اب تک غلطی اور خطا باقی ہو۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اس کے بعض نومرید مسیح کے شریف و فادار شاگرد بن جاتے ہیں تو کیا وہ اپنی ابتدائی تربیت کو اور خیالوں کو ایک ادنےٰ منزل سمجھیں گے جو کہ مدت سے وہ طے کر چکے ہیں۔ تو بھی وہ اقرار کریں گے کہ اس اعلیٰ ترقی میں یہ ضروری منزل تھی +

خدا نے نوعِ انسان کی تربیت و ترقی بھی اسی طرح سے کی۔ ان ابتدائی منزلوں میں بہت کچھ نظرانداز کیا گیا اور اس سے طرح دی گئی (اعمال ۱۷: ۳۰)۔ غلامی کو فی الفور نہیں اُڑا دیا۔ لیکن اس کے ظلموں کی ممانعت ہوئی اور اُس کے غلط استعمال روکے گئے۔ طلاق شروع میں مطلقاً منع نہ کیا گیا۔ لیکن اس کے لئے سخت قاعدے قوانین مقرر ہوئے۔ جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ان برائیوں کو خدا نے رہنے دیا جب ہمیں مثلاً مزامیر میں خدا کی اعلےٰ تعلیم اور اُس کی سرگرم تلاش کا حال معلوم ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی شرارت کے لئے سخت انتقام کی سخت دعائیں پڑھتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم ان آدمیوں کا اندازہ لگا رہے ہیں جو خدا کے سکول کی ادنےٰ جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ اور اُن آدمیوں کے ساتھ روح القدس کی حضوری بالضرور اس امر پر دلالت نہ کرتی تھی کہ ان کی تعلیم اور چلن بالکل کامل تھا۔ دیکھو پہاڑی وعظ

کریں گے اور جن وسائل سے خدا انسان کو پیغام پہنچاتا ہے اُن سے زیادہ واقف ہو جائیں گے اور ہم بہت غلطیوں اور غلط فہمیوں سے بچ رہیں گے جو آجکل لوگوں کو بائیبل کی طرف سے ہٹا رہے ہیں +

رہا ہائر کرٹی سیزم کے متعلق۔ اگر ہم یہ مانیں کہ عہد عتیق کا بیان صحیح ہے کہ جن ملہم شخصوں نے یہ بیان لکھا وہ زمانہ سابق میں علم کے ایسے وسائل رکھتے تھے تو کیا مضائقہ اگر یہ کتابیں موجودہ صورت میں اس سے پیچھے لکھی گئیں جس کا کہ ہم کو خیال تھا۔ کہ ان کو مختلف لوگوں نے روح القدس کی ہدایت سے تالیف و ترمیم کیا؟ ہم یہ تو ہرگز مان نہیں سکتے کہ اس اعلےٰ نکتہ چینی کے سارے بیانات کو ہم قبول کر سکیں گے۔ ان میں سے بعض بیانات تو ابھی متروک اور فراموش ہو چکے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض تو قائم رہیں گے اور ان کے ذریعہ بائبل کے متعلق رائے ہمیں کچھ بدلنی پڑے گی لیکن رائے کی ایسی تبدیلی میں کوئی امر اس بات کا مانع نہیں کہ بائبل کو منجانب اللہ مانیں +

عہد عتیق کے بارہ میں ان سوالوں اور شک کے زمانہ میں بعض ایسے خیالات جو ہمیں مدنظر رکھنے چاہئے۔ اول دیکھو کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ چند تحریرات جو ہمیشہ تفتیش اور تحقیق کے لئے کھلی ہیں وہ منجانب اللہ مانی جائیں اور لوگ اُن کے حکموں کو مانیں جو ان کی طبیعت کے ناگوار تھے؟ ان کو یہ سند اور اختیار کہاں سے حاصل ہوا؟ اس کے سوا اور کوئی جواب بن نہیں آتا کہ اُن کو بذات خود یہ اختیار حاصل تھا اور اُنہوں نے اپنی قدرت سے یہ رتبہ حاصل کیا۔ آدمی کی اخلاقی حس اور عقل نے مل کر ان کے اس اختیار کو قائم کیا۔ جہاں نہ معجزوں نے نہ آسمانی نشانوں نے نہ آسمان سے بیرونی آوازوں نے لوگوں کو ان کتابوں کے ماننے پر مجبور کیا تو ضرور لوگوں نے اپنے خداداد کانشنس کی ہدایت سے ان کو مانا ہو گا۔ سارے زمانوں میں مقدس نوشتوں کی سند اس یقین پر مبنی رہی جو

اُن میں خود پیدا ہوا کہ وہ خدا کی طرف سے تھے۔ آج تک یہی یقین اپنا زور مار رہا ہے دوسری قوموں کے احوال میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طاقت اور اقبال مندی اور نسلی اور دولت پر زور دیا گیا۔ ان عجیب تحریروں میں نیکی خاص اہم شے ہے۔ نبی مورخ اور شارع کا خاص کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمیوں کو ان کے گناہ پر تنبیہ کرے اور پاکیزگی کی طرف ان کی ہدایت کرے۔ قومی نظموں اور گیتوں پر نظر ڈالو "اے خدا اپنے بڑے احسان کے مطابق مجھ پر رحم کر" (زبور ۵۱) "اے میری جان خداوند کی بڑائی کر" (زبور ۱۰۳) "خداوند میرا چوپان ہے" (زبور ۲۳)۔ اور اس وقت ظلمت بھرے باقی جہان کا خیال کرو جس وقت کہ یہ نظمیں لکھی گئی تھیں۔ پھر اس مجبوری پر غور کرو جو انبیاء کو تھی۔ جب روح القدس عجیب طرح سے ان کے ساتھ کوشش کر رہا تھا۔ ان کو منور کر رہا تھا۔ اور خدا کی راستبازی کا ذکر کرنے کے لئے اُنہیں مجبور کر رہا تھا۔ بار بار یہ الفاظ آتے ہیں "خداوند کا کلام" "خداوند یوں فرماتا ہے"۔ یہ عام انسانی سوسائٹی کا منظر نہیں۔ اور پھر اس امر پہ غور کرو کہ ساری بائیبل کا مرکز یسوع مسیح ہے۔ عہد عتیق مسیح کے لئے تیاری کا ذکر کرتا ہے۔ نیا عہد نامہ یہ بتاتا ہے کہ جب وہ تیاری کامل ہو گئی "اور جب وقت پورا ہوا تو خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا"۔ یسوع مسیح عہد عتیق اور عہد جدید کے درمیان گویا کھڑا ہے اور ان دونوں پر اپنا ہاتھ رکھے ہے وہ بار بار تاکید سے کہتا ہے کہ وہ کلام خدا ہے اور اس پر گواہی دیتا ہے۔ نیا عہد نامہ اُس کے اقوال اور کاموں اور اُس کے رسولوں کا قصہ ہے جو اُس نے بھیجے تھے اور یہ دونوں مل کر بائیبل بنتے ہیں اور اُس نے ساری کتابوں سے بڑھ کر آدمیوں کو راستبازی کی طرف پھیرنے میں اپنی طاقت ظاہر کی ہے۔ ہم نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ لاطینی علم ادب کی کتابوں کے پڑھنے سے ان کو قدرت اطمینان

اور امید حاصل ہوئی۔ یا ان کی زندگی تاریکی سے نکل کر نور میں آگئی سوائے بائیبل کے ۔

پس ہم اپنے دلوں کو ان بنیادوں پر قائم کریں اور مطمئن ہوں جبکہ لوگ سوال کر رہے ہیں اور ہمارے لئے ان باتوں کو دریافت کر رہے ہیں جن کو ہم پہلے خدا کے الہامی کلام کے بارہ میں جانتے نہ تھے ۔

۵۔ بائیبل کے مطالعہ کے بارہ میں ہدایات و کنایات

۱۔ عقل سلیم کا استعمال۔ اکثر لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ بائیبل موم کے ناک کی طرح ہے۔ جس طرف چاہو اُس کو پھرا لو۔ اُس کے ورقوں سے جتنی متضاد تعلیمیں چاہو نکال لو۔ بیشک اگر تم نادانوں کی طرح اسے پڑھو کیونکہ بائیبل تعلیم کا ضابطہ نہیں جس میں ہر حکم خوب کانٹ چھانٹ کے تیار کیا گیا ہو اور ہر مستثنیٰ کا احتیاط سے ذکر کیا ہو۔ اس میں خاص محدود احکام کی نسبت وسیع اصولوں کا زیادہ ذکر ہے۔ اور ہم پر یہ بات چھوڑی گئی ہے کہ اپنی زندگی کی عملی ہدایت کے لئے ان اصولوں کو خود عائد کریں۔ بعض اوقات اس کے احکام عالمگیر اطلاق کا حکم رکھتے ہیں اور بعض اوقات ان خاص موقعوں کے لئے ہیں جو مصنف کے روبرو تھے۔ بعض اوقات وہ استعارہ کے طور پر بیان ہوئے ہیں تاکہ ہماری زندگی کی رُوح اور مزاج کو سدھاریں۔ مثلاً "جو تجھ سے مانگے اُسے دے" وغیرہ۔ عہد عتیق کے نمونوں اور پیشین گوئیوں کے بارہ میں بھی یہی احتیاط درکار ہے۔ اگر انسان کوشش کے ساتھ اپنی عقل سلیم کو استعمال نہ کرے جو خدا نے اُسے عطا کی ہے تو وہ بائیبل کے پڑھنے میں غلطیاں کرے گا۔ ملہم مصنف اپنا مطلب بالکل آزادانہ ظاہر کرتے

ظاہر کرتے ہیں اور عموماً وہ یہ اندیشہ بھی ظاہر نہیں کرتے کہ غلط فہمیاں کیسے ہوسکیں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے ذی عقل لوگ ہوں گے۔ اس لئے اپنے بیانات کو محدود کرنے اور اس بات کے یاد دلانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ وہ دوسری جگہ کے دیگر بیانات کے قرینہ میں لئے جائیں گے ۔

بہت طریقوں سے اس عقل سلیم کی عدم موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ اکثر یہ عادت ہو گئی ہے کہ بے سوچے سمجھے بائیبل کے ہر حصہ کو بطور مقدس نوشتے کے اقتباس کیا کرتے ہیں خواہ وہ ہمارے خداوند کے الفاظ ہوں خواہ سوخی بلدد اور ضوفر نعمانی کے ایوب کی کتاب میں جن پر پیچھے خدا نے ملامت کی اور ان کی تردید کی۔ بعض مبشروں کی یہ عادت بھی رہی ہے کہ وہ الفاظ کے ظاہری معنوں کو توڑتے مروڑتے ہیں یا کسی تعلیم کی تائید میں ایسی آیات پیش کرتے ہیں جو کسی اور قرینہ اور کسی اور موقعے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ مثلاً کوئی کسی خط کا کوئی جملہ بلا قرینہ یا مصنف یا اس کے مقصد کا لحاظ کئے بغیر یا بلا لحاظ اُس شخص کے جس کے لئے وہ خط لکھا گیا تھا۔ مثلاً لوگوں نے ایمان اور اعمال کے بارہ میں مقدس پولس اور مقدس یعقوب کو ایک دوسرے کے برخلاف قرار دیا۔ یہ بالکل طبعی امر ہے کہ دو معلم یا ایک ہی معلم مختلف اوقات پر مختلف بیانات لکھے۔ مثلاً کچھ تائب لوگ اپنی مصیبت میں خدا کی مہربانی حاصل کرنے کی خاطر نیک اعمال کا طومار کھڑا کریں اُن کو ایک واعظ یہ نصیحت کرے کہ خدا یہ نہیں چاہتا بلکہ سادہ بھروسے والا ایمان چاہتا ہے جیسے بچہ باپ پر رکھتا ہے تو اس میں کچھ غلطی نہ ہوگی۔ لیکن جو لوگ اپنی ناپاکی کمینگی اور بدمزاجی کو اس طرح سے چھپانا چاہیں کہ اپنے ایمان کا بہت تذکرہ کریں اور مسیح کے پورے ہوئے کام پر نہ اپنی راستبازی تزکیہ کرنے کے بارہ میں بہت باتیں کریں تو وہی واعظ

بہت درشتی سے ان کو یہ نصیحت کرے گا جیسے مقدس یعقوب نے کی کہ ایمان بلا اعمال مردہ ہے۔

۲۔ محنت کرنے کے بارہ میں۔ عقل سلیم کا استعمال اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ہم بائبل کی تلاوت میں بہت محنت کریں۔ فرض کرو کہ دو شخص گلتیوں کا خط پڑھتے ہیں۔ ایک تو مصنف کے معنی تک پہنچنے کی کچھ کوشش نہیں کرتا۔ وہ ہر روز ایک باب پڑھنا شروع کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کیونکہ بابوں کی تقسیم بہت ناقص ہے کہ وہ دلیل کے عین وسط میں سے شروع کرے اور وہ مضمون زیر بحث کے آغاز سے شروع نہ کرے۔ پس پڑھتے ہوئے اس کا مطلب اُسے بہت کم معلوم ہوگا۔ جیسے اس نے پہلا باب ایسے موہوم طریقے سے پڑھا تھا ویسے ہی وہ اس باب کو پڑھتا ہے اور وہ تعلق کے دریافت کرنے کی کچھ کوشش نہیں کرتا۔ یوں اُس کا بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اور اُسے کچھ تسلی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ دوسرا شخص کچھ محنت کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ کسی آدمی کے خط کو سمجھنے کے لئے اُس کا مضمون اور مقصد دریافت کرنا ضروری ہے اور مصنف کی غرض تک پہنچنا اُسے درکار ہے اور کہ وہ خط پہلے کن لوگوں کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ رسولوں کے اعمال کی کتاب میں سے دریافت کرتا ہے کہ مقدس پولس کا تعلق ان گلتیوں کے ساتھ کیا تھا۔ پھر وہ اُس خط کو دو یا تین دفعہ پڑھتا ہے اور اُسے معلوم ہوتا ہے کہ کیسی سختی اور ناراضگی کے لہجہ میں یہ خط لکھا گیا۔ اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مسیحی کیسے متلون مزاج تھے۔ اور جھوٹے معلّموں کو انہوں نے کیسی جلدی سے قبول کر لیا تھا جنہوں نے خود ان کی مخالفت کی تھی۔ ان ساری باتوں سے مصنف کو سخت رنج پہنچا تھا۔ اُس نے اپنے رتبہ کے بارہ میں صاف بیان کیا۔ پہلی یا دوسری دفعہ خط کے پڑھنے سے غالباً اتنا ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے وہ سوچنے لگتا ہے۔ وہ تفسیروں کے نزدیک نہیں جاتا بلکہ خود خدا کا مطلب سمجھنا چاہتا ہے اس کے

بعد وہ تفسیر سے مدد لیتا ہے اور اُس کی مدد سے وہ پھر اعمال کی کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اُسے اس بات کے ماننے کی معقول وجہ ملتی ہے کہ جب پولس گلتیہ سے چلا گیا۔ اُس کے دائمی مخالف جو یہودی مائل مسیحی فریق کے ایلچی تھے یہ منادی کرتے وہاں گئے تھے (جیسا کہ اعمال ۱۵ باب میں مندرج ہے) کہ "جب تک تمہارا ختنہ نہ ہو اور تم شریعت کے تابع نہ ہو تم نجات نہیں پا سکتے" تب مطالعہ کنندہ کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف کیوں اُن سے ایسا ناراض تھا جو اُسے چھوڑ کر جھوٹے معلّموں کے پیچھے ہو لئے تھے اور جنہوں نے اُس علاقہ کی مسیحیت کو آئندہ کے لئے کیسے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس کلید کو لے کر وہ پھر خط کا مطالعہ کرنے لگ جاتا ہے تو پھر اُس میں دلچسپی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ اس محدود جگہ میں اس سے زیادہ ہم بیان نہیں کر سکتے

۳۔ عبادتی (devotional) مطالعہ۔ یقیناً یہ کہنا تو ضرور نہیں کہ آدمی بائبل کو باقاعدہ پڑھے۔ یعنی اس مقصد سے پڑھے کہ خدا کی پہچان زیادہ حاصل ہوتی جائے اور اس غرض سے پڑھے کہ خدا کی مرضی کو دریافت کرے اور جب وہ مرضی دریافت ہو گئی تو اس پر عمل کرے۔ اور یہ کہنا تو اس سے بھی کم ضرور ہے کہ بائبل کا ہر سچا مطالعہ کرنے والا دعا کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے اگرچہ اُسے یہ جتا دینا مناسب ہوگا کہ وہ پہلے اپنا باقاعدہ مقررہ حصہ پڑھے اور پھر گھٹنے ٹیک کر جو کچھ پڑھا ہے اُسے دعا میں پیش کرے تاکہ نہ صرف خدا اُس سے کلام کرنے والا ہو بلکہ وہ بھی خدا کے علیم الفاظ میں خدا کے ساتھ کلام کرنے والا ہو۔

دیندار مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ سب معمولی باتیں ہیں۔ لیکن جس کی شاید سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ دھیان (meditation) کے لئے مدد کی ضرورت ہے۔ لڈن صاحب (Liddon's clerical life and work) کی کتاب میں اس مضمون کے بارہ میں ایک عمدہ فصل مخصوص ہے جس سے کہ مجھ مصنف کو بہت مدد

ملی ہے۔ بہت تھوڑے لوگ یہ جانتے ہیں کہ ہم کس طرح بائبل پڑھنے سے فایدہ اُٹھا سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد تو اور بھی کم ہے جو اس پر دھیان کرنا جانتے ہوں۔ ہم کچھ اس کا ذکر کریں گے کہ دھیان کیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ بائبل اپنے سامنے کھول کر اپنی کہنی کے بل ہو کر پڑے رہو۔ اور خاموشی سے ایک ایک آیت پڑھتے جاؤ۔ اور خیالات کو اِدھر اُدھر بھٹکنے دو۔ کسی آیت پر اس قسم کا اونگھنا مراد نہیں۔ یہ تو ساری رُوح کا کام ہے کہ وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ خدا کی طرف رجوع ہو۔ قوت حافظہ قوت متخیلہ۔ عقل اور ارادہ سب اس میں مصروف ہوں۔ یہ تو رُوح کو یاہوواہ کی حضوری میں رکھ دینا ہے۔ خدا کا دیدار حاصل کرنے کی یہ کوشش ہے ٭

اول تو اپنی قوت متخیلہ کو اس مقام پر اپنا پورا کام کرنے دو۔ فاعل یا مصنف کا خیال کرو۔ اپنے آپ کو اُس کی جگہ رکھ دو۔ اُس رسم پرست فریسی۔ حاسد فقیہہ۔ نادان بھیڑ اور اُس کے پرمحبت دل کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ جس نے ان سبھوں کو پیار کیا اور اُن کے دلوں کا مطلب سمجھا اور ان کی حفاظت کی۔ اور جب مقدس پولس کے کسی مقام کو پڑھو تو اپنے تئیں مصنف کی جگہ رکھنے کی کوشش کرو کہ اُس کی ذات و طبیعت کیسی تھی۔ ابھی وہ خوش نظر آتا ہے۔ ابھی وہ مایوس ہے۔ ابھی وہ دق اور غیر مطمئن ہے لیکن ہمیشہ ہر خیال میں اپنے مالک کا پورا وفادار ہے ٭

قوت متخیلہ کے اس استعمال سے اُس مقام کا مطلب سمجھنے میں مدد ملے گی۔ پھر عقل کو طلب کرو کہ وہ خدا کے سامنے حاضر ہو کر اُس کے پیغام کا مطلب سمجھے اور اُس مضمون کے معنی گرفت کرے اور اس میں سے خاص خیال کو چن لے ٭

یہ تو تیاری ہے۔ بعد اس کے مرضی اور ارادہ کا کام ہے۔ ایسا ارادہ جو سب سے اعلا کو پیار کرے۔ ایسا ارادہ جو سب سے افضل کی تقلید کرے۔ ایسا ارادہ جو اپنے تئیں تعظیم کے ساتھ خدا کی اُس محبت اور قربانی یعنی یسوع مسیح کے آگے سرنگوں کرے ٭

ایسا کرنے کی عادت کرو۔ اگر دن میں ایک دفعہ نہیں تو ہفتے میں ایک دفعہ لیکن جتنی دفعہ ہو سکے۔ سب سے مناسب مقام بائیبل کے اس مطلب کے لئے چن لو۔ مسیح کے دکھوں کا بیان۔ مسیح کے کلمات۔ اپنے پیارے لوگوں کے لئے مقدس پولس کی دعائیں یوں رُوح کو خدا کی حضوری میں ٹھیرنے دو۔ اپنے سارے باطن کو اُس کے آگے حاضر کرو اور اُس کے ساتھ بڑے ادب اور بھروسہ کے ساتھ کلام کرو۔ اُس کے آگے فروتنی سے گر پڑو۔ تاکہ وہ تمہاری روحوں سے متکلم ہو اور تم اُس سے روبرو کلام کرو جیسے آدمی اپنے دوست سے کلام کرتا ہے۔ دھیان کی عادت حاصل کرنے کے لئے سعی بلیغ کرو۔ ایسی حالت میں ہی رُوح سیکھ سکتی ہے کہ اپنے آپ کو کیسے ملامت کرے اور اپنے خدا کی تعظیم اور اُس سے محبت کیسے کرے ٭

مذہب کے عناصر

بائبل کے شروع کے صفحے ہم پر مذہب کے عناصر ایسے الفاظ میں منکشف کرتے ہیں گو وہ استعارہ کے طور پر ہوں تو بھی ان کے معنی بخوبی واضح ہیں۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک خالق ہے جس نے ساری دنیا کو موجود کر دیا (پیدائش ۱:۱)۔ اور آدمی کو اپنی صورت پر بنایا (پیدائش ۱: ۲۶ و ۲۷)۔ اور اُسے خود مختاری کے زیور سے آراستہ کیا۔ وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ آدمی نے اس نعمت کو کیسے غلط طور پر استعمال کیا اور جھوٹی خود مختاری کی تلاش میں وہ گناہ اور موت کی غلامی میں مبتلا ہو گیا (پیدائش ۳ + بمقابلہ رومی ۵: ۱۲)۔ ایسی غلامی جس سے رہائی صرف خدا ہی کی مدد سے حاصل ہو سکتی تھی۔ شریعت کی کتابوں خاص کر احبار کی کتاب نے الٰہی مدد کی اس ضرورت پر خاص زور دیا۔ چنانچہ قربانی کی تعلیم میں اُنہوں نے خدا کی قدوسیت پر بہت زور دیا (احبار ۱۱: ۴۵ + ۱۹: ۲ + ۲۰: ۷ وغیرہ)۔ اور آدمی کی اس ضرورت پر کہ وہ پاک ہو اور اپنے تئیں خدا کے سپرد کرے حالانکہ مزمور نویس اور انبیا توبہ کی روحانی بصیرت اور خدا کی اخلاقی شریعت کی اُس دلی اطاعت پر جس کے بغیر قربانی تمسخر سے بھی بدتر ہے (۱ سموئیل ۱۵: ۲۲ + زبور ۴۰: ۵ + ۵۱: ۱۶ و ۱۷ + یسعیاہ ۱: ۱۱ + ہوسیع ۶: ۶) +

ان میں سے بعض خیالات کم و بیش ناقص صورت میں ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ کسی روحانی وجود یا وجودوں پر انحصار رکھنا اور ان کے ساتھ شراکت ٹوٹنے کا علم اور اس وجہ سے کسی نئے اور خدا داد وسیلہ رفاقت کی ضرورت۔ یہ خیال اور نیز یہ سادہ خیالات کہ انسان اپنی مرضی سے تعظیم اور شکر گزاری کی قربانی گزرانے۔ ان ساری قربانیوں کی جڑ ہے جو غیر مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ مذہب کے بارہ

میں بائبل کی تعلیم کا اگر ہم اس زمانہ کے غیر مذاہب کی تعلیم کے ساتھ مقابلہ کریں۔ خاص کر جو مذاہب سِم کی بت پرست اولاد نے اختیار کر رکھے تھے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اُن سارے خیالات کو لے کر اُن کو زیادہ پاکیزہ اور خالص بنا دیتی اور ان کو سارے زمانوں کے لئے ایک قیمتی تعلیم کا وسیلہ کر دیتی ہے +

۱۔ خدا کا انسان کے ساتھ عہد۔ عہد عتیق کا ایک بڑا خیال وہ خیال جس کی وجہ سے یہ کتاب عہد عتیق کہلاتی ہے ایک عہد کا خیال ہے جو خدا اور انسان کے درمیان تھا۔ نوح کے ساتھ عہد۔ پیدائش ۶: ۱۸ + ابراہام کے ساتھ عہد (پیدائش ۱۲: ۱ سے ۳ + ۱۷: ۱ سے ۱۴ + ۲۲: ۱۶ سے ۱۸)۔ یعقوب کے ساتھ عہد۔ خروج ۲۴: ۷ + ۳۴: ۱۰ و ۲۷ + احبار ۲۶: ۹ + استثنا ۲۹: ۹ سے ۱۵ + ۳۱: ۲۴ سے ۳۰)۔ داؤد کے ساتھ عہد (زبور ۸۹: ۳ و ۲۸ و ۳۳ سے ۳۹)۔ ایک ایسا عہد جسے پولس شریعت پر مقدم اور اُس سے اعلیٰ ظاہر کرتا ہے (گلتیوں ۳: ۱۵ + خاص کر ۱۷)۔ اس عہد میں خدا گویا مہربانی کر کے وعدہ کرتا ہے کہ اگر انسان خاص شرائط کو پورا کرے گا تو وہ بھی اپنی طرف سے اس کے گناہوں کو معاف کر کے اُسے برکت دے گا۔ اس عہد کے حقیقی باطنی معنی اُس عہد کے نئے عہد نامہ میں ظاہر ہوتے ہیں (عہد عتیق جس کا ایک سایہ تھا)۔ جس کی خبر پہلے نبیوں نے دی (یرمیاہ ۳۱ + بمقابلہ عبرانی ۸: ۸ سے ۱۲ + ۲ کرنتھی ۳: ۶)۔ اور عشائے ربانی کے وقت مسیح نے جس کا اعلان دیا: "نئے عہد کا یہ میرا خون ہے" یا "یہ پیالہ میرے خون میں نیا عہد ہے" (متی ۲۶: ۲۸ + مرقس ۱۴: ۲۴ + لوقا ۲۲: ۲۰ + ۱ کرنتھی ۱۱: ۲۵) +

۲۔ عہد اور قربانی۔ جس عہد کا ذکر بائبل نے کیا وہ قربانی کے ذریعہ قائم ہوا (خروج ۲۴: ۵ + زبور ۵۰: ۵ + عبرانی ۹: ۱۵)۔ اس کا اصول کفارہ

ہے انسان اور خدا کے درمیان۔ (احبار کی کتاب خاص کر ۱۶ باب کا کفارہ کا
دن۔ اور عبرانی ۹ باب)۔ پرانے عہد کی قربانیاں تین نشان ہیں۔ مثلاً خطا کی قربانی
(احبار ۴ سے ۶)۔ سوختنی قربانی (احبار ۱: ۳)۔ سلامتی کی قربانی (احبار ۳: ۱
وغیرہ)۔ ان سے انسان کا رشتہ خدا کے ساتھ بخوبی واضح ہوجاتا ہے اور عارضی
طور پر ایمانداروں کی دینی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے وہ بتدریج نئے عہد کے
بڑے کفارہ تک پہنچاتا ہے جس میں ان کے سارے نقص جاتے رہتے اور ان کی
کمتیاں رفع ہوجاتی ہیں۔ خطا کی قربانی یہ سکھاتی ہے کہ شراکت ٹوٹ گئی کہ خدا کے
پاس جانے کا وسیلہ صرف زندہ خون کا بہانا ہے (احبار ۱۷: ۱۱)۔ جو کفارہ اور پاکیزگی
کا نشان تھا۔ سوختنی قربانی جس میں کہ قربانی کا جانور سارے کا سارا مذبح پر جلادیا
جاتا تھا اُس سے یہ مراد تھی کہ انسان بلاچون وچرا کلیہ طور پر اپنے تئیں خدا کے سپرد کردے
خدا یہی تعظیم انسان سے قبول کرسکتا ہے۔ سلامتی کی قربانی جس میں کاہن اور قربانی
چڑھانے والا خدا کے میز پر ضیافت میں شریک ہوتے ہیں وہ خدا اور انسان کے
درمیان خوش شراکت کا نشان تھا۔

۳۔ مسیح کی قربانی کفارہ کی۔ یہ سارے تصورات ہمارے خداوند کی
قربانی میں پورے ہوجاتے ہیں جیسا کہ نئے عہدنامے میں ظاہر کیا گیا۔ اس نے
اپنے آپ کو گناہ کے کفارہ کے لئے دے دیا۔ (رومیوں ۳: ۲۵ + ۱ یوحنا ۲: ۲
۴: ۱۰)۔ وہ باپ کے آگے کامل اطاعت کی قربانی تھی (فلپیوں ۲: ۸)۔ وہ اس کے
ممبروں کے لئے شراکت اور زندگی کا انعام تھا (یوحنا ۶: ۳۲ + ۱۰: ۱۰ + ۱۱: ۲۵
۱۴: ۶ + کلسیوں ۳: ۴)۔ عہد عتیق میں جو نمونے اور سایہ ہی ہیں (عبرانی ۱۰: ۱ +
بمقابلہ کلسیوں ۲: ۱۷)۔ وہ نئے عہدنامہ میں حقیقت سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً
عہد عتیق میں قربانی کا جانور بے علم اور بے مرضی ہوا کرتا تھا۔ لیکن مسیح اپنے تئیں

اپنی مرضی سے نذر چڑھاتا ہے (یوحنا ۱۰: ۱۷ و ۱۸)۔ اور اُس خوفناک وقت کی
طرف نظر کرتا ہے (لوقا ۱۲: ۵۰)۔ اس لئے کفارہ کا وہ تصور غلط ہے جو
یہ ظاہر کرتا ہے کہ غصے بھرے باپ نے معصوم بیٹے کو سزا دی۔ پھر عہد عتیق
میں قربانی کا جانور صرف شرعی اور رسمی طور سے چڑھانے والے کے ساتھ ایک
جان سمجھا جاتا تھا جو اپنا ہاتھ اُس جانور کے سر پر دھرا کرتا تھا اور اپنی جان کی بجائے
اُس کی جان کو چڑھایا کرتا تھا (احبار ۱: ۴)۔ لیکن مسیح کی قربانی حقیقی معنی میں
اُن کو اُس کے ساتھ ایک جان کر دیتی ہے جن کی خاطر وہ دی گئی تھی۔ یہ قربانی کا
جانور وہ چڑھانے والا خود ہے۔ مگر نوع انسان کے نمائندہ کی حیثیت میں وہ
قربانی چڑھانے والا ہے۔ جب مقدس یوحنا نے ہمیں بتایا کہ کلام مجسم ہوا (یوحنا
۱: ۱۴)۔ تو اُس نے ایسے تجسم کا ذکر کیا جس میں ابن خدا نے اپنے اوپر نہ صرف
کسی فرد انسان کے بدن کو اوڑھ لیا۔ بلکہ عام طور سے اُس نے ہماری انسانی ذات
کو اختیار کرلیا۔ اس اختیار کرنے کے نتائج عالمگیر تھے کیونکہ جس شخص نے یہ
ذات اختیار کی وہ قادر مطلق اور ہمہ جا حاضر تھا۔ یوں بقول مقدس پولس مسیح
نوع انسان کا بانی ثانی ہوگیا۔ یعنی آدم ثانی (۱ کرنتھی ۱۵: ۴۵ سے ۴۷ +
رومیوں ۵: ۱۲ سے ۲۱)۔ اس حیثیت سے حقیقی طور پر نہ کہ مجازی طور پر وہ کل نوع انسان
کا نمائندہ ہوگیا اور قادر مطلق خدا کے آگے تہری قربانی۔ یعنی کفارہ کی۔ تعظیم کی اور
شراکت کی قربانی چڑھانے کے قابل ہوگیا۔ علاوہ ازیں جو کچھ اُس نے ہم سبھوں
کے لئے پورا کیا۔ اگر ہم راضی ہوں تو وہ اب ہم میں سے ہر ایک میں فرداً فرداً
پورا کرسکتا ہے۔ اس کی الوہیت ہر ایک میں اُس کی روح القدس کی قدرت کے
ذریعہ وہی اثر کرتی ہے جو اس کی کامل انسانیت نے ایک ہی دفعہ ہمیشہ کے لئے
ہم سبھوں کے واسطے سرانجام دیا۔ اس لئے مخلصی اور پاکیزگی جو اس کے کفارہ

وسیلے ہر فرد روح کو اُس کے اندر بسنے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے وہ محض شرعی رسم نہیں اور نہ اُس کا ہماری خاطر اپنے تئیں قربانی چڑھانا ایک شرعی رسم ہے۔ مقدس پولس نے بیان کیا "مسیح تم میں جلال کی امید ہے" (کلسیوں ۱: ۲۷)۔ اُس کی فتحیاب قدرت جو اُن لوگوں میں اثر کرتی ہے جو اتحاد حاصل کر کے اُس کے بدن کے اعضا بن گئے ہیں اور جنہوں نے اپنی مرضیوں کو اس کی مرضی کے ساتھ ملا دیا ہے وہ اُن کو بتدریج بدل کر جوں جوں وہ ان میں بلوغت تک بڑھتا جاتا ہے اپنی شکل پر بناتی جاتی ہے۔ اور راستبازی کا جو اثر اس طرح سے پیدا ہوتا ہے وہ ٹھیک طور سے ہمارا بھی ہے اور اُس کا بھی ہے۔ وہ "فی الحقیقت ہماری راستبازی ہے" (۱ کرنتھی ۱: ۳۰)۔ ہم میں رہ کر وہ نہ صرف ہمیں اپنی کفارہ بخش موت کے ذریعہ گناہ کی قصورواری سے چھڑاتا ہے جس میں کہ وہ ہم کو شریک کر لیتا ہے (رومیوں ۶: ۳ و ۴ + ۲ کرنتھی ۴: ۱۰ + کلسیوں ۲: ۱۲ و ۲۰ + ۲ تیمتھیس ۲: ۱۱)۔ بلکہ اُس کے داغ اور غلامی سے بھی اُس کی قیامتی زندگی کی قدرت سے (کلسیوں ۲: ۱۳ + ۳: ۱ وغیرہ)۔ اُس کا روح القدس جس کے ذریعہ وہ ایماندار میں بستا ہے اُس کی روح کو جلال سے جلال تک بدلتا جاتا ہے اور اُسے خداوند کے کمال کا آئینہ بنا دیتا ہے (۲ کرنتھی ۳: ۱۸)۔

۴۔ اس کفارہ کے مادی نشان۔ ساکرمنٹس جیسے پرانے عہدنامہ میں خدا نے مہربانی کر کے مادی نشان دیئے تھے ویسے ہی اُس نے نئے عہد میں دیئے ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہ نشان نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔ "جب تک کوئی نئے سرے سے پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا" یا داخل نہیں ہو سکتا (یوحنا ۳: ۳ و ۵ و ۷)۔ اور بعد ازاں اُس نے اپنے

شاگردوں کو حکم دیا "تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ اُنہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو" (متی ۲۸: ۱۹)۔ پھر اُس نے یہ کہا "جو روٹی آسمان سے اُتری وہ میں ہوں۔ زندگی کی روٹی .... جو روٹی میں جہان کی زندگی کے لئے دوں گا وہ میرا گوشت ہے" (یوحنا ۶: ۳۳ و ۴۸ و ۵۱ و ۵۳)۔ کچھ عرصہ بعد اس نے پاک عشاء کے وقت روٹی اور مے لے کر کہا "یہ میرا بدن ہے۔ میری یادگاری کے لئے یہی کیا کرو" (لوقا ۲۲: ۱۹ و ۲۰)۔ یعنی انجیل کی دونوں بڑی ساکرمنٹیں (اگرچہ ان پر بہت بحث مباحثے ہو چکے ہیں خاص کر اصلاح کے وقت سے) سب مسیحی مانتے چلے آئے ہیں خاص کر نئے عہد کے تعلق میں کہ وہ مجسم نجات دہندہ کے ساتھ اتحاد کا نشان ہیں۔ کہ وہ ایسے ادنیٰ وسائل روحانی برکتوں کے پہنچانے کے لئے استعمال کرے وہ ہماری مرکب ذات یعنی مادہ اور روح کے نہ صرف عین مناسب ہے بلکہ اُس کے تجسم کے عجوبہ کے عین مطابق ہے جس میں کہ آسمان اور زمین کا آپس میں اختلاط ہو گیا (مقابلہ کرو یوحنا ۱: ۵۱)۔ ساکرمنٹوں کے بارہ میں یہ صحیح خیال ہے کہ وہ مسیح میں ہم تک خدا کے فضل پہنچانے کا اخلاقی وسیلہ ہیں۔ اُن میں جو خدا ہم کو عطا کرتا ہے وہ کل کی طرح یا جادو کی طرح نہیں نہ وہ محض نشان یا رسم ہیں۔ بلکہ ایک روحانی نعمت اور ان کا اثر ہم میں اس پر موقوف ہے کہ ہم کس نیت کے ساتھ ان میں شریک ہوتے ہیں۔ ان دونوں ساکرمنٹوں کے لائق طور پر لینے کے لئے توبہ۔ ایمان اور اطاعت شرط ہیں اور وہ خدا کے ساتھ صحیح رشتے کی لازمی شرائط بھی ہیں۔ اور یہ ضروریات خود روح القدس کے عطیات ہیں جو سرگرمی کے ساتھ دعا مانگنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

۵۔ بچوں کا بپتسمہ۔ جو مسیحی بچوں کو بپتسمہ دلاتے ہیں وہ اس لئے دلاتے ہیں کیونکہ وہ مانتے ہیں کہ (۱) بچوں کا بپتسمہ مسیح کی طبیعت اور اُس رسم کے صحیح

معنوں کے مطابق ہے کہ (۲) اُس کے معنی اور اثر کی ذمہ واری وہ ضامن لیتے ہیں
کہ جوں جوں بچہ بڑھے گا اُس کے وہ حقوق اور ذمہ واریاں سکھائی جائیں گی جو مسیح
کے عضو کے لئے ضروری ہیں اور کہ خداوند کی تربیت اور نصیحت کے ذریعہ ان انعامات
کی ترقی و تربیت ہوگی (افسیوں ۶: ۴)۔

بالغ شخص اپنے بپتسمہ کے وقت یہ عہد و پیمان خود کرتا ہے کہ میں گناہ کو ترک
کروں گا اور مسیح میں خدا کی رحمت کے مکاشفہ کو بھروسہ کے ساتھ قبول کروں گا
اور الٰہی احکام کی راہ میں چلوں گا۔ بت پرست ممالک میں یہ عموماً منادی کا نتیجہ ہے۔
(رومیوں ۱۰: ۱۴ و ۱۵)۔ کہ اس کے دل میں نور چمکنے لگتا ہے۔ پھر زیادہ مفصل تعلیم
کے بعد وہ عہد کے بپتسمہ کے پاس پہنچایا جاتا ہے +

۶۔ تبدیلی دل یا رجوع لانا۔ (Conversion)۔ یہ منظر رجوع
لانے کا اکثر وقوع میں آتا ہے اور جو لوگ مسیحی سوسائٹی میں تربیت پاتے ہیں اُن میں
بعض اوقات بہت عجیب طرح سے واقع ہوتا ہے اور جنہوں نے خاص کر بچپن میں
بپتسمہ پایا تھا۔ مختلف تاثیرات مثلاً دنیاداری۔ لاپروائی۔ بدجذبات وغیرہ کے
ذریعہ خدا کے فضل کی یہ آگ ان میں بجھ گئی ہوتی ہے۔ جیسے کانٹوں والی زمین میں
دنیا کی فکروں اور دولت کے ذریعہ بیج کا اُگنا رُک جاتا ہے (متی ۱۳: ۲۲)۔
آخر کار خدا کی آواز پھر کان میں آنے لگتی ہے۔ دل گناہ سے قائل ہو جاتا ہے اور
سچی توبہ اور مسیح کے ساتھ اتحاد اور اندر بسنے والے روح کی الٰہی تاثیرات پھر اپنا
کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ خدا کے ساتھ شراکت رکھنے کی پھلدار زندگی سے یہ
نتیجہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس تبدیلی دل کو بپتسمہ کے انعام کے ساتھ خلط ملط نہ کریں
جن بالغوں نے غیر مذاہب سے نکل کر بپتسمہ لیا ان میں یہ نعمت بپتسمہ سے پیشتر
آجاتی ہے۔ جیسے پولس میں (اعمال ۹: ۳ و ۱۸ + ۲۲: ۱۶)۔ اور جو لوگ بچپن

میں بپتسمہ پاتے ہیں اُن کو طبعاً یہ انعام بپتسمہ کے بعد ملتا ہے۔ بعض صورتوں میں جیسے
پولس کے معاملہ میں یہ تبدیلی دل آناً فاناً حاصل ہوتی ہے۔ بعضوں میں یہ بتدریج
اور متواتر ہے اور خدا تک بتدریج رسائی ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ بالتکرار
ظاہر ہوتی ہے اور آدمی کی ظاہری زندگی میں یہ خاص منازل کا نشان ہوتی ہے
جیسے استحکام اور پہلی پاک رفاقت کے وقت یا شادی اور والدین بننے کے وقت
روحانی زندگی میں یہ مختلف درجے ہیں +

سبھوں کے لئے یہ تبدیلی دل لازمی ہے۔ اور سبھوں کو یہ محسوس کرنا ضروری
ہے کہ وہ خدا باپ کا بیٹا ہے۔ ہمارے خداوند نے فرمایا "اگر تم نہ پھرو (یعنی تمہارے
دل نہ بدلیں) تو آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہوگے" (متی ۱۸: ۳) +

۷۔ دینی فرائض۔ پہاڑی وعظ میں ہمارے خداوند نے جن خاص فرائض
پر زور دیا وہ یہ تھے۔ روزہ (متی ۶: ۱۶ سے ۱۸)۔ خیرات (متی ۶: ۱ سے ۴)۔ اور
دعا (متی ۶: ۵ سے ۱۵)۔ یہ تینوں ساری دینی زندگی پر حاوی ہیں۔ اور ہمارے
خداوند کی کفارہ بخش قربانی کے تین پہلوؤں سے ظاہر ہوتے ہیں یعنی خطا کی قربانی
سوختنی قربانی اور سلامتی کی قربانی +

(۱) **دُعا۔** دعا روح کی شراکت اس کے خالق کے ساتھ ہے۔ اس کی اہمیت
اور اس کی حقیقت کو ہمارے خداوند نے اپنے نمونہ کے ذریعہ منکشف کیا (لکھا
ہے کہ وہ بہت گھنٹوں تک اکیلا دعا میں لگا رہتا تھا۔ متی ۱۴: ۲۳ + لوقا ۶: ۱۲ +
مرقس ۱: ۳۵)۔ اپنے احکام کے ذریعہ (متی ۹: ۳۸ + لوقا ۲۱: ۳۶ + مرقس ۷: ۲۰ +
۱۱: ۲۲ وغیرہ)۔ اور جو دعا نمونہ کے طور پر ہمیں سکھائی (متی ۶: ۹ سے ۱۳ + لوقا ۱۱: ۲
سے ۴)۔ یہ گویا فرزند خدا کی رُوح کا آسمانی باپ کے آگے انڈیل دینا ہے جس کی مرضی
کے ساتھ بیٹے کی مرضی کا اتفاق ہونا چاہئے۔ یہ رُوح کی وہ حالت ہے جس کو الفاظ

میں بہت بیان نہیں کیا جس کی نسبت مقدس پولس نے کہا کہ "بلاناغہ دعا مانگو" (۱-تھسلنیکیوں ۵: ۱۷) سو دعا میں محض توکل علی اللہ سے کچھ بڑھ کر ہے "تیری مرضی ہو" یہ مسیح کے الفاظ اور کاموں دونوں سے ظاہر ہے۔ چونکہ وہ ہمیشہ دانا سے کُل باپ کی مرضی کے تابع تھا اس لئے اس نے ہم کو دلیری دی کہ خاص چیزیں اُس سے مانگیں۔ سب سے پہلے روحانی نعمتوں کے لئے جن کی نسبت خدا کی مرضی کے بارہ میں کچھ شک نہیں ہو سکتا اور صرف ایک ہی ضروری شرط ہے۔ یعنی ایمان (لوقا ۱۱: ۱۳ + مقابلہ کرو متی ۱۲: ۳۱ + ۱۴: ۱)۔ نہ صرف روحانی برکتوں کے لئے۔ اُس نے گتسمنی باغ میں پیالے کے ہٹائے جانے کے لئے خاص دعا مانگی تھی اگر وہ خدا کی مرضی ہو (لوقا ۲۲: ۴۲ + عبرانی ۵: ۷) اپنی نمونہ کی دعا میں اُس نے ہمیں یہ سکھایا کہ ان درخواستوں کے بعد جو خدا سے تعلق رکھتی ہیں ہم روزانہ روٹی کے لئے دعا مانگیں (متی ۶: ۱۱)۔ شفا دینے کے معجزات میں اُس نے والدین اور دوستوں کی دعاؤں کا ان کے عزیزوں کی صحت کے لئے جواب دیا (متی ۸: ۵ + ۹: ۲ و ۱۸ + ۱۴: ۳۵ و ۳۶ + ۱۵: ۲۲ وغیرہ)۔

زمانہ حال میں دعا کے بارہ میں لوگ اکثر دو طرح حیرت میں مبتلا ہوئے۔ سائنس نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ خدا جہان میں قانون اور انتظام کے ذریعہ کام کرتا ہے اور ہر ایک شے ایک نہایت پیچیدہ طریقے سے عمل کر رہی ہے۔ اس لئے ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ پھر شخصی دعا کی گنجائش کہاں ہے؟ اگر میں کوئی خاص شے اپنے لئے یا اپنے کسی دوست کے لئے مانگوں گو یہ کوئی اعجازی شے بھی نہ ہو تو کیا میں یہ فرض نہیں کرتا اور بے فائدہ فرض نہیں کر رہا کہ خدا سے اُس کے قانون کے برخلاف کوئی شے طلب کروں۔

سب سے پہلے جواب یہ ہے کہ اگر خدا قانون اور انتظام کے ذریعہ کام کرتا ہے اور قوائے فطرت ایک دوسرے کے مطابق اپنا عمل کرتی ہیں تو ایمان کی دعا

کی قوت اس انتظام سے باہر نہ ہوگی بلکہ اس میں ایک موثر قوت ہوگی۔ علاوہ ازیں ہم ہر دعا کے ساتھ کہتے ہیں کہ تیری مرضی ہو اور ہم اپنی نادانی کا اقرار کرتے ہیں۔ اور جس قدر ہم اس کے علم اور پیار میں ترقی کرتے ہیں ہماری اپنی مرضیاں خواہ مخواہ اس کی مرضی کے مطابق ہوتی جاتی ہیں اور یہ ناممکن ہوتا جاتا ہے کہ ہم کوئی فضول اور ناشایستہ درخواستیں اُس کے سامنے پیش کریں۔ پھر جیسے مقدس آگسٹین نے ذکر کیا ہم کو یہ حکم ہے کہ جو کچھ مانگیں یسوع کے نام سے مانگیں (یوحنا ۱۵: ۱۶ + ۱۶: ۲۳ و ۲۶)۔ جو ہمارا نجات دہندہ ہے۔ اگر کوئی شے نادانی سے مانگی جائے جس کے مل جانے سے خدا کے ارادہ کی مخالفت ہو تو ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہم کو نہ ملے گی کیونکہ وہ فی الحقیقت نجات دہندہ کے نام سے نہیں۔ آخر کار جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا مسیح یہ صاف واضح کر دیتا ہے کہ ایمان داروں کے لئے ایسی چیزیں مانگنا جن کے وہ محتاج ہیں بالکل جائز ہے۔ اور اس کی اس نے ہم کو کئی مثالیں دی ہیں۔ زمین پر اپنی رحمت کے کاموں کے ذریعہ اور ایمان کی ایسی دعاؤں کے جوابوں کے ذریعہ جہاں بالکل مایوسی نظر آتی تھی۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ جب اُس نے کسی کے بدن کو اچھا کیا تو اُس نے کچھ روحانی برکت وصحت بھی عطا کی (متی ۹: ۲ و ۶ وغیرہ)۔

جس دعا کا ذکر ہمارے خداوند نے خاص کر پہاڑی وعظ میں کیا وہ اُس خدا کے ساتھ گہری شخصی رفاقت ہے "وہ باپ جو پوشیدہ میں دیکھتا ہے وہ بدلا دے گا" (متی ۶: ۶)۔ فریسیوں کی ظاہرا دعاؤں کے مقابلہ میں دعا کے اس پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے (متی ۶: ۱۵)۔ البتہ اس میں وہ عبادت عام منع نہیں جس میں خدا کے لوگ پرانے عہد اور نئے عہد دونوں میں اپنی مجموعی زندگی کو ظاہر کرتے رہے۔

(۲)۔ روزہ۔ روزہ یعنی خطا کی قربانی کی روح۔ یا طہارت اور ریاضت

اور خیرات کی رُوح۔ سوختنی قربانی کی رُوح یعنی توکل علی اللہ کی دعا کی طرح پہاڑی وعظ میں مان لیا گیا ہے اور اس امر پہ زور دیا گیا کہ خلوص دل سے بلا ظاہر داری کے ہو +

ریاضت نفس جو روزہ کا باطنی اصول ہے اُس ابتری کے باعث لازمی ہو گیا جو گناہ نے ہماری فطرت میں ڈال دی ہے۔ رسول کو بھی اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مقدس پولس کہتا ہے کہ میں اپنے بدن کو تابع رکھتا ہوں اور اس کو مطیع بناتا ہوں (اکرنتھی ۹: ۲۷ + مقابلہ ۲ کرنتھی ۶: ۵ + ۱۱: ۲۷)۔ یہ دنیا کا جسم کا۔ اور شیطان کا ترک کرنا ہے جو ابتدا ہی سے مسیحی بپتسمہ کے ساتھ ملحق رہے ہیں اور طہارت نفس میں انسان رُوح القدس کے ساتھ ہم خدمت ہوتا ہے۔ اس کا اظہار خود انکاری کے کاموں میں ہوتا ہے۔ اور یہ مسیح کے سچے شاگردوں کا نشان تھا (متی ۱۶: ۲۴)۔ اور شاید اس سے بھی زیادہ زندگی میں خدا کی چند در چند نعمتوں کو خوشی سے قبول کر لینے میں +

(۳) **خیرات**۔ توکل علی اللہ جو خیرات کا اندرونی اصول ہے وہ اس امر کا تسلیم کر لینا ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اور جو کچھ ہم ہیں وہ سب کچھ دُہرے طور سے خدا کی طرف سے ملا ہے۔ جس نے پہلے ہمیں بحیثیت خالق کے ہمیں ہستی عطا کی۔ پھر بحیثیت نجات دہندہ کے ہمیں ایک قیمت سے یعنی یسوع مسیح کے قیمتی خون کے وسیلے مول لیا (اکرنتھی ۶: ۲۰ + ۷: ۲۳) +

ہر سہ ان کاموں میں ہم مسیح کے ساتھ اتحاد کو محسوس کرتے ہیں۔ پس ان تین اصولوں میں جو روزے۔ خیرات اور دعا میں ظاہر کئے گئے ایمان دار نجات دہندہ کے ساتھ اس کے کفارہ کے بہترے فعل میں اتحاد حاصل کرتا ہے اور خدا کے اندر بسنے کی قدرت سے ایمان دار کا گنہگار بدن بتدریج پاک ہوتا جاتا اور مسیح کی

بے داغ انسانیت کی مانند بنتا جاتا ہے۔ اُس کی مرضی اُس کی کامل مرضی کے مطابق ہوتی جاتی اور اُس کی زندگی خدا کی زندگی کے ساتھ شراکت حاصل کرتی جاتی ہے اور اسی طرح الگ الگ ایمان دار اُس مخلصی یافتہ انسانیت کی پاک قربانی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یعنی جو قربانی مسیح نے صلیب پر ایک دفعہ سب کے لئے گزرانی اور اُن میں بتدریج اثر کرتی جاتی ہے جو اُس کے ساتھ متحد ہوتے جاتے ہیں۔ الگ الگ مسیحیوں کا پاکیزہ ہوتے جانا ایک طرح سے خود مسیح کی اشاعت ہے اور مخلصی یافتہ کل بدن کے کمال کا ایک نمونہ ہے جس کی نسبت مقدس پولس کہتا ہے "مسیح کے قد کے پورے اندازے تک پہنچنا" (افسیوں ۴: ۱۳) +

۵۔ **توبہ**۔ ایمان داروں کے گناہ۔ ایسا کہنا تو غلطی میں داخل ہو گا کہ پاکیزگی کا یہ عمل برابر ترقی کن ہے۔ چونکہ بہت مرتد ہو گئے اور کلیسیا میں کبھی زوال کا زمانہ آیا اور کبھی لوگ بے وفا ثابت ہوئے پرانے اور نئے عہد نامے دونوں میں۔ اس لئے فرداً فرداً مسیحی کی زندگی صعود اور زوال کا ایک حیرت انگیز اختلاط ہے عہد عتیق میں ایسی بہت مثالیں ملتی ہیں کلیسیا میں اور شخصی زندگیوں میں اس کی بہت نظیریں پائی جاتی ہیں۔ قوم کا بار بار خدا سے برگشتہ ہونا۔ بہتری آدمیوں کا گناہ میں پڑنا خود اسرائیل کا گمراہ ہونا۔ موسیٰ اور داؤد جیسے اشخاص کا گناہ میں پڑنا یہ ناکامیابیاں گو خطرناک تھیں لیکن عام قوم پر خدا کی مہربانی کو انہوں نے معدوم نہیں کر دیا۔ نئے عہد نامہ میں اکیلے پطرس کا نام لینا ہی اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہو گا کہ مسیح کے ساتھ گہری رفاقت رکھنے کے بعد بھی گرنے کا امکان اور سچی توبہ کے بعد پوری بحالی کا یقین تھا +

عبرانیوں کے خط میں ایک مقام ہے جس میں ایسے گرنے کا ذکر ہے جس کے بعد از سر نو بحال ہونا ناممکن ہے (عبرانی ۶: ۴ سے ۶)۔ اور ہمارے خداوند نے بھی

نہایت عبرت کے الفاظ استعمال کئے جب روح القدس کے خلاف کفر کا ذکر کیا
کہ جس کی کبھی معافی نہیں ہو سکتی (مرقس ۳: ۲۹)۔ ہم درستی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دو
گناہ یہ ہیں۔ معلوم صداقت کے خلاف دانستہ اور ارادتاً عمل کرنا۔ اور ہم اس ناقابل
معافی گناہ اور بشری کمزوری کے اُن قصوروں میں امتیاز کریں جو بار بار ہوتے
رہتے ہیں۔ اور جن کی نسبت مسیح نے خاص حکم دیا کہ ہم معافی مانگیں (متی ۶: ۱۲ و ۱۴)۔
گو نئے عہد نامے میں مسیح کے ایمان دار اعضا مقدس یا پاک لوگ کہلاتے ہیں (مثلاً
رومیوں ۱: ۷ + ۱۵: ۲۶ + ۱۶: ۱۵ + ۱ کرنتھیوں ۱: ۲ + ۶: ۱ + ۱۴: ۳۳ وغیرہ)۔ اور
مقدس یوحنا کامل ایمان دار کا یہ ذکر کرتا ہے کہ "جو خدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ
نہیں کرتا"۔ بلکہ نہیں سکتا (۱ یوحنا ۳: ۶ و ۹)۔ تو بھی خداوند کو یہ خیال تھا کہ یہ
ایمان دار شائد راہ راست سے بھٹک جائیں گے ورنہ وہ اپنی نمونہ کی دعا میں
یہ جملہ نہ ڈالتا "ہمارے قصوروں کو معاف کر"۔ اور نہ ہم یہ بھول سکتے ہیں کہ
مقدس یوحنا نے اسی خط میں ایمان داروں کو معافی اور پاکیزگی کے بارہ میں
صاف تعلیم دی جو گناہوں کا اقرار کرنے سے حاصل ہو سکتی تھی (۱ یوحنا ۱: ۹ و ۱۰)۔
اس لئے مسیحیوں نے یہ درستی سے سمجھا کہ افراد کے لئے اور جماعتوں کے لئے گناہوں
کا اقرار خدا کے فضل میں قائم رہنے کی ضروری شرط تھی۔ پاک شراکت میں شامل ہونے
کے لئے خاص کر اس کی ضرورت ہے۔ اور مسیحیوں کے سب فرقوں نے اس بات
کو تسلیم کر لیا ہے۔ کتاب مقدس میں لکھا ہے کہ جب آدمی سچے دل سے اپنے گناہ
کا اقرار کرتا اور اس پر افسوس کرتا اور اصلاح کا پورا ارادہ کرتا ہے جس کے
ذریعہ روح دنیا۔ جسم اور شیطان کو ترک کر سکتی ہے تو اُسے باپ کی طرف سے
معافی ملتی اور اُس کے ساتھ موثر شراکت حاصل ہوتی ہے +

۱۰۔ ابدی زندگی۔ مسیح میں خدا کے ساتھ روح کی شراکت۔ جیسے پرانے

عہد کے الفاظ میں نئے عہد نامہ نے "خدا کا عرفان" کہا (دیکھو ہوسیع ۴: ۱ + ۶: ۶ و ۳۴: ۹۶
یوحنا ۱۷: ۳ + فلپیوں ۱: ۹ + کلسیوں ۱: ۱۰ وغیرہ)۔ اُسے مقدس یوحنا نے
"ابدی زندگی" کہا ہے (یوحنا ۱۷: ۳)۔ اس جملے سے رسول کی مراد اس انعام
سے تھی جو اس وقت حاصل تھا نہ آئندہ انعام سے۔ لا کلام یہ انعام تو ہے لیکن اس دنیا میں ناقص
طور سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کا پورا کمال ایمان دار مرنے کے بعد حاصل کرتا
ہے (۲ تمتھیس ۴: ۸۔ مکاشفہ ۲: ۱۰)۔ اس زندگی میں بھی ایمان دار اس کا حظ
اٹھاتا ہے۔ عہد عتیق کے مزمور نویسوں نے بھی اس صداقت کو سمجھ لیا اور خدا
کے ساتھ اس زندگی میں شراکت رکھنا آئندہ زندگی کے لئے اعلےٰ دلیل تھی
(زبور ۱۶: ۸ سے ۱۱ + ۱۷: ۱۵)۔ اس دلیل کو ہمارے خداوند نے بھی استعمال
کیا جب اُس نے کہا کہ ابراہیم۔ اضحاق اور یعقوب کا خدا مُردوں کا خدا نہیں
بلکہ زندوں کا خدا ہے۔ کیونکہ سب اُس کے پاس زندہ ہیں (لوقا ۲۰: ۳۷
و ۳۸)۔ جیسے یہ جملہ خدا کی بادشاہی یا آسمان کی بادشاہی۔ بعض اوقات زمین
پر کامل اور جنگ کرنے والی کلیسیا کے لئے استعمال ہوتا ہے (متی ۱۳: ۲۴ و
۴۷)۔ اور بعض اوقات آئندہ کی کامل اور فتحیاب کلیسیا کے لئے بھی (متی
۲۵: ۳۴)۔ اور یہ درست بھی ہے کیونکہ یہ ایک ہی شے کے دو مختلف درجے
ہیں۔ یہی حال "ابدی زندگی" کا ہے۔ جونہیں آدمی مسیح کو قبول کر لیتا ہے۔ اور
اس کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے وہاں ہی یہ زندگی شروع ہو جاتی ہے اور اُس کا
کمال اس وقت ہو گا "جب ابن آدم اپنے جلال میں آئے گا" +

۱۱۔ موت اور عدالت۔ بہشت اور دوزخ۔ زندگی کے
بالمقابل موت ہے۔ خدا کی دانستہ خلاف مرضی کرنے کے باعث آدمی کو موت
کی سزا ملی "جس دن تو اس میں سے کھائے گا تو مرے گا" (پیدائش ۲: ۱۷)۔ کتاب

مقدس میں جس موت کا اس طرح سے ذکر آیا ہے وہ بالخصوص یا اولاً طبعی بدنی موت نہ تھی جس میں بدن تحلیل ہو جاتا ہے۔ بلکہ بدن اور رُوح دونوں کی موت جس کا ذکر مسیح نے ایسی سنجیدگی سے کیا (لوقا ۱۲: ۵)۔ اگر خدا زندگی ہے اور انسان کی ابدی زندگی اُس کے ساتھ گہری اور متواتر شراکت پر مشتمل ہے تو کسی خاص عقیدہ کی ضرورت اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے نہیں کہ اُس سے علیحدگی کیسی ہولناک ہوگی۔ اس مضمون کے بارہ میں کتاب مقدس کی عبارت بہت پُر زور ہے (متی ۲۵: ۴۱ و ۴۶ + مرقس ۹: ۴۸)۔ لیکن اس کے دہشتناک بدل کے سمجھنے کے لئے اس سے بڑھکر اور کیا مدد مل سکتی ہے کہ مسیح نے ہماری مخلصی کے لئے کیسے بڑے دُکھ اُٹھائے۔ جو قیمت ادا کی گئی اس کے ذریعہ اس مخلصی کی قدر و منزلت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یُوں مسیح کے دُکھ باغ گتسمنی کی حالت نزع سے لے کر صلیبی موت تک دل کی تبدیلی کے لئے سب سے زیادہ محرک ثابت ہوئے ہیں۔ یہ ہم کو محبت اور خوف کی دُہری زنجیر کے ذریعہ کھینچتے ہیں۔ خوف تو اس اٹل سزا کا جس کے ہٹانے کے لئے ایسی قیمت ادا کرنی پڑی اور اُس سے محبت جس نے ہماری محبت کی خاطر اپنی خوشی سے ایسی قیمت ادا کی۔ گناہ سے نفرت کا اور اُس کے ہولناک نتائج کا کافی اندازہ صلیب ہی کے ذریعہ لگ سکتا ہے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ نتائج صرف زمانہ آئندہ ہی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ جیسے کوئی سمجھے کہ مسیح کے ساتھ نجات بخش نتائج صرف زمانہ آیندہ سے متعلق ہیں۔ جیسا عہد عتیق میں کہا گیا تھا کہ "جس دن ... اُس نے نافرمانی کی وہ یقیناً مرے گا۔" ویسے عہد جدید میں مقدس یوحنا نے لکھا ہے کہ "جس کے ساتھ خدا کا بیٹا نہیں اُس کے ساتھ زندگی نہیں" (۱ یوحنا ۵: ۱۲)۔ اور "جو محبت نہیں کرتا وہ موت میں رہتا ہے" (۱ یوحنا ۳: ۱۴ و ۱۵)۔ مگر ان دونوں صورتوں میں کمال خواہ موت کا ہو خواہ زندگی کا وہ

قبر کے بعد ہوگا۔ اور کتاب مقدس میں بیان ہے کہ نوع انسان کی آیندہ ابدی حالت عدالت کے بعد ہوگی۔ جس دن سبھوں کو مسیح کے تخت عدالت کے روبرو کھڑا ہونا ہوگا (رومیوں ۱۴: ۱۰ + ۲ کرنتھی ۵: ۱۰)۔ نہ صرف رسولوں کے الفاظ سے بلکہ خود مسیح کے الفاظ سے یہ بخوبی ظاہر ہے (متی ۲۵: ۳۱ و ۳۲)۔ اس عدالت کے بعد مُردوں کی عام قیامت مسیح کی دوسری آمد کے وقت ہوگی (یوحنا ۵: ۲۸ و ۲۹)

۱۲- فردوس۔ اگر ہم پوچھیں کہ جو لوگ اِس زندگی سے اُس وقت سے پہلے ہی رحلت کر چکے ہیں اُن کا کیا حال؟ تو جو الفاظ خداوند نے تائب چور سے کہے تھے کہ "آج تو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا" (لوقا ۲۳: ۴۳) جس کی ایک طرح کی تفسیر دولتمند اور لعزر کی تمثیل میں پائی جاتی ہے (لوقا ۱۶: ۲۰-۲۶)۔ ایسی حالت پر دلالت کرتے ہیں جس میں ایمان دار کی رُوح خاص معنی میں مسیح کے ساتھ ہوتی ہے ایسی قربت کی حالت جو اس دنیا میں نصیب نہیں۔ اس حالت کی طرف مقدس پولُس نے اشارہ کیا جب اُس نے کہا کہ "میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ کوچ کر کے مسیح کے پاس جا رہوں کیونکہ یہ بہت ہی بہتر ہے" (فلپیوں ۱: ۲۳)۔ یہ حالت "انتظار" (عبرانی ۱۱: ۳۹ و ۴۰ + مکاشفہ ۶: ۹) ایمان داروں کی کسی قدر اُس تمثیل میں بیان ہوئی جہاں دولتمند کے عذاب کا ذکر ہے۔ اور وہ اُس جہنم کے عذاب کا کچھ ماقبل ذائقہ ہے (مرقس ۹: ۴۳ سے ۴۸)۔ جس تشبیہ کے ذریعہ ہمارے خداوند نے شریروں کی آخری حالت کا ذکر کیا۔ اُس نے فرمایا کہ آگ تیار کی گئی ہے "شیطان اور اُس کے فرشتوں کے لئے" (متی ۲۵: ۴۱)۔ ہماری موجودہ حالت میں آسمان کی خوشی یا دوزخ کے عذاب کا بیان صرف تشبیہی طور پر ہی بیان ہو سکتا ہے۔ اس لئے کتاب مقدس کی عبارت (گو اُسے بہت احتیاط سے استعمال کرنا چاہئے) بہت سنجیدہ اور عبرت ناک ہے۔ اور جب سب کچھ بیان ہو چکا تو اس سے بڑھ کر ہولناک بیان اُس

عذاب کا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اُس خدا سے جو زندگی اور محبت ہے دائمی مستقل اور مطلق علیحدگی ہے +

۱۳۔ ایمان مسیح پر مخلصی دہندہ اس لئے ہمیں عطا ہوا تاکہ وہ ہمیں اس بد انجام سے بچائے کیونکہ خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے" (یوحنا ۳: ۱۶)۔ اُس پر یہ ایمان جو کہ محض عقلی پسندیدگی خاص تعلیموں کی نہیں بلکہ کل ذات کا پورے بھروسہ اور تعظیم کے ساتھ اُس کی طرف نکل جانا ہے۔ اُس کا قدرتی نتیجہ سرگرم محبت ہے اور محبت کے ہمراہ صبر کے ساتھ اطاعت اور فرماں برداری آتی ہے۔ یوں مقدس یعقوب کی تعلیم مقدس پولس کی تعلیم کا تکملہ ہے۔ گو ایک معنی میں ایمان ہی ایک ضروری شے ہے کیونکہ اس کے ذریعہ رُوح کھل جاتی ہے تاکہ خدا کے فضل کو قبول کرے اور اسی طرح اس کا ہمارے اندر داخل ہونا ممکن ہو جاتا ہے۔ تو بھی ایمان بلا اعمال کے نہ صرف مُردہ ہے بلکہ ایسا ایمان خیال میں بھی نہیں آ سکتا (یعقوب ۲: ۱۷) +

جیسا ہم نے ذکر کیا ایمان خدا کی طرف سے اُن کو انعام ہے جو اسے چاہتے اور قبول کرنے کو تیار ہیں۔ یہ سارے زمانوں میں آدمی کی رُوح میں رُوح القدس کے موثر کام کرنے کے لئے لازمی ہے۔ جیسے ہمارے خداوند کی خدمت کے دنوں میں یہ ایک لازمی شرط تھی جس کے بغیر وہ خود بھی آدمیوں کے درمیان معجزے نہ کر سکتا تھا (متی ۱۳: ۵۸) +

یہ شاید ایمان کی تحریک کے لئے ہے کہ بعض مشکلات مثلاً بدی اور دُکھوں کے مسئلے ہمارے لئے لاینحل رہتے ہیں اور بعض انجام ہم سے پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔ یہ ہمارے اعتبار کو پیدا کرنے اور ایمان کی راستی ظاہر کرنے کے لئے کافی بتایا گیا ہے

اگر سب کچھ واضح اور روشن ہوتا تو ایمان کی تربیت کی کچھ گنجائش نہ ہوتی۔ تب ہم ایمان سے نہیں بلکہ دیکھ دیکھ کے چلتے (۲ کرنتھی ۵: ۷ + بمقابلہ یوحنا ۲۰: ۲۹ + ۱ پطرس ۱: ۸) +

مسیحی دین کی یہ خاص خاص بڑی بڑی باتیں ہیں اور جیسے ایمان دار کی پہچان کی جاتی ہے۔ اگر اس کا بھی اس کے پھلوں سے اندازہ لگائیں تو ہمیں نتیجہ کے بارہ میں کوئی خوف نہ ہوگا۔ نہ محض کثرت الالٰہ دینوں سے اس کا مقابلہ کرو جو ایک وقت یورپ میں مروج تھے بلکہ اُس کے اُن بڑے حریفوں سے جن کی عزت نوع انسان کا ایک بڑا حصہ کرتا ہے۔ مثلاً بُدھ مذہب اور محمدی مذہب سے۔ تب اس کی فوقیت اور بھی ظاہر ہوگی اور اس کی صداقت کی راستی اور بھی زیادہ ظاہر ہو جانے کی۔ ذرا سوچو کہ کلیسیا نے یورپ کے لئے اور مغربی تہذیب کے لئے ان اُنیس صدیوں میں کیا کچھ کیا۔ اس نے عظیم الشان رومی سلطنت کو موثر کیا جب کہ اُس کے اخلاق بگڑے ہوئے تھے اور اُس کے قوانین اور سلطنت کو زیادہ قیام دیا اور ان کو پاک صاف کیا جب کہ قدیم سلطنت کا جو کہ دُنیا کی ملکہ تھی نقارہ اجل بجا اور شمال کی وحشی قومیں اس کی حدود پر چڑھ آئیں تو کلیسیا نے اُن کو سدھارنا اور مہذب بنانا شروع کیا۔ اور مسیح کی کامل انسانیت کے لازوال خزانے میں سے ہر قوم و ملت کو ایسی برکتیں عطا کیں جو ان قوموں کی حالت کے عین مناسب تھیں جن کے وسیلے اُن کو ہر طرح کی ترقی حاصل ہوئی۔ اور یوروپ کی سیرت میں جو کچھ اعلٰے اور افضل ہے وہ سب کچھ اسی کی بدولت ہے۔ اور جو کچھ اُس نے الگ الگ قوموں کے لئے کیا اگر ان میں سے ایک ترتیب پیدا کر دی۔ اب وہ ساری قوموں کے لئے بحیثیت مجموعی کر رہی ہے کہ صلح اور عدالت کی حمایت میں دنیا کی عام رائے پیدا کرے +

تمدنی طبقے میں اُس نے خاندانی حالت میں بڑی ترقی کی خاص کر عورتوں کی حالت

میں غلامی کو تو اس نے موقوف کرا دیا اور جسے قدیم جہان نہ کر سکا اس نے کر کے دکھا دیا کہ ہر انسان کی قدر و قیمت کیسی اعلےٰ ہے اور اُس نے ساتھ ہی عالمگیر اصولوں کی تلقین بھی کی یعنی عالمگیر برادری اور سارے انسانوں کا ایک ہی بدن کے اعضا ہونا۔ علم کے طبقہ میں جہاں مسیحی کلیسیا پر اکثر الزام لگایا گیا کہ علمی ترقی میں وہ کچھ رکاوٹ کا باعث ہوئی ہے اس نے خیالوں کو بے لگام اور بادہوائی ہونے سے بے شک روکا لیکن تفتیش و تحقیق کو تحریک دی اور یہ ظاہر کیا کہ خلقت کے اور انسانی ذات کے عجائبات خالق کے جلال اور حسن کا آئینہ تھے۔ بائیبل کا مذہب ایسا ہے کہ گو اُس کی نظر غائی آیندہ جہان پر ہے (۲ کرنتھی ۴: ۱۸)۔ وہ خدا کی مرئی خلقت میں بھی دلچسپی بڑھاتا ہے کیونکہ بائیبل نے بیان کیا ہے کہ یہ اُس کی قدرت اور الوہیت کا اظہار ہے (رومی ۱: ۲۰)۔ اور سب سے بڑھ کر نوع انسان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی تحریک دیتا ہے یعنی تاریخ اور علم الانسان وغیرہ کی۔ کیونکہ بائیبل میں بیان ہے کہ جس کو اُس نے اپنی صورت پر بنایا۔ اس کی تربیت اُس نے کس طرح سے کی اور اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا (پیدائش ۱: ۲۶ و ۲۷)۔ ◆

فلسطین

فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے جو ویلز سے بڑا نہیں لیکن یہ قدیم مہذب جہان کا مرکز تھا اور مصر سے اسور تک قوموں کی آمد و رفت کی شاہراہ پر واقع تھا یہ پہاڑی علاقہ تھا جس کی آب و ہوا دریائے نیل کے ڈیلٹا اور بابل کے میدانوں سے زیادہ بہتر تھی اور اناج و روغن وغیرہ میں مالا مال۔ اسی وجہ سے مصر اور اسور کے بادشاہوں کی آنکھ اس پر لگی رہی۔ اگرچہ اس کا کوئی بندرگاہ نہ تھا لیکن عین شمال میں اہل فنیکی کی بڑی بحری تجارت تھی اور ان کی بستیاں افریقہ اور یورپ میں قائم تھیں۔ ◆

دان سے بیرسبع تک سرزمین یعنی شمال سے جنوب تک طول میں ۱۵۰ میل اور چھ ہزار مربع میل یردن کے مغرب کی طرف تھی اور چار ہزار مشرق کی طرف موآب۔ جلعاد اور بسن میں۔ مغربی فلسطین پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جن کی بلندی سطح سمندر سے تین ہزار فٹ سے زیادہ نہیں۔ مغرب کی طرف ایک وسیع میدان تھا۔ اور مشرق کی طرف یردن کی گہری وادی تھی۔ پہاڑوں میں چونے کے پتھر ہیں اور میدانوں میں عمدہ زمین ہے۔ ان کے کنارہ پر ریت ہے۔ زیرین گلیل میں کوہ کرمل کا سلسلہ شمال مغرب کی طرف نکلا ہوا ہے۔ اور جلبوعہ کا سلسلہ مشرق کی طرف جاتا ہے۔ اور اسدرالیون کا مثلث ٹکڑہ ان کے درمیان حائل ہے۔ جس کے شمال کی طرف ناصرت اور زیرین گلیل کی پہاڑیاں ہیں اور مشرق کی طرف کوہ تبور۔ شمال کی طرف بالائی گلیل کے پہاڑ ہیں اور اُن تنگ میدانوں اور پہاڑیوں کی طرف اُن کا ڈھلوان ہے جو عکو اور صور کے مابین واقع ہیں۔ اس ملک کے وسط میں عیبال اور

گرازیم سب سے بلند چوٹیاں ہیں جنہیں سکم کی تنگ وادی نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یروشلم اور حبرون کے پہاڑوں اور شرون اور فلسطیہ کے میدانوں کے درمیان دامن کوہ کا علاقہ ہے جس کا نام بائبل میں شفیلہ آیا ہے۔ یہ شمال کی طرف کوہ کرمل تک پھیلا ہوا ہے اور مغربی کناروں پر جہاں سمندر کی مغربی ہوائیں چلتی ہیں چھوٹے چھوٹے درختوں کا جنگل ہے۔ دامن کوہ زیتون کے پیڑوں سے اور میدان اناج کے کھیتوں سے سرسبز ہیں۔ حبرون کے پہاڑ اور ان میں سے اکثر تاکستان سے ہرے بھرے رہتے ہیں۔ لیکن پہاڑیاں خاص کر یروشلم اور سکم کے اردگرد ننگی اور بنجر ہیں۔ سارے ملک میں چشمے زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ مشرقی ڈھلوان چٹیان اور بنجر ننگے ہیں۔ اور اس طرف جنوب کی سمت یہودیہ کا صحرا ایک ویران سفید سلسلہ ہے جس میں مردہ سمندر کے اوپر بڑے بڑے کراڑے ہیں۔ جنوب کی طرف پہاڑ حبرون سے بیر شبع کے گھاس دار میدانوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

شرون میں کئی زمین دوز نالے ہیں۔ اور کرمل کے نیچے دریائے کشیون تبور سے نکل کر سمندر میں گرتا ہے کیونکہ صور کے جنوب کی طرف یہ ایک خلیج ہے بعض دیگر نالے دریائے یردن میں جا ملتے ہیں جن میں سے مشہور یہ ہیں۔ دریائے عینون سکم کے شمال مغرب کی طرف۔ اور وادی یزرعیل میں ایک نالہ ہے۔ یردن دان کے نزدیک سے نکلتا ہے یعنی حرمون کے دامن میں سے اور حُلہ (Huleh) دلدلوں میں سے گزرتا ہے۔ اور دریائے گلیل میں جا گرتا ہے جس کے کراڑوں کا عکس پانی میں نظر آتا ہے۔ پھر وہاں سے چل کر یہ بحیرہ مردار تک پہنچتا ہے جو بحیرہ روم کی سطح سے تیرہ سو فٹ نیچے ہے اور یہ درختوں کی جھاڑیوں میں سے گزرتا ہے اور عرض میں کبھی ۳۰ گز سے زیادہ نہیں ہوتا اور اس کے تقریباً تیس گھاٹ ہیں۔ آخری گھاٹ یریحو کے میدان کے بالمقابل ہے لیکن اس کا سیلاب بہت تیز

ہے خاص کر دمانہ کے نزدیک۔ بحیرہ مردار ۱۰ میل عرض میں اور ۴۰ میل طول میں ہے اور اس کے دونوں کناروں پر کراڑے کبھی کبھی ایک ہزار فٹ بلند سطح آب سے ہیں۔

یردن کے مشرق کے ملک میں تقریباً نصف وادی یردن داخل ہے جس کی چوڑائی اوسطاً دس میل ہے۔ اس کے ڈھلوان اس سطح مرتفع تک پہنچتے ہیں جو مشرق کی طرف سریانی صحرا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ڈھلوان ریتلے پتھروں کے ہیں نیچے کی طرف لیکن اوپر کے حصہ میں چونے کے پتھر ہیں۔ موآب کا میدان بنجر اور بیابان ہے لیکن شمال کی طرف جلعاد میں پہاڑیوں پر شاہ بلوط وغیرہ کے درخت کسی کسی جگہ پائے جاتے ہیں۔ مغربی فلسطین میں جو دراصل جنگل تھا اب وہ بہت اجڑ گیا ہے۔ لیکن بیس سال گزرے وہاں ایک گھنا جنگل تھا۔ شاہ بلوط کے درختوں کا ناصرت اور کرمل کے مابین۔ جلعاد میں جہاں بہت اور خوبصورت ندیاں ہیں خاص کر یابک ندی سکم کے بالمقابل۔ وہاں نظارہ اکثر ایسا ہے جیسے چمن کا۔ پھر اس کے شمال میں بشن کے زرخیز اناج کے میدان ہیں۔ اور گولان اور ارغب کے طبقے جہاں ایک خاص پتھر پایا جاتا ہے۔ وہاں آتش فشاں پہاڑ تھے جو اب جل بجھے ہیں اور دور مشرق کی طرف بشن کی پہاڑی ہے۔ جو ان میدانوں سے بلند ہے۔

الغرض فلسطین میں رنگارنگ کا نظارہ ہے اور اگرچہ میدان گرم اور موسم گرما و خزاں میں تپ وغیرہ پیدا کرتے ہیں لیکن پہاڑ زیادہ صحت بخش اور ٹھنڈے ہیں خاص کر جب کہ مغربی ہوا ہر روز سمندر کی طرف سے ماہ جون میں چلتی ہے فلسطین کی آب و ہوا جنوبی اٹلی کی مانند ہے۔ موسم بہار میں میدان پھول پتیوں سے گلزار بنے ہوتے ہیں اور یردن کی وادی ایک سبز فرش ہوتا ہے جس میں پھولوں کی بہار نظر آتی ہے۔ موسم خزاں میں سب کچھ پژمردہ اور جلا ہوا نظر آتا ہے جیسے گرما کے آفتاب اور مئی اور اکتوبر کی مشرقی ہواؤں نے جلا اور کملا دیا ہے۔ لیکن مشرق میں

یہ ملک اپنے پھلوں کے سبب سے مشہور ہے۔ انجیر۔ انگور۔ انار۔ خربوزے
خوبانیاں ملک کے سارے حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ "اچھی زمین ہے"
لیکن آدمیوں کے بُرے کاموں سے برباد ہو گئی ہے۔ چھوٹے درختوں کے درمیان
سیاح اکثر مٹے کے کولہوؤں اور تاکستان کے مجرجوں پر سے گزرتے ہیں جن سے
پتہ لگتا ہے کہ گزشتہ دنوں میں وہاں زراعت ہوتی تھی۔ فلسطین موجودہ آبادی سے
دس گنا کی پرورش کرنے کے قابل ہے اور وہاں کی آبادی ضرور ویسی ہی ہوگی
جیسی کہ عبرانیوں کے دنوں میں تھی۔ بائبل میں جن قدیم حیوانات کا ذکر آتا ہے۔
مویشی۔ پرندے۔ کیڑے مکوڑے وہ اب تک وہاں پائے جاتے ہیں۔ سوائے
شیر ببر کے جس کی ہڈیاں دریائے یردن کی ریت میں مدفون ملتی ہیں۔ اور سوائے
سانڈ کے (جنہیں یونانیوں نے غلطی سے گینڈا سمجھا) جس کا شکار لبنان سنہ ۱۳۰ ق م
میں کیا جاتا تھا۔ اور ریچھ جو اب صرف حرمون کی برفانی چوٹیوں پر سمندر سے ۹۰۰۰
فٹ کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔ ہرن بھی تبور کی چٹانوں میں اور ہرنیاں کرمل اور
گلیل کی جھاڑیوں میں اور جلعاد کے جنگلوں میں اور میدانوں میں مرگ غول کے غول
ملتے ہیں۔ اور چٹانوں میں جنگلی خرگوش پھدکتے پھرتے ہیں۔ چیتے اور بھیڑیے یردن
کے کناروں پر پائے جاتے ہیں۔ لومڑی۔ گیدڑ اور چرخ عام ہیں جیسے کہ شکاری پرند
اور جنگلی فاختہ جن سے کہ بلوط کے درخت بھرے پڑے ہیں۔ البتہ تیتر زیادہ بلند پہاڑوں
میں ملتا ہے۔ فلسطین کے درخت بھی وہی ہیں جو قدیم زمانے میں پائے جاتے تھے۔
اگرچہ سیب کا درخت جنوب میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ توبیاں۔ مگرمچھ بھی کوہ کرمل
کے جنوب کے دریا میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ بہیموت اور فیل اب معدوم ہیں۔
سولھویں صدی قبل از مسیح میں جنگلی فیلوں کے جھنڈ دریائے فرات کے کناروں
پر پھرا کرتے تھے اور سلیمان اور حزقیاہ کے دنوں میں بھی یہ جانور مشہور تھا کیونکہ انہوں

سے ہاتھی دانت کے تخت بنوائے اور اخیاب نے ہاتھی دانت کا ایک مندر بنوایا +
جن شہروں کا ذکر بائبل میں آیا ہے اُن کا بھی ہم مختصر ذکر کریں گے۔ یردن کے
مشرق کے پہاڑوں میں حبرون جنوبی علاقہ کا مشہور شہر تھا۔ وہ ایک پہاڑی وادی
میں واقع تھا اور اس کے چاروں طرف تاکستان تھے۔ اور اس کی مسجد کے فرش
کے نیچے وہ قدیم چٹانی قبر ہے جو پیٹری آرکوں کی معلوم ہوتی ہے +
یروشلم۔ جو یشوع کے دنوں میں اموریوں کا حصین شہر تھا۔ سوائے شمال
کے باقی تین طرف نالوں سے گھرا تھا اور محفوظ جگہ تھی۔ پرانا شہر مغرب کی طرف دو چوٹیوں
پر آباد تھا اور ہیکل کی پہاڑی سے اندرونی وادیوں کے ذریعہ یہ علیحدہ ہوتا تھا۔ اس
پہاڑی کا نشیب بتدریج اوفل کی طرف تھا۔ جو کاہنوں کا محلہ تھا جس کے گرد
نیچے دیوار کھینچی گئی جس سے پرے مشرق کی طرف کدرون کا نالہ تھا جس کے
کئی کراڑے تھے اور پھر مشرقی ڈھلوانوں پر زیتون کے درخت لگے تھے۔ قدیم یروشلم کا
جو بقیہ اب تک باقی ہے وہ ہیرودیس کی ہیکل کے بیرونی احاطے کی دیواریں ہیں۔ اور
مغربی دیوار اور اس کے بڑے برج کا کچھ حصہ یہ بھی اُسی زمانہ کا تھا۔ پرانا شہر
موجودہ فصیل دار شہر سے بڑا تھا۔ اور سنہ ۳۰ء کے بعد اس کی شمال کی طرف
توسیع ہو گئی اور تقریباً ۳۰۰ ایکڑ زمین اس میں شامل ہو گئی اور اُس طرف
ایک تیسری دیوار کی ضرورت ہے۔ زمین کے کھودنے سے معلوم ہوا ہے
کہ کلوری کی جو مشہور جگہ کتھیڈرل کے اندر ہے وہ ایک چوٹی پر ہے جس کا ڈھلوان
جنوب کی طرف ہے جو زیریں شہر کا قلعہ ہوگا اور یہ ناممکن ہے کہ یہ حصہ بھی شروع
میں یروشلم میں شامل نہ ہو۔ گلگتا کی زیادہ ٹھیک جگہ وہ پہاڑی ہے جو شہر کے
شمالی پھاٹک کے باہر ہے اور اب تک یہودی روایت ہے کہ صلیب دینے کی وہی
قدیم جگہ تھی +

شمال کی طرف بیت ایل کے پاس سے گزر کر جو سفید چٹانوں پر ایک چھوٹا گاؤں ہے۔ ہم قدیم دار الخلافہ سکم تک پہنچتے ہیں جس کے عین نزدیک مشرق کی طرف یعقوب کا کنواں ہے۔ یہ ان چند جگہوں میں سے ایک ہے جہاں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا خداوند گیا تھا۔ یہاں یہ صلیبی بہادروں کے گرجا میں محفوظ ہے۔ سکم میں سامریوں کے آخری بقیہ کے پاس توریت کے قدیم نسخے موجود و محفوظ ہیں۔ اور یہ لوگ کوہ گرزیم پر سال بہ سال عید فسح مناتے ہیں۔ اس کے مغرب کی طرف سامریہ بھی پہاڑیوں میں ہے وہاں سے ہیرودیس کی ہیکل اور قلعہ کے کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں سے ہم دوتین کے تنگ میدان میں جا پہنچتے ہیں۔ وہاں کنواں ہے۔ اور اب تک اس کا وہی قدیم نام ہے۔ اور پھر یزرعیل آتا ہے جو جلبوعہ کی پہاڑی پر واقعہ ہے سو وہاں مشرق کی طرف مے نکالنے کے کولہوؤں کے کھنڈرات موجود ہیں۔ نبات کا تاکستان یہاں ہی تھا۔ تھوڑا شمال کی طرف شونیم ہے جہاں لیموں کے باغ اور چشمے پائے جاتے ہیں۔ اور شمال کی طرف موریاہ کی آتش فشان چوٹی ہے اور عین دور کا گاؤں معہ غار کے اور نائین کا گاؤں بھی مغرب کی طرف نزدیک ہی ہے جو دیگر شہر شمال میں قابل الذکر ہیں وہ عکو ہے خلیج کے شمال کی طرف جس کا ذکر قدیم یادگاروں میں آیا ہے۔ اور صور جس کے دو بندرگاہ تھے شمال اور جنوب میں۔ اب بھی اچھی وسیع جگہ ہے اور بے آباد نہیں۔ صیدا جس کا وسیع بندرگاہ ہے۔ وہ سرزمین مقدس کی حدود سے باہر ہے +

ساحل سمندر پر صرف غازہ ہے جو ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ اور اس کے چاروں طرف اونچے اونچے دیودار کے درخت ہیں۔ فلسطیوں کے پانچ شہروں میں سے یہی ایک بچ رہا ہے۔ عسقلون سمندر کے کنارہ پر ایک اُجڑی جگہ

ہے جو نصف توریت سے ڈھپ گئی ہے۔ اور ان دیواروں کے کھنڈرات باقی ہیں جو رچرڈ شیر دل نے تعمیر کی تھیں۔ اشدود سرخ رنگ کی پہاڑی پر ہے یہ کچا گاؤں ہے اور یہی حال عکرون کا جو زیادہ شمال کی طرف ہے۔ جات کی قدیم جگہ غالباً وہی ہے جو تل السافی کہلاتی ہے۔ یہ ایلاہ کی وادی کے دہانے پر واقع ہے۔ لکیس بھی تل یا ڈھیر ہے زیادہ جنوب کی طرف جہاں ایسے کھنڈرات کھودنے سے ملے ہیں جو یشوع کے زمانے کے ہیں۔ یافہ یروشلم کا بندرگاہ ہے (اب ریل کے ذریعہ ان دونوں میں آمد و رفت ہوتی ہے)۔ یہ ایک بڑی جگہ ہے اور سنگتروں کے باغوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ شمال کی طرف شیرون کے میدان میں قیصریہ کے کھنڈرات میں چند جھونپڑیاں پائی جاتی ہیں اور دیواروں کے اور تماشہ گاہ۔ گھوڑوں کی جگہ اور ہیرودیس کے زمانہ کی ہیکل کے کھنڈرات باقی ہیں جو چھوٹے صلیبی شہر کی دیواروں کے پرے تک ہیں۔ یردن کی وادی میں یریحو کا نشان اُن تودوں میں باقی ہے جہاں دھوپ کی سوکھی ہوئی اینٹیں پائی جاتی ہیں۔ یہ عین السلطان پہاڑیوں کے نزدیک ہے۔ (Tamarisk) عکور کی وادی کے شمال کی طرف۔ اور ایک اکیلا املی کا درخت مشرق کی طرف جلجال کی جگہ کا پتہ دیتا ہے۔ دریا کے مغرب کی طرف ایک ہی اور شہر بیت شیان نامی ہے یزرعیل کی وادی کے شمال کی طرف اب یہ ایک کچا گاؤں ہے۔ اس کی دیواریں۔ تماشہ گاہ اور رومی زمانہ کی ہیکل باقی ہیں +

یردن کے مشرق کی طرف سارا موآب اُجڑا پڑا ہے۔ ان کے نام تو وہی قدیم ہیں لیکن یہ پچھلے زمانہ کے ہیں۔ مثلاً دیبون۔ میدبا۔ حسبون۔ ربات عمون اور گراسا پہاڑی ڈھلوانوں پر ایسے اینٹ پتھر وغیرہ پائے جاتے ہیں جو غالباً کنعانی زمانہ کے ہیں۔ مہانایم علاقہ جلعاد میں پہاڑوں پر مدور میدان میں ایک اُجڑی جگہ ہے۔ اور آج کل یہ محنوخ ماہ کہلاتا ہے۔ حالانکہ یابک کے شمال کی طرف رامات جلعاد آس

اونچی پہاڑی پر واقع تھا جس کی جگہ آج کل رائے تمون گاؤں واقع ہے اور کچھ
آگے چل کر جو جگہ سوف کہلاتی ہے وہ یعقوب اور افتاح کا مصفاہ ہوگا۔ مصفاہ
بنیامین کے علاقہ میں ایک دوسرا شہر تھا اور غالباً وہ کھنڈرات ہیں جو تل نصبہ
کہلاتے ہیں اور بیت ایل کے جنوب کی طرف جبعہ اور رآماہ کے نزدیک ہیں۔ اور
مکماش معہ کانٹوں کی وادی کے اور اس کی چوٹیاں بنام سنیہ اور بوزیز بھی ہیں
بھی چند دیہات ہیں اور عستارات کرنائیم کی جگہ (تل عشترہ) اور ادرای (Edrei)
کے کھنڈرات بصورت تودہ کے۔ اس علاقہ میں جا بجا عمدہ گھر اور مندر ہوا کرتے
تھے۔ لیکن وہ اب سب برباد ہیں۔ ان میں تیسری چوتھی صدی کے یونانی کتبے
پائے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق قدیم شہروں عوج اور صیحون سے کچھ نہیں۔ لیکن زیادہ شمال
کی طرف بمقام سیعہ (Si'a) ایک مندر ہے جس کے کتبوں سے معلوم ہوتا
ہے کہ اُسے ہیرودیس اعظم نے بعل شمیم دیوتا کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ دمشق جو
ابانا ندی کے کنارہ واقع ہے فلسطین کی حدود سے باہر حرمون کے دامن میں اب تک
آباد شہر ہے جس کی آبادی تقریباً ۲۵۰۰۰۰ ہوگی۔ یردن کے منبع کے پاس بنیاس
دان کے اوپر کی طرف (تل ال قاضی) وہی جگہ ہوگی جو قیصریہ فلپی کے نام سے مشہور
تھی۔ اور وہ نظارہ جہاں دریا ایک پہاڑی غار میں سے زور شور کے ساتھ
نکلتا ہے جہاں پان دیوتا کا یونانی مندر تھا۔ وہ فلسطین میں نہایت ہی مشہور
جگہ ہے۔ درختوں کی قطاریں دریا پر صف باندھے کھڑے ہیں اور صلیبی جنگوں
کے قلعہ کے کھنڈرات گاؤں کے اوپر کی طرف ہیں اور حرمون کی برف بھری چوٹی
شمال کی طرف دکھائی دیتی ہے۔

نئے عہدنامہ کا نظارہ بہت کچھ زیریں گلیل سے علاقہ رکھتا ہے۔ ناصرت
ایک دور گاؤں تھا جس کا نئے عہدنامے کے سوا ذکر بھی پایا نہیں جاتا۔ یہ

پہاڑیوں پر ایک میدان میں واقع ہے اور ایک پہاڑی کراڑہ شمال کی طرف
ہے۔ اب یہ شہر بہت آباد ہے۔ طبریاس جو مسیح کے دنوں میں ایک نیا شہر تھا اب
پر فصیل دار شہر ہے دریائے گلیل کے مغرب کی طرف۔ اور قدیم دیواروں کے
کھنڈرات جو وسیع احاطہ گھیرے ہیں وہ اوپر کی ڈھلوانوں پر ملتے ہیں۔
خرازین جس کے عبادت خانے کے کھنڈرات موجود ہیں وہ اس جھیل کے
شمال کی طرف ایک تحقیق شدہ جگہ ہے۔ ویسے ہی مگدالا مغرب کی طرف طبریاس
کے شمال میں ساحل کے نزدیک ایک گاؤں ہے۔ کفرناحوم کی جگہ کے بارہ میں کچھ
بحث ہے۔ مسیحی روایت تو اسے تل حوم (جو تالمود میں کفراحیم کہلاتا تھا) بتاتی ہے
شمالی ساحل پر۔ وہاں بھی عبادت خانے کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں لیکن یہودی
وسطی زمانہ کی روایت اسے زیادہ مغرب کی طرف بتاتی ہے۔ جہاں منیہ (Minyeh)
کے کھنڈرات گنیسرت کے میدان میں ساحل پر پائے جاتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کے دامن
میں ایک چھوٹی جگہ ہے۔ یوسیفس کے بیان کے زیادہ مطابق یہی موخرالذکر جگہ ہے
جس نے کفرناحوم کے چشمہ کا ذکر کیا جو گنیسرت کے میدان کو سیراب کرتا تھا۔
بیت صیدا کے بارہ میں۔ سوا ایک ہی اس نام کی جگہ ہے یردن کے دہانے کے
پاس جہاں یہ جھیل میں گرتا ہے اور دریا کے مشرق کی طرف ہے۔ آج کل یہ اَت تل
کہلاتا ہے اور ایک طرح کا ڈیلٹا یا مثلث ہے جو تقریباً ایک میل جنوب کی طرف
دریا کا دہانہ ہے۔

بیت عبارہ کی جگہ جہاں بپتسمہ دیا جاتا تھا قانائے گلیل (آج کل اس کا نام
کفر قنا ہے) سے ایک روز کی منزل تھی۔ ناصرت کے شمال کی طرف یہ کوہ زیتون پر بیت عنیا
سے دریا تین دن کی راہ تھی (یوحنا ۱: ۲۸ و ۳۵ و ۴۳ + ۲: ۲ + ۱۰: ۴۰ + ۱۱: ۶ و ۱۷)۔
اس لئے جو مسیحی روایت اسے یریحو کی شرق کی طرف بتاتی ہے وہ غلط ہوگی اور فلسطین میں

اس کا ایک ہی دفعہ نام آیا ہے یعنی عبارہ کا گھاٹ جو دریائے گلیل سے بہت جنوب کی طرف نہ تھا اس جگہ سے سارے دیگر بیانات تسلی بخش مطابقت رکھتے ہیں۔ دیگر مشتبہ جگہیں جو بتائی جاتی ہیں مثلاً گرگسا۔ افرائیم۔ ان پر بحث کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن اس امر واقعی کی کہ گلاڈا کی جگہ دلمنوتہ پایا جاتا ہے (مرقس ۸: ۱۰) یوں تشریح ہو سکتی ہے کہ عبرانی میں گلاڈا کے معنی برج ہیں۔ حالانکہ پہلا نام آرامی ہے یعنی گھاٹ کی جگہ۔ فلسطین کی عام زبان آرامی تھی جس وقت کہ اناجیل لکھی گئیں اور شاید خود مسیح بھی یہی زبان بولا کرتا تھا۔

مسیح کی خدمت کے آخری نظارے بیت عنیاہ سے علاقہ رکھتے ہیں۔ یہ اب ایک چھوٹا شہر ہے۔ کوہ زیتون کی وسطی چوٹی کے جنوبی ڈھلوانوں پر۔ یہاں ایک قدیم قلعہ کے کھنڈرات بھی ہیں جس کے ذریعہ اس خانقاہ کی حفاظت ہوتی تھی جو یروسلم کی ملکہ ملی سنٹ نے بنوائی تھی (Benedictine nunnery of queen milicent)

اس کی زندگی کا پہلا نظارہ بیت لحم تھا جو اب عمدہ ساخت کا مسیحی شہر ہے وہ یروسلم سے جنوب کی طرف بہت دور نہیں اور کوہ زیتون کے ڈھلوان پر ہے۔ یہاں کا کتھیڈرل دنیا بھر میں پرانا گرجا ہے۔ اس کے ستون قسطنطین اعظم نے کھڑے کئے تھے جو چٹانی میدان نیچے ہے۔ جہاں چٹان میں کھدی ہوئی چرنی ہے یہی وہ اصطبل کی جگہ سرائے میں تھی یہی وہ مقدس جگہ انجیل کی تاریخ میں ہے جس کا ذکر مسیحی مصنفوں نے چوتھی صدی سے پیشتر کیا ہے کیونکہ یہ جسٹن شہید اور اوریگن اور جیروم کو معلوم تھی۔ جبرون کے پہاڑوں کے اجڑے شہروں میں ایسے چٹانی اصطبل اکثر پائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہی جگہ ہو۔

ادولام۔ دبیر۔ جزرہ۔ مجدو۔ انتی پطرس۔ بزک۔ تعنک اور دیگر شہروں کا جو ابھی دریافت ہوئے ہیں زیادہ ذکر کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ فلسطین کے چھ سو شہروں کا ذکر بائبل میں آیا ہے جن میں سے کم از کم چار سو مشہور ہیں اور ان میں سے ۱۵۰ کا ذکر [illegible] ۱۸۶۵ء کی تحقیقات سے پیشتر کسی نقشہ میں پایا نہ جاتا تھا۔

بائبل کی قدیم اشیا

گذشتہ صدی میں بائبل کے مطالعہ کی خاص خصوصیت نکتہ چینی یا جرح (criticism) نہ تھی بلکہ دریافت کیونکہ نکتہ چینی تو اٹھارھویں صدی میں شروع ہوئی۔ مقابلہ کرنے کے طریقے نے جیسا کہ دوسرے علوم میں ہوا رفتہ رفتہ تفسیر کی صورت اختیار کر لی۔ اور بہت کچھ قابل اعتبار اور ایسے معلومات حاصل ہوئے جو اور کسی طرح سے معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اور یہ نتیجہ تھا مشرقی ممالک میں سائنٹفک تحقیقات اور کھودنے کا جس کے ذریعہ پوشیدہ خزانے ظاہر ہو گئے۔ بارہ سو برس سے زیادہ تک مغربی ایشیا مسلمانوں کی تعصب کی وجہ سے ایسی تحقیق و تدقیق کے لئے بند پڑا رہا لیکن آخرکار جب تہذیب نے ترقی کی اور سیاحت کے وسائل زیادہ حاصل ہو گئے تو اہل یورپ کو موقعہ ملا کہ خود مشرقی ممالک میں رہ کر مشرقی زندگی کا مطالعہ کریں۔ غیر تر قبر خزانے۔ فراموش شدہ قدیم تہذیبیں زبانیں اور نوشتے جو ہزارہا سال سے مٹی کے ریتوں میں مدفون پڑے تھے۔ یا ایشیائی محلوں کی بنیادیں بتدریج ملتی گئیں اور ان محققوں کی کوششوں اور عالموں کی عقل کے ذریعہ دوسروں کے لئے ان کا راہ کھل گیا۔ ایسی دریافت کے وسیلے سے بائبل کا مطالعہ بالکل ایک نئی بنیاد پر قائم ہو گیا اور اگرچہ اس کے وسیلے سے اٹھارھویں اور اُس سے ماقبل صدیوں کی بہت راہیں متروک ہو گئیں لیکن یادگاروں کی جو شہادت اسی طرح سے محفوظ رہی اس نے اس تاریخ کی زیادہ تصدیق کی عبرانیوں اور اُن کے آس پاس کی قوموں کے خیالات اور رسوم کی زیادہ تشریح کر دی جن کا کہ بیان پرانے اور نئے عہدناموں میں ہوا ہے۔ لیکن اس مطالعہ کا یہاں پر ہی خاتمہ نہیں بلکہ ہر سال کچھ نہ کچھ نئی معلومات

حاصل ہوتی ہیں۔ فلسطین۔ ایشیائے کوچک۔ مصر اور مسوپتامیہ میں روز بروز تحقیقات ہو رہی ہے۔ اور نئی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں اور زبان اور یادگاروں کا مطلب زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے جس میں کہ یہ بیانات لکھے گئے تھے جن کا ذکر بائبل میں آیا ہے +

۱۸۲۰ء سے پیشتر صرف فنیکی یادگاریں جو بہت پرانی ہیں علما کو مل سکتی تھیں اور خاص مطالعہ یہ تھا کہ مقدس نوشتوں کے نسخوں اور ترجموں کا مطالعہ کریں اور عبرانی نسخوں کے لحاظ سے یہ ہم کو صرف ۱۰۰۸ء تک پہنچاتا تھا اور یونانی سُریانی اور سامری نسخوں کے لحاظ سے چوتھی اور پانچویں صدیوں تک مصری تصویر نما حروف (Hieroglyphs) اور کونائی شکل (cuneiform) کی نوشتیں وسطی زمانہ میں بھی حیرت کی اشیا سمجھی جاتی تھیں لیکن ۱۸۲۲ء میں اس مطالعہ کو تحریک ملی۔ جب ایک فرانسیسی عالم چمپولی آن (champollion) نامی نے ان کے معنی ظاہر کئے (۱۸۱۲ء میں پہلی جتنی یادگاروں کا ذکر جو حاماث میں ملی تھیں برکٹ (Burckhardt) صاحب نے کیا لیکن ان کی اہمیت و اشاعت اور بیس سال تک ملتوی رہی۔ ۱۸۳۵ء میں سر ہنری رالنسن (Sir Henry Rawlinson) نے کونائی شکل کے حروف کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی مدد سے وہ ایک نئی اور خاص سائنس بن گیا۔ لیکن [illegible] تک کنعان کی تہذیب کا ثبوت جو موسیٰ اور یشوع کے زمانہ میں مروج تھی نہ ملا۔ اس وقت وہ پرشکل خط و کتابت ملی جو ایشیا کے بادشاہوں اور سرداروں کی فرعونوں کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ تحریریں موضع آمرنا (amarna) میں ملیں جو مصر میں ممفس اور تھیبز کے مابین واقع ہے۔ ای چینٹر (E chantre) کی دریافتیں جو ۱۸۹۳ء میں اور ڈاکٹر ایچ ونکلر کی دریافتیں جو ۱۹۰۶ء میں علاقہ کپادوقیا میں ہوئیں

ان کے ذریعہ کونائی حروف کی عبارت سے کچھ زیادہ علم حاصل ہوا جن میں کہ حتّیوں۔ مصریوں اور بابلیوں کی تاریخ پندرھویں اور چودھویں صدیوں قبل مسیح کی عجیب مفصل طور سے پائی جاتی ہے +

زمانہ حال کا عالم اپنے علم اور معلومات کے لئے یونانی یا رومی مصنفوں کا ہی دست نگر نہیں جو کہ غیر ملکی تہذیب و شائستگی سے اکثر ناواقف تھے۔ یا یوسیفس کی محرف عبارت پر۔ یا بطلیمی زمانہ کے مصری مورخ مینتھو (manetho) نامی پر یا بابلی بروسس (Berosus) کی تصنیفات کے چند اجزا پر۔ بلکہ پتھروں چٹانوں یا مٹی کے تختوں یا بھوج پتر پر جو یادگاریں ہیں ان کو وہ خود پڑھ سکتے ہیں جیسے کہ فنیکی عبارتوں۔ یا فلسطین۔ فارس۔ یونان اور روم کے سکوں کو جن زبانوں کی ہستی سے بھی لوگ ناواقف تھے (مثلاً اکادی خلدیہ میں)۔ صابئین عرب میں قدیم فارسی۔ وآنی اور توکیان زبانیں وہ اب معلوم ہو گئی ہیں اور موجودہ زبانوں مثل ترکی عربی۔ قبطی وغیرہ کی مدد سے ان کا مطلب سمجھ میں آ گیا ہے۔ اور جن زبانوں کا ابھی پتہ لگا ان کے معنی سمجھنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مثلاً حتّی وغیرہ بولیاں جو حال ہی میں ظاہر ہوئی ہیں +

مصری تحقیقات۔ گو ساری شاخوں کی نسبت اس کی طرف شاید زیادہ توجہ مبذول ہوئی تو بھی اب تک یہ جزوی اور غیر مکمل حالت میں ہے کیونکہ اس کی مسلسل تاریخ اب تک ظاہر نہیں ہوئی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ڈیلٹا کی تہذیب بہت قدیم ہے لیکن جس زمانہ میں یہ پہلے برپا ہوئی اس کے بارہ میں بھی دو ہزار برس کا تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ ۱۶۰۰ء ق م سے ۱۳۰۰ء ق م تک مصری اس بڑی تجارتی شاہراہ کے مالک تھے جو فلسطین اور سوریا سے ہو کر مسوپتامیہ کو جاتی تھی۔ رعمسیس دوم کی یادگاریں (۱۳۳۰ء ق م) جو بمقام صیدا۔ بیروت اور دمشق میں ملتی ہیں۔ اور دمشق میں

ایک کتبہ سیتی اول کا ہے (۱۳۲۰ق م)۔ وہ حال ہی میں ملا ہے۔ لیکن مصری عبارتوں میں عبرانیوں کی طرف صرف ایک ہی اشارہ ہے۔ یعنی اسرائیل فلسطین میں من پتاہ (mine-ptah) کا حملہ کرنا ۱۲۳۰ق م کے بعد۔ برعکس اس کے قدیم بائبل کی تاریخ میں جو سب سے زیادہ مدد مل سکتی ہے وہ کنعانی خطوں میں ہے جن کا ذکر پیچھے ہو چکا کہ وہ مصری نسخوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں شاید پہلا ذکر عبرانیوں کی طرف پندرھویں صدی قبل مسیح کا ہے جبکہ یشوع نے فلسطین فتح کیا تھا۔

بابلی اور آسوری یادگاریں۔ ان میں مصری یادگاروں کی نسبت زیادہ حالات ملتے ہیں جن کا تعلق بائبل سے ہے۔ بابل کی تاریخ میں صحیح زمانہ دیا گیا ہے۔ اس وقت تک کہ اس بڑے شہر کی بنیاد (۲۲۵۰ق م) کے قریب پڑی اور بہت صدیاں پہلے کے خلدین بادشاہوں کی موجودگی تحقیق ثابت ہو گئی ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا تاریخ کے پہلے زمانہ کے بارہ میں بہت کچھ تحقیق نہیں ہوا۔ نویں صدی ق م سے لے کر اسرائیل اور یہوداہ کے بادشاہوں کے نام آسوری ہم عصر بادشاہوں کے احوال میں آتے ہیں جن کا ذکر عہد عتیق میں ہوا ہے اور بنوکدنضر کے متعلق عبارت۔ اور دوسرے مقام جو دانیال کی کتاب کے بابل کے متعلق ہیں اور بعد ازاں دارا اور ارتخششتا کے زمانہ کے فارسی کتبے کی تاریخ کے سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ نینوہ میں جو زمین لایارڈ (Layard) صاحب نے کھدوائی جس کے ذریعہ سے یہ علم بہت کچھ حاصل ہوا۔ یہ کام پہلے پہل ۱۸۴۹ء میں شروع ہوا۔ لیکن حال ہی میں اہل امریکہ نے بمقام نپور (واقعہ خلدیہ) بابل کے جنوب میں جو کھدائی شروع کرائی ہے۔ اور اہل جرمن نے خود بابل میں اور شمالی سوریا میں۔ اور فرانسیسی گورنمنٹ نے تل لوہ (Tell Loh) (واقعہ خلدیہ) میں۔ بمقام شوشن جو دریائے

دجلہ کے زیریں حصہ کے مشرق کی طرف ہے۔ اور کپادوقیا میں سوریا کے عین شمال کی طرف ان کے ذریعہ مغربی ایشیا کی قدیم تہذیب کے ابتدائی درجوں کے بارہ میں ہم کو بہت کچھ علم حاصل ہو گیا ہے۔

فینیکی تحریریں اس قدر مابعد زمانہ کی ہیں کہ ان سے بائبل کی تاریخ کے متعلق بہت مدد نہیں مل سکتی۔ اگرچہ اس امر کے بارہ میں وہ دلچسپی رکھتی ہیں کہ اس مشہور بحری قوم پر عبرانیوں کے کلام کی کیا تاثیر ہوئی جس کے قبضہ میں صور سے لے کر لبنان کے شمال تک کے ساحل تھے۔ پندرھویں صدی قبل از مسیح میں فینیکیوں کی وہی زبان تھی جو بابل اور آسور میں بولی جاتی تھی اور کونائی حروف تحریر میں استعمال کرتے تھے۔ یہ حروف پیچھے سارے مغربی ایشیا میں مروج ہو گئے۔ لیکن ان کے مابعد کتبے چوتھی صدی قبل از مسیح کے حروف تہجی میں ہیں اور ایسی بولی میں ہیں جو عبرانی سے بہت مشابہ ہے اور شمالہ کے کھنڈرات میں جو کتبے ملے ہیں (سوریا کے نہایت شمال کی طرف) اور جو آٹھویں صدی قبل از مسیح کے ہیں وہ آرامی بولی میں ہیں۔

فلسطین میں تین قدیم تحریریں ملی ہیں۔ ایک تو موآبی پتھر (نویں صدی قبل از مسیح کا)، سلوام کے کتبے (۷۰۰ق م سے پیشتر کے)، اور پندرھویں صدی قبل از مسیح کی تختی جو لکیش میں ملی جس میں زمریدا (Zimrida) ایک مقامی حاکم کا ذکر ہے جس کے خطوں کا ذکر تل العمارنا کے مجموعہ میں بھی ہے۔ دوسری صدی مسیحی کے گلیلی عبادت خانے ایسی تحریروں کو ظاہر کرتے ہیں جو مربع حروف میں ہیں اور ایک کتبہ ان سے پہلے کا یروشلم میں بنی حزیر کے مقبرہ پر پایا جاتا ہے لیکن اب تک بہت تھوڑے سے قدیم کتبے، سکے اور مُہریں ملی ہیں۔

حتی یادگاریں۔ ان میں مصوری کی کئی مثالیں ہیں۔ انسانوں کی شکلیں جو مغلوں کی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا خاص لباس ہے۔ اور تاتاریوں کی طرح لمبی چوٹیاں

ہیں یہ تصویریں بمقام حامات اور الیپو شمالی سوریا میں منقش ہیں اور ان پر تصویر دار حروف ہیں اور وہ غالباً دو ہزار قبل از مسیح کے ہیں۔ وہ اُس علاقہ میں پائے جاتے ہیں جس میں قدیم زمانوں سے بنوکدنضر کے عہد سلطنت تک حِتّی رہا کرتے تھے (۶۰۶ ق م)۔ لیکن وہ سارے ایشیا کوچک میں پھیلے ہوئے تھے اور اس کی دو مثالیں خود بابل میں ملی ہیں اور حِتّی تحریریں نینوہ میں ملی ہیں خود حتّی لوگ شمالی سوریا اور کپادوکیا میں محدود تھے لیکن یہ قدیم اشیا ایسی نسل سے علاقہ رکھتی ہیں جو بابل کی قدیم اکادی نسل سے مشابہ تھی حِتّی لوگ ان کی ایک شاخ یا فرقہ تھا۔

یونانی قدیم اشیا مغربی ایشیا میں مقابلہ کے مقصد کے لئے مفید ہیں ان سب میں سے زیادہ اہم وہ پتھر ہے جو یروشلم میں ملا تھا جس پر ایک عبارت لکھی ہے جس میں یہ ممانعت ہے کہ کوئی غیر قوم ہیرودیس کی ہیکل کے اندرونی حصہ میں داخل نہ ہو۔ ہمارے خداوند اور پولس کے دنوں میں یہ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ دوسری عبارات اس امر کی شاہد ہیں کہ دکاپولس میں یونانی بولنے والے (دریائے گلیل کے مشرق کی طرف بشن کے علاقہ میں) اُس زمانہ میں موجود تھے۔ دوسرے کتبے زیادہ مشرق کی طرف سیع (Seeia) بت پرستوں کے مندر میں سے ملے۔ جسے ہیرودیس اعظم کی کسی رعیت نے تعمیر کیا تھا۔ یہ مشہور بات ہے کہ جو اصطلاحات خاص کر رسولوں کے اعمال کی کتاب میں مستعمل ہوتی ہیں وہ عجیب طرح سے اُس یونانی عبارت کے مطابق ہیں۔ جن کی طرف رومیوں نے پہلی صدی مسیحی میں سوریا اور ایشیا کوچک کی سلطنت کی طرف اشارہ کیا۔ جو یونانی بھوج پتر مصر سے ملے ہیں اُن سے بھی ابتدائی مسیحی دین کے بارہ میں بہت دلچسپ باتیں معلوم ہوگئی ہیں۔

فلسطین کی کھدائی۔ بائبل کے مطالعہ کے مقابلہ کے طریقہ میں اس کھدائی سے بہت ترقی ہوئی۔ فلسطین کے جغرافیہ کی سائنٹفک تحقیقات کا کام پہلے پہل ۱۸۳۸ء میں امریکن سیاح ڈاکٹر رابنسن نے شروع کیا۔ اور جس نے یونانی اور لاطینی کلیسیاؤں کی غلط اور نقیض روایات کو رد کیا اور اس کی جگہ وہ جغرافیہ قائم کیا جو خود اُس ملک میں جاکر تحقیق کیا تھا۔ پرانے شہروں کی جگہوں کو دریافت کیا جہاں کے پرانے نام اب تک موجودہ سُریانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۶۴ء میں سر سی۔ ڈبلیو ولسن صاحب نے یروسلم کی پیمائش (Survey) کرائی اور ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۰ء تک بذریعہ سر سی وارن صاحب ہیکل کی پہاڑی پر اور شہر میں بہت ضروری کھدوائی کا کام ہوا۔ مغربی اور مشرقی فلسطین کی پیمائش خود میں نے کرائی (۱۸۷۲ء سے ۱۸۸۲ء تک) اور اس وقت تقریباً ۱۵۰ بائبل میں مذکور شدہ شہر اور مل گئے جو پہلے نقشوں میں پائے نہ جاتے تھے۔ کوہ سینا کی پیمائش ۱۸۶۸ء میں شروع ہوئی اور اس سے خروج کے قصہ کے سمجھنے میں مدد ملی۔ لیکن جغرافیہ کے متعلق معلومات کے سوا فلسطین کی عمارات کے مطالعہ نے بہت غلطیوں کو دور کر دیا اور عبرانی اور کنعانی تہذیب کو بہت کچھ روشن کر دیا۔ البتہ یروشلم کے سوا دیگر مقامات میں کھدائی کا کام ابھی شروع ہوا ہے اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ لکیس میں اور جات کی جگہ۔ جزر میں اور تعنک واقع گلیل میں اور دوسری جگہ۔ انگریزی۔ امریکن اور جرمن کھدائی کرانے والوں نے قدیم شہروں کی بنیادیں شمال اور جنوب دونوں میں کھود کر نکالی ہیں۔ اور ان میں کئی کتبے ملے ہیں۔ عبرانی اوزان صوتی اور نگ۔ قدیم کنعانی بتوں کے ٹکڑے اور دیگر قیمتی آثار اس ملک کی قدیم تہذیب کے جن سے بائبل کے بیانات کی تشریح ہو جاتی ہے۔ چونکہ عبرانیوں نے کنعان

کے بتوں کو برباد کر دیا تھا۔ اس لئے زمین مقدس کی سطح پر ایسے نشان پانا ناممکن ہے وہ صرف زمین کھدوانے ہی سے مل سکتے ہیں +

اس عملی کام کا عام نتیجہ یہ ہوا کہ بحیثیت مجموعی بائیبل کی تاریخ کی تصدیق ہو گئی جہاں کہیں ان کا مقابلہ ہم عصر تحریرات سے کیا گیا۔ بابل کی تاریخ صحیح طور سے ابراہیم کے زمانہ تک دریافت ہو سکتی ہے اور کنعان کی تہذیب جو موسیٰ اور یشوع کے زمانہ میں پائی جاتی تھی وہ مصر کی فتح کی تاریخوں اور موجودہ کھنڈرات سے ثابت ہوتی ہے۔ اور ان سے عبرانی بادشاہوں کی دولتمندی اور علم کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ جو تحریریں پختہ مصالح پر تھیں مثلاً پتھر یا اینٹ پر وہ اس وقت موجود تھیں جب موسےٰ نے شریعت کی لوحیں لکھیں۔ اُس وقت موتیوں پر کھُدائی ہوتی تھی۔ اور خیمے کے سنہری ستون استعمال ہوتے تھے۔ اور قدیم فقیہوں نے ان کو ہزارہا سال تک صحیح طور سے محفوظ رکھا اور نقل کرنے میں انہوں نے بہت احتیاط کی اور اس سے ثابت ہوا کہ اس تہذیب کے ظاہر کرنے میں توریت نے کوئی غلطی یا مبالغہ نہیں کیا +

عبرانی جنتری۔ سکّے۔ اوزان اور ماپ

جنتری

یہاں ہم یہودی جنتری کے آغاز کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کرتے لیکن مابعد زمانوں میں جو صورت اُس نے اختیار کی اس کا مختصر بیان کیا جائے گا۔ سال کا اندازہ موسموں کے انقلاب پر لگایا جاتا تھا اور اُسے بارہ مہینوں پر تقسیم کرتے تھے۔ چاند کے انقلابات کے مطابق ایک مہینے کے دن کبھی انتیس کبھی تیس ہوتے تھے۔ یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ عبرانی تاریخ کے مختلف زمانوں میں سال کب شروع ہوتا تھا۔ جلاوطنی سے پیشتر شاید یہ موسم خزاں میں شروع ہوتا تھا۔ لیکن بعد ازاں معلوم ہوتا ہے کہ دُہرا انتظام تھا جس کے مطابق ملکی سال کا آغاز تو موسم خزاں سے گِنا جاتا تھا اور مقدس سال کا موسم بہار سے۔ عہد عتیق میں عموماً مہینوں کا شمار گنتی کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً پہلا مہینہ۔ لیکن آخرکار مفصلہ ذیل نام ان کے رکھے گئے۔ ابیب یا نیسان۔ جو تقریباً ہمارے اپریل کے مطابق ہے اور دوسرے مہینوں کے نام بترتیب یہ تھے۔ زِف۔ سیوان۔ تمز۔ آب۔ الول۔ تِشری یا ایتانیم۔ بُول۔ چسلو۔ تبت۔ شبت۔ اور آدار۔ ہر مہینہ چار ہفتوں پر منقسم تھا اور ہر ہفتے میں سات دن تھے۔ آخری دن نہ کہ پہلا دن ہفتہ کا آرام کا سبت تھا۔ دن طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک شمار ہوتا تھا اور اس کو پہروں یا گھنٹوں پر تقسیم کرتے تھے۔ خواہ رات کا شمار ہو یا دن کا۔

روپیہ

سب سے پہلے یہودی سکّے شمعون مکابی کے دنوں میں ۱۴۲ ق م کے

قریب ضرب ہوئے۔ لیکن فارسی، مصری۔ اور فنیکی سکے اس سے پیشتر مروج تھے اور بعد ازاں یونانی اور رومی سکے مروج ہوئے۔ قدیم زمانوں سے خرید و فروخت کے لئے مختلف قسم کی دھاتیں استعمال ہوتی تھیں یا تو ٹکڑوں کی صورت میں یا حلقوں کی صورت میں اور ان کی قیمت کا اندازہ ان کے وزن پر موقوف تھا۔ سونے اور چاندی کی قیمت بلحاظ وزن کے حسب ذیل تھی:-

	قدیم عبرانی			یہودی	
	پونڈ	شلنگ	پنس	شلنگ	پنس
ہلکا مثقال چاندی کا	۰	۱	۸	۱	۲
بھاری مثقال چاندی کا	۰	۳	۴	۲	۴
ہلکا مینا چاندی کا	۴	۳	۴		
ہلکا مینا سونے کا	۶۶	۱۳	۴		
ہلکا توڑا چاندی کا	۲۵۰	۰	۰		
ہلکا توڑا سونے کا	۴۰۰۰	۰	۰		

۳۵۰ ق م سے پیشتر سکے مروج نہ تھے اور عزرا کے زمانے سے پیشتر بائبل میں سکوں کا ذکر نہیں آتا۔ عزرا ۲: ۶۹ + نحمیاہ ۷: ۷۰ و ۷۱ و ۷۲ میں درکیمون یا درہم کا ذکر آتا ہے اور تواریخ ۲۹: ۷۔ عزرا ۸: ۲۷ میں اور آکون (درہم) کا جو غالباً اتنا ہی ٹکڑا چاندی کا تھا۔ یہ لفظ غالباً فارسی زبان کا ہے۔ فارسیوں کا درہم (daric) ۱۳۰ رتی وزن کا تھا۔ نئے عہد نامہ میں مفصل ذیل الفاظ آئے ہیں وہ یا تو یونانی یا رومی سکوں سے علاقہ رکھتے ہیں:-

دمڑیاں (lepton) مرقس ۱۲: ۴۲ سب سے چھوٹا یہودی سکہ برنجی قیمت ½ فردانگ

کوڑی (Kodarantes) متی ۵: ۲۶ + ¼ اونس آنز = ½ فردانگ۔

پیسا (assarion) متی ۱۰: ۲۹ + رومی آنز۔

دینار (denarius) متی ۱۸: ۲۸۔ رومی سکہ = ½ ۸ پنس کے

درہم (drachme) لوقا ۱۵: ۸ + انطاکیہ کا سکہ = دینار کے برابر

مثقال (didrachmon) متی ۱۷: ۲۴ + انطاکیہ کے دو درہم کے برابر = ۱ شلنگ ۴ پنس۔

روپے (argurion) متی ۲۶: ۱۵ + تین دینار کے برابر یا ۲ شلنگ ½ ۱ پنس کے۔

مثقال (stater) متی ۱۷: ۲۷ + یہ پچھلے کے برابر تھا

اوزان

ہلکا مثقال = ۱۶۰ رتی

بھاری مثقال = ۳۲۰ رتی

ہلکا منا = ۵۰ ہلکے مثقال کے = ۸۰۰۰ رتی کے = ۱ پونڈ ۴ اونس ۱۲ (drams) ۸ رتی کے

بھاری منا = ۱۰۰ مثقال = ۱۶۰۰۰ رتی کے

ہلکا توڑا = ۳۰۰۰ ہلکے مثقال کے = ۴۸۰۰۰۰ رتی کے

بھاری توڑا = ۳۰۰۰ بھاری مثقال کے = ۹۶۰۰۰۰ رتی کے۔

بیکہ = ½ مثقال۔

ربع = ¼ مثقال

جیرہ = 1/20 مثقال

توڑا یا کیکر = ۶۰ من

ماپ

مصریوں کا گز (cubit) ۲۰.۶ انچ کا ہوتا تھا۔ اور بعد ازاں

۱۶ء۱۲ انچ کا استعمال ہونے لگا۔ خلدیہ کے قدیم اکادی لوگ ۵ء۱۰ انچ کا گز استعمال کرتے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اہالیان بابل اور آسور یہی استعمال کرتے تھے یا نہیں۔ شوام کی سرنگ (۱۲۰۰۰ cubits) سے پتہ لگتا ہے کہ حزقیاہ کے زمانہ میں عبرانی گز (ammah cubit) ۱۷ انچ سے بڑا نہ تھا۔ یسیمونی دیس لکھتا ہے کہ عمارت کا گز (ammah cubit) ۱۱۶ انچ کا تھا اور چھوٹا گز (ammah cubits) ۳ء۱۳ انچ کا عربی ذرع یا ہاتھ کا نصف۔

لفظ (ammah) کیوبٹ کے معنی ہیں ہاتھ۔ اس کی یوں تقسیم تھی۔

جو	=	۳۳ء انچ
انگلی	=	۶۶ء انچ
ہتھیلی	=	۶۶ء۲ انچ
مشت		۳۳ء۵
بالشت		۰۰ء۸

	فٹ
	۶۶ء۱۰
کیوبٹ خورد	۳۳ء۱۳
عمارت کا کیوبٹ	۰۰ء۱۶
کیوبٹ کلاں	۶۶ء۱۸

مربع ماپ

عبرانی مربع ماپ (خروج ۲۷-۱۲ءو ۱۸) ۵۰ کیوبٹ مربع پر مبنی تھا۔ یوں زمین کا ایک کور (Kor) ۱۶ انچ کے کیوبٹ کے حساب سے ۰۳ء۳ ایکڑ ہوں گے۔ بہت کچھ عربی فدآن کے برابر یا ۳ء۳ ایکڑ کے برابر

خشک ماپ

ربیوں کے حساب کے مطابق ایک لوگ (Log) مرغی کے چھ انڈوں کے برابر تھا اور اس میں ۶۰۰ رتی کے برابر پانی سما سکتا تھا۔ تقریباً اسی قسم کا ایک ماپ مصر میں مستعمل تھا۔

لوگ ۲۴ مکعب انچ ۶۹ء۰ پنٹ (Pints)

کب	۹۶	...	۷۶ء۲ پنٹ
ومر	۸ء۱۷۲		۹۶ء۴ ″
ہین	۲۸۸		۰۴ء۱ گیلن
سیہ	۵۷۶		۰۸ء۲ ″
ایفہ	۱۷۲۸		۲۰ء۶ ″
کور	۱۷۲۸۰		۰۰ء۶۲ ″

تری کے ماپ

یہ ماپ بقول یوسیفس یونانی ماپوں کے مطابق تھے۔

	عبرانی مکعب انچ	یونانی
لوگ		
کب	۷ء۳۲ +	۸۱ء۰ پنٹ۔ ازستا + ۹۴ء۰ پنٹ
اومر	۸ء۱۳۰ +	۴۴ء۳ + ۴ ازستا + ۷۶ء۳ ″
ہین	۰ء۲۳۶ +	۷۰ء۶ + ۱۲ ازستا + ۵۸ء۶ ″
سیہ	۰ء۳۹۳ +	۴۰ء۱ گیلن + ۲ کوآس + ۳۹ء۱ گیلن
بط	۰ء۲۸۵۰ +	۹۰ء۲ + ½ امپوڈائی + ۸۰ء۲ ″
کور	۰ء۲۳۵۳ +	۴۰ء۸ + ۱ اختریطس + ۴۰ء۸ ″
	۰ء۲۳۵۳۶ +	۰۰ء۸۴ + ۱۰ اختریطس + ۰۰ء۸۴

بائیبل کی تاریخ

ابراہیم کی بلاہٹ سے پیشتر کی تاریخ بتانا ممکن نہیں۔ اور اس واقعہ کے بعد بہت سالوں تک بلکہ بادشاہوں کے زمانہ تک تاریخوں کا اندازہ کم و بیش بہت مشکوک ہے۔ ظلم کا زمانہ اور مختلف قاضیوں کی حکومت کا

زمانہ جو قاضیوں کی کتاب میں دیا گیا ہے اُس میں کچھ مبالغہ ہے۔ لیکن جن واقعات کا اس کتاب میں ذکر ہے اُن میں سے بعض ایک ہی زمانہ کے وقوعے ہیں اور نہ یکے بعد دیگرے وقوع میں آئے۔ جو سن عبرانی بادشاہوں کے دیئے گئے ہیں وہ ان کی سلطنت کی درازی کے لحاظ سے ہیں جن کا ذکر سموئیل اور سلاطین کی کتاب میں پایا جاتا ہے اور جس کی اصلاح کسی قدر آسوری کتبوں کے مطابق کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ کتبے اس امر میں بیش بہا ہیں

تاریخ	واقعات	تاریخ	واقعات
ق م ۲۳۰۰؟	ابراہیم	ق م ۱۰۴۰	ساؤل
ء ۱۷۰۰؟	یوسف	ء ۱۰۱۷	داؤد
	مصر میں جانا	ء ۹۷۷	سلیمان
ء ۱۲۵۰؟	موسیٰ	ء ۹۷۳	ہیکل کی بنیاد۔
	خروج	ء ۹۳۷	سلطنت کا منقسم ہونا

ء ۱۲۰۰ سے ۱۰۵۰ تک قاضیوں کا زمانہ

سلطنت کے منقسم ہونے کے بعد

تاریخ	اسرائیل	یہوداہ	تاریخ	اسرائیل	یہوداہ
ق م ۹۳۷	یربعام اول	رحبعام	ق م ۹۱۴	بعشہ	
		شیشک کا حملہ کرنا	۹۰۰ (۸۹۰)	ایلہ	
۹۳۰		ابیاہ	۸۹۹ (۸۸۹)	زمری	
۹۱۷		آسا	۸۹۹ (۸۸۹)	عمری	
۹۱۵	نادب				

تاریخ	اسرائیل	یہوداہ
	سامریہ کی بنیاد	
ق م ۸۷۶		یہوسفط
۸۷۵	اخیاب	
۸۵۴	اخیاب کرکر کی لڑائی میں	
۸۵۳	اخزیاہ	
۸۵۲	یہورام (یورام)	
۸۵۱		یہورام
۸۴۳		اخزیاہ
۸۴۲	یاہو	اتھلیاہ
	آسور کو خراج دیتا ہے	
۸۳۶		یوآش
۸۱۵	یہوآخز	
۷۹۸	یوآش	
۷۹۶		امصیاہ
۷۸۹		عزریاہ یا عزہ
۷۸۲	یربعام دوم	
۷۳۹		یوتام
۷۴۱	زکریاہ شلوم	
۷۴۰	سناحیم	
۷۳۸	آسور کو خراج دیتا ہے	